

# خانہ بدوش

سفرنامہ

مُستنصر حسین تارڑ



# ”خانہ بدوش“

۷	۱	عکس چار سُو ہے
۳۱	۲	آپریشن افغانستان
۶۱	۳	کاروان سرائے
۷۷	۴	سُنہری کُونج
۱۰۹	۵	باہر رات ہے
۱۲۷	۶	مائی پھیرے باز
۱۴۵	۷	سُکھ دیپ
۱۶۳	۸	وادی آرا رات
۱۸۵	۹	سُوئے شام
۲۰۳	۱۰	دَم دِشَق اندر — ۱
۲۲۱	۱۱	دَم دِشَق اندر — ۲
۲۳۷	۱۲	گولان
۲۵۱	۱۳	بیروت — خانہ جنگی !
۲۶۵	۱۴	بیروت — واپسی کا دن !
۲۸۷	۱۵	بیروت — بادشاہ یا جوکر !
۳۰۱	۱۶	بیروت — خُدا حافظ !
۳۱۹	۱۷	قبرص

## عکس چار سو ہے

۲۳۷	۱۸) سکندر - سکندریہ
۲۵۵	۱۹) اوڈیسس کشتی روک دو
۲۶۷	۲۰) شیطان اور سکندر کے درمیان
۲۸۱	۲۱) روم سویٹ روم
۲۹۹	۲۲) پتھر کا شہر
۳۲۵	۲۳) ونس کی موت
۳۵۵	۲۴) آپس
۳۷۳	۲۵) چپسی
۳۸۵	۲۶) چپسی اور خاموشی
۵۰۵	۲۷) ہوا میں مرگ

ہوا تیز ہے۔ اس کی شدت کے موبہم برجھے میری آنکھوں میں کھبتے چلے جاتے ہیں اور یوں میری نظر کے آگے نمی کی ایک جھلی نمودار ہونے لگتی ہے۔ محدود اور لامحدود فاصلوں پر ابھری اشیاء اس آبی پردے کے پار سراب کی صورت لہر رہی ہیں۔ نیچے، میرے قدموں میں بچھے سپاٹ میدان کی بنجر سطح میں سے ہوک کی مانند ایک بگولا اٹھ رہا ہے۔ اس کے ان دیکھے دائروں میں ایک کانٹے دار جھاڑی آتی ہوئی ہے جو بھنور میں پھنسے کنڈیالے چوہے کی طرح بے بسی سے ایک میکائی توڑ کے ساتھ گھومتی چلی جاتی ہے۔ ہوا کا زور محض بھر کے لئے ٹوٹتا ہے اور کانٹے دار جھاڑی گردش کی اس قید میں سے نکل کر ٹھنڈی پٹی لاش کی طرح ایک آدھ مرتبہ جھٹکوں سے حرکت کرتی ہے اور پھر میدان کی بنجر زمین پر سناکت ہو جاتی ہے... بگولا بیچ و خم کھاتا اب ایک اور جھاڑی کی جڑوں کو چوس کر اسے اپنے متحرک جسم کا حصہ بنا لیتا ہے۔

میں ایک مخصوص بلندی پر بیٹھا ان جھاڑیوں کی بے بسی کو جانتا ہوں۔ ان کی بے اختیاری سے واقف ہوں کہ میں خود اسی طور بے بس اور بے اختیار ہوں۔ میں جو ازل سے سفر کے اس بگولے کی زد میں ہوں جو کبھی میرے وجود کی جھاڑی کو ایک مقام پر جڑیں پکڑنے نہیں دیتا... ہر سال دو سال بعد مجھے اکھاڑ پھینکتا ہے اور میں بے اختیار ہوک کہ اس کی منتیں کردہ سمتوں میں گردش کرنے لگتا ہوں، حرکت میں آجاتا ہوں، سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

ہوا بہت تیز ہے... فضا میں ایک متواتر گونج ہے جو شاید روزِ ازل کو ان دیرانوں

پہلے... کن فیکون کہا گیا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں کے پتھروں کو کسی مجسمہ ساز کے ہاتھوں نے نہیں چھوا۔ سوائے سب سے عظیم بت تراش کے ایک لفظ نے... کن فیکون! بیرونیع ویرانے، یہ ہیبت ناک سلسلہ کوہ اور ان میں سنسناتی ہوائیں ابھی وجود میں آئے ہیں۔ ابتدا آج ہی ہوئی ہے۔ مجھ میں ایک ایسے انسان کی پُرشوق حیرت ہے جو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ مجھ میں ابھی استدلال کی قوت پیدا نہیں ہوئی۔ میں گنگ ہوں، صرف دیکھ رہا ہوں اور اپنے گرد پھیلے ہیبت ناک منظر کے رعب سے سحرزدہ بہوت ہوں... اور شاید میں تو ان سر بلند پتھروں کے درمیان گھرے کسی ڈیلنی کے معبد میں چلا آیا ہوں جو کچھ مستقبل میں رُوپوش ہے اس میں جھانکنے کے لئے، اپنے انجام سے باخبر ہونے کے لئے۔ اے ڈیلنی کے اور دیکل! مجھے خبر کہ میرا یہ سفر کیسا ہوگا؟ کیا میں ہمیشہ کی طرح خیر و عافیت سے گھر لوٹوں گا یا ان دیکھے دیوتاؤں کے غضب کا شکار ہو کر جہاں گرد اوڈیس کی طرح ایک عمر مرنج شراب ایسے سمندر میں بھٹکتا رہوں گا؟ مجھے خبر کہ۔

میرے اوپر نیلی اینٹوں کا آسمانی گنبد اتنا قریب لگ رہا ہے کہ شاید میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو بھی سکتا ہوں۔

آسمانی قربتوں نے ہمیشہ سے انسان کو اپنی جانب کھینچا ہے وہ تلاش کے لئے یا تو غاروں کے اندھیروں میں بسیرا کر کے اپنا اندر روشن کرتا ہے اور یا پھر بلند یوں پر ڈیرہ بجا کر دھونی رمالیتا ہے۔ کیا ہم ان دیکھی حقیقتوں کی جستجو انسانوں سے کٹ کر ہی کر سکتے ہیں؟ اپنی پہچان کے لئے ذرہ صحرا سے الگ ہو تھبی؟ میں خود سفر پر نکلتا ہوں تو شاید اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ اور مخصوص معاشرہ اپنے زور حرکت سے میرے قدم اکھاڑ کر مجھے ایک مکانی اور بے اختیار وجود میں بدل دیتا ہے... لیکن میں ان سے نادر جدا بھی نہیں رہ سکتا۔ کچھ عرصے بعد گھر کی جانب کھنچا چلا آتا ہوں، چاہت کی اسی شدت کے ساتھ جو اسے چھوڑتے ہوئے مجھ پر حاوی ہوتی تھی۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ میں اپنے چار چھیرے میں ایک مس فرٹ ہوں؟ مجھ میں ایک جگہ جم کر حقیقتوں کا سامنا کرنے کی جرأت

میں اٹھی، ان پر حاوی ہو گئی اور پھر اس کی شوکتی ہوئی صدائیں کبھی مدھم نہ ہوتیں۔ میرے کانوں میں اترنے والی یہ اداس گونج وہی ہے جو اس کائنات میں پہلا سانس لینے والے انسان کو سنائی دی تھی... مگر میرے گرد و سر اسٹ کی یہ ماتی سرگوشیاں مجھے آنے والے کن دکھوں کا سندسیر دے رہی ہیں جو ابھی میرے گمان میں نہیں۔ ماؤں کے ماتم کی سرگوشیاں؟ ان ماؤں کی جو پہلے پہل بچھاڑ کھا کر گرتی ہیں، پھر وہ دہائی دیتی ہیں۔ وقت گزرتا ہے تو لوگ ان کے ماتم سے تنگ آجاتے ہیں اور پھر وہ بند کمروں میں چھپ کر آہستہ آہستہ ان بلیوں کی طرح روتی رہتی ہیں جن کے بچے بچھڑ جاتے ہیں۔

نیچے، بے آب و گیاہ میدان کی دستوں میں بکلوں کی منتظر چند جھاڑیاں اپنے ہی سایوں پر بھی ہیں اور ان کے درمیان ایک سیاہ لکیر نظر آرہی ہے... کابل سے ہرات جلنے والی سڑک، اور اس لکیر پر میری بس یہاں سے ایک ڈنکی کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی ہے مختصر مگر مکمل جزئیات کے ساتھ۔ بس کا ڈرائیور اور کنڈکٹر نظر نہیں آ رہے کیونکہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں۔ ڈرائیور سڑک کے نزدیک چرواہے کے ایک جھونپڑے میں سو رہا ہے اور کنڈکٹر ایک آئی ٹینگر پر لفٹ لے کر قندھار گیا ہوا ہے تاکہ وہاں سے وہ فالتو ٹائر خرید کر واپس آسکے جو اصولاً اسے آج صبح کابل سے حاصل کر کے چلنا چاہیے تھا۔ وہ فالتو ٹائر جس کی غیر موجودگی اس بلند چوٹی پر میری موجودگی کا باعث بنی ہے۔

تہذیب کے کوکون میں لیٹے ایک انسان کی حیثیت سے اگرچہ مجھے سویڈن اور فنلینڈ کے منظم زمینی مناظر اپنی جانب کھینچتے ہیں مگر تہذیب کے اس مصنوعی درخت کی جڑیں اسی وقت اکھڑ جاتی ہیں جب میں اپنے آپ کو افغانستان کی وسیع اور بے قابولینڈ سکپ میں گھرا ہوا پاتا ہوں۔ میرے اندر کا وحشی اتنی تک پھیلے ان بھر پہاڑوں اور صحرائی دستوں کی گرفت میں جکڑا جاتا ہے، ان کا حصہ بن جاتا ہے۔

میری پشت پر روس ہے، سامنے دشت مرگ کا کنارہ اور چار چھیرے ایسے پرجلال زمینی مناظر جن کے درمیان بیٹھے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی... ایک لمحہ



کابل کے چاروں اور، وفادار خدمت گاروں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے  
فلک بوس پہاڑوں پر ابھی تک موسم سرما کی برف چمک رہی تھی۔ ججوں کی سفید و گول ایسی  
برفیلی جھالیں نیچے وادی کے دامن تک پہنچ رہی تھیں۔ مصوروں کے ذہن میں نقش  
شاگرہی لاکے خیالی شہر کا نقشہ شاید کابل سے اتنا مختلف نہ ہو کہ میں نے کسی اور انسانی  
بستی کو اتنے دلفریب تصویری چارچفیرے میں گھرا ہوا نہیں دیکھا۔

کوچ کرنے کے بعد اگلی منزل کی جانب سفر کرتے ہوئے اکثر اوقات طویل رفاقت  
کی بنا پر مختلف قومیتوں کے سیاحوں کا ایک ٹولہ خود بخود تشکیل پا جاتا ہے جو بقیہ سفر کے  
دوران گروہ میں شکار کرنے والے جانوروں کی طرح مل جل کر ارزاقوں اور طعام کی  
سستی جگہوں کا کھوج لگاتے ہیں۔ پشاور سے کابل پہنچنے تک میں بھی ایک ایسے ہی گروہ  
کا حصہ بن چکا تھا۔ بس سے اتر کر ہم سب کندھوں پر اپنا اپنا بوجھ لادے اڈے کے  
نواح میں ایک ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ یکایک اتنے بڑے جہوم گا ہکاں کو اپنے سامنے  
پاکر ہوٹل کا مالک پہلے تو بول کھلا گیا اور پھر فوراً ہی مسرت سے مغلوب ہو کر ہمارے نام پتے  
رجسٹر پر درج کرنے کا تردد کئے بغیر ہمیں کمرے کی چابی سے نوازا دیا۔

”ہال مکہ ہے۔ آپ سب حضرات... معاف کیجئے خواتین و حضرات کے لئے کافی  
ہوگا۔ گدے نرم اور سپرنگوں والے۔“ اُس نے آنکھ دبا کر ہمارے گروہ میں شامل نسوانی  
جھگٹے کو نوید دی اور پھر پاسپورٹ جمع کر کے آرام سے ڈیسک تلے پوشیدہ بیر کی بوتل  
کو گال مٹھا کر آدھا کر دیا۔ سفید جھاگ اس کی مونچھوں پر یوں نمودار ہوئی جیسے کسی جلی ہوئی  
جھاڑی پر تازہ تازہ برف گری ہو۔

”میرا ہاضمہ خراب ہے، صرف اسے درست رکھنے کے لئے پتیا ہوں اور ہمیشہ غیر ملکی  
پتیا ہوں، پاکستانی ہے۔“

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اب پاکستان ایک غیر ملک ہے۔  
کمرے میں داخل ہو کر میں نے بالکونی کے قریب ایک بستر پر قبضہ جمایا اور پھر جیسا کہ

نہیں؛ وطن واپسی ہوتی ہے تو ایک مختصر مدت، پچھلے سفر کی یادوں میں غرق ہو کر گزرتی  
ہے مگر بالآخر مجھے سانس لینے کے لئے واپس اپنے ماحول میں سرخ آب پر آنا پڑتا ہے  
اور تب میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، میں دیکھ نہیں سکتا اور ایک مرتبہ پھر ٹوٹتا ہوا  
نئی روشنیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ یوں نہ تو میں مچھلی کی طرح تادیر پانی سے  
باہر جی سکتا ہوں اور نہ ہی سفر کا سمندر مجھے ہمیشہ کے لئے قبولتا ہے۔ ایک معتبر عرصے  
کے بعد پھولتی ہوئی ایک لاش کی طرح خشکی پر پھینک دیتا ہے۔

طورخم سے سرحد پار کر کے میں نے افغانستان میں پہلا قدم رکھا تو کچھ بھی نہ ہوا۔  
میں نے حیرت سے اپنے اندر جھانکا اور انتظار کرنے لگا۔ ان زنجیروں کے ٹوٹنے کے  
چھینکے کا جو ساکت رہنے سے میری رگوں کے گرد خود بخود لپٹی جاتی ہیں۔ ہم جوئی کے  
اُس بھرنے کی ترل رل کا جو ماضی میں ہمیشہ میرے روتیں روتیں سے بھوٹنے لگتا تھا مگر کچھ  
بھی نہ ہوا۔ میں منتظر تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ان پہاڑوں کی طرح جن کی رگیں خشک ہو چکی ہیں  
میرا اندر بھی بخر تھا۔ آخر اس مرتبہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ کہیں ان رتوں کی تعداد تو نہیں  
بڑھ گئی جنہیں شمار کر کے انسان اپنے آپ کو بوڑھا یا جوان سمجھتا ہے؛ لیکن سفر کی لاعلاج  
دیوانگی کا رتوں کے گزر جانے سے کیا تعلق؟ پھر ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں نے پیچھے مڑ کر  
پاکستان کی جانب دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے سرحد کے کھلے چھاٹک کا حجم بڑھتا چلا جا  
رہا ہے، اوپر ہی اوپر تا آنکہ اس کا آہنی وجود افلاک کے گنبد میں سپست ہوا اور پھر  
ایک مہیب دھماکے سے مجھ پر بند ہو گیا۔ میری دھرتی کے تمام مناظر آنکھوں سے اوجھل  
ہو گئے۔ میری زمین نے رُخ پر ایک آہنی پردہ ڈال لیا۔ کہیں یہ دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے  
لئے تو نہیں بند ہو گیا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں نے  
منہ موڑا اور ان سرزمینوں کی جانب دیکھا جو ابھی تک میری نظروں کے سامنے تھیں میری  
منتظر تھیں۔ سفر کا سمندر عصائے مم جوتی کے انتظار میں تھا اور یوں میرے سفر کا آغاز ہو گیا۔

”تم یقیناً ایک وحشی افغان لٹیرے ہو۔“ تو لیے میں اودھ لپٹی ایک سوئیش بی بی نے اسے جھاڑ پلائی۔

”یہ ہمارا ساقی ہے۔ اگر تم اس کو جگہ نہیں دو گے تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔“ ان سب نے فیصلہ سنا دیا۔

اس کھلی دھکی سے جھاگ آلود مونچھوں کے اندر ذخیرہ شدہ بہتر فی الفور سادہ پانی میں بدل گئی۔ ”میں تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ ایک بستر میں پہلے ہی کرائے پر اٹھا چکا ہوں۔ ہاضمے کے ساتھ میرا حافظہ بھی خراب ہے، بس اتنی سی بات تھی اُس نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”درنہ پاکستانی... ہمارے برادر مسلمان چشم ماروشن... ہمارے ہمسائے... میں بھلا...“

”اور کمرے میں خالی پڑے ہوئے بقیہ دو بستر؟“ ایک فرانسیسی خاتون نے اپنی سوانی شلوار اڑتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بھی کرائے پر اٹھ چکے ہیں... درنہ پاکستانی، ہمارے برادر...“

جھاگ آلود مونچھیں صریحاً جھوٹ بول رہی تھیں مگر میں نے ان کی دشمنی کو بنیاد بنا کر اپنے قیام کی عمارت کھڑی کرنے میں دانشمندی نہ سمجھی اور اپنے ہم سفروں کے پُرشور احتجاج کے باوجود سامان دوبارہ پیک کر کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ آخر کابل میں یہ واحد ہوٹل تو نہیں تھا۔

میں باہر آیا تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ تھوڑی دیر پہلے چمکتی برف کی سفیدی اب ہلکی پیلاہٹ میں بدل رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ زردی بھی گہری ہو کر تانبے ایسے رنگ میں ڈھل گئی جیسے چوٹیوں پر ایک خزاں رسیدہ جنگل بکھر گیا ہو۔

میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک مٹی جوڑے سے کسی ارزاں قیام گاہ کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا ”چکن مارکٹ چلے جاؤ۔“

”چکن مارکٹ“ میں نے بے یقینی کے عالم میں سر کھلایا۔ ”کم بخت چرس میں جذب

ان اجتماعی شب بلبوں میں دستور ہے، وہیں کھڑے ہو کر، صرف تصور کے پردے اپنے ارد گرد گر کر باہر جانے کے لئے لباس تبدیل کرنے لگا۔ جب میں اس نازک مرحلے کے قرب وجوار میں پہنچا جہاں آپ نظریں نیچی کر کے بہ طور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اب یقیناً آپ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور بہ کمال عجلت ستر سے پوشی کی جانب پکٹے ہیں، مگر سہ کادروازہ بغیر دستک کے چو پٹ کھل گیا۔ ہوٹل کا مالک اپنی جھاگ آلود مونچھوں سمیت ہمارے درمیان کھڑا تھا۔ پہلے تو زپ ڈراپ خاموشی طاری ہوئی جس میں زپوں کے چڑھنے کی سرسراہٹ اور چٹنوں کی بچ بچ واضح طور پر سنائی دی اور پھر یکدم لڑکیوں نے اس مداخلت نیم برہنہ پر شور مچا دیا۔ ظاہر ہے ایک غیر مرد کی آمد پر ان کے گرد پڑے ہوئے تختیل کے پردوں میں چھید ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔

جھاگ آلود مونچھوں نے ایک ایسے کھلونے کی طرح رُک رُک کر گردن گھمائی جس کی چابی ختم ہونے کو ہو، اور پھر سیدھا میرے پاس چلا آیا میں نے نیچے کھسکتی ہوئی پتلون اوپر کر لی۔

”پاکستانی؟“ اُس نے جیب میں سے میرا سبز پاسپورٹ نکال کر یوں میری طرف اُچھال دیا جیسے سادہ کاغذ کی بجائے دکھتا ہوا انگارہ ہو اور دروازے کی سمت انگلی سیدھی کر دی۔ ”باہر نکل جاؤ۔“

یہ صورت حال میرے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے ہونٹ بھیج کر دریافت کیا۔

”بس تم اس ہوٹل میں شب بسر ہی نہیں کر سکتے۔“

اس سے پیشتر کہ مزید کچھ کہنے کی نوبت آتی میرے ہم سفروں کا نیم برہنہ غول اس کے گرد ہو گیا۔

”اوتے بوڑھے مچھل کیا کہہ رہے ہو؟“ ایک ننگ دھڑنگ سواچھ فٹے جرمین نے اس پر منڈلاتے ہوئے دانت کچکپائے۔

ہیں اور مجھے سیاح کی بجائے مرغوں کا بیوپاری وغیرہ سمجھ رہے ہیں۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ بیچارے درست کہتے تھے ”یہاں مارکٹ“ سلیس ہوتی ترجمہ ہے کابل کے ایک علاقے ”بازار مرغ“ کا۔ جہاں شاید ایک زمانے میں اسیل مرغ وغیرہ بھی بکیتے ہوں گے مگر ان دنوں یہ اُن زیر زمین قعود خانوں میں دوسٹ حالت میں ہی دستیاب ہوتے ہیں جہاں دیہاتی افغان سرسویڈ ہاتے سازنگیوں پر لوگ موسیقی بجاتے ہیں اور پتی مخلوق حشیش کے زیر اثر اذگمختی، لپٹتی، لپٹاتی دنیا کا مدہم ترین رقص اذنگھ کر بھی تو کیا جاتا ہے۔ بازار مرغ کی بیشتر دکانیں نوادرات کی ہیں۔ نیم تاریک کوٹھڑیاں جن کے اندر داخل ہوتے ہی پھپھی چند صدیاں باہر رہ جاتی ہیں۔ آپ قدیم افغانستان میں سانس لینے لگتے ہیں۔ چرواہوں کے بٹے ہوئے پہاڑی بکروں کی کھردری مگر گرم آؤں کے موزے، سویر اور ٹوپیاں، انتہائی پرکشش کوہستانی نمونوں والے، مرقاقلی اور لوٹری کی کھال کی پوسٹینیں، وہ گھریلو اشیاء جو در افتادہ پہاڑی گھروں میں صدیوں سے زیر استعمال تھیں مگر اب وہاں کے باشندے انہیں پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کابل میں نوادرات کے طور پر فروخت کر جاتے ہیں۔ پتیل کے پرانے سداوار، منقش چوبی دروازے، لکڑی کے سیاہ پڑتے صندوق، کٹورے، تھال، زرعی آلات اور قدیم عروسی جوڑے اور وہ تلتے دار پرکشش چولیاں جو نسل در نسل افغان خواتین نے زیب تن کیں اور جنہیں اب ہپتی لڑکیاں دھڑ سے اوپر واحد لباس کے طور پر بڑے دھڑتے سے پہنتی ہیں اور بچہ خوش لباس محسوس کرتی ہیں۔

”بازار مرغ“ کے عجیب و غریب ماحول میں پہنچ کر میں کچھ دیر کے لئے جھول گیا کہ میرے کندھوں پر بیس سیر وزنی سامان کا تھیلہ ہے، میں یہاں شب بسر کرنے کے لئے کسی ٹھکانے کی تلاش میں آیا ہوں اور میرا بنیادی مقصد نوادرات کی دکانوں میں تانک جھانک کر نیا ہپتی لڑکیوں کے جسموں پر کسے افغان عورتوں کے ملبوسات دیکھنا ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ میں مرکزی چوک کے پہلو میں ایک ایسے ہوٹل کے اندر چلا گیا جس

خا ہر اسج دھج اگرچہ میری جیب کے موافق نہ تھی مگر وطن سے باہر پہلی شب کسی آرام دہ ماحول میں بسر کرنے کی خواہش مجھ پر غالب آگئی۔ ڈیسک کلرک نے انتہائی مہربانہ انداز میں میری فرمائش کی تعمیل کی اور پاسپورٹ رجسٹر پر رکھ کر مجھے ایک چابی تھادی ”دوسری منزل کمرہ نمبر بیالیس۔“

اس سے پیشتر کہ میں کمرہ نمبر بیالیس کے قفل میں چابی گھماتا وہ کلرک ہانپتا ہوا سیڑھیوں سے برآمد ہوا اور معذرتوں کا انبار مجھ پر لا کر بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ یہ کمرہ خالی نہیں ہے بلکہ اس ہوٹل میں کوئی بھی کمرہ... ابھی ابھی رجسٹر چیک کرنے پر معلوم ہوا۔“ مجھے معلوم تھا کہ اس نے رجسٹر نہیں پاسپورٹ چیک کیا تھا۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس غریب کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ بار بار کسی نازکی شعر کا حوالہ دے رہا تھا جس میں ”صد افسوس“ تین مرتبہ آتا تھا۔ وہ مجھے صدر دروازے تک چھوڑنے آیا۔ ”آپ تو پاکستانی ہیں ہمارے مسلمان برادر... مگر مجبوری ہے آج کل ٹورسٹ سیزن کی دگر سے... ورنہ آپ تو... بہر حال کسی اور ہوٹل میں کوشش کر لیجیے۔“ کسی اور ہوٹل میں بھی یہی حشر ہوا۔ رات کے نو بجے تک میں نے اتنے ہی ہوٹلوں میں کوشش کی اور ہر جگہ ”پاکستانی برادر، مسلمان، صد افسوس“ کے بلند وزروں سے باہر دھکیل دیا گیا۔

عام حالات میں شاید میں ایسی صورت حال سے بالکل ہراساں نہ ہوتا اور بڑے اطمینان سے کسی پارک یا پل کے نیچے ڈیرے ڈال دیتا مگر مجھے کابل کی خشک راتوں کی کاٹ کا علم تھا جنہیں اگر کھلی فضا میں بسر کیا جائے تو بقول کسی صبح سویرے آپ کی ستیسی منہ سے باہر نکلی ہوگی اور آپ ہنستے ہوتے ہی اٹھیں گے، اگر اٹھے تو! چنانچہ اس وقت سر پر کسی چھت کی موجودگی ہی مجھے اس مزاحیہ انجام سے بچا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک عرصے کے بعد اپنا سامان اپنے ہی کندھوں پر اٹھانے کا اتفاق ہوا تھا اور ڈی کلاس ہونے کے اس عمل نے مجھے تھکاوٹ سے چور کر دیا تھا۔

اس مٹرگشت کے دوران ایک سنیہا ہال کے قریب سے گزر رہا جس کے باہر ایک افغان سکھ ہندوستانی ایکٹرسوں کی غیر شرعی تصاویر فروخت کر رہا تھا۔ گاہکی کا زور قدرے ٹوٹا تو میں نے اپنی بیٹی بیان کی ”سردار جی کابل میں کوئی ایسا ہوٹل بھی موجود ہے جہاں مجھے مسلمان برادر کی بجائے صرف ایک سیاح کی حیثیت سے کمرہ مل جائے؟“

”پاکستانی ہو؟ سردار جی نے ایک کوہستانی افغان پر شرمیلہ اشکور کی چمکیلی ٹانگوں کا لشکارا ڈالتے ہوئے لاتعلقی سے پوچھا۔

میں نے بے چارگی سے سر ہلادیا۔

”پھر تو دریا کے اس کنارے تئیں کوئی بھی ہوٹل جگہ نہیں دے گا... میں افغانی بابا، اُدھر کوہستانی بابا صرف دس افغانی میں حسن ہندی کا خریدار تھا“ بھائی صاحب یہ افغان گورنمنٹ کا آڈٹر ہے۔ دریا کے پار چلے جاؤ وہاں دو ہوٹل ایسے ہیں جہاں قانونی طور پر پاکستانیوں کو رہنے کی اجازت ہے... اچھا بابا لاؤ دس افغانی“ سردار جی نے شرمیلہ کو بیچ کر تھیلے میں سے میا مالینی کا گٹھا ہوا جسم نکالا اور بارش افغانوں کے ایمان کو متزلزل کرنے لگا۔

صرف دریا کے پار یعنی کابل میں پاکستانیوں کو دریا بدر کر دیا گیا تھا۔

میں اپنے قدموں کو جو لمبی مسافتوں سے پیشتر ہی تھک چکے تھے، گھسیٹتا ہوا جب دریا کے کابل پر سے گزرا تو پل کے جا بجا اکھڑے ہوئے تختوں میں سے نیچے بہتے پانی کی خنکی میرے ٹوٹتے جسم کو سرد تر کر گئی۔

دوسرے کنارے پر سردار جی کے بتائے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے سبز پاسپورٹ کا چہرہ مالک کے ردِ برد کر دیا۔ ”میں پاکستانی ہوں، مسلمان برادر“ ان تباہیوں کے باوجود مجھے کوئی کمرہ وغیرہ مل سکے گا؟

اُس نے ”میں سب سمجھتا ہوں“ کی مسکراہٹ لبوں پر پھیلانی اور ریشٹر پر نام پر توجہ کر کے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔

”کر ایکتنا ہو گا؟“

”دو سو افغانی“

”دو سو... تم یقیناً مذاق کر رہے ہو؟“

”میں ہوٹل چلاتا ہوں، مسکرس نہیں۔“ اُس نے مسکراہٹ جاری رکھی۔ ”دو سو افغانی“

”میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی اور ہوٹل تلاش کرنا پڑے گا۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے

دھمکی دی۔

”میرا خیال ہے یہ تمہاری حماقت ہوگی۔“ اُس نے اپنی مسکراہٹ کو فوراً نکل لیا اور ترشی سے کہا۔ ”دو سو ہوٹل جہاں تم قانونی طور پر شب بسر کر سکتے ہو بالکل فل ہے اور اگر کوئی غیر ملکی جو کہ تم ہو، کابل کی سڑکوں پر رات کے گیارہ بجے کے بعد گھومتا ہوا مل جائے تو افغان پولیس اسے بخوشی گرفتار بھی کر لیتی ہے۔“

میں نے گھڑمی پر نگاہ کی، ساڑھے دس بج رہے تھے۔

”گو یا تم میری مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو؟“

”بس بھی سمجھ لو۔“ اُس نے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا اور اپنی کامیاں مسکراہٹ کو دوبارہ جاری کر دیا۔ ”ہاں البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے... اگر تم کمرہ نمبر بیس میں رات گزار لو تو میں صرف پچاس افغانی چارج کر لوں گا۔“

”بات ہوئی ناں...“ میں فوراً اُس کی شرافت اور اسلامی اخوت کا قائل ہو گیا۔

کمرہ خالی ہے نا؟

”ہاں... تقریباً خالی ہی ہے۔“ اُس نے قدرے تاثر سے کہا۔ ”اس میں صرف ایک جرمن سٹی پڑا ہے۔“

”جرمنوں کے ساتھ ویسے بھی میری خوب گزرتی ہے۔“ میں کھل اٹھا۔ ”مجھے منظور ہے۔“

”مردہ جرمنوں کے ساتھ بھی؟“

”مردہ؟“ میرا منہ کھل گیا۔

”بس میری کم بختی... تین ہفتوں سے یہاں مقیم تھا... آج صبح ملازم کمرہ صاف کرنے کی غرض سے اندر داخل ہوا تو خنجر پر کا پتھر مار پڑا تھا... جرمن سفارت خانے کو اطلاع کر دی۔ چہ، لینے نہیں آئے... ابھی تک بستر پر پڑا ہے... میں پوچھتا ہوں اس کا لڑیہ کون ادا کرے گا؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بد بخت صرف مرنے کے لئے کابل آیا ہے...“

ایک خدشہ نہ ہونے کا جو سفر میں ہمیشہ آس پاس رہتا ہے، میرے بدن میں سرایت کر گیا۔

”جو غیر ملکی یوں سفر کے دوران مر جاتے ہیں، انہیں کہاں دفن کرتے ہیں؟ میں نے گویا اپنے بارے میں ہی پوچھا۔

”ان ہمتی سورتوں کا یہاں ایک علیحدہ قبرستان ہے وہاں... تم تو خیر نوکری کی تلاش میں وطن سے نکلے ہو گے لیکن ان سفید چٹری والوں کو دیکھو، ادھر یورپ کا عیش چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، ادھر دیرانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔“

”ہاں... صریحاً دماغ کا فتور“ میں ہلے سے بولا۔

”تم کمرہ نمبر بیس میں ہی ٹک جاؤ... وہاں دو بستر ہیں... ڈیڑھ سو افغانی کی بجائے... ویسے تم بیمار و مار نہیں ہونا؟“ اُس نے فکر مند لہجے میں سوال کیا۔

میں نے جبکہ میں سے سو سو افغانی کے دو نوٹ نکال کر ڈیسک پر رکھ دیے۔

”بطور ایڈوانس... تاکہ تمہیں میرے کرائے اور میری صحت کے بارے میں تشویش نہ ہے“

”تمہاری مرضی ہے؟“ وہ اطمینان سے رقم جیب میں ڈال کر بولا۔ ”ویسے آج تک کسی مُردے نے کسی زندہ انسان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا... پڑا رہتا ساتھ والے بستر پر“

میں نے خاموشی سے سامان اٹھایا اور سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پر آ گیا۔

کمرہ نمبر بیس کا دروازہ کھلا تھا۔

شیشے کی اُدھ کھلی کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی بے نام روشنی اندر آ رہی تھی لیکن بستر کے پاس ہراتی نل بوتلوں کا جوڑا پڑا تھا، یتیم بچوں کی طرح منہ کھولے منتظر۔ آس پاس دھندلائی

ہوتی چیزوں کی شیشیں بھینس، سگرٹوں کے ٹکڑے، بسوں کے ٹکٹ، ٹوٹے پیسٹ کی پچکی ہوئی ایک ٹیوب اور میلے کپڑے، ننگے فرش پر پکھرے سیاحتی کتابچے اور نقشے کھڑکی میں سے تیرتی ہوئے کمرے کے نیم سہل پر بندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ کونے میں رکھے رک سیک پر خیمہ بندھا تھا اور اس کے اوپر ایک گٹار... اور بستر پر... مٹیالے کبیل تلے جانے کون لٹیا تھا... ہنری، آندرے، گیراڈ، مستنصر، کوئی بھی مس فٹ، سر بھرا، آوارہ گرد، ذوئے خنجر، سوڈا کا پچہ جس نے مادہ پرستی سے فرار ہو کر، چوہوں کی دودھ سے الگ ہو کر اُن دیکھی ہواؤں میں آزاد سانس لینے کا جتن کیا۔ کار، کوٹھی، کھڑکی وی ایسی نارمل اور قابل احترام خواہشوں کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے بدن کو انجانے تجربوں کے لمس کے لئے اجنبی راہوں پر ڈال دیا۔ میرے ایک عمر رسیدہ جرمن ہم سفر نے سیاحت کو دیوانگی کہا تھا، دیوانگی جو فصل گل کے آتے ہی عود کر آتی ہے۔ بستر پر پڑے اس سیاح کے لئے فصل گل کے پہلو میں اجل بھی آئی اور کہاں آئی؟ کابل میں۔

میں سر جھکا کر آگے بڑھ گیا اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ جب میں نے اپنا سامان کھولا تو میرے کمرے کا بھی وہی نقشہ تھا۔ کونے میں رکھے رک سیک پر بندھا خیمہ، سیاحتی کتابچے اور نقشے۔ البتہ بستر ابھی تک خالی تھا۔ اُن کھلے سر می کبیل پائنتی پر ابھی تہ شدہ حالت میں تھے۔

کپڑے بدل کر کھانے کی غرض سے جب نیچے اترا تو ہوٹل کا مالک بآمدول کی ڈشمنیاں گل کر رہا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی اس کے حوالے کی تو نرمی سے کہنے لگا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ دو سو افغانی بہت زیادہ ہیں مگر میں کبھی کیا سکتا ہوں۔ بی کلاس ہوٹلوں کی ادھی آمدنی تو ٹیکس میں اٹھ جاتی ہے۔ میرے بارے میں دل صاف رکھنا۔ کتنے روز ٹھہر گئے؟

”میں کل صبح ہی ہرات چلا جانا چاہتا ہوں، اگر بس میں نشست مل گئی تو...“

”کیوں نہیں ملے گی؟“ اُس نے ٹکٹوں کا ایک پلندہ دراز میں سے نکال کر ڈیسک پر رکھ دیا۔ ”میرے دوست سید خاں کی اپنی بس سر دس ہے، بے شک کمرے کی کھڑکی میں سے

جھانک کر دیکھ لو، نیچے کھڑی ہے، نہایت عمدہ اور ایرانی ٹاپ کی بس صبح چار بجے روانہ ہوگی... ساڑھے تین سوافغانی ہرات کے لئے...“

”ساڑھے تین سو“

”تم تین سو دے دو... ٹھیک ہے؟“ اُس نے ٹکٹ کاٹ کر مجھے بخدا دیا۔ میں ملازم کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ صبح تین بجے تمہیں بیدار کر دے۔“

”شکریہ۔“ رقم ادا کر کے میں نے ٹکٹ جیکٹ میں محفوظ کر لیا۔

”اس کافر کے بچے نے بھی مجھ سے ٹکٹ خریدا تھا...“ اُس کے درشت چہرے پر اب تأسف کی ہلکی سی پرچھائیں تھیں۔ میں نے ٹکٹ کی رقم لوٹادی ہے۔ بے شک اس کے رُک سیک کی جیب میں چیک کر لینا... میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔“

ایک نواحی چلی کباب رستوران سے تن سندرمیں کچھ الابلا جھونک کر میں فوراً ہوٹل جانے کی بجائے چل قدمی کی خاطر دریا کی سمت چلا گیا۔ کابل رات کو جاگنے والے شہروں میں سے نہیں ہے۔ پانیوں کی ہلکی سرسراہٹ کے علاوہ ہر سو خاموشی تھی۔ اندھیرے کی مہر ثبت تھی۔ البتہ شہر کے درمیان اُبھرے ہوئے کچے پہاڑ پر چند روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں جیسے کسی غریب عقیدت مند نے ایک دیو نہاد قبر پر ناکافی تیل کے چند دیے روشن کر دیئے ہوں۔ ایک لمپ پوسٹ کے سہارے، ہاتھ جیبوں میں اُڑے ہوئے ہونٹوں میں سکرٹ دبائے ایک افغان سپاہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کچھ کہا اور میں جواباً صرف ہاتھ ہلا کر اُگے بڑھ گیا۔ ایک تنگ گلی کے آخر میں ایک قہوہ خانہ ابھی تک کھلا تھا۔ دھوئیں سے بھرے کچے کمرے کے فرش پر قدیم انبک قالین تہہ در تہہ بچھے تھے جن پر اُلتی پالٹی مارے چند عمر رسیدہ افغان بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ ایک کونے میں لاد روشن تھا۔ روشنی کی حدت سے لبریز لہریں ان کے چہرے پر پھیلتیں تو یوں لگتا جیسے ازمنہ قدیم کے افغانستان کا کوئی کم شدہ منظر فلم پر دیکھ رہا ہوں۔ تیکھے آریائی نفوس، چمکتی آنکھیں، بے ترتیب داڑھیاں، کاڑھے ہوئے لمبے انبک چوڑے اور کالے فل بوٹ۔ وہ بے حد متانت اور آمہنگی سے مصروف گفتگو تھے۔

کبھی کبھار وہ خاموش ہوتے تو قہوے کو چھوڑتے ہوئے لبوں کا ہلکا سا ارتعاش سُنانی دیتا۔ میں اندر داخل ہوا تو انہوں نے اپنی سفید جینوں سیکر کر میری جانب دیکھا اور پھر کھسک کر آتش دان کے قریب جگہ بنا دی۔

”ہندی؟“ جھکی ہوئی کر دالے ایک خوب رو بوڑھے نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔

”پاکستانی؟“ میں نے پچھلے تجربے کی بنا پر ڈرتے ڈرتے کہا۔

”الحمد للہ“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مزید جھک گیا۔

اجنبی چہروں پر اپنائیت اور محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ میں جو کچھ ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کتا وہ الحمد للہ کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک جاتے، اُنھنے سے پشتیں میں نے قہوے کی قیمت ادا کرنی چاہی تو انہوں نے باقاعدہ خفا ہو کر سرنش کی۔ ”پاکستانی برا در، مہمان۔“

میں اس مہمان نواز قہوہ خانے سے باہر نکلا تو اپنے ان جذبات پر نادم تھا جو اس شب ہوٹل والوں کے ناردارویتی کی بنا پر افغانوں کے بارے میں میرے دل میں کدورت بھر چکے تھے۔ ایک قوم ٹیکسی ڈرائیوروں اور ہوٹلوں کے مالکان سے نہیں بچانی جاسکتی جن کے ساتھ ایک عام سیاح کا سابقہ پڑتا ہے بلکہ یہ وہ عام لوگ ہوتے ہیں جو آپ کو قہوہ خانوں، چوراہوں اور کھلی فضاؤں میں ملتے ہیں۔ ایسے محبتوں والے لوگ جو اپنے گرد کھڑی سیاسی اور مذہبی دیواریں مسمار کر کے آپ کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے گلے لگا لیتے ہیں۔

والپسی پر اسی لمپ پوسٹ کے قریب سے گزر رہا جس کے ساتھ ایک افغان سپاہی سکرٹ ہوٹلوں میں دبائے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اب بھی اسی حالت میں موجود تھا۔ مجھے دوبارہ دیکھ کر میرے قریب آگیا اور کھڑی دیکھ کر بولا۔ ”کون ہو؟“

مجھے ہوٹل کے مالک کی وارننگ یاد آگئی، اگر کوئی غیر ملکی جو کہ تم ہو، رات کے گیارہ بجے کے بعد کابل کی سڑکوں پر... مسافر ہوں، کھانا تناول کر کے میں ذرا قہوے

کی چکی لگانے گیا تھا، الحمد للہ، شب بخیر، اس سے پیشتر کہ وہ مزید پوچھ کر تائیں بظاہر لا پرواہی سے تیز قدم اٹھاتا ہٹوں کی جانب چل دیا۔ میرے کان بھاری بوٹوں کی چاپ کے منقطع تھے مگر میرے پیچھے کچھی سرک پر خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرا تعاقب نہیں کر رہا۔

کمرہ نمبر بیس کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ فل بوٹ، رُک سیک، گنا اور ہول کے زور سے لرزتے فرش پر کچھ بے کاغذ، سمرتی کبل بستر پر بٹھرا ہوا، ادھلی کھڑکی میں سے کابل شہر کے بالائی حصے پر ٹٹھاتی روشنیاں، ایک بے نام قبر پر چلتے بگھتے چراغ۔ اس شب مجھے اپنا بستر بے حد سرد لگا۔

باہر ابھی تک گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا کی غیر موجودگی کے باوجود خنکی اتنی شدید تھی کہ شاید اگر میں اپنے سر کو زور سے جھٹکتا تو میری ناک اور کان فی الفور پکے ہوئے سُرُخ بیروں طرح جھڑک کر میری جھولی میں ٹپ ٹپ گر جاتے۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے مشکل سنگٹ سلگایا اور باہر کھڑے کنڈکٹر سے کہا: ”آغا خیلے خنکی است“ اُس نے ہاتھ بڑھا کر چابی گھا دی اور ساکت بس کا انجن رُک رُک سسکیوں کی طرح ہولے ہولے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انجن گرم ہوا تو خوشگوار حدت کے ہلکے میری جانب جھولنے لگے۔ میں نے اس پاؤں کی طرح آرام دہ اور گرم محسوس کیا جو تازہ پالش کئے ہوئے بوٹ میں داخل ہوتا ہے تو پالش کرنے والے غریب ہاتھ کی گرمی ابھی اندرونی حصے کے چپڑے میں سے پھوٹ رہی ہوتی ہے اور وہ انگلیاں پھیلا کر اس پر اپنی حدت سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

چار بجے کو تھے مگر ابھی تک میرے سوا اور کوئی مسافر بس میں سوا نہیں ہوا تھا۔

”خان بابا! کوچ کب ہو گا؟“ میں نے کنڈکٹر سے پوچھا۔

”صبر صبر“ اُس نے خاصی بے صبری سے تلقین کی۔

باہر چند مزدور ڈرائیور اور کنڈکٹر کی زیر نگرانی روٹی کی بڑی بڑی گانٹھیں رسوں کی مدد سے چھت پر باندھ رہے تھے۔ چھت پر روٹی کا پہاڑ تعمیر کرنے کے بعد بقیہ گانٹھوں کو بس کے اندرونی حصے میں سارڈین پھلیوں کی طرح پیک کیا جانے لگا۔ میرے برابر خالی نشست پر بھی تیل کے کنسٹر جا دیئے گئے تاکہ سفر کے دوران میری لوز ششنگ کا اگان باقی نہ رہے۔ لوڈنگ مکمل ہونے پر سید خاں بس سروس کا ڈرائیور جو خود سید خاں ہی تھا اپنی نشست پر دھپ سے بیٹھا اور گیس پمپ کر بس کو حرکت میں لے آیا۔ اڈے سے نکلنے کے بعد ہم دریا کے کنارے واقع بڑی سرک پر آئے اور پھر دیتیں ہاتھ پر ہرات جانے والی شاہراہ پر مڑ گئے۔ چند فرلانگ طے کرنے کے بعد بس ایک وسیع میدان میں کھری بکر منڈی میں گھس گئی اور کنڈکٹر ”غزنی غزنی“ کی دہائی دینے لگا۔ مجھے اب اپنی حماقت کا بھرپور احساس ہوا یعنی میں کسی مسافر ٹرین کی بجائے مال گاڑی میں سوار ہو چکا تھا۔ اس قسم کی بسیں کابل سے ہرات تک کے لئے سامان لوڈ کرتی ہیں اور پھر سروس بارہ میل پر بریک لگا کر مختصر فاصلوں پر جانے والے مسافروں کو ٹھونس کر بغیر کسی متعینہ شیڈول کے دھیرے دھیرے اپنی من مرضی سے جاتے مقصود پر پہنچتی ہیں۔ اگر میں عام بس پر سوار ہوتا تو رات تک ہرات پہنچنا یقینی تھا مگر اب میں حضرت سید خاں کے رحم و کرم پر تھا کہ وہ دو روز میں پہنچاتے ہیں یا ایک ہفتے میں۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا، میں صابر و شاکر چپکے سے بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ میدان میں پھیلے هجوم میں افغانستان کی مختلف قومیتوں کے افراد اپنے الگ الگ لباس اور ناک نقشتے کی بنا پر صاف پہچانے جا رہے تھے چسپی ناکوں والے ترکستانی، لمبے چہنوں میں حرکت کرتے ہوئے تاجک اور ازبک، جہازی گیمٹیوں کے بوجھ تلے دبے پٹھان اور وحشی آنکھوں والے ہزارے۔

”بخیرے روی مومناں“ کھڑکی سے باہر ایک آشنا چہرہ تھا۔

وہی فقیر جو آج سے چھ برس پیشتر اس چمکیلے روز بھاری بس میں داخل ہوا تھا، جب میں ”نکلے تری تلاش میں“ کے آغاز میں علی کے ہمراہ ہرات جا رہا تھا، وہی فقیر



یا کم از کم اس کا کوئی ہنزا دے۔ میں نے جلدی سے ایک سکرٹ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر ”خیر میرے رومی“ کا ورد کیا اور چلا گیا مگر اس فقیر کی دعا اس مرتبہ تو قبول نہ ہوئی۔ میں گیا تو خیریت سے مگر واپسی... خیر یہ بعد کی باتیں ہیں اور شاید اس لئے بھی کہ دعا صرف بخیرے رومی کے لئے تھی، اس میں خیریت سے واپسی کا ذکر نہ تھا۔ کابل کی نواحی بستیوں سے نکل کر افغانستان کے وحشی مناظر نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے آغا زنگشکو کے لئے سید خاں سے کہا: ”آغا! بس خیلے خوب است“ آغا یعنی سید خاں میری اس موقع و مستحق فارسی سے بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا۔ ”خوہم بیس سال نخور میں ڈر یور رہا، اردو میں بات کرو۔“

”ہم ہرات کب پہنچیں گے؟“  
”اللہ مالک ہے۔“ اُس نے انگلی سیدھی کر کے پہنچے ہوئے بزرگوں کی طرح بشارت دی۔  
”آغا تم تو ادھر لشپور میں رہا، ہمارا بھائی ہے۔“  
”بالکل بھائی ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے غزنی میں اتار دو تاکہ میں وہاں سے ہرات کے لئے مسافر بس میں سوار...“

”اتار دوں گا... مگر ٹکٹ کا پیسہ واپس نہیں ملے گا۔“  
”خیر یہ بس بھی اتنی بُری نہیں ہے، کبھی نہ کبھی تو پہنچ ہی جائے گی۔“ میں نے کھیانے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”سکرٹ پوگے؟“

”اوتے کندھے پر ہاتھ مت رکھو، ایکسیڈنٹ کروا دے گا۔“ وہ دکھائی سے بولا۔  
طویل سفر کے دوران ڈرائیور کو سکرٹ پلاتے رہنا خاصا سود مند ثابت ہوتا ہے۔ کسی خوبصورت منظر کو کیمیرے میں اتارنے کو جی چاہے یا خوراک کی تبدیلی کی وجہ سے پیٹ میں ہلچل مچ جائے تو بس آسانی کوئی جاسکتی ہے مگر سید خاں صرف پتھر ہی پتھر تھا اس

کے اندر دوستی کا وہ بارود موجود نہ تھا جسے سکرٹ کی پیش کش سے بھک سے اڑایا جاسکتا ہو۔ میرے اس سست روی چکیاں لیتے ہوئے سفر کی کیفیت سے صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنہوں نے کبھی مقامی آدمی بس پر پشاور سے ملتان تک سفر کیا ہو، اگر کوئی ایسی سر دس چلتی ہے تو۔ غزنی تک تو ہم اتنی جگہوں پر رُکے کہ اگر میں چاہتا تو مرنے سے سکرٹ بھونکتا، گم دکے مناظر سے لطف اندوز ہوتا پیدل غزنی پہنچ جاتا اور آدھے گھنٹے بعد آنے والی اُسی بس پر دوبارہ سوار ہو جاتا۔ ہر سٹاپ پر بے شمار بوڑھے، بچے عورتیں دروازے میں سے داخل ہو کر چھت اور گانٹھوں کے درمیان خلا میں رنگ کر فٹ ہو جاتے۔ منزل آنے پر یا تو خود بمشکل اُٹھے ترچھے ہو کر نکل آتے در نہ کند کٹر پیچھے سے ان کے پاؤں پکڑ کر گھسیٹ کر باہر لے آتا۔ ایک فربہ گدھا بھی دو میل تک میرا ہم سفر رہا۔ جسے چھت پر گانٹھوں کے درمیان رسوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

سلطان محمود کے مقبرے کا سفید گنبد درختوں میں سے نظر آیا تو سید خاں نے بس روکے بغیر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے فاتحہ پڑھی۔ اس دوران میں اگلی نشست کو اتنی مضبوطی سے تھامے رہا جیسے سیڑنگ وہیل اب میرے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ غزنی منجر ہواڑوں کے پس منظر میں سرود کے درختوں میں سے کچے گھروں اور پرانے حصار کے بام و در ایک معدوم ہوتے ہوئے خواب کی طرح گزر گئے۔

سید خاں نے بتایا کہ اب ہم قندھار تک بغیر رُکے سفر کریں گے۔ لیکن یہ صرف سید خاں کا خیال تھا۔

میں نے سکرٹ سلگایا اور تھیلے میں سے پاکٹ ٹرانسمیٹر نکال کر آن کر دیا پتہ نہیں کونسا پاکستانی سٹیشن تھا رستہ پر ایک فلمی دُھن بج رہی تھی۔ جانی پہچانی دُھن جو مجھے وایلوں میں تیری اس بس میں سے نکال کر واپس اپنے گھر لے گئی۔ بے تحاشا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھا کر کابل واپس چلا جاؤں اور وہاں سے... مگر میرے اندر کا سیاح اس مرتبہ آنا بڑول اور رقیق القلب کیوں ہو گیا ہے، رستہ پر بچنے والی یہ ایک عامیانہ قسم کی

دھن نصف دنیا کی سیاحت پر حامی ہوتی چلی جا رہی ہے، کیوں؟ سانس لینے میں دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ جوں جوں ہم غزنی سے دور ہوتے گئے، میرے پیدلیو پر بچنے والی دھن کے درمیان فاصلے حامل ہوتے چلے گئے اور سردمہم سے مدہم تر ہونے لگی اور پھر یکدم ایک پر شور کھڑکھڑاہٹ اس پر چھا گئی۔ بہتر آواز کے لئے میں نے مٹیابی سے سوئی گھائی تو مدہم آواز بھی ایک جیسی مچھلی کی طرح میری انگلیوں میں سے پھسل کر شور کے سمندر میں اتر گئی جیسے ایک رشتہ تجاں منقطع ہو گیا۔

نیم بیداری کے عالم میں میرے کانوں میں انجن کے باقاعدہ مکالمی ایکشن کی بجائے تیز ہوا کا شور گونجا۔ سنسناتی ہوئی آوازوں کا شور۔ ایک طویل "ہو" کی صدا جیسے لاکھوں درویش ورد کر رہے ہوں۔ "ہو، ہو، ہو۔ بس ساکت کھڑی تھی۔ سید خاں اور کندھڑا پی نشستوں پر موجود نہ تھے۔

بس سے باہر آیا تو تیز ہوانے یوں قدم لئے کہ مجھے ایک جگہ جم کر کھڑے رہنے کے لئے اپنی تمام تر قوت بردے کا رونا پڑی۔ ہوا کا رلیا ڈوبتی آبدوز میں شرلاٹے بھرتے ہوئے پانی کی طرح میرے لباس میں داخل ہوا اور مجھے ایک خلا نورد کی طرح ڈولنے پر مجبور کر دیا۔ ایک جانب تاحہ نظر پر شکوہ مگر ہیبت ناک صحرا اور دوسری طرف ایک بجز میدان کے آخر میں کھڑے بلند پتھر تلے تو دوں نے مجھے بھی حیرت سے پتھر کر دیا۔ میں نے آنکھوں سے رستے پانی کو پونچھ کر اس طویل سڑک کو دیکھا جو سامنے کے پہاڑی سلسلے میں گم ہو رہی تھی اور جس پر جا بجا روٹی کی گانٹھیں بکھری پڑی تھیں۔ سڑک پر ٹانوروں کے کالے زگ زگ رنگ نشانوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ بس کسی خرابی کے باعث بے قابو ہو کر گھسٹی ہوئی یہاں تک آن پہنچی ہے۔ میں کہ اتنی ہلکی نیند کا مالک ہوں جانے کیوں اتنے بڑے حادثے کے باوجود بیدار نہ ہو سکا۔ دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہ ملتا تھا، سوائے ایک کچی کوٹھڑی کے جو سڑک سے کچھ فاصلے پر میدان کے بجز سمندر میں کسی ذیل چلی کے کوٹان

کی طرح اٹھری ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے سوراخ نما روشن دان سے دھواں اٹھ رہا تھا جو ہوا کی پاگل مسافت میں حامل ہوتے ہی منتشر ہو جاتا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں سڑک پر سے اتر ادر کاٹنے دار جھاڑیوں اور کوئیلی گھاس سے دھن بچاتا کوٹھڑی کی جانب چل دیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ہوا کا شور بالکل مدہم ٹپ گیا جیسے کسی نے سوچ گھا کر اسے دھیا کر دیا ہو۔ میرا اندازہ درست تھا۔ سید خاں کچے فرش پر بچھی ایک بوسیدہ دری پر نیم دراز قہوہ پینے میں مشغول تھا۔ کونے میں ایک افغان چرواہا پیسیا کرتے کسی جوگی کی مانند ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کئے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھار اٹھتا اور گھٹی پر دھری کیتی میں چچھہ ہلا کر پھر اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا۔ ایک طرف سوکھی ہوئی کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک ڈھیر تھا جو شاید سردراتوں میں اسے موسم کی شدت سے بچاتا تھا۔ ایک تھے پر چند پیالیاں اور سوکھے پنیر کے چند پٹے رکھے تھے۔ بھر بھری دیوار پر ۱۹۵۲ء کا ایک بوسیدہ کیلنڈر لٹکا رہا تھا جس پر خانہ کعبہ کی تصویر تھی۔ سید خاں مجھے دیکھ کر سفر کے دوران پہلی دفعہ مسکرایا۔

”اگلا ٹاٹر چھٹ گیا ہے۔ اتنے ٹکڑے ہیں کہ کسی پیر فقیر کے مزار پر لٹکتی دھجیاں بھی کم ہی ہوں گی۔ میں نے کندھڑ کو نیا ٹاٹر خریدنے کے لئے قندھار بھیج دیا ہے۔ پانچ چھ گھنٹوں میں لوٹ آئے گا... آد قہوہ پیو...“

افغان چرواہا قہوے کا نام سن کر مراقبہ سے بیدار ہوا اور مجھے گرم گرم قہوے کی ایک ایسی پیالی تھمادی جو درجنوں مرتبہ ٹوٹنے کے باوجود اس مشاقی سے جوڑی گئی تھی کہ سبحان اللہ۔ موزیک کے کسی شاہکار کا گانگن ہوتا تھا۔ پیالی میری ہتھیلیوں کے درمیان ایک پزندے کے جسم کی طرح گرم تھی۔ میں نے قہوے کا ایک گھونٹ بھرا۔

”کیا تم آج رات قندھار پہنچ جائیں گے؟“

”اللہ مالک ہے۔“ سید خاں نے قہوہ ختم کیا اور چہرے پر گڑھی کا پتلا اوڑھ کر دری

پرلیٹ گیا۔

بوڑھا چرواہا جانے کس افغان قومیت سے متعلق تھا کہ میری مختصر فارسی کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ پاتا اور جواب میں کسی نامانوس زبان کا ایک فقرہ ادا کر کے میری پیالی خالی ہونے سے پہلے ہی گرم قہوے سے بھر دیتا۔ انگلیٹھی میں پڑے اُپوں پر سفید راکھ نمودار ہونے لگی تو اس نے انہیں اپنی کھردری انگلیوں سے چھید کر پھر سے دمکا دیا اور اپنے کونے میں براجمان ہو کر اُونگھنے لگا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

چرواہے کے کچے جھونپڑے کے گرد فطرت کے پرشور عناصر کا راج تھا۔ اُن کا بس چلتا تو اس جھونپڑی کو بھی مسما کر کے سیلوں پھیلے اس میدان کی طرح ہموار کر دیتے جس میں جگہ جگہ بگولے اُٹھ رہے تھے۔ چند گھومتے رُٹیل سانپوں کی طرح پھنکارتے، اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے گھاس اور جھاڑیوں کو چبختے، اُچھالتے ہوئے۔ اور کچھ ایک ہی جگہ پر سحر زدہ، ساکت یوں جیسے موہن جو دارو کے کھنڈروں میں بڑے کنوئیں کی گول عمارت نمایاں کھڑی نظر آتی ہے۔ ان سے پرے وہ ویران اور خشک پہاڑ تھے جنہیں کسی مرتبہ میں نے چلتی بس میں سے حیرت سے دیکھا اور ان سے قربت کی خواہش کو دل میں دبائے گزر گیا۔

”کنڈکڑ شام سے پہلے قندھار سے واپس نہیں آ سکتا“ قربت کی خواہش نے مجھے راہ دکھائی۔ اس عرصے میں یہ مختصر میدان عبور کر کے اگر تھوڑی سی کوہ پیمائی کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟

اگر میں سید خاں کو اپنے ارادے سے باخبر کرتا تو وہ یقیناً مجھے خطی سمجھتا کیونکہ اُسے اس کوہ پیمائے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ہو گا جسے ایک ذی ہوش انسان نے پوچھا تھا۔ ”آخر تم لوگ ان پہاڑوں پر چڑھتے کیوں ہو؟“

جواب تھا۔ ”کیونکہ یہ پہاڑ یہاں موجود ہیں اس لئے۔“  
موجود کی یہی منطق میرے سامنے بھی تھی۔ میں نے جیکٹ کی زپ گلے تک چڑھائی

اور ہوا کی تندی سے بچنے کی خاطر سر نیچا کر کے ان بگونوں کی جانب چلنے لگا جو میرے بدن کی جھاڑی کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

اور اب پچھلے تین گھنٹوں سے میں اس پرشور بلندی پر بیٹھا نیچے پھیلے وسیع میدان کے درمیان کھڑی اس بس کو دیکھ رہا تھا جو یہاں سے ایک ڈنگی کھلونے کی طرح لگ رہی تھی مختصر مگر مکمل جزئیات کے ساتھ۔ دائیں ہاتھ پر بھروسے پہاڑوں کی کوکھ میں سے پھوٹی سیاہ سڑک میں سے ایک نکتہ نمودار ہوا۔ ایک ٹرک جو نسبتاً بڑے نکتے یعنی میری بس سے بھی کم از کم پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ جو نبی یہ فاصلہ طے ہوا، ٹرک کا اور اس میں سے ایک منحنی سا پتلا برآمد ہوا جو یقیناً کنڈکڑ تھا کیونکہ اس ویرانے میں آباد اس چرواہے کو ملنے کون آتا ہو گا؟

میں نے کھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آنکھوں کے آگے آتی ہوئی نمی کی جھلکی کے پاتین کا ہندسہ تیرنے لگا۔ سورج جس نے تین گھنٹے پیشتر مجھے اپنے عین نیچے پایا تھا، اب ترچھا ہو کر ڈھل رہا تھا۔ ان سرزمینوں پر چمکنے کے لئے جدھر مجھے سفر کرنا تھا... ہرات کے قدیم شہر کی جانب گلی اب ایران کی طرف، ترکی کے بوڑھے پہاڑ آوارات کی چوٹی کے قریب، شام کے صحرائوں میں کھڑے ہجوم غیل کے سروں پر، مصری صحرائیں بکھرے فرعون تہذیب کے کھنڈروں پر، سُرخ شراب ایسے اُن انجین سمندروں پر جن میں جہاں گرد اوڈیسس ایک عمر بھٹکنے کا باوجود بالآخر اپنے وطن واپس پہنچ گیا تھا۔

نیچے اُترتے ہوئے میرا سایہ میرے آگے چل رہا تھا، مجھے راہ دکھانے کے لئے، سفر پر نکلنے سے پیشتر اور اب تک جو خدشات میرے دل میں بدر وحوں کی طرح مکین تھے، گہر ہو چکے تھے۔ میں ایک ایسے موسم کی مانند اس پہاڑ پر سے اُترا جسے تمام جواب مل چکے ہوں، جس نے سچائی کو پالیا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ میری واپسی پر سرحد پر کھڑا بند دروازہ میرے چھوٹنے سے ہی دھوا ہو جائے گا، میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگرچہ میرے ایسے لوگ کبھی گھر نہیں جاتے، ہمیشہ جلا وطن ہی رہتے ہیں۔ میرا بدن آئندہ سفر کے خوشگوار اضطراب

## اُپریش افغانستان

سے یوں ہوئے ہوئے دیکھنے لگا جیسے سگارا کا آخری کش لگاتے ہوئے آگ کا قرب ہوٹوں کو ایک جلتی ہوئی آسودگی بخشتا ہے۔

میدان عبور کر کے سڑک کے قریب پہنچا تو سیدھاں اور کنڈکڑ کو لہوں پر ہاتھ رکھے میری جانب یوں بھونکیں لگا ہوں سے گھوڑے تھے جیسے ایک دزدہ اپنی طرف بے خبری میں بڑھتے شکار کو دیکھتا ہے۔

”خوتم نے بس کسے ٹکٹ کی قیمت ادا کی ہے، بس نہیں خریدی۔“

”میں ذرا ان پہاڑوں میں گیا تھا۔“ میں نے حیرت سے اس بلندی کو دیکھا جو ایک گھنٹہ پیشتر میری آماجگاہ تھی۔

”اُدھر... اُس پہاڑ میں؟“ سیدھاں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”اُدھر تو غاروں میں بھیڑیا رہتا ہے۔ گرمیوں میں روس کے ملک سے آکر اُدھر سوتا ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ میں بے اختیار ہر کمر مسکرا دیا اور بس میں سوار ہو گیا۔



قندھار کا ”ہوٹل پامیر“ اُجڑے ہوئے ایک ایسے قصبے سے مشابہ تھا جو دیرانے میں راتوں رات صرف اس لئے اُبھرتا ہے کہ اس کے آس پاس انسانی آنکھ سونا دریافت کر لیتی ہے اور یوں اس چمکتی دھات یا بقول گورکی ”پلے شیطان“ کی آماجگاہیں، قمار خانے، ہوٹل، شراب خانے، رقص گھر خود بخود ہر سو جنم لینے لگتے ہیں۔ اُدھر سونے کی کان اپنی آخری ڈلی انسانی ہاتھوں میں تھماتی ہے، اُدھر چمکتا دکتا قصبہ اُسی طور اتوں رات دیرانیوں کو لوٹ جاتا ہے۔ قصبے کے کناروں پر رکنا مگر منتظر صحرانیکل ہے۔ اُسے اپنی ریتیلی لپیٹ میں لیتا ہے، اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ہوا بند دوانوں اور کھڑکیوں کو کھول کر اس اپنائیت سے عمارتوں میں واپس لوٹ آتی ہے جیسے ایک رئیس زادی ایک عرصہ شہر میں قیام کے بعد اپنے قصبائی مینشن میں داخل ہوتی ہے۔ گلیوں میں دھول اُڑنے لگتی ہے۔ سنہری چھتوں کو چمکا دڑوں کے پُرسپاہ کرتے ہیں اور دیرانیوں کا محبوب پرندہ کلیسا کی صلیب پر براجمان اپنی گول گول آنکھیں کھاتا ہے۔ ”ہوٹل پامیر“ کا گولڈرش ان دنوں شروع ہوا جب متحدہ ہندوستان کی تمام تر شرقی تجارت قندھار کے راستے گزرتی تھی۔ اور یہ سنہری دور تقسیم کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو گیا۔ اب اس ہوٹل کے طویل برآمدوں میں خوشحال تاجروں کی بجائے قندھاری سیبوں ایسے چھوٹے ہوئے صحت مند چرہ چہل قدمی کرتے ہیں۔ لائن میں بچا ٹاٹ کسی قالین رفتہ کی یادگار ہے۔ پھول بوٹوں کی بجائے سولائوں سے مزین جن میں سے اکھڑا ہوا

سیلن زدہ فرش نظر آتا ہے۔ کمروں میں جا بجا جالے تنے ہیں جن کے پُرسکون وجود میں تخفیف ہوا  
ارتعاش صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب چھت سے اُٹھڑا ہوا چونا ان پر گرتا ہے،  
چند لمحے جھولتا ہے اور پھر نیچے بستر پر آگرتا ہے۔

میں صرف دو وجوہ کی بنا پر اس دیرانے کا اسیر ہوا، ایک تو سید خاں کی بس اُس  
کے سامنے آکر رُکی تھی اور دوسرے ایک شب کے لئے کرایہ صرف آٹھ روپے تھا۔  
”ہوٹل پامیر“ کے بھائیں بھائیں کرتے برآمدے میں چلتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے  
شہر خموشاں میں چل رہا ہوں۔ بیشتر کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور ان کے اندر  
چھت سے گرا ہوا چونا رنگتے صحرا کی مانند فریج کو خاموشی سے چاٹ رہا تھا۔ چند ایک پر  
قفل پڑے ہوئے تھے جن میں سے پھوٹتی ہوئی زنک کی بھر بھری تھیں گواہی دیتی تھیں کہ ان  
میں آخری مرتبہ چابی گھمانے والے ہاتھ اب زیر زمین ہوں گے۔ میں نیم تاریکی میں سنبھل سنبھل کر  
قدم رکھتا ڈیسک تک پہنچا۔ وہاں تاریکی مکمل تھی۔

”کوئی ہے؟“ میں نے ڈیسک پر دستک دے کر ہلے سے پوچھا۔

کچھ فاصلے پر ایک ٹیبل لمپ نیم روشن ہوا۔ ناکافی روشنی میں ڈیسک کے چھچھو دیکا  
ایک ایسا کلرک دکھائی دیا جو ”ہوٹل پامیر“ کے زوال پذیر ماحول کا ایک لازمی جزو بن  
چکا تھا، شکستہ اور سیلن زدہ، چہرے پر لرزتی جھرتیاں چھتوں سے گرنے والے چونے کی  
طرح کسی لمحے بھی جھڑکتی تھیں۔ بوسیدہ سوٹ میں پھنسا ایک پوپلے منہ والا افغان  
دولوں ہاتھوں سے اپنی بڑھی ہوئی دائرہ سی کھلانے میں مصروف تھا۔

”ہاں ہے۔“ اُس کی آواز جیسے کسی تاریک غار میں سے برآمد ہوئی۔  
”کیا ہے؟“

”تم پوچھ نہیں رہے تھے کہ کوئی ہے؟“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”ہاں... میں باہر جا رہا ہوں، اپنے کمرے کی چابی جمع کر دانا چاہتا ہوں۔“  
”رہتے دو... یہاں چوری چکاری کا امکان نہیں، تم ہی واحد مسافر ہو۔“

کھانے کے بارے میں پوچھا تو بولا۔ ”ہوٹل کا باورچی خانہ تو کچیل بارشوں میں منہم  
ہو گیا تھا۔ ساتھ والے تنور سے کھالو... اور کچھ؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ٹیبل لمپ گویا اسی اشارے کا منتظر تھا، فوراً اُگل ہو گیا،  
مجھے اس آسیب زدہ ہوٹل اور پوپلے بوڑھے سے سخت وحشت ہونے لگی۔ پوپلے بوڑھا جو  
یقیناً کئی مائت اس کے تاریک برآمدوں میں ٹھٹھا ہوگا۔ گھنے جنگلوں اور خاموش دیرانوں میں  
تن تنہا رات گزارنا میرے جیسے آوارہ گرد کے لئے ایک کاروباری معمول تھا مگر اس قسم کی  
نامعقول عمارت میں شب بسر کرنے کے خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے پچھلے سفر  
میں قندھار میں اسے آیا تو علی کے ہمراہ پاکستان کونسلٹ کے آرام دہ ریسٹ ہاؤس میں قیام  
کیا تھا۔ کیوں نہ اس مرتبہ بھی وہیں شب بسر کی جائے؟ میں نے سوچا ”مگر ہوٹل چھوڑنے  
سے پیشتر تصدیق ضرور کر لینا چاہیے، مبادا وہاں جگہ نہ ملے اور میں کابل کی طرح قندھار  
میں بھی اُدھی رات تک دھکے کھاتا پھروں۔“

”آپ کے پاس فرن ہے، ٹیلی فرن؟“ میں نے اندھیرے میں پوشیدہ بابے سے پوچھا۔  
”ہے؟“ اس نے ٹیبل لمپ پر ہاتھ مارا اور پھر دلائیں۔ ”سے گرا ہم بیل کا ادیر کبلی ٹیلیفون  
نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔“  
”ڈائر کٹری بھی ہوگی؟“

اس نے چپکے سے دو صفحوں کا ایک کتابچہ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے کونسلٹ کا  
نمبر تلاش کر کے ڈائل کھایا۔

”ہیلو، کو، بول رہا ہے؟“ ایک نہی تلی احتیاط پسند آواز سنائی دی۔  
”پاکستان کونسلٹ...“

”مکن بول رہا ہے؟“ پھر اُسی انداز میں سوال دہرایا گیا۔

”اگر یہ پاکستان کونسلٹ ہے تو میں تفضل جنرل سے بات کرنا چاہتا ہوں...“  
”ہاں پاکستان کونسلٹ ہے۔“

”تویں تو فصل جنرا سے بات...“

”کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے مختصراً اپنا تعارف کرایا اور لیٹ ہاؤس میں شب ب سری کی خواہش کا اظہار کیا۔  
”وہ تو بند کر دیا گیا ہے... لیکن ٹھہریے آپ فون مت بند کیجیے گا۔ آپ اسی وقت یہاں  
تشریف لائیے، ہم آپ کو چاہتے پلانا چاہتے ہیں۔“  
”شکریہ مگر...“

”مگر کیا، میں کہہ چور ہا ہوں کہ فوراً آئیے اور چاہتے پیجیے۔“

چائے کی دعوت میں درخواست کی بجائے صریحاً حکمانہ رویہ تھا۔ اپنے پاکستانی بھائی  
بندوں کے گلے کا کالہ ملک سے باہر جا کر بھی نرم نہیں پڑتا، اکثر اسی رہتا ہے۔ میں بھی اگر کیا  
”اس وقت...؟ جی نہیں... نہیں آسکتا۔“

”آپ نے فون کیا ہے تو آکر چائے بھی پیجیے۔“ جواب آیا۔

”صاحب اگر لیٹ ہاؤس نہیں مل سکتا تو میں آج بھی نہیں سکتا۔ تھکا ہوا ہوں، کھانا  
کھا کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”صاحب آپ کو آنا پڑے گا... میرا مطلب ہے پلیز آجائیے... پلیز ہم انتظار کر رہے  
ہیں، چشم براہ ہیں... مہربانی ہوگی...“ اُن حضرت نے تو باتا وعدہ آہ وزاری شروع کر دی

”کھانے کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے جھلا کر فون بند کیا اور اس قندھاری می  
کے آگے رکھ دیا جو ایک ہاتھ سے بدستور داڑھی کھلا رہا تھا اور دوسرے کی انگلیاں ٹیل  
لیمپ کے سوچ پر رکھے اس انتظار میں تھا کہ میں گفتگو ختم کر دوں اور وہ اسے گل کر کے  
ایک مرتبہ پھر تاریکی میں روپوش ہو جائے۔

قندھاری می کی تجویز کردہ تنور پر چاول گوشت کی رکابی میں انگلیاں چلاتے ہوئے  
مجھے میرا ذہن پاکستانی کونسلٹ کی دھونس آمیز دعوت کی گتھیوں میں الجھا رہا۔ آخر وہ  
اتنے بصد کیوں ہیں؟ پھر خیال آیا کہ یہ تو اپنی تحریروں کی بین الاقوامی شہرت اور بے مثال

اداکاری کا کرشمہ ہے کہ تو فصل جنرل محمد ایسے آگسٹ، وی وی آئی پی سہان کو قندھار  
سے چلاتے پلاتے بغیر رخصت نہیں کرنا چاہتے۔ نوکری نہیں کرنی انہوں نے؛ مگر اس  
مفروضے سے بھی تسلی نہ ہوتی۔ تمہارے کی دو بیالیاں اور متعدد مفرغے حلق سے اتارنے  
کے بعد میں تنور سے باہر آیا اور تانگے پر سوار ہو گیا۔ کوچوان نے پہلے تو مجھے کوئی دھولنگا  
فرنگی جان کر اپنی کبوتری انگریزی آزمائی اور پھر مجھے غور سے دیکھ کر چاک لہراتے ہوئے  
بولاً۔ ”صاحب انگریزی فلم دیکھیے گا؟“

”نہیں، پاکستانی کونسلٹ چلے گا۔“

”اُس نے چاکلے نیچی کر کے باگیں کھینچ لیں۔“ ادھر نہیں چلے گا۔“  
”کیوں؟“

”بس نہیں چلے گا۔“

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی ”برادر پچاس افغانی دوں گا۔“  
اُس نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور چاکل لہرا دیا ”چلے گا مگر گیٹ پر نہیں آئے گا۔“  
ہم احمد شاہ ابدالی کے مزار کے قریب سے گزرے تو کوچوان نے دونوں ہاتھوں  
کی انگلیوں کو بوسہ دیا اور انتہائی عقیدت کے ساتھ آنکھوں سے لگا لیا۔

”ادھر شاہ ابدالی سوتا ہے نا؟ میں نے پوچھا۔“

”وہ بھی سوتا ہے مگر...“ مزید کچھ کہنے سے پیشتر اُس نے دوبارہ انگلیاں چوہیں  
اور انہیں آنکھوں سے لگایا۔ ”مگر اس کے مقبرے کے پیچھے، اُس بڑے گنبد کے نیچے“  
ادھر ہمارے نبی سرکار کا خرقہ شریف ہے جسے بت میں فرشتوں نے اپنے ہاتھوں سے  
بنایا۔ پہلے بخارا میں تھا، وہاں سے ابدالی ادھر لے آیا۔ قندھار خرقہ شریف کی برکت  
سے قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔“

استنبول میں، حضور کے لبادہ مبارک کے صندوق نے مجھے چشم نم کی جس کیفیت میں  
ڈوبایا تھا، وہی رواں جذبے اس قندھاری تانگے والے کی آنکھوں میں سے چھلک رہے تھے۔

کیا خرقہ شریف اصلی ہے؟ اس سوال کا جواب تو تب پیدا ہوا اگر اس ہستی سے موسم کوئی بھی شے کسی اور کی ہر سکتی ہو تو!

مجھ بھی تنگ گلیوں میں سے جھوٹا ہوتا ناکہ بالآخر ایک کشادہ چوک کے درمیان میں رُک گیا۔ ”برادر جلدی سے اتر جاؤ، وہ ادھر تمہارا جھنڈا نظر آ رہا ہے۔“

کرایہ ادا کرنے کے بعد میں نے کونسلٹ کی عمارت پر پھر پھڑپھڑاتے چاند ستارے کی جانب نگاہ کی تو بے اختیار مسکرا دیا۔ وطن میں تو صرف سبز کپڑے کا ایک ٹکڑا لگا کر بھی آسمانوں میں لہراتا دکھائی دے تو ایک ہمدم دیرینہ جس سے بیٹے جانے کو جی چاہتا ہے میں کونسلٹ کے پچاسک سے اندر داخل ہوا تو پورے درج میں پورا علم میرے استقبال کے لئے دست بستہ کھڑا تھا۔ ایک دُبلے پتلے صاحب آگے بڑھے۔ ”آپ ہی مستنصر حسین... تا۔ تا۔“ انہوں نے پھرتی سے کوٹ کی جیب میں سے ایک چٹ نکال کر دیکھی ”ٹار۔“

”جی ٹار۔“

”بالکل... آپ ہی ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہیں اطمینان ہوا اگر مجبوشی سے ہاتھ ملایا، باقی علم سے تعارف کر دیا اور لان میں لے گئے جہاں پُر تکلف چائے کے تمام تر لوازمات نفاس سے سچے تھے۔

”آپ نے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا جو ہمارے بلانے پر یہاں تشریف لے آئے ورنہ...“

”ورنہ کیا؟“

”آپ پہلے چائے تو پیجئے۔“

چائے کی پہلی پیالی سے فارغ ہو کر میں نے سلسلہ کلام ”ورنہ کیا؟“ سے شروع کیا۔

”آپ جانتے ہیں کہ دونوں برادر ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد رکھی جا چکی ہے مگر پھر بھی شک کی ایک خاص فضا بدستور قائم ہے... آپ نے فون پر بھی

گفتگو کی وہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت قندھار کے حکمہ جاسوسی کا سربراہ بنفس نفیس سٹن رہا تھا... ہمارا فون بگڑا ہے... اب اگر کوئی پاکستانی قندھار آکر خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت ہی کونسلٹ سے رابطہ قائم کرے تو اُن کے ذہن میں

خواہ مخواہ شبہ تقویت پکڑتا ہے کہ ہونہ ہر یہ شخص قندھار میں کسی خاص شن کے لئے آیا ہے... چنانچہ اس کا پیچھا کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو گرفتار کر کے پوچھ گچھ بھی کی جاتی ہے۔“

”ادہ واقعی؟“ میں نے لاپرواہی سے چلنے کا ایک گھونٹ بھرا ہینکلری کی طرح سڑ تھا۔ ”لیکن صاحب اگر وہ جاسوس... میرا مطلب ہے وہ شخص کھلے بندوں کونسلٹ آجائے اور میری طرح دعوتیں اُڑانے لگے تو کیا اُن کے خدشات کو مزید تقویت نہیں ملتی؟“

”آپ کو اس طرح تقریباً زبردستی چائے پر مدعو کرنے کا واحد مقصد ہی یہ تھا کہ اگر کل کلال آپ کو غائب کر دیا جائے...“

”کہاں غائب کر دیا جائے...؟“ میری انگلیوں میں جکڑی تھالی پر چائے کی پیالی باقاعدہ جلتزنگ بجانے لگی۔

”خیر غائب تو نہیں...“ ایک اور صاحب نے لقمہ دیا۔ ”ویسے ہی اگر گڑبڑ ہو جائے تو کم از کم انہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ قندھار میں آپ کی موجودگی پاکستان کونسلٹ کے علم میں ہے اور ہم ایسی صورت میں اپنے ایک شہری کی گمشدگی... میرا مطلب ہے اُس کے بارے میں سرکاری سطح پر باقاعدہ جواب طلبی کر سکتے ہیں...“

”یعنی باقاعدہ گمشدگی...“ میں ایک ہنسی ہنسا جیسے صرف گھگھکیائی ہوئی کہنا بھی خوشگوار تاثر دیتا ہے۔

”اگر خدا نخواستہ ایسا ہو تو ہم نہ صرف سرکاری طور پر جواب طلبی کریں گے بلکہ یقین جانیے شدید احتجاج بھی کریں گے۔“ دُبلے پتلے صاحب نے تسلی دی۔ ”اُن کی گہری سنجیدگی سے یوں معلوم پڑتا تھا جیسے میں فی الحال اُن کے سامنے براجمان نہیں ہوں غائب کر دیا گیا ہوں اور وہ اس وقت ذہن میں احتجاج کا سرکاری نوٹ ترتیب دے رہے ہیں... حکومت پاکستان کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ ہمارا ایک معزز شہری



جناب مستنصر حسین... تاتا...

”آپ کچھ کھاتیں نا؟“ انہوں نے انتہائی محبت سے کیک کا ایک ٹکڑا پلیٹ میں لے کر مجھے دیا۔ پلیٹ پسینے سے تر انگلیوں میں سے پھسلتے پھسلتے بچی ”بہر حال ٹکڑا نہ ہونے کی قسم ضرورت نہیں۔ آپ اگر کل ہرات کے لئے روانہ ہو رہے ہیں تو ہم بڑل فون کر کے تسلی کر لیں گے کہ آپ واقعی روانہ ہو گئے ہیں یا...“ انہوں نے ایک عمدہ قسم کی ڈپلومیٹک کھانسی کھانسی کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔  
دفتر خارجہ میں ڈپلومیٹک ٹریننگ کے دوران کسی شری کو کوئی بڑی خبر سنانے کا سلیقہ بھی سکھایا جاتا ہو گا جو ان صاحب نے تو نہیں سیکھا تھا۔

چائے کے پہلے دور کے بعد نسبتاً کم پرنسٹر گفتگو کا دور چلا۔ مجھے بتایا گیا کہ قندھار میں تعینات ہونے اور کالے پانی کی سزا پانے میں بس انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ علیے کا بیشتر وقت کونسلٹ کی چار دیواری میں اُٹھتے بیٹھتے اور سیر کرنے میں گزرنا ہے۔ بار قدم رکھیں تو رکھوالے ساتھ ہو لیتے ہیں اور کہیں بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ قومی تمواروں پر جو تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، ان کے دعوت نامے چونکہ افغان دفتر خارجہ کے توسط سے تقسیم کئے جاتے ہیں اس لئے اکثر دست افغانوں تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ یوں ان موقعوں پر پاکستانی عملہ خود ہی ہلاکلا کر کے خوش ہو لیتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر کوئی میں ایک طاقتور ایجنٹ برسرِ نصب کر دیا جاتے تو یہاں پاکستان کے بارے میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔

اس گفتگو کے دوران ڈبلے پتلے صاحب نے ایک دم قریب کھڑے چوکیدار سے پوچھا ”موٹھوں والا ہے؟“

اُس نے جھک کر کہا ”صاحب، دیکھ کر آتا ہوں۔“

وہ پھاٹک تک گیا، باہر تانک جھانک کی اور واپس آکر بولا ”نہیں صوفی صاحب!“  
”ہاں آج تو انہی کو ہونا چاہیے تھا۔“

ان مسائل تصوف پر میری ہیرت کو بھانپتے ہوئے ڈبلے پتلے صاحب مسکراتے اور ابرو کے اشارے سے بیرونی دیوار کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ایک درویش نما شخص کو میرے علم میں لا کر بولے ”ہمارے کونسلٹ پر نظر رکھنے کے لئے جو نظرباز حضرات متعین ہیں، محلے کے ارکان نے ان کی پہچان کے لئے اُن کی شکل و شباهت اور عادات کے مطابق کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ چنانچہ جو حضرت کونسلٹ کی بیرونی دیوار پر سوار کی پسکیں بچھا کر تے ادھر آنکھ رکھتے ہیں وہ سنوار خاں ہیں۔ موٹھوں والے کا نام طاہر ہے اُس کی دبیز موٹھوں کا مہرہ منٹ ہے اور صوفی صاحب... یہ اپنی طویل داڑھی اور کبیل کی مخصوص بیکل کی بنا پر اس لقب کے حقدار ٹھہرے ہیں۔ موصوف مشتبہ حضرت کا چھپا کرنے میں ماہر مانے جاتے ہیں۔ آج خاص طور پر آپ کے لئے تشریف لائے ہیں۔“  
”میں اس نظر خاص کے لئے افغان سی آئی ڈی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔“ میں نے ایک جعلی مقدمہ لگانے کی کوشش کی اور پھر پھیکا پڑتے ہوئے پوچھا ”گویا صوفی صاحب صرف مجھ پر نظر رکھنے کے لئے سایہ دیوار بنے ہوئے ہیں؟“

”قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے درنہ عام طور پر موٹھوں والا ہوتا ہے۔ لیکن آپ حوصلہ رکھتے نہایت معصوم قسم کا انسان ہے۔ آپ کی موجودگی رپورٹ کرنے آیا ہے، باہر جانے پر کچھ نہیں کہے گا۔“

”اس بے چارے کو تو ہم کبھی کبھی اندر بلا کر چاتے بھی پلا دیتے ہیں۔“ کونسلٹ کے ہنس مکھ ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے ”کریم بسکٹ بے حد رغبت سے کھاتا ہے۔“  
اس گفتگو کے دوران ایک مرتبہ جب صوفی صاحب بڑی شان بے نیازی سے دیوار پر سے جھانکنے گزرے تو ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ ہلا کر صدا بلند کی ”صوفی یار یہ کام تو ہوتا ہی رہے گا، آد چاتے پیر۔“

صوفی نے مشکل اپنی منہی ضبط کی اور بیکل میں منہ چھپا کر اُسی لائق سے چلتے رہے۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ بین الاقوامی سیاست، خشک میوے کے بھاد اور

حرکت نہیں کر رہی تھی۔ اطمینان کا ایک گہرا سانس سُکھتے حلق میں اُترا اور میں نے سگریٹ سٹکا کر دلائن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے اعصاب کو معمول پر لانے کا جتن شروع کر دیا۔

اگلے چوک پر داییں ہاتھ سے ایک تانگہ اس خاموشی سے مُڑا جیسے اُس کا گھوڑا سڑک پر پاؤں رکھنے کی بجائے فضا میں تیرتا چلا آ رہا ہے، آسمان سے اُترتے ایک کھٹولے کی طرح بے آواز۔۔۔۔۔ اور پھر چم چم کر تا ہمارے پیچھے چلنے لگا اگلی نشست پر محترم بزرگ صوفی صاحب براجمان تھے، کمر میں لپٹے، اور اُس چور پڑنوں جیسے جو فی الحال اُن کی کُپل کی بجائے اگلے تانگے میں تھا۔ قندھار کی خنک شب بھی اُس پسینے کی راہ نہ روک سکی جو میرے پورے بدن میں سے یوں پھوٹا جیسے لب دریا چکئی مٹی پر پھیلی دبانے سے اس کے گرد بلبے پھوٹنے لگتے ہیں۔ ”آپریشین افغانستان“ شروع ہو چکا تھا۔

کچھ فاصلے پر چڑھ کے درختوں کے درمیان ایک کچی سڑک نظر آئی۔ ”غان بابا آہیں ہاتھ مُڑ جاؤ۔“

”لیکن ہوٹل پامیر تو۔۔۔۔“

”ہائیں ہاتھ۔۔۔۔“

ہمارے مُڑتے ہی صوفی صاحب کا تانگہ لحظہ بھر کے لئے اٹکا اور پھر جھوٹا ہوا ہمارے پیچھے کچی سڑک پر آ گیا۔ صوفی صاحب اپنی شہرت کے مطابق ایک شہرہ حضرت کلچیا نہایت ماہرانہ انداز میں کر رہے تھے۔ اُس لمحے میں نے آئن فلیمنگ کے تمام ناولوں کے وہ حصے یاد کرنے کی کوشش کی جہاں ہر قدم پر مخالف گروہ کا ایک آدھ آدمی جیمز بانڈ کے پیچھے ہو لیتا ہے اور سپر سپائی بانڈ نہایت اطمینان سے اپنی سپورٹس کار کا ایکسپریٹ ڈاکر اسے غیظ دے جاتا ہے۔ یہاں صورت حال اتنی جدید اور دماغی نہ تھی۔ میری سپورٹس کار کا انجن دھارمیل گھوڑا تھا جس کے پشتی ایکسپریٹ

بڑکشی سے ہوتا ہوا میرے سفر کی جانب مُڑ گیا مگر خوف کا منہ زور گھوڑا ایک ہی سمت میں رواں رہا۔ باہر ٹپکتے صوفی صاحب کو دیکھتا تو بے اختیار ہنسنے لگتا۔

رات گہری ہونے لگی تو میں نے دھڑکتے دل سے جانے کی اجازت چاہی، حالانکہ میرا بس چلتا تو شب بصری کے لئے قندھار کی تاریک سڑکوں کو مانپنے کے بعد آسیب نہ وہ ہوٹل پامیر پہنچنے کی بجائے وہیں کوئٹہ کے کسی کوئے کھدرے میں پڑ رہتا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ عملے کا کوئی رکن میرے ہمراہ کر دیں جو مجھے ہوٹل پامیر تک چھوڑ آئے؟ میں نے باہر نکلنے سے پیشتر درخواست کی۔

”ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ایسا کرنا شاید آپ کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔“ دُبلے پتلے صاحب کان میں اُنگلی چلاتے ہوئے بولے۔ ”اگر ہمارا کوئی آدمی آپ کے ساتھ ہوٹل تک جاتا ہے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ آپ سچ بچ۔ بہ حال آپ فکر نہ کریں، آپ کی روانگی کے پورے تیس منٹ بعد ہم آپ کو فون کر کے تصدیق کر لیں گے کہ آپ بحفاظت ہوٹل پہنچ چکے ہیں یا۔۔۔۔؟“ فقرہ ادھورا چھوڑ دینے کا رجحان پھر اُن پر غالب آ گیا۔

کوئٹہ کے پھاٹک سے باہر آتے ہی جسم میں ہلکا خوف کا بوجھ میرے پیروں میں منتقل ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس وقت میرے پاؤں کسی آزمائش گھوڑے کی طرح پھول چکے تھے اور اُن کے گرد اہموں کی دبیز جھالیں لٹک رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے فردا ہی ایک تانگہ دستیاب ہو گیا۔

”ہوٹل پامیر“ پچاس افغانی کا نوٹ تانگے والے کو تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔ اُس نے معمول سے چونکا کہ ایہ شلوار کے نیچے میں اڑسا اور گھوڑے کو چابک دکھا دیا۔

چوراہے سے نکلنے ہی میں نے ڈرتے ڈرتے پیچھے نگاہ کی۔ سنسان سڑک پر دُور دُور تک صوفی صاحب، موچھوں والے یا نسوار خاں کی قبیل کی کوئی شے

سے بے پناہ بوجھ آ رہی تھی اور میرا پیچھا کرنے والا، کالے چشے چڑھائے، سفید سوٹ میں ملبوس کوئی اٹالوی یا ترک نہ تھا بلکہ باریش حضرت صوفی تھے، شلوار قمیض پہنے، کمر میں لپٹے ہوئے خطرے اور خوف کے طے جلے احساسات اپنی جگہ مگر صورت حال کی مفکرمیزی مجھے محفوظ بھی کر رہی تھی کیوں نہ صوفی صاحب کی ماہرانہ شہرت کو پرکھا جاتے اور اسی بہانے قندھارہ کی سیر بھی کی جاتے۔ ہم جوتی کی جس نے مجھے بھی اُس سکھ کی مانند ٹھوکا دیا جس نے بعد میں پوچھا تھا کہ ہمداری کی داد دینے سے پیشتر یہ فرمائیے کہ مجھے دھکا کس طرف آدھی نے دیا تھا؟

”خان بابا، مرکزی چوک کی جانب...“

”لیکن ہوٹل پامیر تو...“

”مرکزی چوک۔“

”نانگہ چھوڑ کر جب میں قندھارہ کے مرکزی چورلے میں آیا تو بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر فلمی گیتوں سے گونجتے قہوہ خانے ابھی تک باؤنتی تھے۔ فٹ پاتھ پر ہندو کش کی بلند یوں سے آتے ہوئے چر دیا ہے وحشی جانوروں کی کھالیں فروخت کر رہے تھے۔ بھوری، چنگیری کھالوں کے درمیان خاموش بیٹھے یہ افغان راہ گیروں پر اپنی تنگدلیوں کی ایک وحشی جانور کی طرح ہی جاتے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گلے میں طشتیاں لٹکائے پھر رہے تھے جن میں امریکی سگریٹ، روسی ماسیس اور ایرانی چیرنگم کے پکیٹ سجے تھے۔ وہ باؤز بلند ان اشیاء کے برانڈ پکار پکار کر لوگوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ بنسین اینڈ میجر گٹ ان کی زبان میں صرف ”بانسن“ تھے، ۵۵۵ کو ”بچ بچ“ اور کیمیل کو ”کال“ کا نام دیا گیا تھا۔ ایک دکان کے تھڑے پر ایک عمر رسیدہ افغان لکڑی کے مرتبان میں جھنگ گھوٹنے کے انداز میں ایک مگرہ قسم کی شے گھما رہا تھا اور اس کا بیٹا سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا راہ گیروں کو آستینوں سے کھینچ کھینچ کر اپنے باپ کی بنائی ہوئی آٹس کریم کی خوبیوں سے مطلع کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ میرا دامن بھی

تھام لیتا میں خود ہی دکان کے اندر چلا گیا۔

آٹس کریم آؤ گئی مگر اتنے آٹس آٹس ”کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کریم نام کی کوئی شے اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔“

میں اس برقی خوراک کو ابھی دانتوں تلے کرکڑا رہا تھا کہ اپنے صوفی صاحب وارد ہو گئے۔ انہوں نے بھی آٹس کریم منگالی جس کی قیمت ظاہر ہے حکومت افغانستان کی خفیہ فائلوں میں ”پوشیدہ اخراجات“ کے زمرے میں ڈالی گئی ہوگی مگر صوفی صاحب ابھی پہلا چھپرہ کر اپنے جھارٹیں سے منہ تلاش کر رہے تھے کہ میں دکان سے باہر آ گیا۔ پہلو میں ایک پساری کی دکان تھی۔ میں شتر بے ہمار کی طرح اس کے اندر جا گھسا۔ وہاں سے الائچیاں خرید رہا تھا کہ صوفی صاحب نے قدم ریچھ فرمایا اور درک کی ایک گانٹھ کا آرڈر دے دیا میں نہایت اطمینان سے الائچیاں چباتا باہر نکلا اور فٹ پاتھ اور مرٹک کے درمیان الیتادہ ریلنگ پر براجمان ہو کر سگریٹ سلگا لیا۔ صوفی صاحب بھی کچھ فاصلے پر آسمان کی جانب منہ اٹھا کر بظاہر لالعلقی سے کھڑے ہو کر جامیاں لینے لگے نصف شب قریب تھی اور اگر میں یوں قندھارہ میں نہ آٹھکتا تو وہ اس وقت اپنی رضائی میں دیکھے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں خاصی دیر ادھر ادھر بے مقصد ٹھٹھا رہا اور انہیں اپنے ہمراہ بامقصد ٹھٹھا تارہا کبھی راہ چلتے لوگوں کو خواہ مخواہ ٹھٹھا کر۔ ابدالی کا مزار کدھر ہے، چہل زینے کو نسا راستہ جاتا ہے — قسم کے سوالات پوچھتا اور ادھر صوفی صاحب ان بے گناہ حضرات کے بارے میں بھی اپنی پاٹ بک پر نوٹس تیار کرتے جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں ان میں سے ایک آدھ شخص کی ضرورت شامت آتی ہوگی کہ فلاں دن اتنے بجے، بمقام مرکزی چوک قندھارہ ایک غیر ملکی جاسوس نے تم تک رسائی حاصل کر کے کون سے سرکاری رازوں کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

مجھے بے طور واپس جانا تھا، چنانچہ میں نے مزید ایک شخص کا مستقبل تاریک کر کے

اُس سے ہوٹل کا راستہ دریافت کیا اور اُس جانب پیدل چلنے لگا۔ راستے میں ایک سنبھا گھر بڑا تھا، میں پھر نچلا نہ بیٹھ سکا، صوفی صاحب بھی کیا یاد کریں گے آج ان کو ظم بھی دکھا دی جائے۔

بلنگ آفس میں آؤ گھستے افغان نے مجھے بتایا کہ ظم تو کب کی شروع ہو چکی ہیں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں، تم دو ٹکٹ کاٹ دو، ایک میرے لئے اور دوسرا ایک دوست کے لئے جو ابھی آکر تم سے ٹکٹ طلب کرے گا۔ میں نے ٹکٹوں کی رقم ادا کی اور سنبھا مال میں داخل ہو کر کہیں بیٹھنے کی بجائے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بخوڑی دیر بعد حسب توقع صوفی صاحب ہانپتے ہوئے اندر آئے اور مال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سر جھکائے، کسی لاغر مینڈک کی طرح پھدکتے، چندھیائی ہوئی آنکھوں سے گوہر مقصود تلاش کرنے لگے۔ اس دوران وہاں بیٹھے ہوئے تماشا تیروں نے انہیں بے تحاشا ہوٹ کیا کیونکہ وہ ان کے اندر میٹو سنگھ کے درمیان بُری طرح حامل ہو رہے تھے، مگر وہ بدستور کھڑے ہو کر زلف کی مانند گردن آگے بڑھائے تظاروں کے درمیان چلتے رہے۔ ایک آدھ جگہ کوئی خفیف سا جھگڑا بھی ہوا۔ مجھے مال میں نہ پا کر وہ قابلِ فہم طور پر بے حد مضطرب ہوئے۔ عالم وحشت میں دائرہ کھلائی بلکہ لُچی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے صدر دروازے پر تعینات ہو گئے یعنی خوکھی تو ادھر آئے گا۔ اب وہ باقاعدگی سے سانسوں کی بجائے جاہیاں لے رہے تھے۔ میں نے انہیں مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا، سو چاغریب کے بال بچے انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے جھمی کرادی جائے۔ چنانچہ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مال سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر صوفی صاحب کے چہرے پر رون آگئی۔ مجھے راستہ دینے کے لئے پیچھے ہٹ رہے تھے کہ میں نے نہایت عاجزی سے پوچھا ”ہوٹل پامیر کو کونسا راستہ جاتا ہے... صوفی صاحب!“

صوفی صاحب اس طرح شناخت ہو جانے پر خاصے برہم نظر آئے مگر ایک منجھے ہوئے جاسوس کی مانند بولے نہیں، چپکے سے آنکلیں جھکاتے ادراک کی گانٹھ کترتے تھے۔

سنبھا کے باہر ایک کشادہ مگر سفسان شاہراہ پھولوں کی بے ترتیب کیا دیوں اور مختلف قسم کی جھاڑیوں سے آٹی میری منتظر تھی۔ اختتام پر ایک مدھم سا بلبل ہوٹل پارک کے صدر دروازے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، نظر غایتِ جون کی تھیں مجھ پر تھی۔ خطرے کا پُرشور اضطراب نصف شب کی لالچنی مسافت کے بعد اب اپنی سوہاؤنی کیفیت کھو چکا تھا۔ میں تھکے قدموں سے جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب بھی مڑ کر دیکھتا تو صوفی صاحب کے پاؤں کی برکیں گویا میری گردن میں نصب تھیں، فوراً ساکت ہو جاتے۔ راستے میں ایک بو جھل احساس نے کونسلٹیٹ میں پی ہوتی چائے کی متعدد پیالیوں کا حوالہ دیا جواب دہاداری کے شدید حقوق کا تقاضا کر رہی تھیں۔ چنانچہ ایک نسبتاً گھنی جھاڑی کی ادٹ میں کھڑے ہو کر میں ان انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اسی لمحہ صوفی صاحب پر نشانِ حال، کبیل دریدہ، دونوں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو تاخت و تاراج کرتے میرے سر پر آن وارد ہوئے۔ پیغامِ رسانی کی بجائے آبِ رسانی کی غیر متوقع حالت میں پا کر قدرے شرمندہ ہوئے اور نعتِ مٹانے کی خاطر ایک طرف ہو کر اُسی فعل میں شریک ہو گئے۔

ہوٹل کے صدر دروازے پر پہنچ کر میں نے آخری مرتبہ پیچھے نگاہ ڈالی صوفی صاحب جھاڑیوں کے نواح میں ڈالواں ڈول ہو رہے تھے۔ ایک ہوائی سلام اُن کی خدمت میں پھینک کر میں اطمینان سے دوسری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بستر پر دراز ہوا تو قندھار کے قدیم شہر میں ایک پُرخاطر مگر گدگدی کرنے والے تجربے کے بعد ہوٹل پامیر کا آسیب زدہ کمرہ بھی ایک بے مثل گوشہٴ عافیت لگ رہا تھا۔

ابھی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ صرف دو روز ہی تو ہوئے تھے اور طلوع و غروب کی صرف چار ساعتوں میں کیا کچھ نہ ہوا تھا... عمر کے تمام ہونے کا صبح شام ہونے کا عمل تو ہر جگہ یکساں طور پر جاری رہتا ہے مگر ایک بھر پور زندگی کی علامت ان گزرتی صبحوں شامل میں ہونے والے تجربوں سے ہی وجود میں آتی ہے۔ وطن میں بھی حیات کے

پلوں تلے وقت کا پانی اسی رفتار سے بہتا چلا جاتا ہے مگر اس کا تفصیلی حساب کبھی یاد نہ رہا۔ فلاں تاریخ کو میں کہاں تھا؟ فلاں روز کیا ہوا؟ اُس ہفتے کس سے ملاقات ہوئی تھی؟ فلاں مہینے...؟ دنوں اور مہینوں کا تو ذکر ہی کیا، اکثر اوقات تو پورے برس کا سرائے کہیں نہیں ملتا۔ شک ہونے لگتا ہے کہ زندگی کا یہ سال بٹیا بھی یا صرف دامہر ہے کہ شاید گزرا... مگر جب سفر کا سمندر رواں ہو تو دن اور مہینے کیا ایک ایک لمحے کا حساب ملتا ہے، یاد رہتا ہے۔ مثلاً اچھلے دور وز محلوں کی جزوی تفصیل کے ساتھ ذہن پر ثبت ہو چکے تھے، امنٹ، ہمیشہ کے لئے کل شب کابل میں ایک سر بھرے آوارہ گرد کا کمرہ جس میں صرف اُس کا جسم تھا، سانس نہیں تھے۔ آج دوپہر ایک عظیم، کوہستانی بلندی پر لمحہ کن فیکون اور ابھی ابھی آپریشن افغانستان کا ہیجان خیر تجربہ۔ سانس کی ڈوری چاہے اب تک طول کھینچ لے، کیا مجال حوران دنوں کا ایک ایک پل میرے سامنے جرابدہ نہ ہو یعنی زندگی وہ کہ گزرے تو اس کا حساب بھی یاد رہے نہ کہ اُس پرواہوں کا گمان ہو۔

نیند کی دادی میں اُترتے اُترتے مائل خواب ذہن میں جو بے نام شکلیں اور رنگین دائرے بکھرتے سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ میں ابھی اُن کے گنجشک جنگل میں تیر رہا تھا کہ دُور سے ایک مدھم دھم کی آواز آتی۔ آہستہ آہستہ بیدار دھم دھم دھم دھم کی دنیا سے ناظرہ توڑ کر حقیقت میں بدلی تو میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ بُری طرح لٹک رہا تھا۔

”صوفی صاحب! میری چھٹی یا ساتویں جس نے دُہائی مچادی۔

سلیپنگ بیگ کی آغوش سے نکل کر میں ایک ہی جست میں دروازے تک جا پہنچا

”کون ہے؟“

”دروازہ کھولتے۔“ گھٹی گھٹی نیند آلود آواز آتی۔

”نہیں کھولوں گا۔“ میں نے گُنڈی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”نہیں کھولیں گے تو فون کیسے سنیں گے؟ کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

آواز تو قندھاری مچی کی تھی مگر رات کے اس پہر یہ کون کرم فرما ہیں جو شہر قندھار میں مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں... لا... لا... لا... یقیناً پاکستانی کونسلٹ، میری خیریت نیک مطلوب چاہتا ہے۔

”اُن صاحب سے کہہ دیجئے کہ شکریہ، میں بفضلِ خدا خیریت سے پہنچ گیا ہوں اور۔“

”یہ تو میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں مگر وہ بھند ہیں کہ...“

میں نے دروازہ کھول ہی دیا۔ قندھاری مچی نے نیند سے بندھتی آنکھوں کو قدرے تھرا لود بنایا اور راہداری میں چلنے لگا۔ اس کے ازار بند کا پھندا ٹانگوں کے درمیان میں سے لٹک کر فرش پر گھسٹا چلا جا رہا تھا۔ اپنے آگے آگے سرسراتے پھندے پر یک دم پاؤں رکھ دینے کے خیال کو میں نے بڑی مشکل سے دبایا۔

”گفتگو کے خاتمے پر لمپ گُل کر دینا۔“ وہ دائرہ کھلاتا اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

”ہیلو“ میں نے چونکا اٹھایا۔ ”صاحب میں تو بالکل خیریت...“

”کیا میں مسٹر مستنصر حسین تراسے مخاطب ہوں؟ ادھر سے امریکی لہجے کی لگتی ہوئی انگریزی میں کسی نے ملائمت سے پوچھا۔

”ترار نہیں... تار... بہر حال بول رہا ہوں۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی، مگر کیا آپ اس وقت پولیس سٹیشن تشریف لا سکتے ہیں؟“

”پولیس...“ سٹیشن کو میں دہشت کی تھوک سمیت نکل گیا۔

”صرف روٹیں۔ آپ سے چند سوالات پوچھے جاتیں گے۔ چونکہ آپ قندھاریں انہی ہیں اس لئے میں اپنے آدمی ہوٹل بھیج دیتا ہوں وہ...“

”جناب میرے سفری کاغذات بالکل مکمل ہیں۔ ویزا، پاسپورٹ، ہیلیتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ اور میں تو جناب کل صبح ہی یہاں سے جا رہا ہوں، سویرے سویرے۔“

”جی آپ درست فرما رہے ہیں آپ کی نیت پر شک نہیں کر رہا مگر چند معاملات

کے باعث یقیناً ٹھکے ہوئے ہوں گے، ہم آپ کے آرام میں مغل ہونا نہیں چاہتے ہیں اپنا پاسپورٹ نمبر اور ویزے کی تاریخ وغیرہ لکھوا دیجئے۔۔۔“  
میں نے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

”بہت بہت شکریہ مستنصر صاحب... آپ کا نام مجھے بے حد پسند آیا۔ ویسے شتی افغانستان میں تو بے شک مستنصر ہی رہے گا مگر شیعہ ایران میں صرف حسین کہلائیے گا۔ ایرانی نژد عباس کو پسند نہیں کرتے... میرے ایک دادا جان کا نام بھی... بہر حال پھر کبھی سہی... لیکن آپ کل صبح قندھار ضرور چھوڑ دیجئے ورنہ... گہری نیند سوئیے اور سہانے خواب... خدا حافظ۔“

خاک سہانے خواب، میں بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آگیا میرے رگ دپے میں ایک عجیب سا احساس کلبلیا، میں قندھار میں سے کبھی نہ نکل پاؤں گا قندھار میں میں ایک مشتبہ شخص تھا۔ یقیناً اس صوفی کے بچے کی کارستانی تھی جس نے صرف کارروائی ڈالنے کی خاطر نہ جانے میرے بارے میں کیسی خوفناک رپورٹ اپنے افسروں کو دی تھی۔

بستر میں پاؤں پھیلانے سے پیشتر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا، ہر ستواری کا راج تھا۔ صرف صدر دروازے کا بلب ابھی ٹنک ٹنک رہا تھا... اوہ مجھے یاد آیا میں ڈیسک پر رکھے لمپ کو گل کرنا بھول گیا تھا، مگر اب مجھ میں اتنی جرأت باقی نہ تھی کہ صرف ایک بٹن دبانے کی خاطر دوبارہ اُن سحرزدہ برآمدوں کو طے کرتا۔ سیلینگ بیگ میں لیٹ تو گیا مگر نیند کہاں سے آتی، آنکھوں کے سامنے مفرد مجرموں اور خطرناک قاتلوں کو زندہ یا مردہ پیش کرنے والے وہ پوسٹر گھومتے رہے جن پر جلی حروف میں WANTED لکھا ہوتا ہے اور تصویر کے نیچے انعام کی رقم کے بڑے بڑے ہندسے نمایاں نظر آتے ہیں... ایسے پوسٹر پر وہ میری کس قسم کی تصویر شائع کریں گے؟ وہ چھاپ دیں ناں سو منگ کا سٹیوم پننے جمیل جنید کے نیلے پانیوں کے کنارے... وہ شاید اس قسم کے پوسٹر کے لئے مناسب نہ ہو... البتہ وہ کالی جیکٹ اور سیاہ چشتے

ایسے ہیں جو آپ کی روانگی سے پیشتر ہی طے پائیں تو مناسب ہے۔ آپ اسی وقت...“  
”اس وقت؟ بے حد تھکا ہوا ہوں۔ پچھلے دو روز سے مسلسل سفر میں ہوں انشاء اللہ بشرط زندگی صبح سات بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا... اب اجازت دیجئے۔“  
مگر اجازت نہ ملی۔ شاید وہ بھی جانتے تھے کہ سید خاں کی بس صبح چھ بجے ہی قندھار سے روانہ ہو جاتے گی۔

”میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں مگر کیا کیا جاتے مجبوری ہے میں جیتے بچے رہا ہوں۔“  
فون میں سے برآمد ہونے والی آواز انتہائی شستہ اور دھیمی تھی مگر اس کے پس منظر میں دھمکی کا غصہ بھی خاصا واضح تھا... اب یا کبھی نہیں والا معاملہ تھا۔ اگر چیکے سے پولیس سٹیشن چلا جاتا ہوں اور وہاں مجھ اُن پڑپڑی نہ دوسری بلکہ تیسری ڈگری کا برتاؤ شروع ہو جاتا ہے تو... نہیں جاتا تو ظاہر ہے لینے آجائیں گے۔ بالآخر میں نے پگھلتے ہوئے اعصاب میں سے مشکل توڑتے گویائی کشید کی اور جھٹس ہوتے ہوئے ٹھٹے سے بولا۔ ”نہیں آؤں گا۔“

”پھر یہ معاملہ آپ اور سپاہی طے کریں گے جنہیں آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔“  
”اس معاملے میں ایک فریق پاکستانی کو نسلیٹ بھی ہے جسے میں فوری طور پر اطلاع دینے کا حق رکھتا ہوں۔ میں پاکستانی ہوں، جائز طریقے سے، جائز کاغذات پر سفر کر رہا ہوں۔ آپ کو مجھے یوں ہراساں کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں... نہیں آؤں گا پولیس سٹیشن۔“ میں اُس کمزور جانور کی طرح غصے سے پھٹ پڑا جو پیچھا کرتے ہوئے دندنے کی وحشی طاقت کو جانتے ہوئے بھی مجبوراً ختم ٹھونک کر میدان میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ادھر فارسی میں کچھ کھسکھسپس ہوئی اور پھر وہی شائستہ امریکن لہجہ گویا ہوا۔ ”پاکستانی کو نسلیٹ کو اس معاملے میں الجھانے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ پولیس سٹیشن کے آرام دہ اور صاف ستھرے ماحول میں بیٹھ کر باہمی دلچسپی کے چند امور پر تبادلہ خیالات کر لیا جاتا۔ بہر حال آپ مسلسل سفر

والی بہتر رہے گی جس میں امریکی گینگسٹر آل کا پون کا بھاتی بند لگ رہا ہوں... یا پھر وہ تصویر بھی تو موزوں رہے گی، اس ٹیلی ویژن ڈرامے کی جس میں مجھے قید خانے کے اندر پابند سلاسل قتل کیا جا رہا ہے۔ قتل؛ لاحول ولا... یہ میں کیا سوچ رہا ہوں بھئی بیسویں صدی کا قندھار ہے، کوئی عہد قدیم تو نہیں کہ بے گناہ مسافر کو پکڑا اور سُولی پر چھلادیا۔ اُس وقت مجھے وہ پاکستانی صاحب یاد آگئے جو افغان سرحد کے قریب ڈرا کی ذرا ٹھٹھتے ہوئے دو قدم اندر آگئے اور دھرتے گئے۔ اسی جرم میں، اسی قندھار کے جیل میں ایک طویل عرصہ مہمان رہے۔ دن بھر مشقت لی جاتی اور شام کو انہیں بقیہ قیدیوں کے ہمراہ کشکول تھما کر شہر بھیج دیا جاتا تا کہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مانگ لائیں اب یہ بھیک کیسے مانگی جاتی ہے، یقیناً فارسی میں ہی مانگتے ہوں گے اور میری فارسی تو... لیکن میرا خیال ہے کہ صرف ”بخیرے ندی مومناں“ کہنے سے ہی گزارہ ہو جائے گا۔ ”مجھے بہت بھوک لگی ہے“ کو فارسی میں نہ جانے کیا کہتے ہیں، خیر وہی بخیر بخیر... اس مرتبہ جو دستک ہوئی تو میں لاشعوری طور پر صوفہ پھلانگ کر کھڑکی کے قریب جا پہنچا۔ پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ صدر دروازے کے بلب تلے دو افغان سپاہی کھڑے تھے... یہ تو لے جانیں گے۔ اُدھر دروازے پر کسی رکتے ہوئے دل کی طرح دقتوں سے مگر ایک تو اتر کے ساتھ دھک... دھک... دستک ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہارے ہوئے جواری کے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

ایک طویل قامت و بلا سا نوجوان ہاتھ میں ایک فائل تھامے کھڑا تھا نقوش جیسے کیکر کا چھلا ہوا تنا، تیکھے اور شفاف، تانے کے پتلے فریم کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں بے حد روشن اور ذہانت سے بھرپور تھیں۔

”میں بے حد شرمندہ ہوں۔“ اُس نے ایک ایسے مہمان کی طرح معذرت میں ڈوب کر کہا جو دعوت کے خاتمے پر پہنچا ہو۔ ٹیلی فون کی لائن میں خرابی کے باعث آپ کی گفتگو کے کچھ حصے مجھ تک نہ پہنچ پاتے۔ صدا فسوس!... تشریف رکھیے“ وہ مجھے دعوت

دے کر جھجکتا ہوا صوفے پر بیٹھا، فائل کھولی اور ایک فارم نکال کر پُر کرنے لگا۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ صدر دروازے پر سپاہی تعینات تھے اور کمرے میں یہ فرشتہ اجل جو شکل سے محکمہ جاسوسی کے افسر کی بجائے ایک پڑھا کو طالب علم لگ رہا تھا۔

”اوہ! میں نے اپنا تعارف تو کر دیا ہی نہیں... مجھے ”جیم“ کہتے ہیں۔“ وہ گردن جھٹک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ ”آپ نے کونسلٹ سے رابطہ قائم کیا؟“

”جی نہیں۔“

”بہت خوب۔“

مجھے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا میں اب سراسر ان کے رحم و کرم پر تھا۔ یعنی اگر مجھے یہاں سے کسی انجانے جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے قندھار کے کسی کچے تہ خانے میں نظر بند کر دیا جاتا ہے تو کونسلٹ والوں کو خبر تک نہ ہوگی۔

”آپ کو جو کچھ دریافت کرنا ہے ازراہ کرم پوچھ لیجئے میں صبح ہرات روانہ ہو رہا ہوں۔“ ”صبح؟“ اُس نے ایک بے یقین مسکراہٹ لبوں پر پھیلانی۔ ”وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔“

میری آنکھوں میں کچھ کلبللاہٹ سی ہوئی۔

”صرف چند سوالات ہیں، خالص روٹین۔ آپ ان کے جوابات دے دیجئے... قندھار آپ کس مقصد کے لئے آتے ہیں؟“

”میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ اگر میں سید خاں بس مردوس کی بجائے کسی اور مسافر بس میں سوار ہوتا تو اس وقت میں آنکھیں جھپکنے کی بجائے ہرات میں سو رہا ہوتا۔ یہاں میری موجودگی کا باعث صرف سید خاں اور اُس کی بس کا پنچر شدہ ٹائر ہے ورنہ مجھے قندھار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔“

”آپ ہم قندھاریوں کا دل دکھا رہے ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح ہنس دیا۔



اُس کی منہسی مجھے نہ رہ لگی، یعنی میرا باقاعدہ مسلح قسم کا محاصرہ کیا جا رہا ہے اور ان کا دل دکھ گیا ہے، صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔

”یہاں کتنی دیر قیام کا ارادہ ہے؟“

”چار گھنٹے اور تقریباً دس منٹ...“

”آج شام قندھار میں کس کس جگہ پر گئے؟“

”برابر کے نور سے کھانا کھا کر پاکستان کو نسلیٹ میں چائے پینے کے لئے گیا تھا۔“

”اُس کے بعد؟“

”اُس کے بعد... آپ کو صوفی صاحب نے نہیں بتایا؟“

اُس کا قلم لحظہ بھر کے لئے اٹکا اور پھر رواں ہو گیا۔

”کیا آپ قندھار میں کسی صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہیں؟ اگر جانتے ہیں تو اُن

صاحب یا اصحاب کے نام اور مکمل پتے...“ وہ نہایت روانی سے انگریزی بول رہا

تھا۔ سرکاری نوعیت کی گفتگو بھی اُس کے اندر کے تہذیب یافتہ اور پڑھے لکھے انسان

کو دبا نہیں پاتی تھی۔

”انگریزی زبان پر آپ کو خاصا عبور حاصل ہے۔“ میں نے سوال کا جواب دینے

کی بجائے گفتگو کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

”اوہ شکریہ۔“ اُس نے قائل پر سے نظریں اٹھا کر انگلی سے عینک کی کمائی کو ٹھکا

دیا۔ ”میں نے ماسٹر کی ڈگری امریکہ کی مٹھی گن یونیورسٹی سے حاصل کی ہے... صرف

دو ماہ پیشتر وطن واپس آیا ہوں۔“

”کمال ہے۔“ میں نے ایک کاتیاں جاسوس کی طرح اُس کی توجہ بہکانے کی خاطر

کہا۔ ”کون سے مضمون ہیں؟“

”نفسیات میں آنرز کے ساتھ۔“

”ایک نفسیات دان پولیس کے محکمے میں کیا کر رہا ہے؟“

وہ سرکے پیچھے ڈال کر معصومیت سے منہس دیا۔ ”اُن کا خیال ہے کہ جاسوسوں کو پکڑنے

کے لئے نفسیات دان مناسب رہتے ہیں کیونکہ جاسوس... میرا مطلب ہے... خیر تو

میں پوچھ رہا تھا کہ قندھار میں کن لوگوں کے ساتھ آپ کی آشنائی ہے؟“

”ایک تو صوفی صاحب ہیں...“

وہ اس انتظار میں تھا کہ میں مزید کچھ کہوں مگر میں جان بوجھ کر خاموش رہا۔

”کون سے صوفی صاحب؟“ بالاخر اُس نے لالچلی سے کہا۔

”جیم صاحب، کیوں نہ ہم دونوں اپنے اپنے کارڈز میز پر رکھ دیں... بسم اللہ میں

کرتا ہوں۔ میں نے آج شب صرف اس مقصد کے لئے پاکستان کو نسلیٹ کو فون کیا تھا

کہ مجھے شب ب سری کے لئے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ آپ کے محکمے نے وہ فون سنا پھر

میں قونصل جنرل کی دعوت پر اُن کے ہاں چائے کے لئے گیا جو کوئی جرم نہیں۔ پاکستانی

ہونے کی حیثیت سے میں اپنے کو نسلیٹ میں جب جی چاہے، چائے پینے یا اُن کے برآمدے

میں رکھی ٹیبل پر پنگ پانگ کھیلنے کے لئے جاسکتا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر آپ کے

تین پیشہ ور جاسوسوں یعنی موٹچوں والے، نسوار خاں اور صوفی صاحب میں سے موٹر لڈ

نے میرا پیچھا کیا۔ ایک آئس کریم کی دکان، پنساری کی دکان، ایک سنیا ہال اور چنچھارویں

کے بعد انہوں نے مجھے یہاں تک چھوڑنے کی تکلیف گوارا کی۔ صوفی صاحب نے واپسی پر

آپ کو رپورٹ دی اور یہ اُسی رپورٹ کی کارستانی ہے کہ آپ اس وقت یہاں موجود

ہیں... مزید کوئی سوال؟“

جیم آخر نفسیات کا ماہر تھا۔ چہرے کے تاثرات منہجہ کتنے میری تقریروں سننا رہا

جیسے میں اُسے ایلیس ان ونڈر لینڈ کی کہانی سنا رہا ہوں۔

”آپ کو غلط فہمی ہوتی ہے، ہم قندھار میں داخل ہونے والے ہر غیر ملکی سے روٹین

قسم کے بے فہم سوال پوچھا ہی کرتے ہیں۔“

”میں اس سے پیشتر دو مرتبہ قندھار سے گزرا ہوں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا...“

سگرٹ پیچھے گا؟

”شکریہ، میں ڈیوٹی پر نہیں پتیا۔“

”مجھے اجازت ہے؟“

”پلیز“ اُس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا میں اُٹھ کر میز تک گیا اور بنسین کا پیکٹ کھول کر سگرٹ سلگا لیا۔ وہ اس دوران خاموش بیٹھا رہا۔ میں واپس صوفے پر آکر بیٹھا تو اُس نے ناک کی پھینک کو ناخن سے کریدتے ہوئے آہستہ سے پوچھا: ”آپ کا پیشہ کیا ہے؟“

”ویگا بانڈ بانی پرفیشن۔“

”کیا بانڈ؟“ جیم قدرے چونکا۔ شاید وہ ویگا بانڈ کو جیمز بانڈ کا کوئی قریبی کزن سمجھا چنانچہ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔

”پرفیشنل آوارہ گرد۔“

”اور اس پرفیشنل آوارہ گردی کے درمیان میں پڑتے ہوئے وقفوں میں آپ کیا کرتے ہیں؟“

یہ سوال اہم ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی تھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ چھوٹا موٹا دکاندار ہوں، بیج وغیرہ بیچتا ہوں تو جیم نے میرے مستقبل کے بارے میں جو خوفناک منصوبے بنا رکھے ہیں، یہ پیشینہ اُن پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور اگر قلم کے ذریعے لڑائی کمانے کا اقرار کرتا ہوں تو شاید صرف اس خوف کے زیر اثر کہ میں وطن واپسی پر ان واقعات کی تفصیل اخباروں میں نہ لکھ دوں، وہ مجھے ہمیشہ کے لئے غائب کر دینے کے بارے میں مزید سنجیدہ ہو سکتا ہے، یا شاید نہ بھی ہو۔

”ادیب ہوں۔ کتابیں وغیرہ لکھتا ہوں۔“

”آپ ایک ادیب ہیں؟“ اُس نے فائل اتنے زور سے بند کی کہ میں اُچھل پڑا۔

غلطی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ میں نہ کہیں قسمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ دیوانگی سفر کی قیمت ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ بخیر می رودی مومن... میں قندھار کی قدیم نگینوں

میں جھولی پھیلاتے پھیک مانگتا ہوا، یا کوہ ہندو کش میں پوشیدہ کسی ایسے غار میں مقید جہاں افغانستان میں عرقیہ بھگتنے والے مجرموں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ بدن پر چبھتے گھٹنوں پر سرسراتی داڑھی۔ میرے تلووں میں پسینہ یوں ٹھونکا کہ میں چاہتا تو بے شک اُس پر تیر سکتا تھا۔ جیم صوفے پر سے اُٹھا، یقیناً کھڑکی میں سے اُن سپاہیوں کو اشارہ کرنے کے لئے جو اسی مقصد سے وہاں تعینات تھے... مگر اُس کی آنکھوں میں تو ایک فلاح کی چمک کی بجائے ایک ٹین اینج مداح کی سی معصوم حیرت تھی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اُس نے عینک اُتار دی اور چند ہیاتی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ ”کیا آپ واقعی مشہور ادیب ہیں؟“

”مشہور؟ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اب میں حیرت زدہ تھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ ”ہاں مشہور، بہت ہی مشہور، اتنا مشہور کہ بس یوں

سمجھ لیجئے کہ اگر خدا خواستہ میں اپنے سفر کے دوران ادھر ادھر ہو جاتا ہوں تو پورے پاکستان میں تھلکہ مچ جاتے۔ اخبار والے ادارے لکھیں گے، ریڈیو اور ٹی وی چینل گاہم گاہم ٹیلی ویژن کی باقاعدہ نشریات روک کر بار بار میری گم شدگی کا اعلان کیا جائے گا۔ ہم عصر ادیبوں کے علاوہ بقیہ ادیب پُر زور احتجاج کریں گے اور ورنات خارجہ... بالامیری تم شدگی کو ٹاپ پر اتر بیٹھی دے گی... مثلاً... مثلاً اگر میکسم گورکی اپنے امریکہ کے سفر کے دوران گم ہو جاتا تو آپ کا کیا خیال ہے کہ روسی حکومت...“

”گو کیا آپ پاکستان کے گورکی ہیں؟“ اُس کی تھر تھرا ہٹ میں لبریز آواز میں عقیدت بدستور قائم تھی۔

”بس انیس میں کافر قہی سمجھیں۔“ میں ایک ایسی ہنسی ہنسا جو اپنے کھوکھلے پن کی وجہ سے کسی بھی باہوش انسان کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ میں بیہودہ ڈینگیں مار رہا ہوں، مگر جیم... وہ تو مکمل طور پر میرے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا، اُس کا منہ کھل گیا اور پھر ایک مجرم کی طرح سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”میں بھی ادیب ہوں۔“

”کیا؟“ اب میرا منہ کھل گیا۔

”ادیب ہوں“ اُس نے شرم کر کہا۔

”واللہ جیم صاحب! میں نے ایک مرتبہ تھکی اُس کی پیٹھ پر رسید کی، گرم لوسے پر ایک ضرب کی طرح۔“ مجھے ایک ادیب بھائی سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ جناب آپ کبھی لاہور تشریف لائیں، ہم آپ کے ساتھ شامیں منائیں گے، آپ کی مدح سرائی میں ٹھیکے پر کالم لکھواتیں گے کہ ان دنوں بہت فیشن ہے اور جیم صاحب یہ بندہ حقیر بقلم خود آپ کی نگارشات کو اردو اور پنجابی میں منتقل کرے گا اور پھر... اور پھر کم از کم پاکستان میں آپ افغانستان کے سب سے بڑے ادیب کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔“

شاید یہ متوقع شہرت کی اور ڈوڑ کا نتیجہ تھا کہ جیم ایک عرصہ تک بت بنا بیٹھا ہوا اور پھر جھٹک کر بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”یقین مانتے کہ میں موجودہ حالات میں تو اس بارے میں بے حد سنجیدہ ہوں... ویسے آپ کس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں؟“

”افسانے لکھتا ہوں۔“ اُس نے جھجک کر اقرار کیا۔

”طبیعیاتی یا بالعد طبیعیاتی؟“

”پتہ نہیں وہ کیسے ہوتے ہیں۔“ وہ یکایک مجھ سے لاتعلقی ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”بہر حال میرے افسانے اُن بزرگ ادیبوں ایسے نہیں ہوتے جو لوگوں کو ادب کی انیون کھلا کر سُلا دیتے ہیں۔ آپ نے تو افغانستان میں صرف بڑی شاہراہوں پر ہی سفر کیا ہے مگر اُس کے گرد پھیلے پاٹوں اور اُن سے پرے دُور افتادہ وادیوں اور صحراؤں میں سسکتے وہ قصبے نہیں دیکھے جو اصل افغانستان ہے۔ غربت ایسی کہ آپ دیکھ کر بھی یقین نہ کر سکیں۔ انسانی سطح سے نیچے نہیں، وہ تو حیوانی سطح سے بھی کہیں پست مقام پر کچلے ہوئے پڑے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کس صدی میں سانس لے رہے ہیں! انہیں یہ نہیں معلوم کہ دن، مہینے، سال کیا ہوتے ہیں۔ وہ وقت کا تعین صرف خوراک

کے درمیان وقفوں کی طوالت یا اختصار سے کرتے ہیں... میں انہی لوگوں کے بارے میں لکھتا ہوں۔“

”یہ افسانے کہیں شائع بھی ہوتے ہیں؟“

”افغانستان میں جراند کا سلسلہ محدود ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سرے سے یہ بدعت موجود ہی نہیں۔ چنانچہ مجبوراً مجھے اپنی تخلیقات ایرانی رسالوں میں چھپوانی پڑتی ہیں۔“

”ایران میں تبدیلی کی خواہش رکھنے والی کہانیاں کیسے چھپ جاتی ہیں؟“

”وہ انہیں صرف اپنی امارت کے چاؤ میں، دولت کے گھنڈ میں چھاپ دیتے ہیں! تقابلی جائزے کے طور پر۔“

جیم جو کچھ دیر پہلے جسمانی اذیت اور پردیس میں موت کی علامت بن کر میرے کمرے میں داخل ہوا تھا، اب ایک مختلف انسان تھا۔ وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے فرد کی مانند گفتگو کر رہا تھا جو معاشرے میں زبردست تبدیلی کی خواہش کے باوجود اسی معاشرے میں ایک ناپسندیدہ کردار ادا کرنے پر مجبور تھا۔ جیم کا آہنی ہاتھ صرف مشتبہ سیاحوں کو تو نہیں دلوچتا ہوگا، کسانوں اور مزدوروں کی گردنوں تک بھی تو پہنچتا ہوگا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایک ماہر نفسیات، ایک ترقی پسند ادیب ہونے کے باوجود آپ نے اس... اس کھر دے کام کو کیوں ترجیح دی؟“

”ترجیح میں نے نہیں دی، حکومت نے دی ہے۔ ہمارے ہاں قانون ہے کہ ہر شخص کو تعلیم کے اہتمام پر ایک برس کے لئے لازمی طور پر عسکری تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مجھے انہوں نے فوج کی بجائے ادھر بھیج دیا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں...“ اُس نے ہنس کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علم نفسیات کو بروئے کار لا کر کوئی چھوٹا موٹا جاسوس دلوچ لیتا تو خیر آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا... مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں کامیاب بھی رہتے ہوں گے۔“

”اکثر، مگر آج کی شام نہیں۔“ وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”اب میں آپ کی سگرٹ والی دعوت قبول کرتا ہوں۔“

سگرٹ سٹکا کر وہ اٹھا اور پھر اپنے رجسٹر کی دقت گردانی کرنے کے بعد میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مدتوں بعد مجھے ایک ایسا شخص ملا ہے جسے ادب سے لگاؤ ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنی ایک مختصر کہانی سناؤں؟... میں آپ کی راستے جاننا چاہتا ہوں... کیا آپ نہیں گے؟“

”مجھ ایسا پرفیکٹ سامع آپ کو کچھ بھی نصیب نہ ہوگا۔ ایک ایسا سامع جو اگر بھال جائے کی کوشش بھی کرے تو باہر کھڑے آپ کے سپاہی اُسے پکڑ کر واپس آپ کے سامنے بٹھادیں گے۔“

جیم نے فارسی سے ترجمہ کر کے جو افسانہ مجھے سنایا وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے اور اُس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک جیم کے چار چوہیرے اُس قسم کا معاشرہ جنم نہیں لے لیتا جس کی خواہش کا اظہار اُس نے اپنی کہانی میں کیا تھا۔ جو وعدے کچھ دیر قبل میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر کئے تھے، اُس کی تخلیق سننے کے بعد میں انہیں واقعی عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ میں نے جیم سے اُس کا پتہ دریافت کیا تو کہنے لگا۔ ”میں ابھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ میری اس سروس میں ابھی چند ماہ باقی ہیں، اس کے بعد ایک آزاد انسان کی حیثیت میں آپ سے خود رابطہ قائم کروں گا۔“

ہم پرانے دوستوں کی طرح دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اپنے خوابوں، اپنی آرزوؤں کی باتیں، یہاں تک کہ کھڑکی سے باہر تاریکی میں روپوش تندھار کے گلی کوچے اور اُن پر سایہ نگن کچے گنبد آہستہ آہستہ اپنا آپ ظاہر کرنے لگے جیسے انہوں نے بھی جیم کی کہانی سن لی ہو۔ تاریکی میں سے نکل آنے کی آرزو کی شدت محسوس کر لی ہو۔ باہر روشنی تھی، باہر صبح ہو رہی تھی۔

جیم نے اپنا رجسٹر اٹھایا جس میں سرکاری نوٹس کے ساتھ ساتھ اُس کے آئیڈیل بھی بندھے اور کہنے لگا۔ ”اب مجھے چلنا چاہیے، ابھی مجھے شیش پر جا کر تفصیلی رپورٹ بھی لکھنی ہے۔“

”میرے ساتھ چلنے کی ضرورت تو نہیں؟ میں نے خوش دلی سے کہا۔“

”نہیں۔“ وہ جھینپ گیا اور پھر بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔ ”آپ واقعی جان گئے تھے کہ کونسلٹ سے نکلنے ہی آپ کا بیچا کیا جا رہا ہے؟“

میں نے اُسے صوفی صاحب کے ہمراہ چل قدمی کی پوری تفصیل سنائی۔

”نہایت نالائق آدمی ہے... اُس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”پلیز صوفی صاحب کو کچھ نہ کہنے گا۔“ میں نے جیسے ایک دوست کی سفارش کی۔ ”انہوں نے نہایت شرافت اور تندہی سے میرا بیچا کیا۔“

”ایک درخواست ہے۔“ وہ میرا کندھا دبا کر متانت سے بولا۔ ”اس رات کی بات صرف ہم دونوں کے درمیان ہی محدود رہے، کم از کم اگلے چند ماہ کے لئے.... دیے صرف روٹین کی خاطر بتا دیجئے کہ اگر کسی نے پوچھا کہ آج کی شب کیسے گزری تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟“

”کہانیاں کہتے اور کہانیاں سنتے؟“ میں مسکرا دیا۔ ”چلتے ہیں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں! وہاں میری حیثیت بدل جائے گی۔ میں بیس ایک رفیق کی مانند آپ کو خدا حافظ کہوں گا، اس خواہش کے ساتھ کہ آئندہ ملاقات آج سے مختلف اور خوش بخت ماحول میں ہو۔“

اُس نے بے حد گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ددوازہ کھول کر جانے لگا۔

”جیم! میں نے کچھ سوچ کر آہستہ سے کہا۔“

اُس نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”اگر ہمارے درمیان ادب کی مشترک قدر دریافت نہ ہوتی، کیا اس صورت میں کسی گڑبڑ کا احتمال تھا؟“

”تھا۔“ اُس نے مختصراً کہا اور کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔

## کاروان سہرائے

جیم کے رخصت ہونے پر میں ایک ایسے شخص کے محسوسات سے دوچار ہوا جس کا عزیز دوست گاڑی پر سوار ہو کر جا چکا ہو اور وہ پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑا، رنجیدہ ہونے کے باوجود طمانیت سی محسوس کر رہا ہو کہ چلو بالآخر جدائی ہونے کا لمحہ تو ختم ہوا۔ مگر میری زندگی میں پلیٹ فارم پر ساکت بیکر ہمیشہ دوسرے تھے۔ میں نہ تھا کہ میں تو ہمیشہ اسی گاڑی کا مسافر رہا جو مجھے ان سے دُور لے جاتی تھی۔ کاش میں ان درجنوں ساعتوں میں سے صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار سفر کو چھوڑ کر اس چاہت کو اپنا لیتا جو پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس کے پھر پھرتے ہوئے ہاتھ مجھے اپنی جانب لٹٹے دیکھ کر جدائی کی تپش کی بجائے یکجہلی ٹہنیوں کے اندر کی ٹھنڈک سے لمس ہو جاتے، صرف ایک بار۔

میں نے کپڑے تبدیل کئے، سیلینگ بیک پلیٹ کر رُک سیک پر باندھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ پوپلا افغان راہداری کے درمیان میں دکھی ایک کُرسی پر آلتی پالتی مارے نیم خوابی میں جھول رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر افغان پولیس کی نظر خاص نے اسے بھی چوکننا کر دیا تھا اور وہ اپنے بستر کی راحت چھوڑ کر شب راہداری میں اپنے تئیں ایک مشتبه شخص کے فرار کے راستے مسدود کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کمرے کی چابی اور کرائے کی رقم دانت صاف کرنے سے پیشتر کی باسی مسکراہٹ میں لپیٹ کر اُس کے حوالے کی اور سیڑھیوں سے اتر کر

سے مگر زیر لب "جہنم میں جاؤ" کہا اور پاکٹ ٹرانسسٹر آن کر کے "دغا دغا دئی دئی" قسم کا کوئی افغان نغمہ سننے لگا۔

ہم قندھار سے باہر آتے تو دھوپ ایک عمر رسیدہ گڈریے کی طرح آہستہ آہستہ پہاڑوں سے اتر رہی تھی۔ دامن کوہ میں پھیلے میدان ابھی تمازت سے محفوظ تھے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ہم نے ایک ندی عبور کی جس کے کناروں پر انار کے درخت فور تک چلے گئے تھے۔ اناروں کے سبزے میں گہرے مسافر خانے کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ندی کے تیز پانیوں میں دو غیر ملکی جسم تیرتے دکھائی دیئے۔

سید خان نے بس آہستہ کی اور بولا "کافر کے بچے ننگے نہا رہے ہیں۔"  
"بچیاں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔  
"اچھا۔" اُس کا منہ لٹک گیا۔

دوسرے بدن جڑواں دھیل مچیلیوں کی طرح ڈبکی لگاتے اور پھر سطح آب پر نمودار ہو جاتے۔ میں ان کے لمبے بالوں کی وجہ سے دھوکہ کھا گیا تھا، لڑکی صرف ایک ہی تھی۔

"سید خان۔" میں نے پھر اطلاع کی۔ "بچہ بھی ہے۔"  
سید خان کا موڈ فی الفور درست ہو گیا اور اُس نے بس کی رفتار تیز کر دی۔  
"رات کیسے گزری؟" اُس نے گنگناتے ہوئے پوچھا۔

"کہانیاں لکھتے اور کہانیاں سنتے... اور ہاں سید خان آج تو ہم ہرات پہنچ ہی جائیں گے ناں؟"

"اللہ مالک ہے۔" حسب سابق بیزاری میں لپٹا ہوا جواب آیا۔  
دوپہر کے وقت ہم ٹرک کے کناروں پر جھانکتے دس بارہ کچے مکانوں پر مشتمل ایک قصبے میں رُکے۔ کچھ فاصلے پر پہاڑوں میں گم ہوتی ایک پگڈنڈی کے پہلو میں ایک کچی چار دیواری تھی۔ جب ہم ایک شکستہ حصے کو پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تو وحشی

کے سامنے کھڑی سید خاں کی بس میں جا بیٹھا۔  
روٹی کی کانٹھوں نے صبح کی کاشتی ہوتی سروری کو جذب کر کے بس کے اندر کر بے حد نگہا اور کوزی بنا دیا تھا۔ میں اپنی نشست میں فٹ ہو کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلکا کر دھوئیں کی بے نام حدت نکلنے لگا۔ کشادہ شاہراہ دھیرے دھیرے روشنی کی زد میں آ رہی تھی۔ صدر دروازے کا بلب بھی گل ہو گیا۔ تنوری ہوٹل کا دروازہ اندر سے کھلا اور دو پٹھان بچے جھاڑو بغل میں دلبے باہر نکلے اور نور کے سامنے پھیلے کچے راستے کو صاف کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گرد میں گم ہو گئے۔ شاہراہ پر ایک ٹرک آیا اور گزرا گیا مگر اس کے ماتھے پر نصب لاؤڈ سپیکر میں سے اُبلتے نغمے کے لفظ دیر تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ ہم تم اک کمرے میں بند ہوں... بند ہوں... کمرے میں بند۔

"جیل میں بند ہو رہا کیلی... جیم کی جگہ کوئی میم آجاتا تو اس وقت ہم ہی ہم جیل میں بند... سیلو جیل برڈ؟" میں ابرو چڑھا کر لالینی خود کلامی میں غور ہو گیا۔  
"ہاں تو جیل برڈ آج کدھر جائے گا، ہرات جائے گا؟ ناٹ لاسکیل یو اولڈ گڈ ٹائٹ ایف سید خان کین ہیلیپ اٹ... سید خان، سانچی کا پان... گدھے کا۔"  
سید خان نے شاید میری لاؤڈ تھکنگ کو سُن لیا۔ فوراً ہشاش بشاش چہرے لئے کھڑکی کے باہر نمودار ہو گیا۔

"آگے ہو؟" وہ اپنی نشست پر گر کر زور زور سے ہارن بجانے لگا۔  
"سید خان تمہارا اکوٹا مسافر تو بس میں موجود ہے اور میری معلومات کے مطابق روٹی کی کوئی کانٹھ ناشتہ کرنے کے لئے باہر بھی نہیں گئی، پھر ہارن کا ہے کو بجار ہے؟ خان بابا؟" میں نے نئے دن کا خوشگوار آغاز کرنے کی خاطر ہانک لگائی۔  
"اوئے کیا کتا ہے؟ کنڈیکٹر کو ادھر قندھار میں ہی چھوڑ جاؤ؟ منہ پچا کر نسوار کو ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوتے وہ بیزاری سے بولا۔ میں نے بھی برابر کی بیزاری

نقوش کے حامل چند افغان اُن کے ایک بڑے ڈھیر پر بیٹھے تو وہ پی رہے تھے۔ سیدخان کو دیکھتے ہی وہ اُٹھے اور معانقے وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک بڑے ترار پر اُن تولنے لگے تیز ہوا کی وجہ سے انہیں اس کام میں بے حد دشواری پیش آرہی تھی۔ پلڑے پر رکھتے ہی آدمی سے زیادہ اُن ہوا سو جاتی۔ ان میں سے دو افغان ٹنگر ٹوٹنے والے بچوں کی طرح فوراً ہاتھ اٹھا کر ہوا سے پھینکا بھیڑی شروع کرتے اور اُن کو قابو کر کے واپس پلڑے پر رکھنے کی سعی کرنے لگتے۔ وزن کے بعد اُن کو ایک بڑے گٹھے میں باندھ دیا گیا۔ سیدخان نے افغانی ٹوٹوں کا ایک بندل بطور قیمت ادا کیا اور پھر گٹھے کو قصبے میں کھڑی بسر جھت پر رکھوا لیا۔

اُن کی خریداری کے بعد بی بس پورے دو گھنٹے بلا رُکے سفر کرتی رہی اور پھر اچانک سڑک سے اُتر کر دائیں ہاتھ پر پھیلے چٹیل میدان میں چمکولے کھانے کی خواہہ ستاؤں میں کسی سانس کی لونہ تھی۔ بے آباد اور زندگی سے عاری زمین، تاحد نظر خالی زمین، کارڈیوگرام پر ڈوبتی، تیرتی برقی لہروں کی مانند گرمی کے سُکلتے جھولے پھیلے تھے، سُکڑے تھے۔ ہوا کی تنوری پیش اس امر کا پتہ دے رہی تھی کہ ہم ایران اور افغانستان میں پھیلے عظیم صحرا دشت مرگ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

”یہ ہرات کے لئے شارٹ کٹ ہے کیا؟“ ڈرتے ڈرتے سیدخان سے استفسار کیا مگر اُسے جواب دینے کے لئے اتنا مجبور نہ پایا۔ وہ جھاڑیوں اور ٹیلوں کو روندنا ہی سمت بس چلا تا رہا۔

”اللہ مالک ہے، کیوں خان صاحب؟“ میں نے جھلا کر باواز بلند کہا اور صابر و شاکر دھکے کھانے لگا۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک بلند ٹیلا نظر آیا جس کی اوٹ میں سے ہلکا شور بہتا چلا آ رہا تھا۔ بھیڑ بکریوں کے میانے اور کتوں کے بھونکنے کی بلی بلی آوازیں پھر اُونٹوں کے جُگل کی کرتے ہوتے چند جبرے دکھائی دیے۔ ایک سیاہیم

جیسے ٹیلے کے پہلو میں سے فرار ہو کر یکدم سامنے آیا اور پھر جونہی ہم دوسری جانب پہنچے اس کے دامن میں پوشیدہ خیموں کا ایک شہر آنکھوں کے آگے پھیل گیا۔ انجن کی آواز سنتے ہی خیموں میں سے مختلف جموں کے سر نمودار ہوئے اور ساتھ ہی بقیہ ماندہ دھڑ بھی باہر آ گئے۔ بس کے پیچھے پیچھے بچوں اور کتوں کا ایک جم غفیر بھاگ رہا تھا جو شور مچا رہا تھا اور بھونک رہا تھا۔ اسی ترتیب سے۔ اس عارضی قصبے کے درمیان میں پہنچ کر سیدخان نے بس کھڑی کر دی اور مجھ سے ہم کلام ہوئے بنا نیچے اُتر گیا۔

خانہ بدوشوں نے اسے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے ایک دیوان جزیرے میں پھنسے ہوئے مسافر کسی جہاز کے کپتان کا استقبال کرتے ہیں۔ سیدخان اس هجوم میں گھرا ایک خصوصی طور پر خوفناک کی پیٹھ پر پے درپے جھانپ کر رسید کرتا ہوا چل رہا تھا۔ ایک نسبتاً بڑے خیمے کے قریب جا کر وہ رُکا، ٹرک میری جانب دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”چلے چلیں گے ہرات، کوئی بات نہیں؟“ اور پھر اپنے باوجود خوار کے ہمراہ پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

چمکا ڈر نما خیموں کا یہ عارضی شہر کوچی خانہ بدوشوں کا تھا جو ہمیشہ ہمارے لئے پابہ رکاب رہتے ہیں۔ کجاووں پر بندھا سامان اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ ان کے مالک چند دنوں میں شمالی کوہساروں کی جانب کوچ کرنے والے ہیں جہاں ان دنوں بھی چراگاہیں سرسبز ہیں اور ان کے درمیان گھچلتی برفوں کا پانی سفیدندیوں کی صورت آئینہ بکف ہے۔

آج سے پچیس تیس برس پیشتر واکان کو ریڈر کسی گوشہ میں روس چین، پاکستان کے چٹانی سلسلوں میں پوشیدہ ایک افغان دادی میں خانہ بدوشوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا کرتا تھا۔ ایک صبح بہار دادی میں آنے والے پرنسپل راستوں سے، بلند دروں سے روسی، پاکستانی، افغان، ایرانی اور چینی خانہ بدوشوں کے قافلے اُترتے، قافلے ترقی اور بے باک آزادلوں کے بھی اُترتے اور بیابان زندہ ہو جاتا۔ آئندہ چند روز میں باہمی جھگڑے بزدل خنجر نیٹائے جاتے۔ گھوڑوں اور اُونٹوں کی ددڑیں ہوتیں اور تبارکی معاہدے



میرے پاس لاتا اور دو افغانی وصول کر کے خوش خوش واپس چلا جاتا۔ کان کھینچنے کے لئے کتوں کا شاک ختم ہو گیا تو بچے بھی تتر بتر ہو گئے۔

خانہ بدوشوں کا یہ سیاہ شہر جس ٹیلے کے دامن میں بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا اس سے پرے کائنات کی طرح بے انت فاصلوں تک پھیلا ایک چٹیل میدان تھا۔ گرم آسمان میں اونٹوں کی اکاؤ کا گردنیں معلق تھیں جو کبھی کبھار جھکتیں اور آسمانی نیلا ہٹ کو خالی کر کے زمین کے عبور سے پس منظر میں مدغم ہو جاتیں۔ سُرخ چھینٹ کی چادر میں لپٹی ایک نوخیز خانہ بدوش ہانپتی ہوئی ایک خیمے سے نکلی اور ہاتھوں میں کپڑی چھڑی کو فضا میں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور لب بھینچتی ہوئی واپس چلی گئی یہ ایک ایسا چہرہ تھا جو مطمئن تھا اور دوسروں کو صرف خوشی دے سکتا تھا۔ میں نے کلائی پر پھسلے کپڑی کے سٹریپ کو گھما کر وقت دیکھا چار بجنے کو تھے۔ نظروں سے گزرنے والے آخری سنگ میل پر ”ہرات“ ۵۰ کلومیٹر کے الفاظ دیکھے گئے تھے۔ معلوم نہیں سید خاں کا ان خانہ بدوشوں سے کس قسم کا تعلق تھا مگر میں اس خیال سے دہشت زدہ ہو گیا کہ کہیں مجھے آج کی شب ان سیاہ خیموں میں ہی نہ بسر کرنی پڑے۔ شاہراہ سے میلوں دور دشت مرگ کے کنارے خانہ بدوشوں اور ان کے وحشی کتوں کے درمیان۔ بالآخر تنگ آکر میں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور تب تک نہ اٹھایا جب تک کہ سید خان بڑے خیمے میں سے آنکھیں ملتا ہوا نمودار نہ ہو گیا۔ اس کا برہمنہ پاخانہ بدوش یا بھی پہلو میں چلا آ رہا تھا۔ سید خان نے کانٹھوں کے درمیان خراٹے لیتے ہوئے کند کٹر کو ایک داہمی سی گالی دے کر بیدار کیا۔ وہ کپڑی کے پلہ سے پسینہ پونچھتا ہوا نیچے اترے اور پھر چھت پر چڑھ کر ایک بڑا سا رابڈل اُتار لایا۔ سید خان نے بڈل خانہ بدوش کے حوالے کیا اور اس کے عوض وصول کردہ نوٹوں کا پلندہ شلوار کے نیپے میں اڑسا ہوا اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ ”تم ادھر ہی بیٹھا رہا، ادھر خیمے میں آ جاتا، بہت ٹھنڈا ہوا چل رہا تھا۔“ اُس نے بس سٹارٹ کر دی۔

ٹپ پاتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر تہذیب یافتہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر، پھر ایک صبح تمام خیمے اکٹھڑ جاتے کہ دل کا بے چین اصل خانہ بدوش اپنے خیمے کے نیچے تازہ گھاس اُگنے نہیں دیتا، اس سے پہلے ہی کوچ کر جاتا ہے۔ اور ادھر تو بدن کے خیمے کے اندر چاروں اور ملت ہوئی کسی بے نام قبر کی طرح جھاڑ جھنکار اور گھاس اُگی ہوئی ہے۔ چاہت کے منظروں کو تنکے ایک عرصہ ہوا۔ محبت کی سراؤں پر قیام ایک خواب ہوا، چہروں پر بکھری سُرخ خوشی کب کی نظروں سے اوجھل ہو چکی، صرف گھاس ہے، سرکندے ہیں جو چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور ہم ہیں کہ پھر بھی اپنے آپ کو خانہ بدوش کہتے ہیں۔

بس میں رُدی کی موجودگی جو صبح سویرے آرام دہ گراہٹ کا باعث تھی، اب دشت مرگ کے نواح میں سفید آگ بنی ہوئی تھی۔ میں نے تتر بتر جسم کو ایک نچڑتے ٹکڑے طرح گردن آگے کر کے جھٹکا، پسینے کے قطرے پیٹھ پر سے پھسلتے، جہن کے کھر درے کپڑے میں جذب ہو گئے۔ گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے کیمے کا کیس کھولا، اس کی تھوکتھی گھما کر اپر چر سیٹ کیا اور تصویر کشی کی نیت سے نیچے اترنے لگا تھا کہ خیموں کے سائے میں اُدگھتی ہوئی چند بھیروں نے کان کھڑے کئے اور اُچھل کر میری جانب پہنچا۔ قریب آنے پر وہ یکدم جھالدار کتوں میں بدل گئیں۔ میں نے ایک اُلٹی چل جانے والی فلم کے کسی کردار کی طرح بیک گیر لگایا اور وہیں ان میٹھا جہاں سے اٹھا تھا۔ بس کے گرد منڈلاتے چھوٹے شیطان یعنی بچے میری اُلٹی چھلانگ سے بے حد پرست ہوئے اور کتوں کو اس کر تہ پر تھسکنے لگے۔ ان میں سے ایک بچے نے کتے کو تھسکتے تھسکتے کان سے پکڑ لیا اور اسے باقاعدہ گھسیٹتا ہوا میری کھڑکی کے عین نیچے لے آیا۔ کان اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اُس نے دوسرا ہاتھ ہاتھ پر جا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس نوازش کی رسید کے طور پر دو افغانی کا سکہ بچہ اور کتا لوگ کی نذر کیا۔ یہ پہلا نظروں ثابت ہوا، اس کے بعد باری باری ہر بچہ اپنے اپنے حصے کے کتے کا کان پکڑ کر گھسیٹتا ہوا

ہرات جانے والی شاہراہ جب ہماری بس کے ٹائروں تلے آئی تو سورج ڈھل تھا۔ آج صبح کی طرح دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آہستہ آہستہ سرک رہی تھی مگر گہریا واپس لوٹ رہا تھا۔

صبح سویر ہی ہے یا شام ہونے کو ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ تکلیف مسافت کے تسلسل نے میرے بدن میں ایک گونجی ہوئی سنسناہٹ چھوڑ رکھی تھی۔ آج صبح کابل سے روانہ ہوئی تھی یا پچھلے بقیے چلی تھی! وقت کے تعین کا پیمانہ اس سنسناہٹ کے گونجتے چکر میں پھنس کر بیکار ہو چکا تھا۔ ایسے لمحوں میں نہ منزل پر پہنچنے کا آرزو سرگوشی کرتی ہے اور نہ ہی گھر کو واپس چلے جانے کی چاہت کا شور برپا ہوتا ہے۔ مسافر ایک پھرتا بدن کے ساتھ اپنے سامنے سرکتے سڑک کے سیاہ فیتے پر نظر پڑتا ہے جس میں بیٹھا رہتا ہے۔ بس بے شک سناکت ہو جاتے مگر انجن اسی طور کا نواں کے پڑا پر دندنا کرتا رہتا ہے، سڑک حرکت میں رہتی ہے۔

میں نے رُک سیک بدن پر بوجھ کیا۔ سر جھکایا اور آہستہ آہستہ سپاٹ میدان پر اپنا بوجھ ڈالنے لگا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس تاریکی میں ڈوٹش ہو چکی تھی، البتہ سیدخان کی کرخت آواز کبھی کبھار میدان پر تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچ جاتی۔ میرے سامنے بھی ملکی تاریکی کا ایک غبار تھا۔ میں سر جھکاتے چلتا رہا۔ ایک مقام پر میرے قدموں تلے پچھی ہموار سطح ایک خفیف سے اٹھاؤ کے ساتھ بلند ہونے لگی۔ غالباً گسی ٹیلے کا آغاز تھا۔ اسی لمحے یک نخت ایک مدھم سے دھماکے کی آواز مجھے سنائی دی اور پھر ڈوبتی چلی گئی، یہاں تک کہ خاموش ہو گئی، جیسے کھلے منہ سے اُبلنے والی چیخ کو ایک مہیلی مقفل کر دے۔ پھر آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک شائبہ سا گھبرا اور ساتھ ہی گرج کا ایک پردہ پوش دُور کیوں دُور سے تیرتا ہوا میری جانب بڑھا مگر راستے ہی میں دم توڑ گیا۔ ٹیلے کے عقب میں بجلی چمک رہی تھی۔ ایک بے آواز قدموں والے چور کی طرح، جیسے ایک بلی اُون کے گولے کے ساتھ خاموشی سے کھلتی ہے۔

”ہرات سے ادھر تو ٹھہرنے کا بندوبست نہیں، یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کاروان سرائے ہے، رات ادھر ٹھہر جائے گا، ٹھیک ہے؟“ وہ بولا۔

مجھے برسوں پیشتر اس کاروان سرائے کا کھنڈر یاد آگیا جسے دیکھنے کے شہنشاہ میں اور علی اپنے سامان سے محروم ہوتے ہوتے بچے تھے۔ اس روز میری شدید زخمی تھی کہ میں فاضی کی ان چھتوں تلے ایک رات بسر کروں مگر اس وقت... اس وقت تو بقول امر کمیوں کے مجھے ایک ڈیم کی اور بقول انگریزوں کے دہلی کی بھی پرواز تھی کہ ہم یونہی ساری رات سفر کرتے رہیں یا کسی گاؤں یا سیکن یعنی اللہ ماری سرائے میں سر جھپکا کر تاریکی کی چادر لپیٹ دیں۔ ایک موٹر پر بس سڑک سے اُتریں اور ایک تہ

میں نے رُک سیک بدن پر بوجھ کیا۔ سر جھکایا اور آہستہ آہستہ سپاٹ میدان پر اپنا بوجھ ڈالنے لگا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس تاریکی میں ڈوٹش ہو چکی تھی، البتہ سیدخان کی کرخت آواز کبھی کبھار میدان پر تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچ جاتی۔ میرے سامنے بھی ملکی تاریکی کا ایک غبار تھا۔ میں سر جھکاتے چلتا رہا۔ ایک مقام پر میرے قدموں تلے پچھی ہموار سطح ایک خفیف سے اٹھاؤ کے ساتھ بلند ہونے لگی۔ غالباً گسی ٹیلے کا آغاز تھا۔ اسی لمحے یک نخت ایک مدھم سے دھماکے کی آواز مجھے سنائی دی اور پھر ڈوبتی چلی گئی، یہاں تک کہ خاموش ہو گئی، جیسے کھلے منہ سے اُبلنے والی چیخ کو ایک مہیلی مقفل کر دے۔ پھر آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک شائبہ سا گھبرا اور ساتھ ہی گرج کا ایک پردہ پوش دُور کیوں دُور سے تیرتا ہوا میری جانب بڑھا مگر راستے ہی میں دم توڑ گیا۔ ٹیلے کے عقب میں بجلی چمک رہی تھی۔ ایک بے آواز قدموں والے چور کی طرح، جیسے ایک بلی اُون کے گولے کے ساتھ خاموشی سے کھلتی ہے۔

دانت پیستی ہوئی ہلکی چمک پھر نمودار ہوئی تو میں نے ٹیلے پر بکھرے کاروان سرائے کے کھنڈر کے خطوط اُفتی پر سیاہی میں نقش دیکھے۔ میں تھکے قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہا۔ اگر آسمانی بلندیوں سے جھانکا جاتا تو نیچے پھیلے اس منظر کی ایک عجیب سی لینڈ سکیپ بنتی ہوگی۔ چپٹیل وسعت کے بیچ ایک ٹیلہ جس پر گئے وقتوں کی ایک عمارت کا کھنڈر اور اس کھنڈر کی جانب بوجھل قدموں سے بڑھتا ایک پکیر، ایک مسافر۔ ایک ایسی تصویر جو وقت کے کسی بھی پس منظر میں قابل یقین ہی رہتی ہے بدلتی نہیں، اسے دوام حاصل ہے۔ دو ہزار برس پہلے بھی تصویر یہی تھی اور آج بھی منظر وہی ہے۔ شب بھری کے ایک چھت کی جانب بڑھتا ہوا ایک تھکا ماندہ جسم اور چھت منتظر۔

کاروان سرائے کا مسیب دروازہ اندھیرے میں سے کچھ اس طرح میرے سامنے اُکھڑا ہوا جیسے یکدم ایک غفریت سمندر کی سیاہی میں سے نمودار ہو جائے۔ میں رُک گیا اس لئے نہیں کہ دروازہ بند تھا کہ وہ تو کبھی کا اپنے قدیم مسکن سے جدا ہو کر میرے پاؤں کی مٹی میں بدل چکا تھا بلکہ اس لئے کہ اندر گھسٹا ٹوپ تاریکی تھی اور مجھ میں ہرگز نہ تھا کہ تن تنہا اس کھنڈر میں داخل ہو جاتا۔ میں نے اپنا بوجھ زمین پر منتقل کیا اور بلند محراب سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک اب قدرے دیر پا ہوئی چلی جا رہی تھی روشنی پھیلی تو سرائے کا ہیولے از منہ وسط کے کسی مشرقی شہر کی طرح سامنے آیا۔ گنبدوں سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں، بلند فصیلیں اور ایک وسیع صحن کا نٹے دار جھاڑیوں گھاس بھوس سے اُٹا ہوا۔ دو خاموش سائے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ سیدخان اور کنڈکٹر۔

”آؤ“ سیدخان ایک دھم کی طرح قریب سے گزر گیا۔

صدر دروازے میں سے داخل ہو کر ہم سرائے کے دالان میں آگئے۔ سیدخان نے چند بکھری ہوئی شوکھی جھاڑیاں جمع کر کے انہیں دیا سلائی دکھادی اور سرائے کے دھندلے نقوش روشن ہو کر جھلکانے لگے۔ اس دوران کنڈکٹر سامان رکھ کر ایک

جھاڑی کی مدد سے دالان کا درمیانی حصہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اکثر کوٹھڑیوں کی چیمیں ڈھکے چکی تھیں اور ان کے گنبد شکستہ پیالوں کی طرح اوندھے پڑے تھے۔

جھاڑیوں کا الاؤ جس شتابی سے روشن ہوا تھا، اسی تیزی سے یکدم مدھم ٹپنے لگا۔ سیدخان اسی اثنا میں ایک لالٹین جلا کر دالان کے درمیان ایک اینٹ پر جھپکا تھا۔ الاؤ کے بجھنے کے بعد بھی جھاڑیاں خاصی دیر تک جگنوؤں کے ایک جھگڑے کی طرح اُلگ اُلگ دکھتی رہیں اور پھر بالکل مدھم ہو کر راکھ میں بدل گئیں۔ میں نے رُک سیک کھول کر سیلینگ بگ کھولا اور اسے لالٹین کے قریب بچھا کر دراز ہو گیا۔ سرائے کی ماتمی تاریکی سے اُپر آسمان میں چھپا ہے۔ سترے کسی عرب حمام کی چھت میں جڑے چمکدار پتھروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس میں نمی کی خوشبو تھی اور میرے چہرے پر راکھ کی ایک تہہ جم گئی۔

کنڈکٹر نے صدر دروازے کے قریب دو اینٹوں پر ایک دیگی رکھی اور آگ جلا کر گوشت کو دم بچت کرنے لگا۔ یہ گوشت غالباً خانہ بدوشوں سے خرید کیا گیا تھا سیدخان اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم آج شب ہرات نہیں پہنچ پائیں گے۔ کھانے سے نادرغ ہو کر میں نے دونوں حضرات کو نہایت تیز کافی تیار کر کے پلائی۔

”سیدخان! اس خانہ خراب میں شاید ہم پہلے مسافر ہیں جو کئی صدیوں کے بعد یہاں رات گزارنے آئے ہیں۔“ میں نے جسم میں اُترتی کافی کی حدت اور گہرے پھیلے خوشگوار خشکی کا مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں برادر، ہم تو تیسرے چوتھے ہفتے ادھر ہی ہوتا ہے۔ خاص کر جب ہم کوچی خانہ بدوشوں کے لئے کابل سے لالٹین، نمک، سونی دھاکہ وغیرہ لاتا ہے تو رات یہیں گزارتا ہے۔ با با تم صدیوں کی بات کرتا ہے، ابھی ساٹھ ستر سال بھی نہیں ہو اجب افغانستان میں بالکل سڑک وغیرہ نہیں تھا۔ تمام کاروبار اُونٹوں کے کاروان سے ہوتا تھا۔ ہمارے دادا کا ایک بھائی جواب بھی یا میان کے قریب ایک پہاڑی قصبے میں

کھیتی باڑی کرتا ہے اسی کا روان سرائے میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ان دنوں ملکوں کے درمیان سرحدیں صرف نقشوں پر تھیں ورنہ تہذیب سے تاشقند جانے کے لئے پاسپورٹ کی بجائے صرف آؤنٹ درکار ہوتا تھا۔

بجلی اس مرتبہ خاصی شدت سے چمکی اور اس کا دمکتا غبار دیر تک سرائے کی تاریکی میں معلق رہا۔

کنڈکٹر نے چپکے سے اپنی چادر اور چند برتن اٹھائے اور ایک کوٹھڑی میں غائب ہو گیا۔

”بارش آئے گی۔“ سیدخان نے فضا میں ایک شکاری کتے کی طرح سونگھا۔ اندر چلیں کسی بھی کوٹھڑی میں سو جاؤ، یہاں رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندر؟ کوٹھڑیوں میں؟ محفوظ ہیں ناں؟

سیدخان نے ایک بچکی لی اور پورے دن کا ذخیرہ شدہ قمقمہ فضا میں اڈیل دیا۔ ”اتنے ڈرپوک ہو تو سفر کیوں کرتے ہو؟ کوٹھڑی پر اگر چھت قائم ہے تو محفوظ ہے۔۔۔ البتہ چوہے ہوں گے۔“ اس نے لالین اٹھائی اور اپنا بستر سمیٹ کر اسی طور قمقمہ لگاتا ہوا دالان عبور کرنے لگا۔

میں نے ماچس جلا کر چند کوٹھڑیوں میں جھانکا۔ اکثر کی چھت آسمان تھا۔ ہر حال ایک نسبتاً خوش حال کوٹھڑی تلاش کرنے کے بعد میں نے اس کا فرش صاف کیا اور سلپنگ بیگ بچھا کر لیٹ گیا۔ اگرچہ باہر ابھی تاریکی تھی مگر کوٹھڑی کے کھٹاؤپ اندھیرے کے باعث آہستہ آہستہ دالان کی شکل دافع ہونے لگی۔ بجلی وقفوں کے ساتھ باقاعدگی سے چمکنے لگی اور دُور سے آتی گرج کی گھٹی گھٹی آواز اب قدرے کھل کر بات کرنے لگی۔

قد حار میں رت جگے اور تھکاؤ کے باوجود میرے پیوٹے لوہے کی مانند بجاری نہیں ہو رہے تھے بلکہ پروں کی مانند تھے، ہلکے اور کھلے ہوئے۔ متعدد پلیسٹ مارنے کے

بعد مجھے یقین ہو گیا کہ نیند ابھی نہیں آئے گی۔ چنانچہ میں نے سگرٹوں کا بیگٹ جیب میں ٹھونسنا اور باہر آ گیا۔ سیدخان کے مسکن میں تاریکی تھی۔ لالین مجھ کی جیب سے سگرٹ سگاکر میں صدر دروازے سے باہر آیا اور اس کی منقش اینٹوں سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

میرے سامنے وسیع میدان تھا جس کے کنارے دشت مرگ سے ملنے تھے اگرچہ اندھیرا تھا مگر اندھیرے کی بھی ایک اپنی مثالی سی روشنی ہوتی ہے جو بندریج آنکھوں کو گرم شدہ شبیہوں سے روشناس کرواتی چلی جاتی ہے۔ یکدم میرے سامنے میکیاں و سعتیں چمکیں جیسے دیے کی کو تیز ہوا کے تھپیرے کے فوراً بعد لڑکر یکایک بھڑکتی ہے اور پھر ایسے ہوا کے کائنات کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک اندھا کرینے والی چمکیں نیلا ہٹ پھیل گئی۔ میدان اور پہاڑی سلسلے ایک لمحے کے لئے سامنے آئے، ایک لمحے کے لئے تاریکی کے اس پردے کو اتارا جس میں وہ روپوش تھے۔ اور ان کے سینے پر کھڑے پتھر، پودے، جھاڑیاں، کنکر سب نیلے ہو گئے۔ بجلی مسلسل ایک بھوکے دندے کی طرح اُفنی پرغز آ رہی تھی۔ دُور کہیں بھڑکتی اور پھر ایک آتشی گیند کی طرح کٹی ہوئی پورے آسمان پر پھیل جاتی۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ ایک حیا دار خاتون کی طرح اپنے حسن کی پرچھائیاں کبھی کبھار ہی زمین پر ڈالتی تھی مگر اب وہ ایک کسی کی مانند برہنہ ہو کر سامنے آ رہی تھی۔ ایک ہولناک گرج میرے کانوں میں مٹی، آسمان جیسے کانپنے لگا، پھر ایک نیلا شعلہ زمین کی جانب آہنی قوت کے ساتھ لپکا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کاروان سرائے ایک نیلے نیکیڈ کی مانند دکھائی دے رہی تھی اور پھر خاموشی کے عمیق کفن میں جیسے کسی نے ڈبکی لگائی ہو، بارش کا پہلا قطرہ۔۔۔ چند ڈبکیوں کی ٹر ٹر اہٹ کے بعد موٹے موٹے قطرے زمین پر پڑنے لگے اور بے آواز ریت میں جذب ہو رہے گئے۔

ابھی باقاعدہ بارش شروع نہیں ہوئی تھی البتہ مجھ سے دو رانی کے اُس حصے تلے جو طوفان کا مرکز تھا، بے پناہ بارش ہو رہی تھی اور اس کا دبا دبا شور لہروں میں پوشیدہ کسی آبشار کی طرح مسلسل مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ آسمان کے مختلف حصے اتنی دہشت اتنی

باتا عذگی سے چمک رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے مقابلے پر اتر آتے ہوں۔ بجلی کے پکٹے کوندے آسمان کو یوں چیرتے جیسے جگر گوشے کے دفن ہونے پر جگر کٹا چلا جاتا ہے۔ میدان اور پہاڑ بار بار نیلے شعلے کی زد میں آتے اور پھر خنک تاریکی میں ڈوب جاتے۔ بجاری بارش یکدم ایک شکستہ چھت کی طرح زمین پر آگری۔ میں اُس کی زد سے محفوظ ہونے کی خاطر صدر دروازے کے عین نیچے اکھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے گرد ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دیں جیسے کوئی چپکے چپکے نیند میں چل رہا ہو، جیسے درجنوں بالشتیہ پرے آس پاس سے گزر رہے ہوں۔ پہلے تو میں اسے دامن سمجھا مگر پھر کبھی کبھار میرے پاؤں سے کوئی لڑھکتا ہوا چھوٹا سا جسم چھو جاتا۔ یہ وہ جانور تھے جو بارش سے بچنے کے لئے کاروان سرائے میں پناہ لینے کی خاطر رینگتے چلے آ رہے تھے، بالکل میری طرح قد سے تہذیب یافتہ مگر ایک جانور جو آج کی رات کے لئے اس سرائے کی پناہ میں تھا۔ رات گئے میں اپنی پناہ گاہ کو لوٹا اور موت کے غامضی ذاتقے سے روشناس ہوا، سو گیا۔

ٹیلے سے اترتے ہوئے میں نے ہمیشہ کی طرح پیچھے مڑ کر دیکھا تو کاروان سرائے اس دنیا کی طرح دکھائی دی جیسے میں نے چھوڑ جانا تھا۔ اسرار کی ہلکی دھند میں شکستگی کا باوجود دلآویز اور بدن کو کھینچنے والی۔ میرا ہر قدم زندگی کی طرح مجھ میں اور دنیا کی اُس سرائے کے درمیان جدائی کی منزل قریب تر لانا گیا۔ ہموار میدان تک پہنچتے پہنچتے وہ میری نظروں سے ردپوش ہو گئی، دھند میں تحلیل ہو گئی۔ میرا اور اُس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا اور اُس عمارت کے لئے میرا وجود اس کائنات میں ختم ہو گیا۔

میرے گرد میدان کی سطح پر گہری دھند سلووشن میں آہستہ آہستہ اُبل رہی تھی دھند کے اس سفید کفن میں سے سوگوار کے آنسوؤں کی طرح بارش ابھی تک سرائے تک نہ رہی تھی۔ سید خان اور کند کٹر شاید بس تک پہنچ چکے تھے کیونکہ ہارن کی مسلسل آواز بارش کے ہلکے شور میں مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ سرد ملکوں میں تو دھند ایک آسیب کی طرح ذہن پرست

ہو جاتی ہے مگر ایک نیم صحرائی خطے میں اس کا ظہور بے حد دلکش ہوتا ہے۔ پودے، جھاڑیاں، پتھریوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی بچے نے انہیں باریک ٹلٹل میں لپیٹ کر ادھر ادھر بکھیر دیا ہو۔ میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چلتا رہا۔ ”اے ناکی ڈے ان لائن ٹاؤن“ کی بجائے ”اے ناکی ڈے ان افغانستان“۔ ہارن کی آواز نسبتاً صاف سنائی دی تو بس کا پیکر بھی دھند میں سے ابھرا اور زیر آب پڑے کسی جہاز کے ڈھانچے کی طرح دکھائی دینے لگا۔

کسی من چاہے چہرے کا پر تو کب تک یوں سامنے آتا رہتا ہے جیسے وہ سامنے ہو، صرف چند برسوں کے لئے۔ پہلے بدن کا لمس ساتھ چھوڑتا ہے پھر آواز معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد آنکھیں بھولتی ہیں مگر مسکراہٹ بہت دیر تک ساتھ دیتی ہے اور ایک روز وہ تجھتی لو کی طرح تھر تھراتی ہوئی تاریک ہو جاتی ہے۔ میں نے آخری بار کاروان سرائے کی جانب دیکھا تو میں بھولنے کے یہ تمام مراحل طے کر چکا تھا سرائے کی مسکراہٹ بھی دھند کے پردے میں چھپ چکی تھی۔ تم ایک بستی کو، ایک لڑکی کو تو نہیں چھوڑتے بلکہ وہ بستی وہ چہرہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں بھی ان کا وجود برقرار رہتا ہے۔ یوں ایک دھند آلود صبح میں افغانستان کے صحراؤں میں پہاں جانے کہاں اُس کاروان سرائے نے مجھے چھوڑ دیا۔



## سنہری کونج

نہرسانی دوپہر کی سفید تمازت ہمارے چادر چھیرے پھیلے چٹیل میدان اور خشک پہاڑیوں پر بڑی خاموشی سے لکھل رہی تھی۔ پسینے کے قطرے چھینٹوں کے ایک ریوڑ کی طرح میری بنیان کے نیچے رینگتے ہوئے جین کے کھر درے کپڑے میں جذب ہو رہے تھے۔ آنکھیں کھلی رکھنا محال ہو رہا تھا کہ ماتھے کی ٹپکتی چھت سے پسینہ ٹپ ٹپ ان میں گر رہا تھا۔ کارواں سہارے، دھند آلود صحرائی صبح اور ہلکی ہلکی بارش کا تصور، ہولناک گرمی کے تجارت میں تحلیل ہو چکا تھا۔ جانے کون سے زمانوں کی کہانی تھی کن خطوں میں اس عمارت کا وجود تھا جس کی قدیم چھت نے مجھے پھلی شب اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ میں نے سراٹھا کر تہیتی ہوئی ڈنڈسکرین کے پار دیکھا۔ دور خالی سڑک پر سیاہ بان کے خلا میں دوپٹے پر بیٹھوں پر ٹوک سیک اٹھائے گرمی کے بوجھ تلے ٹوٹے ہوئے قدم گھسیٹ رہے تھے۔ بس کی آواز سن کر ان کے جھکے ہوئے جسم ایک دم سیدھے ہو گئے جیسے کسی خاموش جنگل میں ایک شاخ کے ٹوٹنے کی آواز جانوروں کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ انہوں نے سچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سڑک کے درمیان میں کھڑے ہو کر آؤٹ آف کنٹرول پتیلیوں کی طرح بے تحاشا ہاتھ بلانے لگے۔ سید خاں نے قریب جا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

نیکرا اور بنیان پہننے ہوئے ایک چھپر ریاسا زرد رولر کا چندھیائی ہوتی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی نیلا جیکٹ اور جین میں بھنسی ہوئی تھی بار بار سانس روک کر کبڑی سی ہوتی اور جیکٹ کے کھلے بٹنوں میں رد مال گھسیٹ کر پسینے پر رواں پسینہ پونچھنے لگتی۔ اس کا بدن نہرسانی دوپہر کی سفید تمازت کا ایک حصہ دکھائی دیا۔

”ہی رات۔ ہی رات...“ زرد بو نوجوان نے اطمینان سے بس کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا مگر فوراً ہی ایک ہلکے سے دھکے نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔  
 ”فرسٹ۔ ٹو ہنڈرڈ افغانی...“ کنڈکٹر نے بند مٹھی کھول کر مطالبہ کیا۔  
 چھریے نوجوان نے نیکر کی جیب میں سے چند بوسیدہ اور پسینے سے بھیکے ہوئے نوٹ نکالے۔ لڑکی نے بھی ان تمام جیبوں کی تلاشی لی جو اس کے بدن نے اگرچہ بھر رکھی تھیں مگر ویسے خالی تھیں۔

”ون ہنڈرڈ...“ لڑکے نے کل پونجی اپنے راستے میں حامل شائیلک کی ہتھیلی پر رکھ کر لجاجت سے کہا۔ ”باقی رقم ہرات پہنچ کر...“  
 وہ اتنا سہا ہوا تھا کہ بقیہ سوافغانیوں کے عوض وہ باقاعدہ کنڈکٹر کا منہ چومنے پر تیار نظر آتا تھا۔ کنڈکٹر نے لڑکی کی طرف دیکھا مگر وہ بالکل تیار نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ اس نے ہتھیلی پر رکھے نوٹ نفرت سے اُن کے منہ پر دے مارے اور سید خاں نے فی الفور بریک پر سے پاؤں اٹھالیا۔ بس حرکت میں آگئی۔ یہی جوڑا ”ہے ہے ۱۰ سنوسنو“ کا شور مچاتا بس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔

میں نے کنڈکٹر سے کہا ”بھلے آدمی ان غریبوں کو اس دیر لانے کے دیکتے ہوئے تندر میں تو نہ چھوڑو، بٹھالو، بقیہ رقم ہرات پہنچ کر وصول کر لینا۔“

”بابا وہاں جا کر بولے گا خلاص، پیسہ نہیں۔ ہم ان مہی خانہ خراب کو جانتا ہے ہمیشہ ایسا کرتا ہے۔“

”بٹھاؤ ان سورتے بچوں کو...“ سید خاں جانے کیوں موم ہو گیا اور ایک دم بس روک دی۔

وہ دونوں گرتے پڑتے پہنچ تو گئے مگر بس میں سوار ہونے کی بجائے باہر کھڑے ہو کر کتوں کی طرح ہانپنے لگے۔

جین سوٹ میں پیک شدہ لڑکی نے بمشکل سانس درست کیا اور مجھ سے مخاطب

ہو کر نہایت عاجزی سے کہا۔ ”سپیک انگلش؟... اچھا تو پھر پلیز ہمیں سوافغانی ادھار دے دو، ہرات پہنچتے ہی لوٹا دیں گے۔“  
 ”نقد یا جنس میں؟“ میں نے مذاق سے کہا۔  
 ”جس طرح تم پسند کرو۔“ وہ بے تابی سے بولی۔

میں نے جھینپتے ہوئے ہامی بھری۔ وہ دونوں خوفزدہ بھیڑیوں کی شکلیں بنائے جھپکے ہوئے بس میں داخل ہو گئے۔ سوافغانی کا نوٹ کنڈکٹر کے حوالے کرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر لڑکے کی جانب دیکھا جو اس اٹنا میں پھپھی نشست پر ردی کی ایک گانٹھ سے ٹیک لگا کر اپنے آپ کو آرام دہ حالت میں استوار کر چکا تھا۔ ”بقیہ سوافغانی؟“  
 ”ضرور۔ ضرور۔“ اُس نے فوراً اٹھ کر رقم ادا کر دی۔ وہ اس خیال میں تھا کہ شاید میں اس کی ہم سفر لڑکی کے جُستے کی آنج سے کچل کر پورا کر دیا اور کچا ہوں کہ وہ کئی لباس کا شکی بدن اب میرے پہلو میں بیٹھ چکا تھا۔

بس سٹارٹ ہوتی تو لڑکے نے اپنے رُک سیک میں سے ایک ہنسی برآمد کر کے اُسے لبوں سے لگالیا اور ایک نہایت اٹکٹی اٹکٹی بے کیف دھن بجانے لگا۔

”ایک بندل شکریوں کا۔“ وہ حسب معمول ماتھے کی بجائے شانوں سے نیچے بلند ہونے والی سطح میں سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ اس کا گٹھا ہوا جسم بالکل غیر متحرک تھا، ساکن اور گونگا، جیسے لکڑی کے کسی متناسب مجسمے پر چین اور جنیکٹ فٹ کر دی گئی ہو، شکریں میں ایستادہ بے جان ڈمی۔ ”تم ہماری مدد کو نہ آتے تو جانے رات تک ہمارا کیا حشر ہو جاتا۔ پچھلے برس دوام کی بھائی جو خچر دوں پر سفر کر رہے تھے، اسی علاقے میں افغان ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے، اُن میں سے ایک کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔“

”ایک خچر کو؟“

”ایک خچر کو بھی۔ سگرٹ ہو گا؟“

سگرٹ سٹلکا کر اس نے اتنا لمبا کش لگایا کہ سارا دھواں اس کے بدن کے

اندر ہی کہیں تحلیل ہو گیا۔ کھلے منہ سے صرف گرم سانس برآمد ہوا۔

ٹوٹ... ٹوٹ... ٹوٹ... ہٹاں... ہیری کی بنسری کے سوراخوں میں شایانہوا  
جھی ہوتی تھی۔ بے حد بے سُر اور بھنبسی بھنبسی آوازیں آرہی تھیں۔

”ہیری! تم اس کے علاوہ اور کوئی دھن نہیں بجا سکتے؟“ اُس نے سچھے دیکھے بغیر  
اپنے ساتھی کو ڈانٹ پلائی۔ ”ہیری نے یہ دھن نیپال کے ایک چرواہے سے سیکھی تھی۔ کتنا  
ہے اس کے بجانے سے مجھے شانتی ملتی ہے مگر میں تو اسے بار بار سن کر میاں تک...“ اس  
نے اپنے ٹھوس اجمادوں پر پھٹیلی سلیوٹ کرنے کے انداز میں جاکر کہا۔ ”یہاں تک نہیں  
ہو چکی ہوں۔“

ہیری بدستور وہی دھن بجاتا رہا۔

”ہم دونوں آج صبح قندھار سے روانہ ہوتے تھے...“

”پیدل؟“ میں نے آنکھیں بھاڑ کر پوچھا۔

”اوہ نہیں، قادری بس سروس سے... سفر کے دوران ہیری کی تھی اپ سیٹ ہو کر۔“

یہ افغان ٹوڈناں... ڈائریٹیا کے جراثیم کلبلا تے ہیں اس میں۔ ہر دس پندرہ منٹ کے  
بعد ہیری کے اندر اٹھل پھٹل شروع ہو جاتی اور وہ پیٹ دباتے ہوئے شور مچا دیتا کہ  
بس روک لو ورنہ میں یہیں سب کے سامنے بیٹھ جاؤں گا... بقیہ مسافر تو اس حال دہان  
سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے کہ سفر کاٹنے کے لئے اچھا تماشا مل گیا مگر ڈائریٹیا  
میاں تک...“ اس نے ایک مرتبہ پھر کراٹے کا وار کرنے کے انداز میں سمجھیلی سینے پر جانی۔

”فیڈ اپ ہو گیا۔ جہاں سے تم نے ہمیں بک کیا ہے وہاں سے تقریباً دو میل سچھے ہیری  
کے معدے میں چھوڑ دینا کشتی شروع ہو گئی... قندھار سے روانہ ہونے کے بعد یہ تقریباً  
بارہویں ایرجنسی تھی، مگر اس مرتبہ تو ڈائریٹیا نے بس روکنے سے سو فی صد انکار کر دیا۔  
قریب تھا کہ ہیری مجبوراً وہیں فرش پر بیٹھ جاتا مگر خاتون مسافروں کے اصرار پر بس روک  
دی گئی۔ نیکر پر ہاتھ رکھے یہ ڈارلنگ لڑکا کو دکرا کر باہر نکلا اور سر پیٹ بھاگتا ہوا ایک قری

جھاڑی کے پیچھے روپوش ہو گیا اور کیا تم خیال بھی کر سکتے ہو کہ اُس افغان باسٹرڈ نے کیا کیا؟  
— نہیں کر سکتے۔ اُس نے بس چلا دی۔ میں نے بہتیرا شور مچایا کہ ہم مفت میں سفر نہیں  
کر رہے، بٹ خرید کر سوار ہوتے ہیں مگر وہ کم بخت یہی کہتا رہا کہ ہمیں بس کی بجائے کسی  
ٹائلٹ میں سفر کرنا چاہیے تھا۔ اب ہیری کوئی برا انسان بھی نہیں کہ میں اسے اس گارڈنار  
سیکن صحرا میں ایک جھاڑی کے پیچھے معصومیت سے بیٹھا چھوڑ کر چلی جاتی۔ چنانچہ میں نے  
اپنے رگ سیک سنبھالے اور بس روک کر خود بھی اتر گئی۔ واپس اس مقام پر آئی تو ہیری ابھی  
تک مزے سے وہیں بیٹھا راحت محسوس کر رہا تھا، اسے بس کے چلے جانے کی خبر تک نہ تھی  
... بہر حال اب ہم پچھلے دو گھنٹوں سے پیدل چل رہے تھے کہ یہ بس آگئی۔“

”ہیری...“ اُس نے سچھے مڑ کر اس سفید فام کرشن کو دیکھا جو آنکھیں نیم دکائے  
بنسری بجاتے جا رہا تھا۔ ”تمہیں اب تو کچھ... کچھ محسوس تو نہیں ہو رہا؟“

”یہاں کچھ باقی ہی نہیں جو باہر آسکے۔“ وہ لا پرواہی سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
مہسا۔ ”تم فکر نہ کرو سویت ہارٹ۔“

”اور ہم کوئی گداگر قسم کے ٹورسٹ بھی نہیں ہیں۔“ سویت ہارٹ نے کندکڑ کی طرف  
تہرآؤ نظر ڈالتے ہوئے ناک چڑھائی۔ ”ٹکٹوں کے علاوہ ہمارے پاس راستے کی خوراک کے  
لئے سو افغانی بھی تھے، خیال تھا کہ ہرات پہنچ کر ٹریولرز چیک بھنوالیں گے مگر وہ باسٹرڈ  
ڈرائیور... خیر... ایک مرتبہ پھر بہت بہت شکریہ۔“

”ویسے تم اس گارڈنار سیکن صحرا میں چلتے چلتے فیڈ اپ نہیں ہوئیں؟“

”ہوئی۔“

”کہاں تک؟“

”یہاں تک...“ اُس نے کراٹے کی کھلی پھٹیلی اپنے چوٹی سینے پر جادی اور پھر ہیری  
طرف دیکھ کر یکدم مہنس دی۔



”ڈبل بیڈ کا ہے۔ آپ اسے ایک پاکستانی برادر کے ساتھ شیئر کر لیجیے۔ وہ اس وقت کمرے میں موجود ہیں۔“

میں سیڑھیوں کی جانب بڑھا تو میری نظر دیوار پر نصب ہوٹل کے نوٹس بورڈ پر پڑی۔ ہرات کے سیاحتی کتابچوں، تصویروں اور شہر کے نقشوں کے درمیان صادقین کی تخلیق کردہ ایک تصویر بھی چسپاں تھی۔ ہوٹل کے خاردار ہاتھ چاند کو چھونے کی جستجو میں اور ان کے درمیان ایک ایسا چہرہ جس کی تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میری پہلی کتاب ”نکلے تری تلاش میں“ کا سرورق۔

”یہ سرورق آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟“ میں نے ایک عجیب سی کسک محسوس کرتے ہوئے نوجوان سے دریافت کیا۔

”اوہ یہ .... ایک پاکستانی لڑکا دے گیا تھا۔ کتنا تھا کہ اس سفر نامے میں شامل ہر آئے“ کا باب اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں لکھا گیا تھا۔ ہم نے اسے سلیسٹی کے طور پر لگا رکھا ہے۔ آپ بھی تو پاکستانی ہیں، اس کے مصنف کو جانتے ہیں؟“

”وہ ادیب ہے، شہرت کا بھوکا، اور میں ایک آوارہ گرد، گمنامی کا منشا ... میں اُسے کیسے جان سکتا ہوں۔“ میں اداس ہو کر بولا۔

”سیڑھیوں کے خاتمے پر دائیں ہاتھ پر آمدے ہیں ...“

”میں راستے سے واقف ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا اور سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ کمرہ بھی وہی تھا جس میں میں اور علی ٹھہرے تھے۔ صرف ایک فرق کے ساتھ کہ اب کرسی پر علی کی بجائے ایک پاکستانی صاحب سیلینگ سوٹ پر باقاعدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے تشریف فرما تھے۔ میرا موڈ آف ہو گیا۔ جانے کیا چیز ہیں! ایک داجی ساٹھیلو ٹرڈر کے میں نے رُک سیک خالی بستر پر رکھا اور دھول سے دھولیں اڑاتے جین سوٹ کو اتارنے کے بعد بنیان اور اندر ویر میں ہی لیٹ گیا۔ وہ صاحب اس کھلی بے حیاتی کی تاب نہ لاسکے اور فوراً ایک انگریزی رسالے کی اوٹ ہو گئے۔

دربائے ہری روم کے اُس کنارے خراسان کی تپتی دوپہر تھی۔ اس پار ہوئے کہیں پیچھے رہ گئی۔ ایک غنیف سا جھونکا گرمی کے جھلستے سراپوں میں تیر گیا۔ پھر چوک پر خوشبو جیسے گرمیوں کی اندھیری شب میں مائل پرواز پرندوں کی لمبی سرسراہٹ نکلائی ہے اور گزشتہ چاہتوں کا غم بوسہ بدن کو چھوتا ہے۔ ہمارے سامنے چیرٹکے درختوں کے سبز غار میں ایک طویل سرٹک تھی جس کے دونوں طرف سبزہ تھا، باغ تھے، یخ پانیوں والی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں۔ بس صحرا نہ تھا۔ تیمور کے قبر، شاہ رخ اور گور شاہ کے مہر کا شہر، ہرات!

ہم ایک ایسے بازار کے بیچ میں سے گزرے جسے میں جانتا تھا، ہراتی پرستینوں، قالینوں کا قدیم بازار، اور ایک ایسے ہوٹل کے سامنے جاؤں گے جو مجھ سے آشنا تھا، ہوٹل بزداد۔ میں نے بس کی چھت پر چڑھ کر اپنا رُک سیک اور بیگ روٹی کی گانٹھوں میں سے دریافت کیا اور نیچے اتر کر بس کے اندر جھانکا۔

”کم عقل اُدھار دیتے ہیں اور احق اُس کی واپسی کی امید رکھتے ہیں۔“ سید خاں نے دانائی سے سر ملایا۔ ”تم اپنے سوانحی ڈھونڈ رہے ہو ناں؟ وہ تو بس کے رکے ہی غائب ہو گئے۔“

”سید خاں صرف ایک سوانحی کی حقیر رقم کی خاطر تم نسل انسانی پر پیر ایمان متزلزل نہیں کر سکتے۔ بہر حال صرف ایک دن کے سفر کو تین روز تک طول دینے کے لئے میں تمہارا بھی شکر گزار ہوں۔“ میں نے سید خاں کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاما تو اس کے مُر جوش دباؤ تلے پچھلے تین دنوں کی سرد مہری تحلیل ہو گئی۔ میں نے رُک سیک کا ندھے پر ڈال دیا۔ ہوٹل بزداد کے کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔

ڈیسک پر ایک نوجوان لڑکا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے قدرے لا پرواہی سے میرا پاسپورٹ جمع کر کے رجسٹر پر اندراج کر لیا۔ ”کمرہ نمبر چار۔“

”چابی؟“

ادھر ادھر گھومتا رہا، ایک بھی کام کی عمارت نظر نہیں آئی۔ یعنی جدید قسم کے سکائی سکریپر وغیرہ  
شیشے کی کھڑکیوں والے...“

انہیں لگہ لگہ تھا کہ شہر ہزار کی اس مختصر تصویر میں ابھی تک قدیم رنگتیں کیوں چمکتی ہیں  
ان کی جگہ آنکھوں کو چمکنے والے سائیکل ڈلیک رنگ کیوں نہیں لگاتے گئے۔

”آپ اگر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کا نیلا گنبد دیکھ لیں تو...“

”ہاں وہ بھی دیکھا... ٹوٹا ہوا تھا۔“

”اور بقیہ مدرسے کے وہ مینار جو شہر سے باہر زرافوں کی طرح گردنیں اٹھاتے

کھڑے ہیں؟“

”وہ بھی دیکھے مگر صاحب ان کے تو سر کٹے ہوتے ہیں، بلکہ سچ پوچھتے تو مجھے کچھ کچھ پیش

لگے... بہر حال اپنا ٹیسٹ نہیں ان کھنڈروں وغیرہ کے لئے... خیر یہ فرمائیے کہ یہاں

شاہنگ کس قسم کی ہو سکتی ہے، یعنی ہرات کی کوئی سوغات وغیرہ؟“

”ہراتی پوستین۔“

”ایک وہ بھی سونگھی تھی، بکرے کی بو آ رہی تھی۔“

”پوستین سونگھنے کی نہیں پہننے کی چیز ہے۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”اور پھر بکرے کی

کھال سے بنی ہوئی پوستین میں بکرے کی بو ہی آئے گی، لڈھر کی تو نہیں آئے گی۔“

”یہ بھی درست ہے۔“ انہوں نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ”اور کچھ؟“

”لو مڑ کی کھال کے کبل بھی ملتے ہیں، نہایت نرم اور بہت ہی گرم۔“

”لو مڑ؟“ انہوں نے قدرے ناراضگی سے میری طرف دیکھا۔ ”بہر حال اگر چائے

کا موڈ ہو تو...“

”شکریہ مگر میں فی الحال آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

جوادید صاحب نے کالہ پر سے کسی غیر مرنی دھول کے ذرے کو جھاڑا پتھون کی

جیسوں میں ہاتھ مٹھوٹے اور اکڑے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے، مگر فوراً ہی واپس

پچھلے پر جب میری آنکھ کھلی تو ان صاحب کو ایک سیاہ سوٹ ڈانٹے آئینے

سامنے جھکے ٹائی کی گرہ کو اتار تھیل کرتے پایا۔ میرا شک درست ثابت ہوا تھا۔ روز

ایک تہذیب یافتہ انسان تھے۔ سفر کے دوران میں استری شدہ کپڑوں میں طبریں ملنے

آفرشیو سے ملکتے ہوئے حضرات سے بے حد بدگتا ہوں۔ ایسے لوگ جن کے ماتھے پر

پسینہ نہ چمکے جن کے پیرا ہنوں پر سفر کی دھول نہ ہو وہ مجھ میں سے نہیں ہیں۔

”آپ اگر پاکستان سے ہیں تو ہم بھی پاکستان سے ہی ہیں۔“ وہ آئینے سے چمکے اور

”جی۔“ میں اخلاقاً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کہاں کا ارادہ ہے؟“

”چائے داتے پینے جا رہے ہیں، چار بجنے کو ہیں۔“ وہ کسی اشتہاری ماڈل کی طرح

اپنی گھڑی کی نمائش کرتے ہوئے چمکے۔

”میرا مطلب ہے کس سمت میں سفر کا ارادہ ہے؟“

”ہم تو پریس جا رہے ہیں اور آپ؟“

”ہم لبنان جا رہے ہیں۔“

”لبنان؟ لیکن صاحب وہاں تو ان دنوں سخت گر بڑ ہے، خار جنگی وغیرہ۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سید خاں کا تمکیر کلام کام آگیا۔

مزید گفتگو کے دوران کھلا کہ جوادید صاحب کسی سرکاری محکمے میں اچھے خاصے اہل

ہیں۔ ریٹائرمنٹ سے پیشتر کی چھٹی پر یورپ جانے کی سوچھی کسی نے پی پڑھائی کہ خوشی کے

راتے سدھاریے، خرچ کم اٹھے گا اور سیر بھی ہو جائے گی۔ اب اپنی قسمت کو رو رہے تھے

کہ صاحب ہم تو پھنس گئے۔ خدا دشمن کو بھی افغانستان نہ دکھائے۔ ہر طرف اللہ مارے جا

موئے چیل میدان اور سچان ہی سچان۔ نہ ہوٹل کام کے نہ خوراک، ڈبل روٹی تک نہیں

ملتی نرم والی۔ ہم تو تھراں پہنچتے ہی ڈائریکٹ فلائٹ لیں گے انشاء اللہ۔“

میں نے ہرات کے بارے میں تاثرات دریافت کئے۔

”ہرات؟ بیہودہ شہر... صاحب شہر کہاں مقصد ہے بد ملٹی ٹائپ کا... آج صبح

آگئے۔ کن اکھیوں سے میری جانب دیکھا اور پھر اپنے سوٹ کیس میں سے چند قیمتی اشیاء نکال کر ساتھ لے گئے۔ میری ہیئت کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اور نیک ہی ہم سفر نہیں ہو سکتے۔

میں نے پہلو بدل کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف دیکھا۔ آئینہ صاف تھا۔ کوئی ایسا نقش نہ تھا جو خبر کرنا کہ آج سے چھ برس پیشتر جب میں اس کمرے میں آیا تھا تو اس کی سطح پر کسی من چلی سیاح لڑکی نے سرخ لپ سنک سے ہونٹل ہزاد لکھا ہوا تھا۔ لپ سنک کے یہ سرخ پھول ایک عرصہ تک سفر کی یادوں کے اس شہتیر پر کھیلے رہے جسے یورپ اور تنہائی کے لمحوں میں سوچ کا زندہ آہستہ آہستہ پھیلتا رہتا ہے۔ ایک بھوکے فیر کی طرح جو روٹی کے ٹکڑے کو دانتوں تلے چبا چبا کر نگلتا ہے کہ میں یہ جلدی ختم نہ ہو جائے یوں یادوں کا وہ شہتیر جو سفر کی محبتوں اور ذاتیتوں اور رعنائیوں کے تن اور درختوں میں سے نکلتا ہے، وقت کے گزرنے سے دھیرے دھیرے براوے میں بدلتا رہتا ہے اور ایک شب ایسی آتی ہے جب سوچ کے زندے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا اور بے بسی کے سانس براوے کے ڈھیر کو بھی ہواؤں میں بکھیر دیتے ہیں۔ بس اسی شب ناول ذہن پر دیوانگی سفر پر پھیلا دیتی ہے اور آوارہ گرد ایک نئے شہر کے لئے رکھوں کی تلاش میں سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ میرے رک سیک میں پڑی ڈائری ابھی تک آئینے کی طرح شفاف تھی۔ اس کے کورے صفحوں پر عبارت ہوں گی موسموں کی راحتیں اور شدتیں۔ انجانے بدنوں کی نفرتیں اور محبتیں۔ ان پر سفر کی دھول ہوگی۔ اس کے آخری صفحے پر کیا تحریر ہوگا، اس کی مجھے خبر نہ تھی کہ ڈیلیفی کے اور نیکل نے مجھے میرے مستقبل بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے رک سیک میں سے ڈائری نکالی اور پچھلے تین روز کو اس کے منتظر صفحوں پر منتقل کرنے لگا۔ ابھی صرف دو صفحے ہی لکھنے پائے تھے کہ جاوید صاحب دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئے اور میری کمر پر ایک دھپ لگا کر بولے ”آپ بڑے حضنت ہیں“ ان کی اس بے تکلفی نے مجھے بے حد حیران کیا کہ موصوف باہر تو خاصے سنجیدہ و

میں گئے تھے۔

”میں بڑا حضنت ہوں؟“ میں نے احمقوں کی طرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔  
”اور کیا؟“ وہ دروازے کی جانب آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے چمکے۔ ”آپ کو ایک نوڈیا ملنے آئی ہے۔“

”مجھے؟“ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہرات میں کسی نوڈیا... میرا مطلب ہے لڑکی وغیرہ کو نہیں جانتا۔“  
”باہر کھڑی ہے۔“ وہ مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

”آپ کو یقین ہے کہ وہ مجھے ہی ملنا چاہتی ہے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔  
”موٹی موٹی خونا آکھوں اور کھنکھریالے بالوں والا پاکستانی... یہی کہہ رہی تھی۔“  
میں بے دلی سے دروازہ کھول کر باہر جانے لگا تو انہوں نے لپک کر مجھے بنیان سے پکڑ لیا۔ ”صاحب یوں ننگ دھڑنگ... پتلون تو زیب تن کر لیجئے۔“ میں نے صبر پہن کر دروازے میں سے جھانکا، وہی لکڑی کے جسم والی سخت سی لڑکی کو ہوں پر ہاتھ دھرے کھڑی تھی۔

”اوہ تھینک گڈ نیس تم مل گئے...“ وہ کوہوں کو تھپکتی کمرے میں چلی آئی ”یہ لو تمہارے سوا فغانی... اُس نے تنگی جین میں جانے اپنے آپ کو کیسے مزیدنگ کیا اور جیب میں سے چند نوٹ کھینچ کر میری جانب بڑھا دیئے۔

میں نے انہیں گئے بغیر جیب میں ڈال لیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ ”میں انتظار کر سکتا تھا۔“ اس نے جبکہ کمر بستر کے گدے میں انگلی چھبوتی اور میرے برابر بیٹھ گئی۔ ”ہمارے ہونٹل میں گدے نہیں ہیں۔“

جاوید صاحب ایک کونے میں کھڑے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے جیسے کمرے میں ہوں، گو یا آپ ہرات میں کسی نوڈیا کو نہیں جانتے... حضنت!  
”ہاں تو ایسا ہوا کہ بس رکتے ہی تم اپنا رک سیک اتارنے کے لئے پھٹ پر چڑھ گئے

”ہم دیے بھی باہر جا رہے تھے۔“ میں نے بستر سے جیکٹ اٹھائی اور لڑکی کا بازو تھام لیا۔ بیشک سونی صد لکڑی کا تھا، سخت اور کسرتی۔

”بے چلے حضرت؟“ جاوید صاحب شہزاد سے بولے۔

”آپ بھی چلیں۔“ میں نے تکلفاً دعوت دے ڈالی۔

آدنی عقلمند تھے، کھانسی کر کہنے لگے۔ ”ایک وہ قبلہ میری ہیں، دوسرے آپ ہیں“

بیچ میں ہم بڑے بوڑھے کہاں دھکے کھاتے پھریں گے، آپ ہو آئیے۔“

ہوٹل سے باہر تاریخی عمارتوں کی شکستہ اینٹوں کی پرانی باس مٹی، چپڑکی تازہ خوشبو مٹی پرستینوں اور کھالوں کی مخصوص بوجھ کہہ رہا ہے، جو کہ ہرات میں ہونے۔ اس شہر بہزاد میں سانس لینے کا پتہ بتلاتی ہے۔ دکانوں کے باہر خراسانی قالین اور لوڑکی کھالوں سے بنے ہوئے کوٹ اور کبل لٹک رہے تھے۔ ریتاح لڑکیاں انہیں رخساروں سے رنگتیں اور پھر قیمت پوچھ کر کندھے سکیڑتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں۔ بڑے بازار کی یہ دکانیں اب پہلے کی نسبت قدرے جدید ہو چلی تھیں کہ ان میں سے چند ایک کے ماتھے شیشے کے شوکیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ میں بے اختیار اس دکان کے اندر چلا گیا جہاں سے میں نے چھ برس پہلے ایک البی پوسٹین خریدی تھی جس نے طویل سفروں میں ایک نئی روح دینے کی مانند میرا سانحہ دیا تھا۔ دکان کا ان دنوں کاناو جوان اور ادب جوان مالک ایک جرمن لڑکی کا گودا چٹا پاؤں گود میں رکھے اس پر ایک نل بوٹ مٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوٹ فٹ کر کے اس نے چمڑے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ”سونی صد اونٹ کا چمڑا، بیس ڈالر۔“ اس کا سر کٹا ہاتھ جب حیوانی کی بجائے انسانی چمڑے تک آیا تو لڑکی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بہت مہنگا ہے۔“ اور پاؤں پیچ کر دکان سے نکل گئی۔

”اما۔ بہت سالوں کی بات ہے مگر مجھے یاد ہے، تم نے مجھ سے ایک پوسٹین خریدی تھی۔“ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے حد محبت سے بولا۔ کیسی مٹی؟

”وہ جرمن لڑکی؟“ غصیل ہوتی ہیں۔“

اور اسی وقت ہمیری نے شور مچا دیا۔ تمہیں پتہ ہے اس کا پیٹ... مجھے بھی ساتھ جانا پڑا، فارغ ہو کر آئے تو تم وہاں موجود نہ تھے۔ اب تمہاری رقم لوٹانے کی خاطر پچھلے تین گھنٹوں میں دس بارہ ہوٹلوں میں جا کر تمہارے بارے میں دریافت کر چکی ہوں۔ تم اپنا نام تو بتا کر نہیں گئے تھے اس لئے بے حد وقت ہوئی، صرف حلیہ بتا کر...“

”موٹی موٹی خرفناک آنکھوں...“ جاوید صاحب نے بتیابی سے نغمہ دیا۔

”ہاں۔“ وہ کھل کر ہنس دی۔ مجھے بڑے عجیب تجربے ہوئے۔ ایک ہوٹل والا کہنے لگا کہ موٹی موٹی آنکھوں والا صرف پاکستانی چاہیے یا افغان سے بھی گزارہ ہو سکتا ہے؛ باسٹرڈ، میں تو ان افغانوں سے فیڈا پ ہو چکی ہوں...“

”کہاں تک؟“

”یہاں تک...“ اُس کی ہتھیلی سینے پر جم گئی۔

”ہمیری اب کیسا ہے؟“

”سورہا ہے۔“ وہ بیزار ہو کر بولی۔ ”بڑے بازار میں ایک افغان نے اسے تقریباً نصف کیکلو شیش صرف دس ڈالر میں سپلائی کر دی۔ کمرے میں بیچ کر اس نے تین سگڑ بھرنے بھونکے اور اب سورہا ہے۔ سگڑ ہوں گے؟ نارمل سگڑ۔“

اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ڈلیسک والا نوجوان اندر آ گیا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے مگر کمروں میں خواتین کا داخلہ منع ہے... مردانہ کمروں میں۔“

”یہ خاتون ہماری مہمان ہیں۔“ جاوید صاحب نے ”ہماری“ پر خاصا وزن ڈالتے ہوئے گلوگیر آوازیں کہا۔

”پچھلی مرتبہ جب میں یہاں ٹھہرا تھا تو ایک صاحب نے کمرے میں بکر اپال رکھا تھا، اب خاتون پر بھی پابندی ہے۔“

”تب یہ ہوٹل پرائیویٹ تھا، اب سرکاری تحویل میں ہے...“ اُس نے پُر دُتار انداز میں سنجیدگی سے مطلع کیا۔

اُس کی چوٹی انگلیاں میرے ماس میں کھبتی چلی گئیں۔ میں نے کندھے اچکائے اور ہم دوبارہ اندر چلے گئے۔

پوسٹین پہن کر اُس نے میری جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سے آسودگی کا ایک ایسا بھرپور اور شہوت انگیز حیوانی جذبہ اُبُل رہا تھا کہ میں سناٹے میں آگیا۔ وہ اپنے رخسار اس پر اتنی بے چینی سے رگڑ رہی تھی جیسے اُس کے ساتھ ہم آغوش ہو رہی ہو اس کی پوری شخصیت بدل چکی تھی۔ لکڑی کا مجسمہ ایک خوبصورت پوسٹین کے لمس سے زندہ ہو گیا تھا، تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

”کیا قیمت ہے؟“ اُس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”سیونٹی ڈالر...“ دکاندار نے اُس کے جنسی اشتیاق کو ڈالروں میں تول کر قیمت لگا دی۔

”سیونٹی؟“ وہ ایک مفرد مجرم کی طرح بدک کر بولی۔ میں یہ پوسٹین کبھی نہیں خرید سکتی... میرے پاس تو صرف چالیس ڈالر ہیں... ادھ کر اسٹاپ یہ میری کیوں نہیں ہو سکتی... ادھ کر اسٹاپ“

اُس نے تھمتے ہاتھوں سے پوسٹین کو ایک کانچ کے لبادے کی طرح احتیاط سے اتارا، اپنے سامنے پھیلا کر ایک نظر دیکھا اور پھر ناامیدی کا ایک گہرا سانس بھر کے دکاندار کے حوالے کر دی۔ ہم باہر نکلے تو وہ ہمارے ساتھ ہی باہر چلا آیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے کہنے لگا۔ ”یہ لڑکی اگر تمہارے لئے کوئی خاص چیز نہیں ہے تو ایک بات کہوں۔“ میں خاموش رہا تو وہ ہونٹ بھیجنے کر ایک سازشی سرگوشی میں بولا۔ ”اسے کہو آج رات میرے پاس آجائے، صبح پوسٹین اس کی ہوگی۔“

سودا بازوں کے اس کھلے مظاہرے پر میں بے اختیار مسکرائے لگا۔

”یہ تو ایک عام امریکی لڑکی ہے... خان زمان کی بیٹی ہوئی پوسٹین کے لئے تو صوفیہ لورین بھی...“ فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

”نہیں۔“ اس کے آریائی نقوش ہنسنے لگے۔ ”میں اپنی پوسٹین کا پوچھ رہا تھا، کیسی تھی؟“

”بے حد خوش قسمت۔“ میں مسکراتے بغیر نہ رہ سکا۔ ”ہسپانیہ میں تو اس پر ایک جیتی جاگتی بکری عاشق ہو گئی تھی۔“

”خیر تم بھی اتنے بد قسمت نہیں ہو۔“ اُس کی چمکتی آنکھیں میری ساتھی لڑکی پر پھج گئیں۔ لڑکی نے تیز آنکھوں کو اپنے بدن پر کھینچے محسوس کیا اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

”تمہیں ایک اور پوسٹین دکھاؤں؟“ وہ بدستور اُسے گھورتا رہا اور پھر ایک میٹری پر چڑھ کر گیلری میں پڑے ڈھیر میں سے ایک پوسٹین اتار لایا۔ ”خان زمان کے مشاق ہاتھوں کی بنی ہوئی نادر پوسٹین... ہرات میں اس سے بڑا کارگر کوئی نہیں... پہن کر دیکھو گے؟“

پوسٹین کی پُر پیچ اور باریک کڑھاتی خان زمان کے قدیم فن کی گواہی دے رہی تھی۔ ”نہیں، اس مرتبہ میرا رخ ان خطوں کی طرف ہے جہاں شاید مجھے اس کی گرم رفاقت کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

”تو پھر یہ فلی بوٹ لے جاؤ۔“ طویل مسافتوں کے لئے بے حد موزوں۔“ اس نے مجھے کمرسی پر بٹھا کر وہی اونٹ کا چمڑا میرے پاؤں میں فٹ کر دیا۔ جرمین لڑکی کے پاؤں کی گرمی ابھی تک اُس کے اندر کلبلار ہی تھی۔

”کیسے ہیں؟“ میں نے پاؤں اٹھا کر لڑکی سے پوچھا۔

وہ جیسے چونک گئی۔ اس کی نگاہیں پوسٹین پر جمی تھیں۔ ”ادھ... سوپر...“ بوٹوں کی مناسب قیمت ادا کرنے کے بعد ہم دکان سے باہر آئے تو اس نے پھر میرا بازو تھام لیا۔ ”تم مانند تو نہیں کرو گے اگر میں اس پوسٹین کو صرف پہن کر دیکھ لوں... پلیز!“

”کیا کہہ رہا تھا؟“ لکڑی کا مجسمہ اپنی اصلی ہیئت میں واپس آچکا تھا۔

”اودہ کچھ نہیں، پوچھ رہا تھا ان دنوں کابل میں فلمیں کون کون سی لگی ہوئی ہیں؟“

”ہاں صرف یہ لو رین کا فین لگتا ہے۔“

”فین تو وہ تیرہ نہیں کس کا ہے بہر حال...“ میں نے جیب میں سے سوانحی کے نوٹ نکال کر اُس کے چہرے کے سامنے کر دیئے۔ ”سچ پوچھو تو مجھے ان کی واپسی کی کبھی امید نہ تھی، آؤ انہیں کسی رستوران میں جلادیں۔“

”مجھے الزبتھ کہتے ہیں، تمہارے لئے لیزا...“

”اور مجھے مستنصر کہتے ہیں، تمہارے لئے بھی مستنصر سی۔“

”بہت مشکل نام ہے، صرف ”مس“ نہ کہہ لیا کروں؟“

”مس؟ میں بدک گیا۔“ نہیں اس میں سے کچھ کچھ جو باپن دم ہلاتا ہے... میرا نام پکارنا بے حد آسان ہے۔ تم لوگ انگریزی میں MUST ANSWER نہیں کہتے بلکہ

دہی چیز ہے۔“

”مٹا سمر؟“

”تقریباً تقریباً۔“

رستوران میں بڑے گشت کے ریشہ دار تکے اور فرائی انڈے پڑے ٹھنڈے ہوتے رہے اور لیزا کم سم میٹھی رہی میں اس کی پُر اشتیاق آنکھوں میں خان زمان کی پوسٹین کی کڑھائی کے نقوش دیکھ رہا تھا۔

ہوٹل واپسی پر اُس نے مجھے میری کا حدود اربعہ بتایا۔

”ہماری ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ انہی دنوں ہم نے سنے راماتھیر میں ”جنت کی تلاش“ نامی ایک فلم دیکھی جسے نیپال، کشمیر اور ہنزہ میں شوٹ کیا گیا تھا۔ جنت کے ان مناظر کی غیر زمینی خوبصورتی نے ہمیں بے جان کر دیا اور ہم سنیا سکین پر دکھائے جانے والے رنگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے سفر نکل کھڑے ہوئے۔“

نیپال پہنچتے ہی میری کھٹنڈو کے نواح میں ایک پرانے مندر میں مقیم چند مہموں کے گردہ میں شامل ہو گیا اور پورے دو ماہ حشیش کے نشے میں آنکھیں بند کتے پڑا رہا اور اب ہمارے پاس اتنی رقم نہیں کہ کشمیر اور ہنزہ جا سکیں، چنانچہ واپس لندن جا رہے ہیں۔ اُس نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔ آج بھی ہی ہوا، ہوٹل پہنچنے سے پہلے اُسے گھاس دستیاب ہو گئی اور اب وہ بے سندھ پڑا ہے۔ اگلے بیس بیس روزہ ایک اوندھے پڑے مینار کی طرح گزرائے گا اور میں نرس بنی اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔“

وہ گلی بالکل تاریک تھی۔ ایک تنگ کوٹھڑی کے کھلے دروازے میں سے لائٹن کی مدھم روشنی باہر آ رہی تھی، اندر ایک بوڑھا کارگر کچڑے کے چوکور ٹکڑے کاٹ کر انہیں ایک ہینڈ بیگ پر ایک مخصوص ڈیزائن سے جوڑ رہا تھا۔ کل ہی بیگ بڑے بازار کا کوئی دکاندار اودے پونے داموں خرید لے جائے گا اور کسی یورپی خاتون کے ہاتھوں میں مانی قیمت پر فروخت کر دے گا اور پھر ناتواں ہاتھوں کی یہ خوبصورت تخلیق یورپ کے بازاروں اور اونچے درجے کے ہوٹلوں میں ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بنے گی... ہاں مگر بوڑھی ہڈیوں کا گودا جو محنت کی صورت میں اس پر صرف ہو رہا ہے اُس کی کیا قیمت پڑی؟ مشقت اور بھوک، بخانہ بمان بھی اس وقت اسی طور کسی کوٹھڑی میں پوسٹین پر جھکا ہوا ہو گا۔

ہم تھوڑی دیر تک اُس کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کو حیرت سے تکتے رہے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ گلی کے نامور پتھر وں پر لیزا کے ٹینس شوزا اور میرے ہراتی بوٹ اہمستہ اہمستہ چلتے رہے۔

”تم اکیلے ہی سفر کر رہے ہو؟“

”میں ہمیشہ اکیلے ہی سفر کرتا ہوں۔“

”سنو اب میں مزید بند کروں کی اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔ دن رات ہیری کی نرنگ نہیں کر سکتی۔ میں فوراً گھر لوٹنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں گھٹے سفر کریں؟“

”ہوں! میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

لکڑی کا یہ جسم دراصل اندر سے کیا ہے؟ سفید ہے تو نرم، خوشبودار گود پر پھسلنے کا امکان ہے اور اگر لکیر ہے تو زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگر میں اُسے رفیق بنالوں تو کیا میں انہی ٹیکنوں کو تو قبول نہیں کر رہا جنہیں میں دیوانگی سفر کی ریتی سے کار و طعن سے نکلتا ہوں؟ لیز یقیناً صبح ایک خاص وقت پر بیدار ہوتی ہوگی۔ چیزوں کا بارے میں پسند، ناپسند کا ایک مخصوص ردیہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے خزانے بھی لیتی ہو۔ یہ تو ایک باہمی سمجھوتہ ہے جسے کسی وقت بھی ایک طرفہ طور پر مغلوب کیا جاسکتا ہے۔

”کل صبح ایرانی سرحد کو جانے والی پہلی دکان میں اگر تم میرے برابر کی نشست پر آؤ تو میں تمہیں منع نہیں کر سکتا لیکن...“

ادہ قضینکس مسانسر...

”لیکن آتا بتا دوں کہ بندھنوں سے دل برداشتہ ہو کر گھر چھوڑتا ہوں تو سفر کے دوران میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ ہم صرف سفری رفیق ہوں گے اور یہ رفاقت کسی بھی اسٹاپ یا ریلوے سٹیشن پر خود بخود ختم ہو سکتی ہے... مگر مہری کا کیا ہوگا؟“

”وہ بچہ نہیں، ہوش میں آئے گا تو پہنچ ہی جائے گا گرتے پڑتے۔“

لیز اکا ہوٹل پستہ قد دیواروں اور نیچی چھتوں میں جکڑی ہوئی چند کوٹھڑیاں تھیں۔ قرائن سے ظاہر تھا کہ ماضی قریب میں اس عمارت میں مولشی بندھتے تھے۔ ہر کوٹھڑی سامنے باقاعدہ ایک ایک کھڑی بھی تھی جن کے اندر لیٹے ہوئے متعدد دھڑکتے ہوئے ٹانگیں نظر آرہی تھیں یا دھوئیں کے سُستی سے اُٹھتے مرغولے۔ مہری بھی کسی نوٹ میں دھرا تھا کہ اُس کی مہری کی بے مہری دھن دھوئیں میں سے فٹہرتی ہوئی پہنچ رہی تھی۔

”سنو! وہ اندر جانے سے پیشتر سر جھٹک کر بولی“ مجھے صرف سچ بتاؤ، اس نے دراصل کیا کہا تھا تم سے؟“

”کون سے افغان نے؟“

”وہی خوبصورت پوسٹین والا دکاندار۔ اُس نے تمہیں کابل میں دکھائی جانے والی فلموں کا تو نہیں پوچھا تھا، یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”اُس نے ایک پیشکش کی تھی...“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میں نے وہ پیشکش مہذب الفاظ میں لپیٹ کر لیز کے حوالے کر دی۔

”واقعی؟“ اُس نے یکدم اپنی کاٹھ کی انگلیاں میرے بازو میں پوسٹ کر دیں۔

”کیا کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ”یہ دکاندار ہر ٹورسٹ لڑکی کو ایک جیسا ہی سمجھتے ہیں۔۔۔“

”دیے ہیں اس سے ناراض نہیں ہوں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ ”کم از کم اس نے میری قیمت تو لگائی، ایک خوبصورت پوسٹین کے قابل تو گر دانا اور مہری...“

وہ چپکے سے اندر چلی گئی۔

واپسی پر بوڑھے کارگیر کی کوٹھڑی میں سے روشنی آرہی تھی۔ وہ اسی طرح ہکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ مگر اب وہ کھانا کھا رہا تھا۔

ہرات کے کوچہ و بازار تاریک ہو چکے تھے مگر پوسٹیمینوں والے بازار کے اقامت پر پھیلے مرکزی چوک کی ٹیوب لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ سبزہ زار کے مختلف حصوں میں بجلی کے کھمبوں تلے افغانوں کی ٹولیاں حسب پسند حقے یا نسوار سے شغل کر رہی تھیں۔ ابھی صرف دس بجے تھے اور میں فی الحال ہوٹل نہیں لوٹنا چاہتا تھا یا یوں کہیے کہ اس وقت لوٹنا چاہتا تھا جب اکڑے ہوئے جاوید صاحب نیند سے مدہوش پڑے ہوں۔ میرے چاروں طرف بے فکرے، آزاد چہرے تھے۔ میں ایک قریبی بیچ کی جانب بڑھا، جس پر ایک قدرے فریب، سفید بالوں والا غیر ملکی بوڑھا ہاتھوں کے پیالوں میں چہرہ لئے گم سم بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں گھاس پر براجمان ایک نونیز افغان مرچھکاتے

ایک سادہ رنگی نما ساز بجا رہا تھا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ میں نے سازنگی کی روتی ہوئی رگوں میں ڈوبے ہوئے بابے سے دریافت کیا۔

”ضرور، ضرور“ وہ چہرہ بلند کر کے بڑی گرجوشتی سے بولا۔ الفاظ کی ادائیگی غراہٹ نمایاں تھی۔ یقیناً جرم تھا۔

”میرے افغان دوست سے ملو“ اُس نے شامانہ انداز میں ہاتھ لہرایا۔ نوخیز افغان نے ساز پر سے گڑاٹھایا اور ایک صاف اور کھری خوشی اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”زیگاٹ۔ زیگاٹ۔“ جرم نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ پھر جھک کر بجانے لگا۔

”ہرات خوبصورت ہے“ جرم کے لہرتے باریک ہونٹوں سے یہ الفاظ ایک نظم کی طرح ادا ہوئے۔ ہرات، جرم لہجے میں، غیرات بن کر سامنے آیا۔ ”میں پچھلے ماہ سے یہاں ہوں اور اس دوران ایک لمحہ ایسا نہیں آیا جب میں اس کی قید سے آزاد ہوا ہوں، تم کب آئے؟“

”آج“

”اور کب جا رہے ہو؟“

”کل“

”ہا۔ ہا۔ خالص دیگا بانڈ... مگر یہ تو ہرات کے ساتھ زیادتی ہے“ وہ غامض ہوا، چند لمحوں کے لئے سازنگی کی دھن میں ڈوبا رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

”ہاں یہ ہرات کے ساتھ زیادتی ہے، صرف ایک روز کے لئے یہاں آنا۔“

دراگھاس پر بیٹھے اُس افغان کو تو دیکھو جس کے بدن سے چپٹیڑے لٹک رہے ہیں وہ پچھلے ایک گھنٹے سے گلاب کا ایک پھول اتنی نزاکت سے سونگھ رہا ہے جیسے کی بنائی ہوئی کسی مختصر تصویر کا الف لیلوی بادشاہ ہو۔ ترک بازیڈ کو جب تیمور

شکست ناش دی تو تاریخ دان گبن کہتا ہے کہ وہ اُس کے دربار میں اس طرح دھل ہوا کہ اس نے اپنی شکست خوردہ موجودہ حالت کو فراموش کر دیا اور اپنے وقار کو یاد رکھا۔ افغان چاہے کتنا ہی غریب اور لپساندہ کیوں نہ ہو وہ اپنے وقار کو یاد رکھتا ہے۔ اس قوم کی چال ڈھال میں ایک ایسی شان ہے جو میں نے ہسپانویوں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھی اور پھر ہرات کے ریگ آلود تاریخی کھنڈروں کا طلسم... اور اس کے بچ بستہ پانی... اور اس کی بدن کو چھونے والی ہوا... تمہیں شاید معلوم ہی نہیں کہیں کیا کدہ رہا ہوں۔ تم نے اگر زندگی کے بہترین تیس برس برلن کی کسی پچاس منزلہ عمارت کے ایک کمرے میں تن نہا بسر کئے ہوں، تب تمہیں معلوم ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں...“

بڑھا جرم نیم خود کلامی میں آنا ڈوبا ہوا تھا کہ میں اُسے آنا بھی نہ بتا سکا کہ ہرات سے یہ میری تیسری ملاقات ہے۔

سازنگی پر بچنے والی دھن میں کچھ بھی اداسی کے وہ گہرے بوجھ تھے جو انسان کو چند لمحوں کے لئے بے حس کر دیتے ہیں اور وہ تاریک پانیوں کی جھیل میں گر کر تاجلا جاتا ہے جیسے لاش کے ساتھ بھاری پتھر باندھ دیا جائے۔ مگر جو نہی بدن تہ کو چھوتا ہے توڑکے ہوئے دل والے مریض کو بجلی سے جھٹکا نہیں دیا جاتا، اُس کی حرکت واپس لانے کے لئے، اُسی طور ایک جھٹکا سالگتا ہے اور انسان دھڑکتا ہوا، زندہ ہو کر ایک مرتبہ پھر جھیل کی سطح پر ابھر آتا ہے۔ ہرات میں بچنے والی اس دھن میں مشرقی یورپ کی موسیقی کی پرچھائیاں تھیں۔ سُر خچوک میں بچنے والے اکار ڈین کے نفوں کی طرح۔ اور ہم دوس کی سرحد پر ہی تو سانس لے رہے تھے۔

”آپ اپنا دن کیسے گزارتے ہیں؟“

”میں...“ وہ چونک گیا۔ ”میں صبح سویرے تانگے کی سواری کرتا ہوں۔“

”تانگے کی؟“

”ہاں ایک ایسا تجربہ جس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ صبح کی تانگہ رائڈ کے بعد میں



سارا دن اُس کے نشے میں گزار دیتا ہوں۔ شام کو یہاں آ بیٹھتا ہوں اور یہاں  
صرف تیس افغانی کے عوض مجھے خراسانی موسیقی سناتا رہتا ہے۔ کیا زندگی اس  
ہو سکتی ہے؟

پچھلے تین ماہ سے روزانہ تانگے کی سواری اور سارنگی... یورپ کے ملکوں کی  
نے شاید اس جرمن کے کل پُڑوں میں فتور پیدا کر دیا تھا۔

ہمارے قریب سے ایک لمبا ٹرنکا بارش افغان منگتا ہوا گزرا۔ اس کی درازوں  
پکڑی میں سے نکل کر شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گھاس پر بیٹھے مچھلے نوجوانوں نے اُسے  
دیکھ کر قربان جاداں اور دلدار صدقے، قسم کے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے اور خوب خوب  
سیٹیاں بجاتیں۔ اُس نے ایک اداسے پکڑی کا پتو دانٹوں تلے دبا کر نثر ماتے ہوئے ناز  
میں کچھ کہا اور اسی طور پر بگلتا، مسکراتا چلا گیا۔ خواجہ سرا کسی بھی قومیت سے متعلق ہو، ایک  
عجبوہ ہوتا ہے مگر بچھان خواجہ سرا... ایک انگریزی محاورے کے مطابق یہ تو وہ ہے  
میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

”میرا خیال ہے تم میری تانگہ راڈ کے بارے میں سوچ کر مسکراتے جا رہے ہو؟  
جرمن مایوسی سے سر ملانے لگا۔ ”اور تم حتی بجانب ہو بالکل“

”آپ کس جگہ قیام پذیر ہیں؟“ میں نے صرف موضوع بدلنے کی خاطر بابے سے پوچھا۔  
”پہلے چند روز تو ایر پورٹ کے نواح میں ایک جدید ایر کنڈیشنڈ ہوٹل میں ٹھہرا  
مگر اب شہر سے باہر جہاں کچی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ سرکے میناروں کے پہلوں میں ایک  
چرواہے کے گھر میں مقیم ہوں، پے انگ گیسٹ کے طور پر، صرف پچاس ڈالر ماہانہ میں  
رہائش اور خوراک اور ایک گدھا سواری کے لئے مفت۔ کیا خیال ہے، فڈ بار...  
یہ فڈ رفل نہیں... گھر سے بالی جزیرے کے لئے رخت سفر باندھا تھا۔ ہرات جس کے  
سے آشنا تک نہ تھا، راستے میں آگیا اور اب یہیں سے واپس ہوگی“

”کب؟“

”جس روز میری حیب میں صرف واپسی کا کمرایہ رہ گیا۔“  
سارنگی نواز لڑکے کی انگلیاں اب تاروں پر تیرتی تیرتی بہکنے لگیں اُن دفوں  
میں جب وہ مراٹھا کر باغ کے درمیان میں شور مچاتے آتے آتے کریم والے کی جانب لپچاتی  
نظروں سے دیکھنے لگتا۔ جرمن بوڑھے نے اس کی بے چینی کا جواز پا کر طے شدہ معاوضہ اس  
کے حوالے کر دیا اور وہ سلام کر کے آتے کریم والے کی جانب چلا گیا۔ خنکی بڑھنے لگی جرمن اپنے  
بوڑھے بازوؤں کے بے جان ٹکٹے گوشت پر ہاتھ پھیرتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہر دوسرے  
فترے میں تانگہ راڈ کا ذکر آجاتا۔ وہ یہ لفظ ادا کرتے ہوئے ہر مرتبہ چھوٹے بچوں کی مانند  
مسکراتا، جیسے کہہ رہا ہو، یہ ایک خفیہ نقشہ ہے میرے خزانے کے جزیرے کا، تبادلگان میں  
آہستہ آہستہ سبزہ زار میں میٹھے لوگ اٹھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ٹیوب لائٹس بھی  
گل ہو گئیں۔ بوڑھا جرمن جس کا نام ہنرخ تھا، مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آیا، اپنے گھسٹے  
پاؤں کے باوجود۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برلن کے محاذ پر کسی روسی مشین گن سے  
نکلنے والی چند گولیوں کی یادگار۔

”تم کل صبح میرے ہمراہ تانگہ راڈ پر جانا پسند کرو گے؟“ وہ اُسی بچکانہ نثرات سے بولا۔  
”میں کل صبح چھ بجے کی دین سے ایرانی سرحد کو جا رہا ہوں“  
”لیکن تانگہ راڈ تو چار بجے شروع ہوتی ہے“ وہ کھکھلا کر ہنس دیا۔ ”میں تمہیں  
لینے آجاؤں گا“ اور پتھر کے فٹ پاتھ پر ننگڑا تا ہوا مگر ایک پُرمست چال سے واپس  
چلنے لگا۔

”کرے میں پہنچ کر میں کپڑے بدل رہا تھا کہ جاوید صاحب نے کمبل سے سر نکالا۔  
”اچھا تو اب تک... ہم نہ کہتے تھے آپ بڑے حضرت ہیں۔“  
میں خاموش رہا۔

”نوٹڈیا کو چھوڑ آئے؟“

”جاوید صاحب، یہ آپ ایک اچھی بھلی لڑکی کو نوٹڈیا ایسے ہیروہ لفظ سے کیوں

پکارتے ہیں؟ میں نے جھلا کر کہا۔

”اس لئے کہ صرف لڑکی کہنے سے میرے ذہن میں سکول کو جاتی، رہن باندھے ہوئے ایک بھلی سی بچی اُبھرتی ہے۔ البتہ لونڈیا...“ وہ ایک لمبا چٹخارے لے کر بل میں رُوپوش ہو گئے۔

نامعلوم سی دستک ہوتی۔ میں نے روشنی جلائے بغیر جلدی سے کپڑے پہنے اور دبے پاؤں باہر آگیا۔

”آجاء“ ہنرخ نے ہوٹل بھڑاکے تاریک برآمدے میں گھومتے ہوئے سرگوشی کی — ایک ایسا بچہ جو بزرگوں سے چھپ کر خفیہ خزانے کی تلاش کو جا رہا تھا۔

ہوٹل کے رُو برد اندھیری سڑک پر ایک تانگہ کھڑا تھا بالکل ساکت، مونہ چڑاؤ کے مٹی کے کھلونے ایسا۔ ہم قریب پہنچے تو گھوڑے کے نتھنے تھر تھرائے اور اس نے لمبے بھر کے لئے اپنے لمبے کان سیدھے کر کے ہماری آمد کی تصدیق کی۔ افغان کوچوان لگی نشست پر نیم دراز سکوٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ہنرخ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوچوان نے گھوڑے کے جسم پر کیپکپاتی لہروں کو تھپکا اور وہ پٹڑ میں پھنسے ایک جانور کی طرح گردن آگے نکال کر زور لگاتے ہوئے پہیوں کو حرکت میں لے آیا۔

میں نے ایک طویل سانس ہرات کی اُس صبح میں لیا جو خراسان کی نیم صحرائی وادیوں پر محیط ہو رہی تھی۔ شہر سے پرے خشک پہاڑیوں کے سلسلے میں سے ہمارے دونوں ٹرن کھڑے چرٹے کے درختوں میں سے اتر کر ہڑھپھیل رہی تھی۔ شفاف خشکی میں گندھی جیڑی کی مہک بدن کے ٹھہرے پانیوں پر چھبکی تھی۔ ایک گھسنے پتوں والی سرسبز مٹی مجھے چھو رہی تھی ہلکے ہلکے خوشبو کی سرد ہوا جو ہونٹوں کو رخ کر رہی تھی کسی سرد الپاٹن جھیل میں غوطہ زن بدن کا زیر آب بوسہ۔

ہنرخ اپنی نشست پر ایک یوگی کی طرح آلتی پالتی مارے گم سم بیٹھا تھا۔

”ہنرخ!“ اُس نے ہونٹوں پر انگلی جھا کر خاموشی کی تلقین کی ”گفتگو بعد میں ہوگی۔“ ”بٹی۔“ اُس شہر قدیم کی صبح میں گھوڑے کے پاؤں میں چھنکتے گھنگھرو اور ترکی میں شہزادوں کے جزیروں میں رواں بکھی کی بھین بھین، ایک ہی حسین تجربہ جواب ایک مختلف جغرافیائی سمت میں ظہور پذیر ہو رہا تھا، حسین تجربے بھی تو حسین عورتوں کی طرح ہوتے ہیں جن میں صرف ایک قدر مشترک ہوتی ہے، حسن۔ البتہ اُن میں سے گزرنے کا عمل، اُس عمل کا ذائقہ ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔

دائیں ہاتھ پر سنگ سیاہ کا ایک تاج محل گزرا۔ یہ مسجد جامع تھی جس کے گنبد اور مینار تاریکی میں تاریک ہو رہے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ تانگہ کن بازاروں، کون سی گلیوں میں سے گزرا صرف پٹری خوشبو اور بیخ ہوا مجھے اُس سفر کے ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ ایک دم گھنگھروں کی چھنکائی تانگے کے پیچھے ایک مختصر وقفے کے لئے جامد ہوئے اور پھر ایک دھچکے سے ہم تارکول کی سڑک پر سے اتر کر ایک کچے راستے پر رواں ہو گئے۔ تاریکی اگرچہ اب بھی مکمل تھی مگر اس کی سخت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم شہر سے باہر آچکے تھے۔ تانگے کی رفتار بتدریج کم ہوتی گئی گھوڑے کے بدن پر زور اور کوشش کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے پٹھے کھنچ رہے تھے۔ کوچوان نیچے اُترا اور حیران کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رُخ بلندی کی جانب تھا۔ ایک نامعلوم فاصلہ طے کرنے کے بعد تانگہ کھڑا ہو گیا۔

”یہاں سے پیدل جانا ہوگا۔“ ہنرخ ایک نوعمر لڑکے کی طرح چھلانگ مار کر نیچے اُترا اور اپنا ناکارہ پاؤں گھسیٹتا ہوا آگے چلنے لگا۔

یہ خراسانی صحرا کی ریت سے اُٹی ہوئی ایک خشک پہاڑی تھی۔ ہوا یہاں قدرے تیز تھی اور ہمارے قدموں تلے بھی ریت پر سرسراتی ہوئی گز رہی تھی جابجا بڑے بڑے پتھریں پڑے تھے جیسے خشک ہوتے ہوئے دریا میں سے مُردہ آبی جانوروں کے دھڑ

اُبھرتے ہیں۔ ہنرخ ایک تجربہ کار کوہ سپاہی طرح معتدل مگر باقاعدہ رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ سانس لینے کے لئے رُکا، مگر نہیں، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جسے وہ اپنے گھر کی طرح جانتا تھا۔

”تم بُرا نہ مانو تو میں اپنے پتھر پر بیٹھ جاؤں؟“ وہ کمال پُھرتی سے ایک ہی جست میں قریبی پتھر پر چڑھا اور اس کی ہموار سطح پر دھڑنا مار کر بیٹھ گیا۔ ”میں ہمیشہ اسی پتھر پر بیٹھتا ہوں۔“ میں ہمیں کھڑا ہوں؟ میں نے نیچے سے دُہائی دی۔

”نہیں نہیں۔“ وہ پُرسرت لہجے میں بولا۔ ”تم یہ برابر دالے پتھر پر بیٹھ جاؤ میرا خیال ہے مناسب رہے گا۔“

میں جب برابر دالے پتھر کے اوپر پہنچا تو میرے گودے گتے پھل چکے تھے اور اُن میں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

”اور اب؟“ میں نے ہانپتے ہوئے اُس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”اوہ خدا کے واسطے“ وہ چلایا ”میری جانب رخ کر کے مت بیٹھو، سامنے دیکھو۔“ سامنے بالکل تاریکی تھی۔ بہر حال میں نے سامنے ہی دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا کہ ”اب؟“

”اب۔“ اُس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”انتظار۔“

میں گھڑی کے چمکتے ڈائل کو آنکھوں کے قریب لایا، چار بجے تھے۔ یہاں تک چارہ اس بلندی پر بے تحاشا پھر پڑا ہی تھی۔ اس کی سر آسودگی نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ہنرخ کو دیکھ لیتا۔ وہ اپنے پتھر پر اُسی حالت میں گم سم بیٹھا تھا، البتہ اُس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یونہی گمان گزرا کہ یہ صاحب کسی ایسے قدیم مذہب کے پیروکار ہیں جس میں مُنہ اندھیرے تانے پر سوار ہو کر آبادی سے باہر نکل جانا اور پھر نزدیکی پہاڑی کے سب سے بڑے پتھر پر براجان ہو کر صرف ہاتھوں سے کوئی عبادتی رقص کرنا کا ثواب ہے۔ مگر اس کی نقل و حرکت کا جواز

بے حد سادہ تھا، وہ سگرٹوں میں چرس بھر رہا تھا۔  
دو تین سگرٹ کھینچنے کے بعد ہنرخ حواس باختہ ہو کر چلایا۔ ”مستنصر!“  
”کیا ہے؟“ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔  
”سامنے دیکھو۔“

سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ تاریکی تھی۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں ہنرخ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک ڈرے ہوئے جانور کی طرح کھلی تھیں اور وہ اپنے سامنے نظریں جمائے تھیں۔ اس سے سگرٹ چھوڑ کر رہا تھا۔ میں نے پھر سامنے دیکھا۔ تاریکی ہی تھی مگر قدرے ہلکی، اور یہ مزید ہلکی ہوتی چلی گئی جیسے سیاہ روشنائی میں ہولے ہولے پانی ملایا جا رہا ہو اور پھر نیچے پھیلا میدان ایک سیاہ نقشے کے صورت دکھائی دیا۔ اس نقشے پر لکیریں اُبھریں میدان نیم سیاہ ٹکڑیوں میں بٹنے لگا، خطوط واضح ہونے لگے۔ جس کسی نے ڈارک روم میں بیٹھ کر نیکیٹوس پر پرنٹ بنایا ہے وہ شاید میرے سامنے لمحہ بہ لمحہ اُبھرتی تصویر کا جھبہ آسانی سے پا جائے۔ نیکیٹوس پر ایکسپوز کرنے کے بعد جب آپ بظاہر سادہ تصویر کی کاغذ کو کیمیاوی محلول میں ڈبو کر آہستہ آہستہ ہلاتے ہیں تو تھوڑی دیر میں صاف چمکیلی سطح پر ہلکے ہلکے دھبے اُبھرتے ہیں۔ کاغذ کو محلول میں ڈبونے والا ہاتھ حرکت کرتا رہتا ہے اور دھبے خدا خال میں بدلنے لگتے ہیں۔ بالآخر ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب پوری تصویر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ کچھ اسی طور نیچے پھیلے میدانوں کی سپاٹ سطح پر مسجد جامع کے مینار، مدرسے کے کھنڈر اور گورہ شاہ کے مقبرے کا گنبد تاریکی میں سے وجود کی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ شہر ہرات کی تصویر دھیرے دھیرے صاف ہو رہی تھی۔ چند لمحوں تک یہ تصویر ہلکی بے نام روشنی میں نظر آتی رہی اور پھر الحمرا کے رنگ بدلتے ایوانوں کی طرح گلاب ہونے لگی۔ میری نگاہ شہر سے پرے کچے ٹیلوں اور صحرا کے آخر میں نمودار ہونے والے اُس نقطے پر ٹھہر گئی جو تبدیلیج بڑھتی ہوئی روشنی کا منبع تھا۔ اُبلتے ہوئے لادے کا ایک نشان۔ طلوع کا لمحہ قریب تھا۔

پہلی کرن اس نقطے میں سے پھوٹی، ایک سنہری کوئچ جس نے زمین اور آسمان کے ملاپ سے جنم لیا، اور پھر ایک تیر کی طرح تیرتی ہمارے سروں پر سے پرواز کر گئی۔ پھر ایک اور رو پہلی پرندے نے اپنے آپ کو آفتی کی قید سے آزاد کیا اور اڑنا ہوا ہم دونوں کے اوپر سے گزر گیا... پھر ایک اور... میں نے شاید آنکھیں جھپکیں کہ ان کے دوبارہ کھلنے تک ہمارے سروں پر سنہری کوئچوں کی ڈائریں اڑان کر رہی تھیں جیسے گندم کی سنہری بالیوں کو پر لگ گئے ہوں اور دیکھو، اب وہاں روشنی تھی۔ مقدس بائبل میں آیا ہے:

”زمین ابھی ایک خطہ دیریاں تھی اور تاریکی گہرائیوں تک چلی گئی تھی پھر رب نے کہا، روشنی ہو جا اور دیکھو، اب وہاں روشنی تھی۔“

ہاں، اب وہاں روشنی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی صبح تھی۔

سنہری کوئچوں کی ڈائریں ہمارے سروں پر سے پرواز کرتی رہیں اور بالآخر ان کا ہجوم بڑھنے لگا۔ کہ نہیں آپس میں مدغم ہو کر چمکتی روشنی میں بدل گئیں۔ ایک بہت بڑی سنہری کوئچ جس نے پورے آسمان کو اپنے چمکتے پروں سے ڈھانپ رکھا تھا ہنر کا نشہ اور سگرٹ اُس کی جامد انگلیوں میں چھنسا سلگ رہا تھا مگر وہ اس سے بے خبر ایک مجسمے کی طرح ساکت آفتی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری کھلی سگڑا باہوش نظروں نے طلوع کے اس منظر کو جتنا سحر آگیا اور زرفشاں دیکھا، چرس کا دھواں بدن میں پھیلا کر بھی اس کے سحر، اس کی چمک میں کمی تو شاید آجاتی مگر اضافہ ناممکن تھا۔ مگر مجھے بالآخر اس پتھر سے اٹھنا تھا، سامنے ظہور پذیر ہوتے تجربے سے وہ ہونا تھا اس لئے میں اپنے آپ کو فریب دے رہا تھا کہ میں بھی ہنر کی طرح لٹے ہیں ہوں۔ یہ سب کچھ اصل نہیں، ایک شعبہ ہے۔

خدا سان کے ویرانوں میں بکھرے کھنڈروں کی نیلی اینٹیں نیلیوں آئینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سورج کا زرد گلاب کھلتا چلا گیا اور میں مہبوت ہو کر دیکھتا رہا۔ ہرات میں دل کو لہانے والے عناصر ناپید تھے۔ نہ کوئی سپر مارکیٹ، نہ کوئی سکیر اور نہ ناٹ کلب۔ پھر یہ ہر ملاقات پر دل میں کھب کیوں جاتا ہے۔ خشک پہاڑیوں، کھنڈروں، بخر ٹیلوں اور کچے کوٹھوں ایسے کند مظاہر میں سے چاہت کے نیزے تیکھے ہو کر کیوں نکلتے ہیں؟ شاید یہ میرے اندر کا اجڑا دیہاتی ہے جو دھرتی کی خوشبو کو اُن تمام کاغذی خوبصورتیوں پر ترجیح دیتا ہے جو مکالمی انداز زندگی کے کارخانے میں تیار ہوتی ہیں۔ اس چمکیلے لمحے سے پشتیہ میں غرناطہ کا وہ اندھا فقیر تھا جس نے الحمر کے سُرخ قصر میں اُبلتے نوادروں کی سرگوشیاں تو سنی تھیں مگر رنگ بدلتے ایوانوں سے نا آشنا تھا۔

میں بھی ابھی تک ہرات کو صرف محسوس کرتا رہا تھا مگر آج اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ آفتی پر دائرے میں گھری روشنی نظروں کو خیرہ کرنے لگی تو ہنر نے آنکھوں پر ہتھیلی جاکر میری طرف دیکھا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سورج کو طلوع ہوتے ہرات میں دیکھا تھا۔ یہیں اسی مقام پر، اسی پتھر پر ہے۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس سے قبل برلن میں سورج کے طلوع ہونے کے اوقات رات کو مجھے ٹیلی ویژن کی اناؤنسر بتاتی تھی اور صبح کو میرا ٹیبل کلاک مستقبل میرے لئے ایک نیم تاریک برآمدہ تھا، جس کے آخر میں ایک مقفل دروازہ تھا بس۔ ناامیدی کے اس قفل کو اب سورج کی ان کرنوں نے پگھلا دیا ہے۔ طلوع کا یہ لمحہ مجھے روحانی مسرت کے پہلو بہ پہلو تمام تر جسمانی لذتوں سے بھی ہٹا کر کرتا ہے۔ یہ میرے لئے عورت کے جسم کا لمس بھی ہے اور شراب کی مدہوشی بھی۔ وہاں مجھے الیکشن کے نتائج، برلن کی دیوار، سیاسی اغوا اور ڈوش مارک کے آثار چڑھاؤ کے بارے میں تشویش رہتی تھی۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام میری خوشیوں کے ترانوہ تھے، لیکن پچھلے تین ماہ سے میں نے اخبار یا ٹیلی ویژن کی شکل تک نہیں دیکھی اور تمہیں پتہ ہے پاکستانی نوجوان کہ اس سے میری زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی... آؤ

اب واپس چلیں۔“

ہم اپنے پتھر کے سنگھاسنوں سے اترے اور نشیب میں کھڑے تانگے کی جانب بچے لگے۔ مہرخ کی آنکھیں سرخ تھیں، ہنستہ آدھ گھاس کے اثر سے مگر اس کے چہرے کی مفری انہی آنکھوں کے سامنے بدلنے والے منظر کی مہربان منت تھی۔

”میں پہلی مرتبہ سفر پر نکلا ہوں مگر تم تو شاید ایک عادی آوارہ گرد ہو۔ مجھے بتاؤ کہ جب میں واپس برلن جاؤں گا اپنے چچا سے منزلہ کمرے میں، تو زندگی کیسی ہوگی؟“ وہ میرے کندھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ اُس کے کھسٹے پاؤں کا بوجھ میرے کندھے نے محسوس کیا۔

”آپ پھر سے کنڈیشنڈ ہو جائیں گے۔ عادی ہو جائیں گے ٹیلی ویژن، اناؤنسر، کڑی چہرے کے، اُس کلاک کے جو آپ کی سائنڈ ٹیبل پر اس وقت بند پڑا ہے اور اخبار کی انہی شہ سرخیوں کے، کیونکہ ایک انوکھا تجربہ، ایک ایڈ وینچر تو بدن میں آزادی، خوف اور محبت کے جذلوں کا گندھا ہوا بارود ہے جس میں ایک لمحے میں ہی جھک سے اٹھاتا ہے۔ بعد میں صرف دھواں رہ جاتا ہے اور یہ لمحے آپ کے کسی کام نہیں آسکتے کسی ہی انوکھے تجربے کو آپ تو وسیع نہیں دے سکتے۔ ایک معینہ وقت کو کھینچ کر اپنی پوری زندگی پر محیط نہیں کر سکتے۔ وہ ایک خاص لمحے کے بعد آگے نہیں بڑھتا، مر جاتا ہے۔ اسی لئے تجربہ کہلاتا ہے۔ اس آخری لمحے کے بعد وہ ایک سوکھی ٹہنی کی طرح ہمارے بدن کے شجر سے ٹوٹ کر ماضی کی بنجر زمین میں گر جاتا ہے۔ ہاں اگر ہم میں تخیل کی بے پناہ صلاحیت ہو تو وہ ہمارے سامنے پھر سے پھوٹتا ہے۔ ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے زندہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ ورنہ وہ ماضی کی گہری دھند میں ہمیشہ کے لئے رُو پوش ہو جاتا ہے۔“

”لیکن اس بات کا تعین کیسے ہوگا کہ تجربہ ختم ہو چکا، وہ آخری لمحہ آن پہنچا؟“

”جوئی ہم سکوت کے سمندر میں سے نکل کر اُس کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں جیسے اب...“ میں ریت میں پاؤں جما کر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ”جوئی اُس کی حرارت بدن چھوڑنے لگتی ہے۔ اُسی وقت جب ہم میں اس تجربے میں سے دوبارہ گزرنے

کی خواہش سر اٹھاتی ہے... جوئی نارمل زندگی شروع ہو جاتی ہے۔“

”میرا خیال ہے تم درست نہیں کہہ رہے۔“ وہ میرے کندھے پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ اُس کا ناکارہ پاؤں اسے اذیت دے رہا تھا۔ ”مجھ میں صلاحیت ہے کہ میں آج کے لمحے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لوں کیونکہ جب میں واپس جاؤں گا تو میری جیب میں طلوع کے ایسے سینکڑوں لمحے ہوں گے۔ تم نے وہ گیت نہیں سنا کہ ایک گرتے ہوئے ستارے کو پکڑ کر اپنی جیب میں ڈال لو اور اُسے کبھی بچھنے نہ دو تاکہ خزاں کی تاریک راتوں میں وہ تمہیں روشنی دے۔ پس اسی طرح میری جیب میں بے شمار ستارے ہیں یا دیں ہیں۔“

”مہرخ یادیں تو ایسے کھوٹے سکے ہوتی ہیں جو صرف اتنی تسلی دے سکتی ہیں کہ تم دوسروں کی نسبت تجربے میں زیادہ امیر ہو۔ ان کھوٹے سکوں سے دنیاوی طور پر کوئی منافع بخش کاروبار تو نہیں کیا جاسکتا۔“

”بہر حال تم تو آج ہرات چھوڑ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں راستے میں کوئی کھرے سکے مل جائیں۔ فی الحال مجھے ایسے ہی کھوٹے سکے جمع کرنے دو۔“

تانگے کے پیچھے حرکت میں آئے اور ہم ایک مرتبہ پھر نارمل زندگی کی جانب رواں ہو گئے۔ یوں تجربے کا آخری لمحہ بھی ختم ہو گیا۔ ہمارے بدن کے درخت سے ایک سوکھی ٹہنی ٹوٹی اور ماضی کی بنجر زمین پر گر گئی۔

∴ ————— ∴

## باہر رات ہے

آسمانوں پر محیط سنہری کونج پرواز کر چکی تھی اور اُس کی جگہ ایک سفید چمکتا آسمان  
تھا، تیز دھوپ تھی۔

”ہیلو مسٹرس“ ہرات سے ایرانی سرحد تک جانے والی دیگن کے باہر لیزا  
کھڑی تھی۔ میں نے برابر کی خالی نشست پر نگاہ ڈالی اور باہر آگیا۔

”بنا ہے کیا؟“ اس کی چوٹی انگلیاں میرے گال پر ثبت ہو گئیں۔ ”تہا ری  
آنکھیں سُرخ کیوں ہو رہی ہیں؟“

”میں نے اس کائنات کے پہلے طلوع آفتاب کو ننگی آنکھوں سے دیکھا ہے  
اس لئے..... اور دیکھو اب وہاں روشنی ہے۔“

”کہاں؟“ اس کے چہرے سے تحیر کی کونپل پھوٹی۔

”وہاں“ میں نے شہر سے فرار ہوتی سڑک کا راستہ روکے کھڑی بھوری پہاڑیوں  
کی طرف دیکھا۔

”تم یقیناً میری طرح افغانی جس کے کش لگاتے رہے ہو“ وہ ایک پشیمان  
سی ہنسی ہنس دی۔ ”دیکھو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے..... اور جو کچھ میں تم سے کہنا  
چاہتی ہوں اسے سن کر تم مجھ سے فیداپ ہو جاؤ گے۔“  
”کہاں تک؟“

”یہاں تک“ اُس کی متبیلی ایک مکانی سپاہی کی طرح سیلوٹ کر  
سینے پر جم گئی ”لیکن....“

”تم نے میرے ہمراہ سفر کا ارادہ ترک کر دیا ہے“

”ہاں.... اور مجھے افسوس ہے“ اُس نے نظریں نیچ کر لیں۔

ہوناں کہ میں ہیری کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے جو  
سہارے کے بغیر یہیں کہیں مشرق میں گم ہو جائے گا مر جائے گا۔

”ہاں میں سمجھتا ہوں لیزا....“ میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ ”خدا  
اور خوش نصیبی تمہارے ساتھ ہو“

”مجھے خوش نصیبی کی کیا ضرورت ہے“ وہ اپنے سیاہ پیراہن پر ہاتھ بھر  
ہوئے تلخی سے بولی۔ ”میسرنہ ہو تو میں اس کی قیمت ادا کر کے خرید بھی تو سکتی  
....“ اس نے جیبوں میں ہاتھ مٹھوئے اور سر جھٹک کر چلی گئی۔

افغان دکاندار نے کہا تھا، لیزا تو ایک عام سی امریکی لڑکی ہے۔ خان  
کی پوسٹین کے لئے تو الزبتھ ٹیلر بھی....! لیزا واقعی ایک عام سی امریکی لڑکی  
وہ بازار کے درمیان میں چل رہی تھی اور خان زمان کی سیاہ پوسٹین اُس کے  
جسم کے ساتھ بڑے وحشیانہ انداز میں لپٹی چلی جا رہی تھی۔

بقارہ مدیسے کے سربریدہ میناروں نے مجھ پر اپنائیت کے نیلے  
ڈالے کہ اُن کی نیم شکستہ نیلی ٹائلیں دھوپ میں چمک رہی تھیں اور ہمارے  
دھول اُڑاتی ہوئی اُن میں سے گذر گئی۔ ایران سے آنے والے سیاحوں پر  
ہرات کے پہلے سائے انہی میناروں کے پڑتے ہیں۔ میناروں سے پہلے  
کے ایک ڈھیر میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اُن کے باہر چند آسودہ مزاج  
منہ اُٹھائے شرک کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جبر الدائر کنڈیشہ ہوٹلوں کے۔

چوڑ کر ہیں کہیں کسی کچی کوٹھڑی میں سنہری کوئنج کے پروں میں گم مزے سے  
سورہا تھا۔

ہرات سے باہر نکلتے ہی سائیکل سواروں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو  
لیا۔ مشقت کرتے ہوئے جسم پسینے سے چمک رہے تھے اور وہ اپنے پہیوں پر ایک  
ایسی سنڈی کی طرح کبڑے ہو رہے تھے۔ جسے تنکے سے چھوا جائے تو وہ اپنا درمیانی  
دھڑنور اُپر اٹھا کر وہیں جم جاتی ہے۔ ہالینڈ کے رہنے والے اس جوڑے  
سے یہ میری پہلی ملاقات نہ تھی۔ سید خاں کی بس کاٹاٹر پچھونے پر جب میں قریبی پہاڑی  
سلسلے پر جا براجمان ہوا تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے انہیں اپنے نیچے پسلی طویل شرک پر دو نقطوں  
کی موت میں بیگتے دیکھا تھا۔ پھر چھوٹے مرگ کے ایک تھوخنے میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں میاں  
یونی سنگا پور سے ہالینڈ تک سائیکلنگ کر رہے تھے۔ وہ پاکستان کے بارے  
میں بے حد شاک تھے کہ وہاں ایک علاقے میں سے گذرتے ہوئے ایک بار لیش  
بزرگ کی قیادت میں لوگوں نے خاتون کی اس ”بے حیائی“ پر اُسے پتھر مارے  
کہ وہ پیادہ اوڑھ کر سائیکلنگ کیوں نہیں کرتی، نیکر اور ٹی شرٹ کیوں پہننے  
ہوئے ہے۔ اُسے یوں نیم برہنہ دیکھ کر پورے ملک کا اخلاق خطرے میں پڑ  
سکتا تھا۔ نیم خواندہ افغانستان انہیں پسند تھا۔ جس کے وسیع صحراؤں میں وہ  
تن تنہا سفر کرتے رہے اور کسی نے اُن کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک  
جگہ چڑھائی شروع ہوئی تو وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر ویگن سے پرے ہو گئے اور  
سائیکلوں سے اتر کر انہیں بلندی کی طرف دھکیلنے لگے۔

ہرات سے دو گھنٹے کی مسافت پر اسلام قلہ کی سرحدی چوکی تھی۔ جہاں پر  
ویگن ڈرائیور نے ہمارا سامان چھت سے اتارا اور کسم ہاؤس کے ایک بوسیدہ کمرے  
میں ڈھیر کر دیا۔ کسم افسر صاحب چونکہ ابھی ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس  
لئے کام بنا کہ آپ لوگ اتنی دیر میں وہ سامنے جو خیمہ ہے اُس میں براجمان ہیلٹھ  
افسر سے اپنے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مہر ثبت کروالیں۔ ہیلٹھ افسر شلوار اور نیل

ساتھی نے انتہائی بجا جت سے فارسی میں کوئی داستان شروع کر دی۔ اُدھر سے کوئی سخت سا جواب آیا۔ کیونکہ غلام محمد کا منہ ٹسک گیا۔

”کیا کہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہتا ہے کہ ٹی بی کے ٹیکوں کے بغیر آپ سرحد عبور نہیں کر سکتے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ آپ سب کو ٹیکے لگائے جائیں گے....“

”تو لگو لیتے ہیں“

”چار مرتبہ لگیں گے“ غلام محمد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر ہفتے کے بعد۔ یوں پورا کورس ایک ماہ میں مکمل ہوگا اور یہ عرصہ ہمیں کسٹ ہاؤس سے باہر واقع خاردار تار میں گھرے کورنٹیں کیمپ میں گزارنا ہوگا....“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے ہراساں ہو کر کہا۔

”ہو سکتا ہے“ غلام محمد آرام سے بولا۔ ”افغانستان ہے بابا.... اور کہتا ہے کہ ایک ماہ بعد آپ بے شک مہنسی خوشی سرحد عبور کر جائیے گا“

”ایک ماہ؟“ میں نے سراپکی کا تھوک نکلنے کی ناکام کوشش کی ”یہاں اس ویرانے میں؟ واپس پاکستان جانا پڑے گا“

”کہتا ہے واپس بھی نہیں جاسکتے“

”پھر؟“

”پھر آپ باہر چلیں ہیں دوبارہ کوشش کرتا ہوں“

ایک طویل وقفے کے بعد ایک مسکراتا ہوا غلام محمد باہر آیا اور مخلوق کے سوکھے حلقوں اور کپکپاتی انگلیوں کو نوید دی کہ صاحب کہتا ہے میں ابھی تمام ٹیکے لگا کر مہر لگا دیتا ہوں البتہ اس رعایت کے لئے سوافغانی فی کس ٹیکوں کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔ ہم اطمینان کے گہرے سانس لیتے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے۔ شامی سے دو سو افغانی صاحب کی پتیلی پر رکھے اور آستینیں چڑھا کر بازو آگے کر دیئے۔ صاحب نے

پہنے ایک بچ پر سزار بٹھا تھا اور اس کے آگے میز پر رنگ برنگی دو دائیوں کی بڑی بکھری پڑی تھیں۔ وہ ہر ایک کے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر مہر لگاتے البتہ جوہی کوئی پاکستانی سامنے آتا ہے خیمے کے ایک کونے میں کھڑے ہو جاتے اور دے دیا جاتا۔ جب دیگر قومیتوں کے سیاح فاسخ ہو کر خیمے سے باہر نکل گئے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انتہائی بیزاری سے کہا ”تمہارے سرٹیفکیٹ نامکمل ہیں ان پر ٹی بی کے ٹیکوں کی مہر نہیں ہیں“

”لیکن جب میں طورخم کے راستے افغانستان میں داخل ہوا تھا تو اس بارڈر تو اس سرٹیفکیٹ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا تھا“ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”مجھے اعتراض ہے“ اس نے یکدم گرج کر کہا ”آئی ایم ہیلتھ آفیسر“

”لیکن جناب....“ میں ابھی ایک انتہائی عاجزانہ قسم کی گفتگو کا آغاز کرنے ا تھا کہ اُس نے باہر کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے ڈنڈا اٹھا کر ہم سب کو نیچے خاردار کر دیا۔

صورت حال تشویشناک تھی۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مہر کے بغیر ہم سرحد عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سامنے پاکستانی بھائی بند سہمے ہوئے کھسر پھسر کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ اس میں سے بیشتر لوگ نوکریوں کی تلاش میں جلا وطن ہوئے تھے اور سفر کے دوران ذرا برابر قانونی یا غیر قانونی دشواری بھی انہیں ہراساں کر دیتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ ہم میں سے ایک شخص ہمت کر کے دوبارہ اندر جائے اور افسر صاحب سے اس مشکل کو حل کرنے کا طریقہ دریافت کرے۔ مجھے اس مشن کے لئے متفقہ طور پر چن لیا گیا۔ میں اندر جانے کے لئے کمر کس رہا تھا کہ ملیشیا کی شلو اور قمیض میں ملبوس ایک دیہہ نوجوان نے مجھے ہوئے مجھ سے کہا ”صاحب میرا نام غلام محمد ہے، مجھے بھی لے چلو۔ پشتون ہوں اور“

خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی افسر صاحب گرجتے کیلئے پرتول رہے تھے کہ میرا



اپنی زنگ آلود سرنج میں کوئی رنگدار شے بھری ہمارے بازوؤں کی جانب دیکھا اور پھر اُسے میز پر رکھ کر ہمارے سر ٹیفکیٹوں پر مہربان لگا دیں۔

”اور ٹیکے؟“

”تم سب خاصے صحت مند ہو، تمہیں ٹی بی نہیں ہو سکتی“ وہ بیزاری سے بولا، ”لیکن اگر کسی نے اعتراض کیا تو؟“

”آئی ایم ہیلتھ آفیسر“ وہ گرج کر بولا۔

ہم اپنے سر ٹیفکیٹ سیٹ کر فوراً باہر آ گئے۔ کسٹم ہاؤس میں پہنچے تو ہمارا سارا سامان پر ڈال کے بعد وگن کی چھت پر باندھا جا چکا تھا۔ غلام محمد نے اُڑا شکایت کسٹم آفیسر سے کہا کہ ہیلتھ آفیسر نے بڑی بد تمیزی کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم سے ناجائز طور پر سو سو افغانی وصول کر کے مہر لگائی ہے۔

”بہت بُرا آدمی ہے، بہت بُرا“ اُس نے ایک چوڑی مسکراہٹ لگا کر کہا، ”میک چھیلایا“ میرا خیال ہے میں تمہارا سامان دوبارہ چیک کروں۔ اُس میں سے ضرور کوئی قابل اعتراض شے برآمد ہو جائے گی“

میں نے غلام محمد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں جلدی سے باہر آ کر وگن بن سوار ہو گئے۔ ادھر ہمارے وگن اسلام قلعہ کی عمارت سے نکل رہی تھی اور اُدھر وہی سائیکل سوار جو راسیڈیاں بجاتا ہوا کسٹم ہاؤس کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

ایرانی سرحد پر طیب آباد کے دھول آلود قصبے کی بجائے اب ایک نیا ٹو شینے اور المونیم کا بنا ہوا وسیع کسٹم ہاؤس تھا جہاں پاسپورٹ اور چیکنگ کے برائے بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے کسٹم ہاؤس کے شوکیسوں میں وہ سوٹ کیسا مائراور مختلف اشیاء بھی سچی تھیں۔ جن میں چرس وغیرہ چھپا کر سہول کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان شوکیسوں کے اوپر مقرر حضرات کی تصاویر آویزاں تھیں اور ان پر عرب حروف میں قومیت درج تھی۔ فرط جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے میں

دیکھا کہ اس شے میں ہم ایک مثالی ملک بن کر اُبھرے تھے۔ بیشتر تصاویر اپنے پاکستانی بھائیوں کی تھیں۔ دس شوکیسوں میں سے سات پر ہمارے پیارے ملک کا نام لکھا رہا تھا۔ یعنی ساری دنیا ایک طرف اور ہم ایک طرف۔ اللہ کرے زور..... کسٹم ہاؤس کے باہر مشہد جانے والی ہوائی جہاز نمائیں کھڑی تھی۔ کنڈکٹر بے حد رقیق القلب واقع ہوا تھا، چنانچہ اُس نے ہر مسافر سے اُس کی حیثیت کے مطابق کرایہ وصول کیا جو معمول سے دگنا تھا۔ مسافروں میں سری لنکا کی پہننے والی ماں بیٹی بھی شامل تھیں جو مداس سے یہاں تک مسلسل سفر کرتے کرتے اتنی چکر چکی تھیں کہ ہر بات پر کہتیں ”بھائی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہم جا رہے ہیں کہ آ رہے ہیں؟“ قد بُت اور چہرے میں ایک دوسرے سے اتنی مشابہت تھیں کہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کوئی ماں ہے اور بیٹی کوئی ہے۔ چنانچہ ایک سرسری سی نشانی یہ تھی کہ اگر ان کی طرف دیکھا جائے تو جو مسکرائے گی وہ بیٹی ہوگی اور..... ظاہر ہے دوسری ماں ہوگی۔

اُسی شام ہم مشہد پہنچ گئے۔ تہران کے لئے بس سات بجے روانہ ہوتی تھی، ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنی نشست مخصوص کر دائی، سامان لگے کپڑے میں رکھا اور اوٹے سے باہر آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر میرا رخ اُن نیلے گنبدوں اور میناروں کی جانب تھا۔ جن کے سائے تلے ایک ایسی مٹی موعنواب ہے جس کے دم سے ایران سانس لیتا ہے، زندہ ہے، ہم ایسے لوگ تو کائنات کی ناقابل فہم وسعت میں غور و بین سے بھی نظر آنے والے برٹوے ایسی زندگیاں رکھتے ہیں۔ ہم شہروں کی جانب جاتے ہیں کہ اُن میں آباد ہو سکیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے خود کائنات سمٹ کر جڑو مہ بن جاتی ہے۔ شہران لوگوں کی طرف آتے ہیں تاکہ خود کو آباد رکھ سکیں۔ بلخ کے ایک

اور ان میں جبراً ہوا ایک پانچ سالہ گول مٹول بچہ لوگوں کے سروں کے اوپر معلق تھا۔ بچے کی چھوٹی ہتھیلیاں دوسنے کی جالی چھونے کے لئے بے چین تھیں۔ جالی اُس کی کانپتی انگلیوں کے قریب آتی تو نیچے جوم میں پھنسے ہوئے اُس کے باپ کے پاؤں کے بے اختیار اکھڑتے اور پھر دور ہو جاتا۔ بچہ مایوس ہو کر زور زور سے سر ہلاتا اور پھر جدوجہد میں مصروف ہو جاتا۔ ایک مرتبہ خاصی دیر تک دوسنے کی جالی اس کی پہنچ سے صرف چند پانچ کے فاصلے پر رہی اور وہ اپنے آپ کو کھینچ کھینچ کر اُس کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اس بار بھی جوم نے اُس کو دور کر دیا۔ بالآخر تھک ہار کر وہ واقعی بچہ بن گیا۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو بھینچ کر جیسے جالی کو اپنے پاس بلانے لگا۔ التجا کرتے ہوئے، ضد کرتے ہوئے، غصے میں بڑبڑاتے ہوئے، امام سے ناراض ہوتے ہوئے..... اور پھر اس کی کھلی انگلیاں جالی کی جانب مقناطیس کی طرح تیرنے لگیں یا شاید جالی اُن کی جانب کھینچتی چلی گئی اور پھر دوبارہ لگی کی پھانکوں ایسے ہونٹ اس پر ثبت ہو گئے۔ میری آنکھوں کے کونوں میں نمی کے دو نقطے پھوٹے اور ایک کیر کی طرح چھپتے چلے گئے، مجھے اپنے بیٹے یاد آ رہے تھے۔

میں دوسنے سے باہر نکلنا تو ایک جم غفیر امام کے حضور پناہ لینے جا رہا تھا نا کہ خود کو آباد رکھ سکے۔

میں نے پینک میں مست ایک معجون کی طرح دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ بس کی ونڈ سکرین پر پھوار پھیل رہی تھی۔ واپس کا سہاگہ شیشے پر پھسلنا تو لمحہ بھر کے لئے صبح کی ہلکی سفیدی نظر آ جاتی۔ میرے برابر کی نشست پر تہران یونیورسٹی کا طالب علم رضا ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ پچھلی شب مشہد سے روانگی کے بعد ہم دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے تھے۔ مگر جوہی میں اُس سے شاہ کے باپے میں کچھ پوچھتا تو وہ جبراً مقفل کر کے بس سے باہر دیکھنے

بزرگ خواب میں دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ اُن سے مخاطب ہیں۔ ”میرا جسدِ فانی شہر سے دس کوس کے فاصلے پر دفن ہے۔ اُس مقام کو پہنچا تو یہی خواب جب مسلسل سات روز تک وارد ہوتا رہا تو بزرگ نے اُس مقام پر جا کر کھدائی کی، چند ہڈیاں برآمد ہوئیں اور ایک قرآن پاک جو حضرت علیؑ کے ہاتھوں کا تحریر کردہ تھا۔ اُس ویرانے میں ایک عالی شان مزار تعمیر ہوا۔ آہستہ آہستہ بلخ کے باسی اہل مزار کی جانب کھینچنے لگے۔ بلخ ویران ہوا اور مزار شریف کا ویرانہ آباد ہو گیا۔ اسی طرح مشہد ایک دیران گاؤں تھا اور چند کوس کے فاصلے پر فردوسی کا شہر ٹوس پڑا تھا۔ امام رضاؑ نے گنبدِ شاہی کی بجائے عوام کی سانسوں میں سانس لے کر زندہ رہنے کا قصد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ مشہد میں دفن ہوئے اور اُن کی ابدی بادشاہت کا اقرار کرنے کے لئے ٹوس اُجڑا اور مشہد کا بے نام قصبہ اُن کے دم سے آباد ہو گیا۔ دوسنے کی پُریچ جالی بھونکی آنکھ ہے جس کے گرد جم کر کھڑا ہونا ناممکن ہے۔ جوم کی لہروں کا زور آپ کو گردش میں لے آتا ہے اور آپ آنسوؤں سے بھیگے چہروں، جالی کی جانب پھڑپھڑاتے تباؤں میں شامل ہو کر طواف کرنے لگتے ہیں۔ میں کائنات کا ایک چھوٹا سا جبرِ ثومہ اُس ہستی کے مرتد کے گرد بہہ رہا ہوں جو خود ایک کائنات تھی.... دہقان تھا آذر بائی جان کا اور اُس سیاہ چادر میں اُس کی بیوی بند تھی۔ یہ صاحبِ تہران کے کروڑ پتی مودا گر تھے اور اس جدید بات میں اُن کی سوس سکول میں اخلاق یافتہ بیٹی یہ ایک تبریزی ملا تھا اور اُس کے جانے تم کے مدد سے کا ایک طالب علم، ادھر ایک فلسفی تھا اور اس کے قریب شیراز کا ایک حکیم۔ مگر یہ ظاہری پہچان چاندی کے ان دیز دروازوں میں داخل ہونے سے پیشتر تھی۔ اس وقت وہ صرف آنسوؤں سے بھیگے چہرے ہیں، پھڑپھڑاتے باز ہیں۔ یہ سب ہیریں ہیں جو دریا یاد کر کے رانجن کے ڈیرے تک پہنچنا چاہتی ہیں۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جس کے دونوں بازو فضا میں بلند تھے اور

لگتا۔ قد سے توقف کے بعد وہ منہ پھیرتا اور کہتا: ”باہر رات ہے۔“

”جی، ہم حضرات“، نکلے تری تلاش میں“ کے سلسلے میں یورپ گئے تھے: ”اُن میں

سے ایک منہ بنا کر بولا۔

”جی؟“ میرا سگرٹ لبوں تک جاتے جاتے رُک گیا۔

”آپ مستنصر حسین تارڑ کو جانتے ہیں؟“ بڑھی ہوئی دائرہ والے لڑکے نے

دہی کا جچہ منہ میں گھسیڑتے ہوئے غصے سے پوچھا: ”یہ اُسی گدرے کے..... کی

کارستانی ہے؟“

اب میں باقاعدہ ندوس ہو گیا۔ مگر میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ اس گدرے

کے..... میرا مطلب ہے میرے بارے میں اتنے پر خلوص جذبات کیوں رکھتے

ہیں مگر وہ تو یہ بیان دے کر مڑے سے دہی کھانے لگے تھے۔

”یہ جو..... بہت میٹرھے نام والے حضرت کا حوالہ آپ نے دیا ہے تو انہوں

نے یقیناً آپ پر بہت برا ظلم وغیرہ کیا ہے؟“

”ظلم؟“ وہی پر خلوص نوجوان چپک کر بولا: ”ہماری بیڑیوں میں بیٹھ گیا جی۔

سفر نامے وغیرہ لکھتا ہے۔ اس کا ایک سفر نامہ پڑھ کر ہم تینوں دوستوں کی عقل کا

میٹر مخالف سمت میں گھوم گیا اور ہم اپنے اپنے دھندے چھوڑے، اُس کی کتاب

بغل میں داب آوارہ گردی کے لئے نکل کھڑے ہوئے..... اب پتہ نہیں واسپی

پر اسے موٹر میکینک کا کام ملتا ہے یا نہیں۔ میرے بینک والے بغیر چھٹی کے چلے

جانے کے باوجود مجھے واپس لیتے ہیں یا نہیں اور اس کو تو اس کا آبا کپڑے کی دوکان

پر بیٹھنے کی اجازت بالکل نہیں دے گا، بہت منع کیا تھا اُس نے، وہ پیالی

پر جھکا اور تہوہ پینے لگا۔

میرا سگرٹ انگلیوں میں سلگ سلگ کر بے چارگی سے راکھ گزانا رہا۔ تھوڑی

دیر کے بعد میں نے پھر مہبت کی: ”اچھا تو یہ صاحب آپ کی بیڑیوں میں بیٹھ گئے

..... کیسے؟“

ایک مقام پر بس نے سڑک کو چھوڑا اور ایک پہاڑی کے پہلو میں بیٹھے چند تہوہ

خانوں کے جھرمٹ کے فریب جا کھڑی ہوئی۔ میں باہر نکلا، بارش رک چکی تھی۔ ہوا میں

نم آلود بوسے کی سی تازگی تھی۔ مسافر تہوہ خانوں کے باہر کمرسیوں پر بیٹھے لگے ان میں

کچھ سڑک سے نیچے اتر کر ایک ندی کے کنارے اپنے چہروں پر چھینٹے مار مار کر دات کی ہاک

تھکن کو اتارنے لگے۔ میں بھی گیلی زمین پر احتیاط سے قدم رکھتا ندی تک گیا۔ پانی میں

ہاتھ ڈالنا تو اُس کی یخ بستگی نے میرے انگلیوں کو باقی بدن کی کستی سے کاٹ کر

زندہ کر دیا۔ میں نے پورے بدن کو اسی طور زندہ کرنے کا سوچا اور ندی کے ساتھ

ساتھ پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگا۔ ایک مقام پر جہاں ندی خم کھا کر نیچے آ رہی تھی

مسافر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے جلدی سے کپڑے اتارے اور مایا برن

کے اُس جھنجھٹاتے تھال میں اتر گیا۔ دو چار ڈبکیوں نے ہی پکپی طاری کر دی اور

میں باہر آ گیا۔ جب میں ناشتے کے لئے تہوہ خانوں کی جانب آیا تو میرا بدن کمال

میں سے نکلے نوین ٹھوکر کے کی طرح کھنک رہا تھا۔ میں نے پہلے دو کپ میٹھا دی

کھایا اور پھر تہوہ کی چکیاں لینے لگا۔ اتنے میں تہران کی جانب سے ایک بس

نمودار ہوئی اور سڑک سے اتر کر ہماری بس کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو گئی۔ اونگھتے

آنکھیں ملتے مسافر باہر نکلتے اور تھکے جسموں کو گھسیٹتے یا تو ندی کا رخ کر لیتے اور

ادھر ادھر کمرسیوں پر پھیل جاتے۔ ان میں تین پاکستانی لڑکے بھی تھے جو مجھے دیکھ

کر میری میز پر چلے آئے۔ سلام دعا کے بعد وہ ناشتے میں مشغول ہو گئے گفتگو کے

دوران معلوم ہوا کہ لاہور کے باسی ہیں اور تین چار ماہ کی آوارہ گردی کے بعد وطن

واپس جا رہے ہیں۔

”آپ حضرات روزگار کی تلاش میں یورپ گئے تھے؟“ میں نے سگرٹ جلاتے

ہوئے پوچھا۔

معانیاں مانگی شروع کر دیں..... سرجی معاف کر دیجئے ہم تو آپ کے بچے ہیں۔ اور میں تو پہلے ہی کچھ کچھ شک ہو رہا تھا مگر آپ کا لباس.... بڑھی ہوئی شیلو اور پھر ایران کے اس قبوہ خانے کے باہر آپ سے ملاقات.... ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے ڈھارس تو بہت بندھائی مگر وہ شرمندگی کی چادر اوڑھے رہے جب تک بس حرکت میں نہ آگئی وہ قطار باندھے منہ بسوئے کھڑکی کے باہر کھڑے رہے۔

”یہ نوجوان غالباً تمہیں کوئی بہت برگزیدہ ہستی سمجھتے ہیں“ علی رضا جو اس صورت حال کا بخور جائزہ لیتا رہا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

”ان نوجوانوں نے چند لمحے پیشتر مجھے خرمی علی کے خاندان کا ایک فرد قرار دیا تھا“

”بالے بالے“ اُس نے سر زور زور سے ہلایا ”مگر کیوں؟“

میں نے روئداد بیان کر دی۔ علی رضا بے پناہ مخطوط ہوا اور اُس کے ہونٹ روبرو کی طرح پھیلتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”باہر رات ہے“

”رات؟“ میں نے اچنبھے سے پوچھا۔ ”بادلوں کی وجہ سے قدرے تاریکی ہے ورنہ تو....“

”تم میری آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے“ اُس کا سر جھکا، تھوڑی سیلنے پر ٹپک گئی اور اُس نے ناک کی بنی کو چٹکی میں دبا کر اپنے آپ کو سوچ کے حوالے کر دیا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اُس نے سر اٹھایا۔ ”پچھلی شب تم شاہ کے بار سے میں مجھے کرید رہے تھے.... میں گریز کر رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ تم خفیہ پولیس ساواک کے ایجنٹ بھی تو ہو سکتے تھے....“

”مگر میں تو پاکستانی ہوں“

”وہ پیسے کے پجاری ہیں، اُن کی کوئی قومیت نہیں، پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں۔“

”جھوٹ بولتا ہے جی“ وہی نوجوان اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہنے لگا۔

”ایسے ایسے قصے جو کہ سننا تاہے کہ بندہ پاگل ہو جائے.... اوئے، اس نے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ”کیا لکھا ہے“ اُس نے نوح کے پہاڑ کے بائیں میں کبھی پہاڑ کا بنا ہوا ہے۔ اپنی شملہ پہاڑی جتنا ہے اور وہ جو شہزادوں کے جزیروں سے تھے، الٹے پچلے۔ اتنی لکھیاں اور سری ہوئی پھیلیوں کی بو....“

”یار اُسے اچھی لگی ہوں گی یہ جگہیں....“ نیسرے صاحب نے بے چارگی سے کہا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب وینس اور اِپس کے قصبے اپنی خوبصورتی اور مہین سے بندے کو پاگل نہیں کرتے، اور سٹاک ہوم....“

”ہاں ہاں.... لیکن ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور بلے کے ڈھبروں کو دیکھ کر ہر فدا ہوتا ہے تو جان عذاب میں ڈال دیتا ہے“

”اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے پیارے“ میرا حمایتی ہنس کر بولا۔ ”اب ہمیں بھی تو ایسے تجربے ہوئے ہیں جو اُس کے خواب میں بھی نہیں آ سکتے۔ وہ جب سوئے میں....“ اس کے بعد وہ اپنے سفر کے واقعات دہرانے میں اتنے مگن ہوئے کہ میری موجودگی سے غافل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد میری بس کا بارن بیتابی سے بچنے لگا اور میں جلنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تینوں مجھے انجان جان کر یورپ تک کے روٹ کے بائیں میں تفصیلات سمجھانے لگے اور میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ میں بس میں سوار ہونے لگا تو انہوں نے اپنا مختصر سا تعارف کروایا کہ جی میرا نام یہ ہے اور یہ ہیں میرے ساتھی.... واپسی پر ملاقات ضرور ہونی چاہیے اور.... آپ کا اسم ٹریفک میں چپکا کھڑا ہا کہ مجھ میں ہمت نہ تھی انہیں اپنا نام بتانے کی.... میں جانتا تھا کہ اُن کا ردِ عمل شرمندگی کا ہو گا اور.... ہوا۔ میرا نام سن کر کچھ دیر کے لئے تیز جیسے فضا میں معلق ہو گئے اور پھر انہوں نے خالص لاہوری انداز میں

”پھر؟“

”پھر یہ کہ تم نے ابھی اپنے ادیب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میں تم پر حیران کرتا ہوں۔ کوئی بھی سچا تخلیق ذہن ظلم کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا...“ علی رضا کے چہرے پر بوڑھی سوچوں کا جال سا بچھ گیا۔ ”میرا نام علی رضا نہیں ہے۔ میرا ”الف“ ہے، میں ایران کا پہلا نصف ہوں، میں آغاز ہوں مگر میرے آغاز اور انجام پر لکڑی کے چہرے والے اُس عفریت کا سایہ ہے جو شاہ ہے۔ اُس کے ہاں ہمیشہ کیلے رہتے ہیں، جرنیلوں، سرمایہ داروں اور ساواک کے ایجنٹوں کے ہاں سے۔ ایک روز ہم بھی اُسے بوسہ دیں گے، ایک بوسہ مرگ۔ ایشیا کی سب سے بڑی اور جدید ترین آلاتِ قتل سے لیس فوج وہ دیوار ہے جو شاہ اس آواز بوسے سے بچنے کے لئے اپنے آگے تعمیر کر رہا ہے۔ مگر ہم دھات اور بارود اس دیوار کو چاٹ لیں گے اور پھر وہ ہمارے سامنے ننگا گھڑا ہو گا...“ پچھلے میں اور میرا ایک عزیز ترین دوست یونیورسٹی سے واپسی پر ملکی حالات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہم قد سے لاپرواہ ہو گئے اور بس میں سوار ہوا بھی وہی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پیچھے بیٹھا ہوا مسافر ساواک تھا... دو روز میرا دوست یونیورسٹی جانے کے لئے گھر سے نکلا اور اُس کے بعد آج اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اُس کے بوڑھے والدین اپنے بیٹے کی گمشدگی کی لکھانے کے لئے پولیس سٹیشن بھی نہیں گئے۔ جانتے ہو کیوں؟ پولیس انہیں گرفتار نہیں کر لیتی۔ اس بوڑھے اور اس کی بیوی نے الزام لگایا ہے کہ اُن کے بیٹے کی گمشدگی میں شاہ کا ہاتھ ہے اور یہ صفِ اول کی غداری ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کمرہ مقنا چپکے چپکے بین کرتے رہتے ہیں اور وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ایران کے ہزاروں میں ایسے مقفل کمرے ہیں۔ جن کے فرشوں پر ماتم کے سیاہ قالین بچے ہیں۔ علی رضا بلکہ ایران کا الف، ایران کا آغاز اپنے انجام کو آزاد کرانے کی جدوجہد

ہائے میں دیر تک گفتگو کرتا اور میں دم بخود، رنجیدہ سنتا رہا۔

ہم تبرستان کے صدر مقام آمل میں پہنچ گئے۔ آمل بہت دیدہ زیب شہر تھا مگر ”الف“ کی گفتگو کے بعد اُس کی کنکریٹ کی عمارتیں اور سینٹ کے فل پاتھ ایک ایسے موڑے کی صورت میں نظر آئے جو شاہ نے حفاظت کی خاطر اپنے دیہات کے اور اپنے درمیان تعمیر کر رکھے ہیں پکٹے اور پس ماندہ ایرانی دیہات جو شہروں کے موڑوں کے عقب میں منتظر ہیں... شہر ہمیشہ آسائش کی افیم پر اونگھتے رہتے ہیں اور دیہات جفاکشی کے ہتھیار سے ہاتھ میں لئے جو بی چہروں والے عفریتوں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔

ایرانی لینڈ اسکیپ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ہمیں فارسی شاعری میں ملتی ہے اور دوسری وہ جو ہمیں دیکھنے میں ملتی ہے۔ دونوں میں خاصا طویل فاصلہ ہے۔ ایک طرف رکنا یا دہے، گلاب کھلتے ہیں اور دوسری جانب چٹیل میدان، بخر ٹیلے اور بے آب و گیاہ صحرا پھیلتے ہیں۔ اس تفاوت کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایران (دعنا کہ میں نے دیکھا) میں سبزہ و آب قد سے کم کم ہیں اور ایک ایرانی شاعر جوہی ایک سبز پتے یا پانی کی بوند کو دیکھتا ہے تو بلا تامل بے قابو ہو جاتا ہے... ہمارے ایک عزیز دوست جو تہران میں قیام پذیر تھے اپنے لئے کسی بہتر رہائش گاہ کی تلاش میں تھے۔ اُن کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ایرانی نے انہیں ایک قیام گاہ کے بارے میں بتایا جو اتفاقاً کرانے کے لئے خالی تھی اور ساتھ ہی مسرت سے لبریز ہوتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ گلشن اردیعی ساتھ میں گلشن بھی ہے۔

لے سفر ایران، جون ۱۹۷۵ء

کی ماکرو بس تھی۔ کسی پالتو کتے کی طرح دریا کے نیچے اونڈھی پڑی ہوئی، پانی کا ریلہ  
ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے گذرتا تو وہ یوں دھیرے دھیرے ہلتی جیسے اس کتے کو بوٹ  
کی نوک سے گدگدی کی جا رہی ہو۔ امدادی پارٹیاں دستوں کی مدد سے نیچے اتر رہی  
تھیں، سیاحوں کی لاشیں نکالنے کے لئے۔

سرنگ کے اس پار اترائی شروع ہو گئی۔ ڈرائیو نے انجن بند کر دیا اور ہم  
بونگ جیٹ کی طرح بیٹھتے دلوں کے ساتھ نیچے ہوتے چلے گئے۔

تہران پہنچ کر علی رضا مجھ سے جدا ہوا۔ میں تمہیں ضرور اپنے گھر میں ٹھہرنے  
کی دعوت دیتا....“ وہ رنجیدہ ہوا، مسکرایا اور چامچ پیڑے نگاہ ڈال کر بولا۔ مگر  
ان دنوں.... باہرات ہے“

ایران کا آغا نہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اس رات میں گم ہو گیا، اس ضمانت کے  
بغیر کہ وہ اپنا انجام آزاد دیکھنے کے لئے زندہ ہے گا یا اس کی لاش بھی دیئے خراج  
کی تہہ میں ہزاروں ایرانی نوجوانوں کے گلتے جسموں کو نوید دے گی کہ ابھی رات کے  
خلاف جنگ مسلسل ہے اور کمرہ کی چہرے والے شاہ اور بوسہ مرگ کے درمیان  
ایک دن مزید کم ہوا۔

—:—:

ہمارے دوست جو خود بھی شاعر ہیں گلشن کے نام پر حافظ و سعدی کے دیوانوں پر  
نقز ہو گئے اور فوراً حامی بھری۔ چونکہ وہ قیام گاہ صرف چھٹی کے روز ملا خط کر کے  
تھی۔ اس لئے پورا ہفتہ وہ ایرانی صاحب ہر دوسرے فقرے میں اُن کی اتر  
پر رشک کرتے کہ انہیں ایک ایسی قیام گاہ ملنے والی ہے جو کہ... گلشن دار ہے  
کے روز انہیں ایک تنگ گلی میں لے جایا گیا۔ ایک بوسیدہ کوارٹر کھول کر دیا  
کے اندر داخل ہوئے۔ ایک مختصر سامعین اور ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ، ہمارے  
دوست نے بے صبری سے پوچھا، گلشن کہا است؟ اس پر ایرانی نے دروازہ  
ساتھ زمین میں گمڑی ہوئی ایک پر مردہ مہنی پر قربان ہوتے ہوئے اعلان کر  
”گلشن....“ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایران واقعی قدرے سرسبز ملک ہو مگر پنجاب  
ہر یا دل سے نیچر سے میدانوں کی عادی آنکھیں ہی ادھر سبز و آب کم دیکھتی ہو  
بہر طور تہران سے تقریباً سو میل دور ایک وادی میں سے گذر ہوا جس میں پنجاب  
سبز خوبصورتی کا عکس تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھر ایک خطہ زمین جس پر پہاڑ  
کے کھیت بچھے ہوئے ہیں اور ان کی نم خوشبو کے درمیان آپ کی بس ناک اٹھا  
سوگھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہاں دھوپ اور بادلوں کا ایک مسلسل کھیل رونما ہو  
رہا ہے۔ ابھی بس کی وینڈسکرین پر بارش کے قطرے پھوٹ رہے ہیں اور آواز  
دھوپ کے تیز فلیش آنکھوں کو چندھیانے لگتے ہیں۔ وادی کے خاتمے پر ایک  
پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم ایک تیراک کی طرح بریسٹ سٹروک کی طرز پر  
سرنگوں میں ڈبکیاں لگاتے اور پھر چمکی سٹروک پر نمودار ہوتے آگے بڑھتے  
ایک سرنگ کے دہانے پر ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ ڈرائیو نے بریک پر ہاتھ  
رکھ دیا۔ سب مسافر کھڑے ہو گئے۔ کھائی کی جانب سٹروک کے گرد کاخ تھی  
ہوا تھا اور نیچے گہرائی میں کئی ہزار فٹ نیچے ایک دریا کی چمکی لکیر تھی اور اس کے  
ایک ڈنکی کھلونا تھا، کھلونا تھا نہیں اس بلندی سے لگ رہا تھا۔ وہ کسی غیر لک

## مائی پھرے باز

میں نے اپنا سامان کاندھے پر بوجھ کیا اور قیام نہران کے لئے کسی رہائش گاہ کی تلاش میں بس سیٹش سے باہر آ گیا۔

”مسافر خانہ دہقان نو“ کی عمارت ایک پرانی کاروان سرٹے تھی جو شاید کسی زمانے میں شہر سے باہر ویرانے میں ہوگی مگر اب شہر ریگستا ہوا اُس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ دالان عبور کر کے مینجر کے دفتر میں پہنچا اور سوال رہائش درآ گیا۔ اُس نے چابیوں کا ایک گچھا دراند میں سے نکالا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تخت ندارد“ وہ دوسری منزل پر واقع ایک بوسیدہ دروازہ دھکیلتے ہوئے بولا۔

”ہم گداگر لوگ ہیں۔ ہمیں تخت کی خواہش بھی نہیں“ میں نے خوش دلی سے کہا۔

”بالے“ اُس نے سر ہلایا۔

کمرے میں واقعی کوئی تخت نہ تھا، یعنی چھت کے علاوہ صرف فرش ہی فرش تھا۔ چار پائی، میز کرسی وغیرہ ندارد۔ میرے جسم کی تھکاوٹ نے اسی کو غنیمت سمجھا اور میں اپنا سیلنگ بیگ فرش پر بچھا کر اُس میں ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ایک اجنبی ملک کی بجائے ایک ایسی وادی میں پہنچ چکا تھا جس میں

دنیا بھر کے انسان اپنی زندگی کا نصف حقہ گزارتے ہیں۔ موت کے عارضی تجربہ  
روشناس ہوتے ہیں۔ میرا جسم آہستہ آہستہ تھکاوٹ کی گینچی اتار مار رہا ہے۔ جانے اس  
میں کتنا عرصہ گزرا مگر جب میں اُس داوی سے واپس آیا تو لپٹا پٹا کو ایک اور  
پایا۔ باہر واقعی رات تھی اور اند میں ایک بھرے پڑے ایرانی گاؤں میں سانس لے  
تھا، بے شمار بچے تھے۔ جو مجھے پھلانگتے ادھر اُدھر کھیل رہے تھے چند مڑتے  
میرے پہلو بہ پہلو مانگیں پھیلانے سو رہے تھے، ایک دہقان خاتون پولکاواٹ جا  
میں روپوش جو پہلے پر ایک چھوٹی سی دیگ چڑھائے کسی طعام کی تیاری میں مشغول  
تھی۔ سلگتی لکڑیوں کا دھواں پورے کمرے کو ایک دھندلاؤد پہاڑی قصبے کا رہ  
دے رہا تھا۔ میں قد سے ہراساں ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ کونے میں اونگھتے ایک سفید  
دہقان نے مجھے دیکھ کر ایک چوڑی مسکراہٹ میرے سامنے رکھ دی اور خاندان  
خاتون سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس نے چادر کا پلو چہرے پر کھینچا، دیگ میں دوٹی  
کر ایک محلول نکالا اور ایک پیالے میں گرا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ بسریوں اور گوشن  
کا گڑھا سوپ تھا جس کا مزاد دھواں دھواں تھا۔ سوپ ختم کر کے میں نے بڑے میاں  
خاتون کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُٹھ کر کھولتا ہوا میزجر کے پاس جا پہنچا۔ "میرے کمرے  
ایک ایرانی گاؤں آباد ہو گیا ہے"

"ہونا بھی چاہیے" وہ ایرانیوں کی روایتی لاتعلقی سے بولا۔

"کیوں؟"

"انہوں نے کرایہ ادا کیا ہے"

"اور میں نے؟"

"تم نے بھی ادا کیا ہے"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تم سب نے کمرے میں سونے کا کرایہ ادا کیا ہے، جا کر سو جاؤ"

یہ گفتگو جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے اتنی رواں نہ تھی بلکہ نیم فارسی میں مشکل تمام  
ان خیالات کا اظہار ہوا، میزجر کا سیٹھ یہ تھا کہ اس مسافر خانے میں کمرے کرائے پر  
نہیں ملتے بلکہ صرف سونے کی جگہ کرائے پر ملتی ہے اور وہ مجھے ملی ہوئی ہے۔ چاہے  
اُس کے گرد ایک ایرانی گاؤں آباد ہے چنانچہ میں اسی طور کھولتا ہوا اُس کے کمرے  
سے باہر نکل گیا۔ میں اس موڈ میں ہرگز نہیں تھا کہ تہران کے قیام کی چند راتیں اتنا  
کھیتی باڑی کے ماحول میں گزاروں چنانچہ میں نے خیابان امیر کبیر کا رخ کیا جو دنیا بھر  
کے تیاہوں میں اپنے سستے مسافر خانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم  
ہوا کہ دنیا بھر کے سیاح مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں اور مسافر خانوں کے مالک  
کمرہ پُری کے بعد اب انہیں دودا لرنی کس کے حساب سے غسل خانوں، برآمدوں  
چھتوں اور تہہ خانوں میں غٹ کر رہے ہیں۔ رہائشی صورت حال تشویشناک تھی خاصی  
میک دود کے بعد خیابان کے آخر میں "مسافر خانہ نادور" ملا جو بے حد چپ چاپ اور  
خالی خالی سا نظر آ رہا تھا مگر یہاں سوال سے پیشتر ہی جواب مل گیا۔ میں مایوس ہو کر  
جانے کو تھا کہ ایک خوش باش کھلے ہوئے سفید چہرے والی بڑی اماں سفید چادر اور  
شلوار قمیض میں ملبوس میسرھیاں پھلانگتی ہوئی نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی ادھیڑ  
عمر میزجر بچوں کی طرح کلکاریاں مانے لگا۔ بڑی اماں نے زبان فارسی اسے بے شمار  
دعاؤں سے نوازا اور اُس کے جھکے ہوئے گتے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔  
میزجر مودب ہو کر سر جھکائے بدستور کلکاریاں مارتا رہا۔ بڑی اماں وہاں سے فارغ  
ہوئیں تو میرے سر پر دست شفقت پھرنا شروع کر دیا۔ "پتر تمہیں پہلے نہیں دیکھا"

"جی میں ابھی آیا ہوں"

"کون سے کمرے میں ہو؟"

"جی کمرہ تو... میں نے بڑی اماں کو ہمدرد پارک لودی کتھا بیان کر دی۔ اُس  
نے میزجر کے جھکے ہوئے سر پر ایک اور پیار دیا اور پھر اُس سے کچھ کہا۔ جواب میں



وہ دیر تک لکے کو ترمکی طرح لگتا رہا۔ پھر بڑی اماں مجھ سے مخاطب ہو کر  
”یہ شہد ابھی ٹھیک کہتا ہے پتر، واقعی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کل صبح کو ریت والے  
جا رہے ہیں۔ تم آجانا بستر مل جائے گا“ میں شکریہ ادا کر کے جانے کو تھا کہ پتر  
نے پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ ”کل ناشتہ میرے ساتھ کرنا پتر  
جیتے رہو“

ایران، شام اور ترکی سنبھالا ہوا ہے۔ بڑے سے تو پچھلے ماہ انقرہ میں ملاقات ہوئی  
تھی مگر جھوٹا چھ ماہ سے پھیرے پر ہے۔ میں تہران آئی ہوں تو وہ دمشق چلا جاتا ہے  
دمشق پہنچتی ہوں تو وہ جدہ بیٹھا ہوتا ہے۔ خیر رب سچا کبھی نہ کبھی تو میل کرائے گا۔  
اللہ حیاتی دے بڑے بچے اور بیٹے بیٹے ہیں....“ اس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی  
آگئی اور وہ سنہرے فریم کی عینک اُتار کر آنسو پونچھنے لگی۔ ”بہت کہتے ہیں کہ مانی جی  
آرام کرو۔ ہم جو ہیں کمانے والے.... مگر دیکھو ناں پتر ترقی وہی حلال ہوتا ہے ہو  
انسان خود کمانے“

”بے شک، بے شک“ میں نے سوتیاں نکلنے ہوئے کہا۔ ”مانی جی ایران،  
شام اور ترکی آپ نے سنبھالا ہوا ہے“  
”آہ پتر“

”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کس طرح سنبھالا ہوا ہے؟“

”بس پتر ترکی سے مال خریدا اور ایران لے آئے۔ یہاں سے مال ڈالا تو  
شام لے گئے۔ ہر جگہ پھیرے بازوں کے مخصوص مسافر خانے ہیں۔ وہاں مقامی  
لوگ آکر مال خرید لیتے ہیں“

”لیکن مانی جی یہ تو.... کچھ غیر قانونی سا سلسلہ نہیں ہے۔ سمگلنگ وغیرہ  
....؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ناں پتر....“ مانی جی نے کانوں کی لوہیں چھوتے ہوئے سر ہلایا ”ہم کسٹم  
والوں کو ان کا حق دیتے ہیں.... کوئی چھپا کر تصود لاتے ہیں.... بڑا کرم ہے۔  
رب سچے کا، مجال ہے کسی سرحد پر یا ایئر پورٹ پر کوئی کسٹم افسر مانی پھیرے باز  
کے مال کو ہاتھ لگائے۔ سبھی دیدار غلط کرتے ہیں“

”سرحد عبور کرتے ہوئے اتنے سامان کے ساتھ کبھی کوئی دشواری پیش نہیں  
آئی؟“

کھلی کھڑکی میں سے ہلکے بخار ایسی سست حدت والی دھوپ آ رہی تھی  
میں اطمینان سے اُبلے ہوئی سوتیوں اور دودھ کا ناشتہ کر رہا تھا۔ سوتیوں پر چڑھ  
ہوئی چھیتی میرے دانتوں تلے کرکڑا رہی تھی۔ سامنے بڑی اماں میرے لئے  
بنانے میں مصروف تھیں اور بار بار پوچھتیں ”بیٹے چینی اور چائے، سوتیاں اور  
بہت ہیں تم نے ہی ختم کرنی ہیں....“ پچھلی شب تو میں نے جوں توں کر کے  
گاؤں میں گزاری اور آج صبح سویرے ”مسافر خانہ نادہ“ میں چلا آیا جہاں  
مجھے ایک خوبصورت ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بسنٹر لائٹ کر دیا گیا اور اب میں بڑے  
اماں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”اماں جی آپ ایران میں زیادتیں کرنے آئی ہیں؟“ میں نے سگرت سلگنا  
ہوئے دریافت کیا۔

”پتر میں تو پھیرے باز ہوں“

”کیا باز ہیں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”پھیرے باز پتر“ بڑی اماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”سب لوگ  
مجھے مانی پھیرے باز کہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہوتا ہے پتر۔ میرے دونوں بیٹے  
اسی کاروبار میں ہیں۔ ہمارا ہیڈ کوارٹر بغداد میں ہے اور چھوٹا وہیں رہتا ہے۔  
بڑا دبئی حرمی سے سرسید ٹیز گاڑیاں لاکر بیروت میں فروخت کرتا ہے میں“

”ہاں ایک مرتبہ شام کے بار ڈر پر عملہ تبدیل ہو گیا تھا تو ان پھولوں  
روک لیا تھا۔“

”پھر؟“

”پھر ہم نے پورے کسم پائوس کے شیشے توڑ دیئے۔۔۔ پولیس آئی پھر فوراً  
بہر حال مال ہم نے پھر بھی نکال لیا۔“

میں مائی پھرے بان کی شخصیت سے خاصا متاثر ہو چکا تھا، قد بڑے فزول  
ہی سہی مگر اس عمر میں بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار یوں دندناتے پھرنا  
ایک کارنامہ تھا۔ آپ سارا سال پھرتی ہی رہتی ہیں؟“

”نہیں پتر، حج کے دن تو میں سوہنے سرکار کے پاس کتے اور بیٹے میں لگا  
ہوں۔۔۔۔۔ مائی جی کی آنکھوں میں نمی نے پھر بلنار کر دی۔“ بس ایک ہی ارمان  
پتر کہ اللہ توفیق دے۔ عمر دے تو پورے بارہ حج کر لوں، دس تو ہو گئے۔۔۔“

”ہو گئے؟“

”ہاں ہو گئے۔“

”کبھی پاکستان جانے کا خیال نہیں آیا مائی جی؟“

”پتر وطن وطن ہوتا ہے، خیال کیوں نہیں آتا، یہ تو رزق کی خاطر ٹھوکر  
رہی ہوں۔ اخیر عمر تو وہیں گزریے گی۔ بری امام کی درگاہ کے آس پاس۔۔۔ بس  
بیٹے کچھ نرم دل ہیں۔ کاروبار کو سمجھتے نہیں۔ پچھلے دنوں چھوٹے نے کویت کا  
لگوایا۔۔۔“

”کویت کا؟ سنا ہے مشکل سے ملتا ہے۔“

مائی جی کا دین دار چہرہ مسکرانے لگا۔ نہیں پتر، بڑے اچھے لوگ ہیں۔۔۔۔۔  
سفارت خانوں والے۔ کل عراق کا ویزا لگوانے لگی تو بڑی خلقت تھی۔ سفارت خانے  
کے باہر۔ سب کو جواب مل رہا تھا۔ مجھے تو اندر بلا لیا۔ کمری دی۔ اُن کو بھی ہم

کاتی دیتے ہیں پتر۔“

”تو آپ کا چھوٹا بیٹا کویت چلا گیا؟“

”نہیں پتر یہی تو بتانے لگی تھی۔ اُسے بغداد میں ایک غریب شخص ملا، بے یار و  
مددگار، ضرورت مند مقابلہ چارہ۔ میرے بیٹے نے ترس کھا کر اپنا ویزا اُسے دے دیا۔  
صرف دس ہزار میں۔ بڑا نرم دل والا ہے۔ اللہ حیا قی دے۔“

اتنے میں دستک ہوئی اور ایک غیر معمولی ایرانی یعنی طویل قامت، چوڑے  
میں حرکت کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے قریب پہنچ کر سر جھکا دیا۔ مائی جی  
نے حسبِ عادت اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور پھر دونوں شدہ فارسی  
میں گفتگو کرنے لگے۔ ایرانی نے چوڑے کی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر مائی جی کی  
خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر مختلف اشیاء کی فہرست تھی جو وہ اگلے پھرے میں  
مائی جی سے خریدنا چاہتا تھا۔ مائی جی نے بڑی پھرتی سے سب اشیاء کے آگے ہاتھیں  
درج کیں، ٹوٹل کیا اور کچھ رقم ایڈوانس وصول کر کے ایرانی کو اگلے ماہ کی ایک تاریخ  
دی، سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ عقیدت سے سرنگوں بامراد مرید کی طرح جھومتا ہوا  
چلا گیا۔

”مائی جی یہ جو ویزا آپ کے بیٹے نے ایک ضرورت مند کو بخش دیا تو میرا اُس  
نے اپنے پاسپورٹ سے اس کے پاسپورٹ پر کیسے منتقل کر دیا؟“ میں نے سلسلہ گفتگو  
جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

مائی جی میرے اس بے وقوفانہ سوال پر دل کھول کر ہنسیں۔ ”پتر اپنے عراق  
میں بڑا بڑا کاروبار کر رہے۔ پاسپورٹ بنانے کا۔ ایک پاسپورٹ کے صفحے دوسرے  
میں اتنی نفاست سے فٹ کرتے ہیں کہ مجال ہے۔۔۔۔۔ اپنے سفارت خانے والے  
بھی مدد کرتے ہیں۔۔۔۔۔ حق ملتا ہے۔ انہیں بھی۔۔۔۔۔ خیر پتر تم کہاں جا رہے ہو؟“  
”یہاں سے ترکی جاؤں گا اور۔۔۔۔۔“

پر آنسو بہاتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے.... اور ان ہاتھوں سے.... اُس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر چلو بناتے ہوئے سسکی بھر کر کہا: ”میں نے خود وہ پانی پیا ہے۔ چٹان روتی ہے پتھر.... وہاں جانا تو میرے لئے دعا کرنا“

”اچھا مائی جی“

”اور بی بی زینب کے مزار پر بھی جانا“

”اچھا جی....“

”اور دمشق میں صرف عبداللہ ہندی کے فندق میں ٹھہرنا، اپنا آدمی ہے“

مائی جی اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہیں بمشکل اپنے روال آنسوؤں کو روکا اور زیر لب آیات قرآنی کا ورد کرتی رہیں اور پھر اٹھ کر سبز فہوہ بنانے لگیں۔

قبوہ خوشنود اور ذائقے کی زبانوں سے عبارت تھا۔ اتنی دیر میں پھر دستک ہوئی اور ایک اور ایرانی ڈھیلے لٹکنے سوٹ میں چلتا ہوا اندھا گیا۔ اُس نے حسب دستور سر جھکایا اور ایک فہرست مائی جی کے آگے رکھ دی۔ میں نے مائی جی کی ہمان نواہی کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کمرے میں چلا آیا جو اس نیک دل خاتون کی سفارش سے مجھے ملا تھا۔ یہاں چار بستر بچھے تھے۔ جن میں سے ایک کا انتخاب کر کے میں لیٹ گیا۔ تنویدی دیر بعد دستک ہوئی اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے۔ ”مال ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”مال؟ کونسا مال؟“

”پھرے باز؟“ انہوں نے قریب آ کر کہا۔

”نہیں نہیں“ میں مسکراتے لگا۔ ”میں تو سیاح ہوں“

وہ صاحب مایوس ہو کر سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

ابھی میں اپنے آپ کو بستر پر دھانڈا کرنے کو ہی تھا کہ ایک اور دستک ہوئی اور ایک ایرانی نمودار ہو گیا۔ ”مال ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”وہاں ایرانی ڈنر سیٹ لے جاؤ۔ بہت پیسے چھوڑیں گے۔ مگر تین ہزار والے نہیں پتوں والے“ مائی جی نے صلاح دی۔

”اور وہاں سے بیروت جاؤں گا....“

”ترکی سے مرسیڈس کے وہیل کپ خرید لینا، بیروت میں دُکنے پھر میں بک جائیں گے“

”راستے میں دمشق بھی ٹھہروں گا....“

”دمشق؟“ مائی جی نے ایک طویل چٹکی لی جیسے فوت ہونے کو ہیں پھر ایک ٹھنڈی ریخ سانس بھری اور زار و قطار دونے لگیں۔ ”دمشق جاؤ گے؟“

”نہ جاؤں؟ میں نے گھبرا کر کہا۔

”جاؤ پتھر جاؤ، جم جم جاؤ، وہاں میرے لئے بھی دعا کرنا....“ وہ اپنی نیند چادر سے ناک پونچھتے ہوئے ایک اور چٹکی لے کر بولیں۔

”کروں گا مائی جی ضرور کروں گا، لیکن کہاں پر؟“ میں آنسوؤں سے لبریز اس صورتِ حال سے خاصا پریشان ہو گیا۔

”موسیٰ کے مصلے پر....“ انہوں نے چادر میں ایک اور ”شوں“ کی۔

”وہ کہاں پر ہے؟“

”حضرت ابراہیمؑ کے مصلے کے ساتھ....“

”دمشق میں ہیں؟“

”دمشق سے چند کوس کے فاصلے پر، اُس پہاڑ پر جہاں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا.... میں نے وہاں نفل پرٹھے نئے مصلوں پر.... ہائے پتھر کیا بتاؤں“

اللہ کی قدرت، سبحان اللہ.... سبحان اللہ....“ مائی جی بدستور روتی رہیں۔ ”جو نہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو مارے دہشت کے چٹان کی زبان باہر نکل آئی اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کروڑوں سال بعد آج بھی وہ چٹان ہابیل کی موت

”نہیں ہے“ میں نے درشتگی سے کہا۔

”پاکستانی ہو؟“ اُس نے صاف اُردو میں پوچھا۔

”ہاں....“

”کمال کے پاکستانی ہو۔ مال ہی نہیں ہے“ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ایک مختصر وقفے کے بعد دستک ہوئی۔ جو صاحب اندر آئے انہیں میں نے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ مال نیست؟ میں نے انگلیاں نیچا کر کہا۔

”نیست....؟“ وہ سر کھچا کر بولے اور ہلکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں اب بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہ آنے دو۔ اس مرتبہ جو صاحب آئے انہوں نے دستک دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، اُن کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو جھٹکا بھی ختم نہیں بنایا جاسکتا تھا بنایا اور انگلیاں پٹا ہوئے کہا ”مال نیست؟“ اُن صاحب نے برا سا منہ بنا کر میری جانب دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کیا بکواس کرتے ہو اور پھر کھڑکی کے قریب والے بستر پر بیگ رکھ کر کپڑے بدلنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میری طرح مسافر ہیں اور اسی کمرے میں قیام کرنے آئے ہیں۔ میں نے جھینپ کر تو لیہ بغل میں دبا اور غسل خانے میں جا کر شیونے لگے۔

میں اپنی نشست پر براجمان رہا تا آنکہ وہ مجھے واپس اسی سٹاپ پر نہ لے آئی جہاں سے میں بلوریت کے بوجھ تلے دب کر اُس میں سوار ہوا تھا۔ شام ہوئی تہران کے وہ چہرے جو دن کی روشنی میں بھر لگ رہے تھے اب انہی کے خدو خال پر رنگ برنگی روشنیوں اور بے باکی کی فصلیں اگنے لگیں مگر میں بجائے اس کے کہ ایک تھکے ہوئے بیل کی طرح ان فصلوں پر منہ مانے کی کوشش کرتا، شہر کی سرد مہری میں ٹھٹھرتا واپس اپنے نئے ٹھکانے پر چلا گیا۔

”مسافر خانہ نادر“ میں میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرے بستر پر ایک شخص جھنگر اُڑا رہا تھا.... اُس نے رنگین لنگی کے اوپر ایک امریکی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس پر بڑے بڑے حروف میں ”MAKE LOVE NOT WAR“ لکھا ہوا تھا اور وہ ”ایلی ایلی“ کے نعرے بلند کرتا جھنگر اُڑا رہا تھا۔ دوسرے بستر پر ایک صاحب آنکھیں لال لال نکال کئے کھیرا نوش کر رہے تھے۔ بستروں کے درمیان میں تپائی پر ایک بوتل دھری تھی اور قابل فہم طور پر شراب کی تھی۔

”اوا آئے، اوا آئے“، جھنگرے کا شوقین مجھے دیکھ کر بستر سے اُترا اور زبردستی بغل گیر ہو گیا۔

”کون آئے، کون آئے“ کھیرا کھانے والے نے چونک کر پوچھا۔

”اوتے اپنے باؤ جی آئے.... اُتھ اوتے ڈھینگر، باؤ جی کے لئے پیگ بنا“ اُس نے نحیف نوجوان کے پیٹ میں ایک معقول قوت کا گھونسا رسید کرتے ہوئے حکم دیا۔ وہ غریب لڑکھڑا کر بستر پر گرہ اور پھر فوراً ہی بڑکے گتے کی طرح سیدھا ہو گیا۔

”اوتے باؤ تیری میں کواری کو.... کتنی مرتبہ کہا ہے مارا نہ کر میرے گردے کمزور ہیں“ ڈھینگر نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

شاید اس میں میری کسی ذہنی کیفیت کا دخل تھا کہ اس دوپہر تہران کا روشن دن مجھے بھابھا سا لگا اور اسی بھتی ہوئی کیفیت کی لپیٹ میں اگر اس کی لگیوں بازار میں رواں چہرے بھی کچھ آؤٹ آف فوکس اور راکھ ہوتے دکھائی دیئے۔ رنگ جیسے نچر گئے ہوں۔ میں پودے دوپہرے مقصد گھومتا رہا۔ تہران میرا دوست نہ بنا مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہا۔ میں نے چورے فٹ پاتھ پر سب سے درجن بھر تصویریں کاڈ خریدے اور ایک پاک میں بیٹھ کر اُن پر اپنے دوستوں عزیزوں کے نام گھسیٹتے پھر ایک بس پر سوار ہوا جو معلوم نہیں کدھر کو جاتی تھی۔ آخری سٹاپ پر پہنچ کر

”اللہ کا کرم ہے“ اُس نے دونوں ہتھیلیوں کو اس طرح اٹھایا جیسے ان پر رکھے وزن کو بیلنس کر رہا ہو۔

”کھیرے تو نہیں ملے، یہ لے آیا ہوں“ ڈھینگرا اندر آگیا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک تربوز تھا۔

”اوئے گھیری کی اولاد شراب کے ساتھ تربوز کون کھاتا ہے...“

”نہیں ملتے کھیرے...“ ڈھینگرا نے روٹتے ہوئے کہا۔

”اوئے گو المندھیے کاں یاروں سے ناراض نہیں ہوتے“ باوے نے اسے پیار سے ایک زوردار تھپڑ لگایا۔

”آپ گو المندھی کے ہیں؟ میں نے ڈھینگرا سے پوچھا۔

”جی ہاؤ جی“

”میرا کاروبار بھی اسی علاقے میں ہے“

”اچھا...“ ڈھینگرا گلوگیر ہو گیا۔ ”ہاؤ جی آپ دادو کو جانتے ہیں؟“

”کیا کرتا ہے؟“

”چکر چھولے بیچتا ہے۔ چوک میں... میرا تایا ہے، اس کی ایک آنکھ میں نقص ہے“

”کانا ہے...“ باوے نے تربوز کاٹتے ہوئے تہمتہ لگایا۔ ”دادو کا ناچھوٹا ڈالا۔“

”اوئے ہائے تیری میں...“ تجھے شرم نہیں آتی میرے تائے کے لئے گستاخی کرتا ہے...“ ڈھینگرا رزتے ہوئے بولا۔

”اوئے رنجیت سنگھ کی اولاد چپ کر کے بیٹھ...“ باوے نے ڈھینگرا کے سر پر

ایک ٹھاپ لگائی اور ڈھینگرا غصے میں آکر سامنے رکھا گلاس ڈمک لگا کر پی گیا۔

”اؤ آپ کہاں کے ہیں؟“ میں نے باوے سے دریافت کیا۔

”میں سیالکوٹ کا ہوں، وہاں بھی کاروبار ہے“

”اوئے ڈھینگرا تیری میں ماں... ہاؤ جی کے سامنے کالی دیتا ہے“ اُس نے ڈھینگرا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ”بنایک باؤ جی کے لئے“

”نہیں بھائی جی آپ بیٹیں... میں ذرا...“

”نئیں جی یہ نہیں ہو سکتا...“ باوے نے ہاتھ جھٹک کر گرم ہوتے ہوئے کہا۔

”میں دراصل... میں بہت قُل ہو کر آیا ہوں باہر سے...“

”اچھا...“ باوا منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ ”تو پھر کھیر کھاؤ“

میں چپکے سے بیٹھ کر کھیر کھانے لگا۔

کمرہ تو میرا ہی تھا۔ مگر حسب دستور میری غیر موجودگی میں یہاں دیگر مسافروں کو بھی فٹ کر دیا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب اس کمرے کا چوتھا باسی یعنی وہی ایرانی ہماری طرف پشت کئے اس ہنگامہ مے لوشی سے بے خبر مزے سے خرائے لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کھیر ختم ہو گئے۔

”اٹھ اوئے ماں کے خصم...“ باوے نے ڈھینگرا کو ایک تھپڑ نہا تھپکی دی۔

”جا کھیرے لا“

ڈھینگرا جھومتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”یہ جو ڈھینگرا ہے ناں اپنا تایا ہے“ باوا پیار سے بولا۔

”ہاں وہ تو لگتا ہے“ میں نے خوفزدہ آواز میں آہستہ سے کہا۔ باوا اس

وقت خمار کی اُس حالت میں تھا جب بھلی کے کچھے سڑک کے عین درمیان

میں پہل قدمی کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

”ہم دونوں آج ہی کویت سے آئے ہیں... وہاں سے مال لائے ہیں۔“

ہمیشہ اسی مسافر خانے میں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں گاہک خود بخود آتا ہے“

”آپ پھیرے باز ہیں؟“

”اوتے باوے خدا کو جان دینی ہے...“ ڈھینگر سیدھا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”باؤجی یہ وہاں ایک سنیائے کی دکان پر کام کرتا تھا اور بنانا تھا۔“

”اوتے موج سنیار لے گیا...“ باوے نے گلا چھڑا کر گلاس اندر کیا اور پرانے کمر میرے بستر پر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ میں بھی چونکہ اسی بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی اچھل کود سے پسینہ کاٹی میں بیٹھے کسی مسافر کی طرح بے اختیار ہلنے لگا۔

”اوتے پھر مروائے گا...“ ڈھینگر میرے گھونسا مار کر بولا۔

باوا بدستور بھنگڑا ڈالتا رہا۔ چنانچہ ڈھینگر اپنا بدبودار منہ میرے قریب لے آیا۔ ”جہاں جاتا ہے گھٹ لگا کر بھنگڑا ڈالنے لگتا ہے اور پھر دم دونوں کو مسافروں والے نکال دیتے ہیں۔ آج بھی اس نے راہداری میں ایک سکھنی کو چھیڑا تھا۔ وہ تو کچھ کڑا شریف سکھ تھا ورنہ یہ قتل ہو جاتا... باؤجی آپ ہی اسے منع کریں...“

”میں کیسے منع کروں...؟“

”آپ کے بستر پر ناچ رہا ہے، منع کریں“

”کردوں؟“ میں نے جرات جمع کرتے ہوئے پوچھا۔

”آہو...“

”لے بھائی باوا صاحب...“ میں نے ایک خوفزدہ مسکراہٹ پہنے پھیلاتے ہوئے گزارش کی ”یہ بستر ٹوٹ جائے گا، ہوٹل والے شاید پسند نہ کریں آپ سے قیمت وصول کر لیں گے“

باوا ہانپتے ہوئے رکا اور لنگی کا ایک ٹکڑا کھول کر اس میں بندھے ہوئے زن ہوا میں اڑا دیئے۔ ”اوتے ہمارے پاس رقیں ہیں لٹا دیں گے“

ڈھینگر کی سرخ آنکھیں باقاعدہ لٹو کی طرح گھومتی گئیں۔ وہ زیر لب گالیاں بچتا فرش اور بستر پر سے نوٹ جمع کرنے لگا۔ اس دوران باوا چپ چاپ کھڑا

دیکھتا رہا۔ چونکہ اُس نے نوٹ اکٹھے کر کے اُسے واپس کئے اُس نے بڑی احتیاط سے انہیں لنگی میں باندھا اور ایک زبردست قسم کی بڑک لگا کر پھر سے پانچنے لگا۔ ڈھینگر نے تیزو کی طرف کی رجوع کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی کے دوران ہمارا ایرانی شریک کبھی کبھار کردٹ بدل کر نہیں گھورتا اور پھر منہ پھیر کر اونگھنے لگتا۔

”تہران اس مرتبہ بہت ہی نامہربان ہے۔“ میں نے سوچا۔ ”پچھلی شب فرش پر گزری مرغیوں اور بچوں کے ساتھ، آج سارے دن میں ایک بھی ایسا لمحہ نہ آیا جو دیوانچی مساحت کا جواز بنے اور اب میں ہوں اور یہ تیزو نہ کھاتا ڈھینگر اور میرے بستر پر ناچتا باوا۔“ اس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا بھی کہ میں اپنا سامان اٹھا کر کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں نکلتا۔ چنانچہ میں نے ڈھینگر کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ ”کہتے بچے سونے کا پروگرام ہے؟“

”ہیں؟“ ڈھینگر چونکا ہو گیا۔ ”ابھی تو ہم نے بیڑی مینی ہے، ٹھنڈک کیلئے دسکی کی گرمی دور۔ جگر کی گرمی دور... دفع دور“

”اور اُس کے بعد؟“

”اُس کے بعد ہم ذرا معشوقوں کو پکڑنے جائیں گے، وہاں...“ ڈھینگر شرارتے ہوئے بولا۔

”آپ لوگ یہی شغل کرتے رہتے ہیں تو مال کب اور کس وقت بیچتے ہیں؟“ ڈھینگر کھسک کر میرے قریب آگیا اور بڑی رازداری سے کہنے لگا۔ ”باؤجی میں تو چار ٹرنک لایا ہوں، اپنا مال ہے، اور باوے کا تو صرف ایک ہے...“

”اوتے...“ باوا فوراً پلنگ سے نیچے اتر آیا۔ ”دیوس کی اولاد کیا کہا ہے؟“

”میرے پاس صرف ایک ٹرنک ہے؟“ ڈھینگر قد سے خوفزدہ ہوا مگر میری جانب دیکھتے ہی اپنا منہ پھلادیا۔ ”آہو کہا ہے میں نے...“

ہاؤس نے اُسے ایک زنانہ ٹائٹل چھڑا دیا۔ ”اے جل گئے باؤجی کے کمرے  
 ہماری بے عزتی کرتا ہے...“ وہ میرے قریب منہ لاکر بولا۔ ”باؤجی ٹرنک ایک کمرہ  
 لیکن مال اپنا ہے اور اس کے تین ٹرنک شیخ کے ہیں، یہ تو کمیشن پر کام کرتا ہے۔  
 کمیشن پر کام کرنا غالباً اُن کے نزدیک دُوب مرنے کا مقام تھا۔ کیونکہ دُوب  
 دم کھڑا ہو گیا۔ اوتے تیری میں مال کو...“ وہ باقاعدہ ہاؤس پر حملہ آور ہو گیا۔ باؤجی  
 کی ناتواں کتیاں کھاتا رہا اور مسکراتا رہا۔ دُوبنگر نے ناؤ میں آکر اپنے محلے تیز کر دیے۔  
 دُوبنگر کا مشتاقی میں جانے کس طرح ہاؤس کے چہرے پر ایک گہری خراش آئی۔ اُس  
 مسکراتا بند کیا، تکیے کے نیچے سے ایک خنجر نکالا اور ایک زوردار بڑک لگا کر گایاں  
 غریب دُوبنگر کی طرف بڑھا۔ دُوبنگر ایک دم چوکتا ہو گیا اور دروازے کی جانب  
 پلکا لیکن باؤس نے پیچھے سے اُس کی شلوار کے درمیان میں ہاتھ اُدس کر لئے۔  
 گرایا اور اُس کے سینے پر سوار ہو کر خنجر لہراتا بڑکیں لگانے لگا۔ میں آہستہ سے  
 کھسکتا ایک کونے میں بک گیا۔ دُوبنگر نے نہ جانے کیسے اپنے آپ کو چھڑایا اور پھر  
 کی جانب بھاگا۔ اس دوران باؤس نے خنجر جو لہرایا تو دُوبنگر ایک دم پلٹ  
 ”اوتے مار دیا“ اس کے بازو میں سے خون رُس رہا تھا، اُس نے ہاتھ لگا کر  
 گیلہاٹٹ محسوس کی اور دھات میں مارا مار کر رونے لگا۔ ”اوتے باؤس مار دیا...“  
 اوتے تیری میں کواری... اوتے بہن... میں مر گیا... کو کو میں مر گیا...“  
 دُوبنگر نے شراب کی بوتل اٹھا کر فرش پر دے ماری اور پھر مر گیا، مر گیا  
 شور مچا تا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب باؤس قدرے سوہن ہوا اور خنجر  
 کے نیچے چھپا کر میرے سامنے اکھڑا ہوا۔ ”باؤجی آپ آرام سے بیٹھیں، ہم تو شغل  
 کر رہے تھے۔“

میں نے دوسری جانب نگاہ ڈالی تو دوسرے کونے میں وہ ایرانی دیوانہ  
 ساتھ گوند سے چپکا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسافر خانے کا مالک کمرے

داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے دیوانہ کو تان کر ہم تینوں کو ایک  
 قمار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ ایرانی مسافر نے انہیں کچھ کہا تو اسے دوسری جانب  
 کھڑے ہونے کی اجازت مل گئی۔ سپاہیوں کے ہمراہ دُوبنگر بھی کھڑا تھا اور اس کے  
 بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بدستور رو رہا تھا اور چلا رہا تھا کہ کو کو میں مر گیا۔ ایرانی  
 سپاہی باؤس بلند کچھ کہہ رہے تھے۔ اُدھر مسافر خانے کا مالک جانے کیا کہہ رہا تھا۔ ادھر  
 باؤجی کی فادسی میں جانے انہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصے بحث مباحثے  
 کے بعد سپاہی آگے بڑھے اور مجھے اور باؤس کو بازوؤں سے جکڑ لیا۔ وہ ہمیں گرفتار  
 کر رہے تھے۔ میں نے اپنی مختصر فادسی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا ان دو  
 حضرات سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں بھی پاکستانی ہوں،  
 مگر وہ سزا لاکر ”بالے بالے“ کہتے رہے اور مجھے کمرے سے باہر گھسیٹنے کی کوشش کرتے  
 رہے۔ اتنی دیر میں ایرانی مسافر آگے آیا اور اُس نے انہیں غالباً یہی بتایا کہ میں یقینی طور  
 پر ان دو کا ساتھی نہیں ہوں اور میں صرف اُن کے ساتھ کمرہ شیر کرنے کا قصور وار  
 ہوں۔ اُس کی سفارش پر پولیس نے مجھے نیم دلی سے چھوڑ دیا اور باؤس کے ساتھ  
 دُوبنگر کو بھی گرفتار کر کے لے گئی۔ اُن کے رخصت ہونے پر مسافر خانے کے مالک  
 نے کمرے کی صفائی کروائی۔ شیشے کے بکھرے ہوئے ٹکڑے چنے، باقی ماندہ تر بوڑ  
 بظ میں دبا اور ہم سے معذرت کر کے واپس چلا گیا۔ ایرانی نے اشاروں اشاروں  
 میں بتایا کہ اب اُسے نیند نہیں آ رہی۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیگ میں سے واڈ کاکی  
 ایک بوتل نکالی اور اُسی تپائی پر رکھ دی جس پر تھوڑی دیر پہلے دُوبنگر اور باؤس  
 کی بوتل دھری تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھے پینے کی دعوت دیتا میں نے طمانیت  
 کی ایک لمبی سانس بھری اور اپنے بستر میں گھس گیا۔

## سُکھ دیپ

تہران کی سرد مہری اگلی صبح بھی جوں کی توں قائم تھی۔ چپکتی دھوپ کے باوجود وہ اپنی لا تعلقی کی ٹھنڈی سانسوں سے میرے بدن کو یخ کرتا رہا۔ تہران آج بھی وہی کتاب تھا جسے میں کل پڑھ چکا تھا اور اس میں کہیں بھی میرے لئے چاہت کا ایک لفظ نہ تھا، صرف بے مہری تھی، کچا وٹ تھی۔ چہرے راکھ ہوتے ہوئے، گلیاں بازاء بجتے ہوئے، تہران آج میرا دوست نہ بنا، مجھ سے دور رہا۔ چنانچہ میں نے بھی اس شہرِ نامہرباں کو نظر انداز کیا اور اپنا رخ اس کے ایک ایسے باسی کی جانب کر لیا جو میرا دوست تھا.... میں نے سُکھ دیپ کو فون کیا.... کال آپریٹر سے منتقل ہو کر ایک نسوانی آواز تک پہنچی ”مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ میں ہیں نو کا لڑ....“ ساتھ ہی کلک ہوئی اور فون بند ہو گیا۔ میں نے پھر ڈائل کیا۔

”مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ....“

”مجھے صرف ایک منٹ کے لئے ملا دیں بہت دور سے آیا ہوں....“

”کون صاحب بات کریں گے؟“

”تامر“

”جی ہاں.... تامر....“ ایرانی سیکرٹری میری ”ر“ پر اڑ گئی۔



آپ پلیز ملا دیں، میں اُن کا ایک غیر ملکی دوست ہوں۔  
 ”ہیلو سکھ دیپ ہتیر...“ اُدھر سے ایک بھرپور کھردری آواز آئی۔  
 ”سکھ دیپ تم نے کہا تھا کہ کبھی تہران واپس آنا، ہم دن کے اُجالے میں  
 چلیں گے... میں آگیا ہوں۔“

”جنٹلمین دی میٹنگ راز اور...“ تھینک یو، جواب آیا۔  
 ”کیا مطلب؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
 اُدھر خاموشی طاری رہی۔

”ہیلو۔ ہیلو“ مجھے شہر ہوا کہ فون بند ہو گیا ہے۔

”اُوئے سُسرے کیا ہیلو ہیلو لگا رہی ہے“ کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز  
 آئی ”کچھ عقل کر، یہاں جن سوہروں کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا۔ انہیں نہیں بھڑکا  
 کرے سے باہر...“

”وہ یقیناً مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔ کسی اور کے دھوکے میں تھا“ سکھ دیپ  
 میں تارڑ بول رہا ہوں، پاکستان والا۔“

”اُوئے آہو... تو بھی مُسلا ہی رہے گا۔ تیرا کیا خیال ہے کہ اس تہران  
 کوئی اور سُسر رہے۔ جس کے لئے میں اپنی بزنس میٹنگ ختم کر سکتا ہوں کیلئے  
 ”مل کر پوچھ لے...“ میری باچھیں کھل گئیں۔

پندہ منٹ بعد دوازے پر دستک ہوئی۔ باہر نیلے رنگ کی ددی بی  
 جرنیلوں ایسی سنہری پی کیپ سجائے ایک صاحب ایٹنشن کھڑے تھے ”سُسر  
 دیپ نیچے گاڑی میں بیٹھ آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میں اُن کا شو فر ہوں۔“  
 فٹ پاتھ کے پہلو میں کھڑی سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر سکھ دیپ  
 اپنی پیٹیا لہ طرز کی پگڑی کے بیٹھا انگلیاں جیٹا رہا تھا... سکھ دیپ کا تیسرا

پہلا روپ تو اب دھندلانے لگا ہے... جب میں اور وہ ساؤتھ اینڈنگ ہائی  
 سٹریٹ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہر سکریٹ پر مر مٹنے کی نظریں لئے گھوما کرتے تھے۔  
 ہماری انگریز دوست لڑکیاں اس حرکت پر بے حد بُرا مانتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم  
 کچھ ”ہومو“ ہیں۔ جب وہ رات گئے حالتِ تہار میں میرے کمرے کے باہر کھڑا  
 ہو کر بے تحاشا تہمتے لگایا کرتا تھا۔ کافی ہاؤس میں داخل ہوتا تو اس کی پگڑی میں ٹانگا  
 ہوا عام شیشے کا ٹکڑا کوہِ نو کی طرح چمکتا اور لڑکیاں اس ہندوستانی ”مہا بلے“  
 پر مر مٹتیں۔ ہم دونوں ایسے پرندے تھے جن کے پر نئے نئے اُگے تھے اور ہم نہیں  
 اندھی پروازوں کے لئے اندھا دُھند استعمال کرتے مگر وہ طالبِ علمی کا نوخیزی کا پیرٹ  
 تھا، آزاد اور بے دریغ محبتوں کا زمانہ... پھر ہم اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ  
 گئے... سکھ دیپ کا دوسرا روپ آج سے چھ برس پہلے کا تھا۔ جب میں اپنے  
 گھونسلے سے اُداری ماہر کر باہر نکل آیا اور تہران میں ہمارا میل ہو گیا۔ وہ اب بھی اسی  
 طور پر دا اور مہنس مکھ اور مخلص تھا۔ صرف شنادی ہو چکی تھی اور ایک وسیع کا دوباد  
 کا مالک تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے خوشی سے اپنے خوابیدہ پر پُھر پُھر اُٹائے اور ہم دونوں  
 شمران کے تہوہ خانوں میں جھرنوں اور آبِ جو کی موسیقی پر جھومتے دریائے خراج کے  
 کناروں پر رواں کیسپین سمندر کی طرف برق رفتاری سے پرواز کرنے لگے۔ اُس کی  
 سپورٹس کار ما زندران کے جنگلوں میں اُڑتی، ریچھوں اور میٹھیلوں سے بھرتی بچاتی رات  
 کے پھلے پھر ہمیں داسرے لگتی۔ وہاں اُس نے اپنی بیوی کو فون کیا اور ”میں چلی پیٹا“  
 کی دھمکی سن کر فوراً سو بر ہو گیا۔ ہم دونوں کو اُسی رات واپس تہران لوٹنا پڑا۔ اُس نے  
 جُڑ ہوتے ہوئے کہا تھا ”واپس آنا، ہم پھر کیسپین چلیں گے۔ لیکن دن کے اُجالے میں“  
 اور پھر ایک زود واہ تہمتہ لگا کر تہران کی کہراؤد صبح میں گم ہو گیا تھا۔

اور اب، اس وقت ”مسافر خانہ نادر“ کے فٹ پاتھ کے پہلو میں وہ ایک  
 پرانی سپورٹس کار کی بجائے سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر بیٹھ اپنی پیٹیا لہ طرز کی پگڑی

کے بیٹھا انگلیاں چٹا رہا تھا.... سکھ دیپ کا تیسرا روپ - مجھے دیکھ کر وہ سا بن گیا اور دائرے میں سے چھوٹی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوششیں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ ہنستا ہوا باہر نکلا اور ایک اداس دیکھ کی طرح چھاتے ہوئے بغلیگر ہو گیا۔ "اوتے تارڑا، اوتے تارڑا، وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ تہقہ لگا رہا تھا۔ مگر اُس کے ہمرلو پر تہقے میں کہیں دکھائی نہیں دیتے جیسے اندر سے اُدا سی طنز میں کیلینج رہی ہو۔

"کیسے ہو سکھ دیپ؟" میں نے تہران کی سرد مہری میں گرمی یا ر محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھ لو، وہ پیچھے ہٹا اور بازو پھیل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پیہ سے قدرے صحت مند - دائرے میں چند سفید بال - کھلا ہوا وسیع سکھ دیپ "بال بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں،" وہ سمٹ کر بولا۔ "بیٹھو کار میں۔" کار کا انجن قالین پر برابر اجمان ایک مغرور ایرانی بی کی طرح ہلکے ہلکے غزلان میں نے سکھ دیپ کی جانب دیکھا۔ وہ انگریزوں کے بقول بالکل درمن طور پر ملبوس تھا۔ اُس کی مسکراہٹ ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور ایک دم شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا۔ "یار ماٹند ز کر ناہ۔ آج صرف ایک گھنٹے کے لئے تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔ میں نے بچوں سے وعدہ رکھا ہے کہ چار بجے انہیں نہلانے کے لئے سومنگ پول لے کر جاؤں گا۔" "یر تمہارا نہلانے کا ضبط ابھی تک نہیں گیا، میں ہنس دیا۔ مجھے کیسٹین کے تہ میں ڈبکی لگوانا چاہتے تھے اور اب بچوں کو سومنگ پول پر لے جا رہے ہو؟" "نہیں اگر تم کہتے ہو تو...."

"نہیں سکھ دیپ بچوں سے کئے ہوئے وعدے پورے کرنے چاہیے۔"

اور خاص طور پر سکھ بچوں سے کئے ہوئے وعدے.... "اوتے تارڑا تو کبھی میرے بچے دیکھ لے ناں.... واہ گورو کی قسم ایسے بچے ہیں کہ...."

"مجھے یقین ہے کہ بہت ہی خوبصورت ہوں گے.... سن رکھا ہے کہ گدھے کے بچے اور سکھ کے بچے جب چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں...." "اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تب؟" وہ دل کھول کر ہنستا ہوا کہنے لگا۔ "تب وہ علی الترتیب گدھے اور سکھ میں بدل جاتے ہیں۔"

"اوتے،" وہ ہاتھیں کھلاتا ہوا بولا "کم از کم بچپن میں تو خوبصورت ہوتے ہیں اور مُسلوں کے بچے.... اب تمہیں ہی دیکھو.... خیر یار چھوڑ اس سُسرے مسافر خانے کو اور بوریال سٹراٹھا کر میرے گھر چلے آؤ.... میں شام کو اُسی ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"پر کیوں؟" وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولا

"اگر سبھی کو پتہ چل گیا کہ میں وہی تارڑا ہوں جو چھ برس پہلے اس کے ڈرائنگ خاندان کو اغوا کر کے کیسٹین کے کنارے لے گیا تھا تو.... وہ تو مجھے مارے گی۔"

سکھ دیپ بچہ سا گیا۔ اُس نے گھر چلنے کی دعوت کو دہرایا نہیں، خاموشی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے اُس کی طویل خاموشی میں غل بولتے ہوئے پوچھا۔ "ہوں...." اُس کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔

"سکھ دیپ ہم کل مل لیں گے۔ تم بے شک ابھی چلے جاؤ اپنے بچوں کے پاس۔" "اوتے نیس اوتے،" وہ یکدم نارمل ہو گیا۔ "ابھی کینٹینی ان چلتے ہیں۔ پیسٹری ٹی کے لئے۔ چار بجے میں بچوں کے پاس چلا جاؤں گا اور کل دفتر سے چپی کر کے ہم دونوں

تہران کو ذرا سرخ کریں گے۔ انشاء اللہ!

انشاء اللہ کے استعمال پر میں قد سے چونکا۔ مگر پھر خیال آیا کہ افغان سکھ تو باقاعدہ لاجول ولاقوۃ بھی پڑھتے ہیں۔

سیاہ مرید س کینیٹکی ان ریسٹوراں کے باہر کھڑی ہوئی اور ایرانی بلی کی مانند بند ہو گئی۔

”سکھ دیپ وہ تمہاری سپورٹس کار کہاں گئی؟“ ریسٹوراں کی نیم تاریک گلیوں میں اترتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”یاد آس کا حادثہ ہو گیا تھا... ایک ایرانی سسرے نے دے ماری پڑی“ پتہ ہے پولیس نے جرمانہ بھی مجھے ہی کیا؟

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی گاڑی کھڑی تھی اور میری چل رہی تھی“ اُس نے ایک بے دھڑکن لگایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زیرزمین ریسٹوراں کی تاریکی میں لوگ سر جھکائے شاید کچھ کھا رہے تھے اور وہ کچھ درمیان جھکے جھکے چوروں کی طرح چل رہے تھے۔ ہم ایک کونے میں بیٹھے تو دروازے کی نسل کا ایک فرد ہمارے پاس چلا آیا، میز پر دو ٹوکریاں سجائیں اور چلا گیا۔ ایک صاحب اندھیرے میں سے نمودار ہوئے اور دو لنگ ہمارے سامنے جا کر دھیرے سے غروب ہو گئے۔ روشنی اتنی قلیل تھی کہ دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں کے بالے میں سے

پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں یا سر جھکائے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ ہم دونوں شطرنج نہیں کھیل رہے تھے کیونکہ ہمارے سامنے بانس کی ٹوکریوں میں سے

طرز کا خصوصی روسٹ چکن تھا اور لنگ ایرانی آب جو سے لبریز۔ مختصر وقفوں کے بعد یہاں میں مقیم وہی صاحب دبے پاؤں نمودار ہوتے اور خالی لنگ کی جگہ ایک اور لنگ

چلتے جو خالی نہ ہوتا۔ آنکھیں نیم تاریکی کی عادی ہونے لگیں اور ریسٹوراں خلوت

کے اذیس لمحوں میں ہرات کی تصویر کی طرح روشن ہوتا چلا گیا اور ہم اپنے جسموں میں پھلتی مدھنی کی تمازت سے آسودہ ہوتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے اُسے پچھلے چھ برسوں کی تفصیل سنانا چاہی مگر تمام قابل ذکر واقعات دس منٹ میں ختم ہو گئے۔ کیونکہ زندگی ایک مٹھنی آدمی کی تھی جو ڈائل پر درج ہندسوں کے تحت شب و روز میں سے ہلک کر تا گذرتا جاتا تھا، کو لہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں حرکت کرتا ہوا۔

”اور تم؟ تم کیا کرتے رہے سکھ دیپ؟“

”سکھ دیپ نے بریزنگ کے اوپر جھاک کے گول دائرے میں پھونک ماری اور اُس میں سمیٹے ہوئے سودا خ پر ہونٹ رکھ کر ایک طویل گھونٹ بھرا ”میں“؟ اُس نے مونچھوں پر سے جھاک پونچھتے ہوئے سوچا۔

”اوٹے“ وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ”چار بجنے والے ہیں، میں ذرا بچوں کو فون کر آؤں“ اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا وہ کاؤنٹر پر کھڑا اُٹھ گیا تھا۔

”انہیں کہا ہے کہ پانچ بجے آجاؤں گا...“ وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا ”تمہارا ایک سلا چاچا آیا ہوا ہے“

”لیکن سکھ دیپ بچے تو...“

”چھوڑ تارڈ... چار کی بجائے پانچ بجے نہا لیں گے، نہانا ہی ہے ناں؟“ اُس نے ایک اور طویل گھونٹ بھرا۔ وہ آب جو کی گرمی کے باوجود کچھ بھجا بھجاسا تھا۔

”اوٹے تارڈ...“ وہ یکدم چوکتا ہو گیا ”یہ تم پاکستان جا کر کتابیں وغیرہ بھی لکھتے ہو؟“

”ہاں“ میں خوش ہو کر بولا ”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟“

”مجھے اس طرح معلوم ہو گیا کہ ہر دوسرے تیسرے ہینے کوئی نہ کوئی پاکستانی سیاحت تمہاری کتاب انٹل میں دلیے مجھے تلاش کرتا ہوا میرے دفتر میں آسکتا ہے

اور بس کھڑا مجھے دیکھتا ہے اور دانت نکالتا ہے۔“

”تو مشہوریاں ہو گئیں ناں تمہاری...“

”آہو“ اس نے ایک بے پناہ قہقہہ لگایا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بچے کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ”تم غلط باتیں بھی تو لکھ دیتے ہو۔“

”غلط باتیں؟“

”آہو۔ دارو کے باسے میں دڈنڈی مار گئے ناں...“

”سکھ دیپ درست کہتا تھا۔ میں مجرم تھا۔ ہم جس نقلی معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بازار میں سے شریفانہ طور پر گزرنے کے لئے کسی محفل میں بیٹھنے کے لئے دشتہ داروں سے میل جول رکھنے کے لئے دڈنڈی مارنی ہی پڑتی ہے۔ نہ ماریں تو مارویں۔ سو فی صد چر کی شراب ہمیں کبھی ہضم نہیں ہوتی، ہم قے کر دیتے ہیں۔ پورے پانچ بجے سکھ دیپ پھر اٹھا اور کاؤنٹر پر جا کر بچوں کو فون کیا کہ وہ تیار رہیں۔ انہیں ہر صورت میں چھ بجے سومنگ پول پر لے جایا جائے گا۔ اُس کی فزفزی میں میں نے ریسٹوراں میں چہل قدمی کرتی ایک خاتون کو پانچ فروش سے ایک ملکا اور سلکا لیا۔“

”سکھ دیپ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گہرے بھورے رنگ کے شتر کی بوتل تھی۔“ ”اب جو میں اب اثر نہیں، اسے چکھتے ہیں۔“

”بارہ گول کے بعد تو ظاہر ہے نہیں رہتا... مگر یہ ہے کیا؟“

”تمہیں لگنے پسند ہیں؟“

”گتے؟ یعنی کما؟ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”اب جو کا اثر یقیناً ہوا۔“

”آہو گتے... یہ گتے کا رس ہے، صاحب لوگ اسے دم کہتے ہیں۔“ اُس نے

دھکن آتا دھر مشروب کو سونگھا۔ ”خالص پونے گتے کا رس...“

رس واقعی خالص تھا کیونکہ اس کی چند چمکیوں نے اسے خوش باش بنادیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوا میں شکاری کتے کی ناک سکیڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اوئے

یکڑا جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے؟“

میں نے بتایا کہ میں سکھارپی رہا ہوں۔

”اوہ... پیو ضرور پیو لیکن خالص تبا کو نہیں پیتا صرف گتے کا رس پیتا

ہے۔“ وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنسا اور گلاس کو ڈیک لگا کر پی گیا۔ مگر یہ سرخوشی عارضی

تھی۔ اُس نے جبرے بھینچ لئے اور سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے

بچی موتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسے شخص کی طرح گویا ہوا جو مکمل طور پر

نارمل ہے اور جس کے خون میں الکوحل کی مقدار زیرو فی صد ہے۔ تم شاید سمجھتے ہو کہ میں

ہمیشہ اسی طرح بلا نوشی کرتا ہوں۔ نہیں تارڑ صرف جب تم ملتے ہو تب تمہیں ملتے

ہی وہ تمام سال پرانی کینچلی کی طرح میرے جسم سے اُترنے لگتے ہیں جنہوں نے مجھے اُن

دنوں سے جدا کر دیا ہے جب ہر درخت سر سبز لگتا ہے اور ہر بد صورت لالچ زاج ہنس

دکھائی دیتی ہے... رانڈر ہیکر ڈکی ”شی“ کی طرح تم گذشتہ زمانوں کی ایسی آگ ہو جو مجھے

پھر سے آزادانہ خوبصورت کر دیتی ہے... تمہارے ساتھ میں نیچرل محسوس کرتا ہوں۔

جبکہ دوسروں کے سامنے مجھے ایک مدبر اور سنجیدہ سکھ دیپ کی اداکاری کرنا پڑتی ہے...“

چھ بجے اُس نے بچوں کو اطلاع کی کہ بس جان پدر میں سات بجے ہر صورت پہنچ جاؤ

گا۔ سات بجے سکھ دیپ نے فیصلہ کیا کہ اب شام ہو چکی ہے۔ یہ کوئی وقت ہے نہانے

کا۔ بچوں کو کل ہنگام دیں گے۔

ریتوراں پر ہو چکا تھا۔ نشستوں کے خواہشمند لوگ میٹرھیوں میں کھڑے میزوں

پر کمری خوراک کی مقدار سے اندازہ لگا رہے تھے کہ کونسا کاگ اب اٹھنے کو ہے۔ ایک ایرانی

جوڑا بہت دیر سے ہمارے سروں پر کھڑا ہمیں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سکھ دیپ دم کا آخری گھونٹ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا اور ویر کو بل کے لئے کہا یہاں

تو میرا لگ گیا ہے کسی ویرانے کو ڈھونڈتے ہیں۔“

بل دو صفحوں پر مشتمل تھا۔ سکھ دیپ نے جیب سے عینک نکال کر ٹوٹل چیکر اور ویر سے کہنے لگا: "جانِ برادر میں یہاں اپنی بارات لے کر تو نہیں آیا، اتنا بل؟" ویر بھگی ہوئی حالت میں مسکراتا ہوا۔

"دو چار ایکڑ میں لگے گئے کے رس کا بل تو اتنا ہی آنا چاہیے۔" میں نے بل پر نگاہ ڈال کر اسے تسلی دی۔

"اوتے آہو،" اُس نے ایک فلک شگاف تہقہہ رستو داں میں بھیرا اور بل ادا کر دیا۔

رستو داں سے باہر آ کر اُس نے ڈائیاور کو فارغ کر دیا اور خود سیٹرنگ منیال آیا۔ "کیا اب ہم پرواز کرنے کو ہیں؟" میں نے دلش بود کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں تارڑ۔ اب میں نے تیر فٹ ای چھوڑ دی ہے۔۔۔۔۔ وہ اور زلمے تھے۔۔۔۔۔ اب تو میں قد سے بزدل ہو گیا ہوں، سوئی چالینس کو عبور کر لے تو سپیڈ میٹر پر مجھے اپنے بچوں کی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔" سیاہ مریدس تہران کی گاڑی سے سوپ ایسی ٹریفک میں رینگنے لگی۔

"تہران دیسے کا ویسا ہی ہے۔" میں نے شاہ رضا کی آسودہ اور پُر آسائش شہر پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا: "کچھ بھی نہیں بدلا۔ یہاں تک کہ شاہ بھی نہیں بدلا۔"

"وہ نہیں بدلے گا۔" سکھ دیپ سیٹرنگ پر انگلی بجاتے ہوئے بولا۔ "اُسے بدلنا جائے گا۔ حالات ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ ہم ہندوستانی جو یہاں کی شہریت رکھتے ہیں میں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے جب تم اگلی مرتبہ آؤ تو میں اُس وقت مشرقی پنجاب میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں۔"

"اچھا ہے قریب آجاؤ گے۔"

"آہو،" وہ مسکرایا۔ "میں اُدھر بارڈر پر آ کر ہر روز غریب لگایا کروں گا کچھ۔"

اُس سرے تارڑ کو وہ اپنا یا ہے۔ وہ تنگ آ کر بھیج دیں گے۔" مریدس ایک بلند آہنی قد والے کے پیٹ میں تھو تھنی لگا کر گھڑی ہو گئی۔

لمحہ کین میں سے ایک پہرے دار نکلا۔ جسے سکھ دیپ نے ایک کار ڈکھایا اور دروازہ کھول دیا گیا۔ یہ تہران کلب تھی۔ سوئنگ پول کے سامنے سینٹل بار کا دروازہ تھا ہم اندر چلے گئے۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ زیادہ تر غیر ملکی صحافی تھے جو ایران کے چیدہ چیدہ کاروباری لوگوں اور فوجی افسروں سے مکمل مل کر تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ صحافی جو شراب نوشی کے باوجود اپنے حواس بجا رکھے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ جن کے حواس ہی نہیں تھے، سکھ دیپ کو دیکھ کر بار کا انچارج باہر آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک وزنی چابی تھی۔ مختلف کمروں میں سے ہوتے ہوئے ایک آبنوسی دروازہ کھولا۔

انچارج نے قفل میں چابی کو گھمایا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بلند چوٹی چھت کا فرنیچر کی پالش کی مہک اور اُونی قاینوں کے گرم ماحول والا کمرہ تھا۔ کسی انگریز جنرل کی قد آدم تصویر سینٹل بیس کے اوپر سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"اس سفید لنگور نے اپنے پنجاب میں بڑی تباہی مچائی تھی۔ پھر یہاں آ گیا۔۔۔۔۔" سکھ دیپ ایک صوفے میں آرام سے گرنا ہول کہنے لگا۔ "یہ اس کا پسندیدہ کمرہ تھا اور اب میں اُسی صوفے پر بیٹھ کر ایرانی آب جو پیتا ہوں جہاں یہ سسر اسکاٹ لینڈ کی دوسکی بیارکتا تھا۔"

انچارج خود اک کے بواہ آب جو کا ایک سرد گلاس بھی لے آیا۔

"کتنے دن ایران میں ٹھہرو گے؟"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے۔ ایک دن بھی نہیں آج تبریز پہنچاؤں گا۔ وہاں سے ارض روم، پھر شام، لبنان۔۔۔۔۔"

”تاریا چلو، سیتل سے ہیر سنتے ہیں....“ سکھ دیپ نے بے بسی سے تیرنگ پر ہاتھ مارے ہوئے میرے منت کی۔  
”اس وقت؟“

”اس وقت کیا ہے؟ صرف ایک ہی توجہ ہے“ اُس نے پورا سیرنگ گھما کر مریدس کو واپس کر لیا۔

سیتل کا فلیٹ تہران کے علاقے ”بہارستان“ کی ایک عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ جیسے لندن کے ساؤتھ ہال میں خالصہ راج کرتا ہے اسی طور بہارستان میں ہر سڑک اپنی رنگ برنگی پگڑیوں میں کھلتے نظر آتے ہیں۔ ہم ہانپتے ہوئے سیتل کے فلیٹ تک پہنچے۔ کال میل بہت دیر تک بجتی رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک خاتون ناگواری کے موموں میں جھانپا لیتی ہوئی ہمارے سامنے آگئی۔ سکھ دیپ کو دیکھتے ہی جھائی مائل منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ ”بھرجی آپ.... آئیے آئیے.... ہمارے مہاجر کہ آپ نے یاد کیا....“

”سیتل کہاں ہے بھابھو؟“ سکھ دیپ نے بے چینی سے فلیٹ کے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو گوردوارے گئے ہیں....“ بھابھو نے اطلاع کی۔  
”گوردوارے؟“ سکھ دیپ نے تھوک ننگے ہوئے بے یقینی سے پوچھا ”کیا تکلیف ہے اُسے؟“

بھابھو میری موجودگی میں کچھ شرمندہ سی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سکھ دیپ کے قریب جا کر کان میں کچھ کہا۔ اُس نے سر ہلایا اور پھر میرا بازو پکڑ کر بائیں بچوں کی طرف درخواست کی ”ساو گوردوارے چلتے ہیں، نزدیک ہی ہے، سیتل کو پکڑ لاتے ہیں“

گوردوارے کے عالیشان ہال میں اکھنڈ پاٹھ جاری تھا۔ ہم نظریں نیچی کئے

”جب آتے ہوا افراتفری میں آتے ہو“ وہ ناراض ہو گیا ”تین چار روز دیگر میں فائدہ ہو جاؤں گا۔ پھر ایک ہفتے کے لئے ہم کیسپین جا سکتے ہیں۔ اُسی طرح کے تنگیوں میں فرمائے بھرتے ہوئے....“

”بھابھو اجازت دے دے گی؟ اُس نے تو ایک رات کا اعتبار نہیں کیا“ اور کہاں پورا ایک ہفتہ....“  
”سکھ دیپ نے سر جھکایا اور گوشت کے ٹکڑے میں کانٹا چھو کر لئے دیر تک دیکھتا رہا۔

مریدس میرے مسافر خانے کی طرف رواں تھی اور سکھ دیپ واقعی اُسے اتنا سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔ خاموشی کا لوجہ ناقابل برداشت ہونے لگا تو اُس کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا.... ایک پاٹ دارا دار والا شخص ہیر مڑھ رہا تھا اس پر اوجہ نرم اور دل گذار نہ تھا بہت دشت تھا مگر وہ ایک ایک لفظ کی ادائیگی اتنی شدت سے کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا۔

”سیر سیتل کی آواز ہے“ سکھ دیپ گہری تھکاوٹ کی ایک سانس بھرتے ہوئے بولا ”یہاں ہندوستانی سکول میں ٹیچر ہے اور میرا جاننے والا ہے۔ جب بھی بوجھنے ہیں تو میں اُس کے پاس چلا جاتا ہوں اور ہیر سنتا ہوں.... یہ وجود میں گھلتی ہے“

دیپتی ہے“

”سکھ تو تمہاری ذات کا حصہ ہے“

”صرف نام کا....“ وہ مدغم ہو کر بولا اور پھر سیتل کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر کے بول لگنہ لگنہ لگا۔ وہ اپنے آپ میں گن تھا، میری موجودگی سے یکسر غبر کیسٹ ختم ہوئی تو کیسٹ ریکارڈر جو چند لمحے پہلے زندہ تھا، ہم سے باتیں کر رہا تھا۔ مردہ ہو گیا۔ لوہے کا ایک بیکار نیم گرم ٹکڑا۔

ایسا ہے جو ڈھکا ہوا نہیں ہے اور وہ اُس کے دوست کا ہے، چنانچہ اُس نے خود اُجیب سے دہال نکال کر میرے سر پر رکھ دیا۔

آخر میں کراہ پر شاہد تقسیم ہوا اور پاٹھ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ سکھ دیپ فوراً ہی سکھوں کے ایک جھوم کے نرغے میں آگیا جو اُس کی گوردوارے میں آمد پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے اقرار کر رہا تھا کہ ہاں واگوردو کی واگوردو جانے۔ وہ جب چاہے اپنے بندے کے دل میں اپنا پریم پھونک دے اور بندہ دھرم کی راہ پر چلتا ہوا گوردوارے پہنچ جائے۔ اس دوران میں سیٹل بھی ہمارے قریب آچکا تھا۔ سکھ دیپ نے جلدی سے اس کا بازو تھاما اور ہم ہال میں سے نکل کر صحن میں آگئے۔

”تیری میر سننے کے لئے آج مجھے گنتھ صاحب بھی سننا پڑا ہے،“ سکھ دیپ نے ہنستے ہوئے سیٹل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گوردوارے کے صدر دروازے پر بھائی سنت جو خاص طور پر اس پاٹھ کیلئے دہلی سے تشریف لائے تھے لوگوں کو اوداع کہہ رہے تھے۔ میری باری آئی تو میں نے جی اُن کی تعظیم کی اور جھک کر ہاتھ ملایا۔ اُس نرم پہرے والے سفید ریش بزرگ نے مجھے بھی سکھ ہی جانا اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”پتر تم نے کیسے اودادھی صاف کر کے واگوردو کی ناراضگی مول لے لی ہے۔ دھرم میں استرے کی منا ہی ہے۔ خالصہ دار دھمی سے ہی بچتا ہے۔“

بڑا نا لائق سکھ ہے بھائی صاحب،“ سکھ دیپ نے کہا۔ ”ولایت کی ہوا کیا لگی ہے دھرم کو ہی بھول گیا ہے۔“

اب میں بھائی صاحب کو کیسے بتانا کہ سکھ دیپ ہر ہفتے اپنی دار دھمی اور کیسے تراشے گراسترے کے ساتھ نہیں جس کی دھرم میں منا ہی ہے۔ بلکہ الیکٹرک شیور

جو تے اُتار کر اندھا نکل ہو گئے۔ دائیں طرف سینکڑوں پگڑیاں جھکی ہوئی تھیں اور بائیں جانب عورتیں اور بچے بصد احترام آنکھیں نیچی کئے بیٹھے تھے۔ سامنے تخت پر گرگنٹھ صاحب کے اداق پر جھکا ایک نرم چہرے والا بوڑھا سکھ تھا۔ اس کی سینکڑوں سالہ سیکنے کی ہوا سے دھنی ہوئی روٹی کی طرح مقدس کتاب پر پھیل رہی تھی۔ روشن تھے اور فرش پر قالینوں کی تہیں تھیں۔ سکھ دیپ کو دیکھ کر بیشتر ہیروں حیرت کی مسکراہٹوں کا دِ عمل ظاہر ہوا۔ ہمارے لئے جگہ بنائی گئی اور ہم دونوں نے پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سکھ دیپ کی نظریں سیٹل کو تلاش کرنے لگیں۔

”وہ ہے سُسر...“ سکھ دیپ نے مجھے کہنی مارتے ہوئے دوسرے کو طرف اشارہ کیا۔ وہاں سکھ ہی سکھ تھے اور اُن میں سے کسی ایک سکھ کا تعین کرنا میرے لئے بے حد دشوار تھا۔

”سُسر اسرجکاٹے میں ہے۔ اوپر ہی نہیں دیکھتا“ سکھ دیپ نے بڑے ہو کر سرگوشی کی۔ ہمارے قریب کی دوداڑھیاں جو فرش کو چھو رہی تھیں ناگوار آوازیں اُپراٹھیں اور سکھ دیپ نے فوراً ایک عقیدت میں ڈوبی ہوئی آہ بھر کر سر جھکا لیا۔ ”یہ تمہارے مولوی صاحب ہوتے ہیں؟“ میں نے گرگنٹھ صاحب پر جھکے سوار کے بارے میں آہستہ سے پوچھا۔

”یہ بھائی سنت سنگھ ہیں“ وہ سہجے سے بولا۔

”کس کے بھائی؟“

”اوتے کسی کے بھی نہیں۔ چپ کر کے پاٹھ سن۔“

اتنی دیر میں بھائی سنت سنگھ نے بلند آواز میں کسی بانی کے بول پڑھے اور حاضرین سر بسجود ہو گئے۔ میں شتر مرغ کی طرح گردن اٹھائے اور اُدھر دیکھتا رہا۔ سکھ دیپ نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھا۔ اوتے سُسرے مار کھانی ہے خالصہ نیچا کر۔“ میں وہیں دبک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ پوری محفل میں ایک

کے ساتھ کہ اُس کا تو گزشتہ صاحب میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔

ہم واپس سیٹل کے فلیٹ میں آئے تو بھابھو نے بڑے اہتمام سے کھانا لکھی تھی اور اُس پر سکھ دیپ کی پیاس بجھانے کے لئے ”پانی“ کی دافر مقلد کی ہو پانی رنگدار تھا۔ سیٹل چونکہ خود بھی شعر کہتا تھا اس لئے اُس نے دو سامعین کی فائدہ اٹھایا اور جی بھر کر اپنے شعر سنائے اور ترنم سے سنائے۔ اس دوران سکھ دیپ بدلتا رہا۔ بالآخر میر کی باری آئی اور رات کے تین بجے تک حافظ و سعدی کی سحر ہم نے اپنے پنجاب کے وارث شاہ کا پُر اثر کلام سیٹل کی پاٹ داد اور جذباتی آواز میں شروع کیا۔

انسان اپنے وطن سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو جائے۔ کتنے ہی چولے کیوں نہ ہوں سے اُس کی دھرتی اُس کے سانسوں اور رگوں کے تحریک کے گرد ریشم کے کیڑے کی طرح باس اور وحشی چاہتوں کا ایک چولا سبھے سبھے بنتی رہتی ہے اور حب بھی درد و زمین کی گرم آواز اُس کے کانوں میں اُترتی ہے تو پر اُتے چولے موم کی کینچی کی طرح چٹے ہیں اور اندر سے وہی اپنا چولا نکل آتا ہے۔ میر کی لئے مجھے واپس لے گئی۔ اُس پر جس کا گنبد کھلا ہے، جس کا پلنگ رنگ رنگیلا ہے اور جس کے رنگ وہی ہیں؟ میرے اندر کا چولا رنگا ہوا ہے.... سیٹل آنکھیں بند کئے۔ ایک ہاتھ کان پر رکھے آہوں کو اپنی زبان سے رہا تھا۔ سکھ دیپ سر جھکائے بیٹھا تھا اور بھابھو کر کے لگائے اونگھ رہی تھی۔

ہم سیٹل کے فلیٹ کی سیڑھیاں اترے تو سکھ دیپ مجھے بہت خاموش سا لگا۔ واپسی پر کار چلا تے ہوئے بھی وہ ایک سحر زدہ وحشی کی طرح سیڑھیاں پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مسافر خانے کے نیچے کار کھڑی کر کے وہ باہر نکل آیا اور مجھے ہو گیا ”خدا حافظ اور یاد راتی افرا تفری میں نہ آیا کرو“

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو چار بج رہے تھے۔ مجھے بے اختیار ہیرہ

آئی جب کیپٹن کے کناے سکھ دیپ کو اُس کی بیوی نے فون پر ڈانٹا تھا کہ فوراً واپس آؤ ورنہ میں چلی پیالے اور وہ انتہائی فرمانبرداری سے کوہ البرز کی خطرناک گھاٹیوں میں کار چلاتا صبح کا ذب کے وقت تہران پہنچ گیا تھا۔

”خدا حافظ سکھ دیپ“ میں نے حدت یار کو محسوس کرتے ہوئے کہا اور ہاں بہت دیر سے گھر جا رہے ہو۔ اگر آج بھی جلتے ہی بھابھی نے ”میں چلی پیالے“ والی دھمکی دے دی تو؟

”وہ تو چلی گئی پیالے“ اُس نے کار کی نشست پر گرتے ہوئے کہا۔ ”دو سال ہوئے اُسے مرے ہوئے“ سیاہ مر سیڈس سٹارٹ ہوئی اور پھر ایک تابوت کی طرح تہران کی سیاہ رات میں جذب ہوتی چلی گئی۔

۔۔۔۔۔



## وادی آرات

میرے سر پر نوح کا پہاڑ ہے اور پاؤں کیچڑ میں ہیں۔  
 پلکیں اٹھاؤں تو برف پوش کوہ آرات کی سفیدی آنکھوں میں چمکتی ہے، ہتھکڑوں  
 تو صرف شے دیکھ سکتا ہوں کہ پاؤں تو بوٹوں سمیت کیچڑ میں غرق ہیں۔  
 میں ارضِ روم کا مسافر ہوں۔ سامنے وادی آرات میں کچی سرک پر رواں ہونا چاہتا  
 ہوں مگر ٹرانسپورٹ کی نایابی کے باعث پچھلے پانچ گھنٹوں سے بازارگان کی ایرانی سرحد  
 کے ادھر ترکی کی سرزمین پر کھڑا ہوں اور اچھے وقتوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیچڑ کے اس  
 جزیرے میں میں اکیلا نہیں ہوں، اور بھی ستیاح ہیں۔ ترکی کی جانب بڑے بڑے ٹریلوں  
 اور ٹرکوں کی ایک طویل قطار ہے جو حرکت میں نہیں ہے۔ کسٹم ہاؤس میں عملے کی کمی کی وجہ  
 سے ترکی سے ایران میں داخل ہونا ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ ایک ٹرک ڈرائیور پچھلے پانچ روز  
 سے پھنسا بیٹھا ہے اور اب وادی میں خیمہ نصب کر کے دھوپ میں بیٹھا دھسکی پیتا ہے  
 اور گائے گاتا ہے۔ شدید بارشوں کی وجہ سے پورا علاقہ کیچڑ کی ایک جھیل میں بدل چکا  
 ہے اور دیو زاد ٹرکوں کے پیسے اس میں سے گھومتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں اور یوں یہ  
 کیچڑ اتنا ہی باریک مگر گاڑھے چینی سوپ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور میرے پاؤں  
 ٹخنوں تک اس میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اوپر نوح کا پہاڑ سنگ مرمر کے سفید مہمانا بدھ  
 کی طرح سکون سے بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہے۔  
 کسٹم ہاؤس سے فارغ ہونے والا ہر ستیاح بڑی افراتفری میں ہمارے پاس

”یہ ایرانی کتنے غلیظ ہوتے ہیں، اپنے کسٹم ہاؤس بھی صاف نہیں رکھتے، اتنا کچرہ“ ایک جرمن سیاح کہہ رہا تھا۔  
 میں نے اُسے بتایا کہ ایران وہ ادھر ہے شاہ کے محنتی والا۔ اب ہم ترکی میں ہیں۔  
 ”ایک ہی بات ہے“ وہ غرایا ”سارے مشرقی ایک سے ہوتے ہیں، غلیظ“  
 ارض روم جانے کے شوقین تمام کے تمام سیاح سفید چٹری دلے تھے اور میں اُن میں واحد مشرقی تھا، غلیظ! شاید اُن کے نزدیک میرا کچرہ میں یوں کھڑا رہنا ایک معمول کی بات تھی۔

ایران کی جانب سے ایک جہاز نما ٹرک لڑکھڑاتا ہوا نکلا جس کے ساتھ ٹرین کے ڈبے سے بھی بڑا ایک ٹریلر لٹکاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جیسے ایک دیو زاد کتورا دم ہلاتا آ رہا ہو۔ لگتا تھا ایک چھوٹی موٹی عمارت کو پیٹے لگ گئے ہیں۔ ہمارے قریب سے گزرا تو ہم جلدی میں اپنی پوزیشن تو نہ بدل سکے البتہ دفاع کے طور پر آنکھیں ضرور بند کر لیں اس اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی جسم کے علاوہ پلوں پر بھی کچرے کے نفیس چھینٹے پڑ گئے... یہ پہلا چھینٹا تھا... ٹرک بڑی باقاعدگی سے ہم پر چھڑکاؤ کرتے ہوئے گزرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ہم سب ایسے جھٹکوں کا دُپ دھار چکے تھے جنہیں سنگ تراش گیلا چھوڑ کر سیر کے لئے چلا گیا تھا۔ اسی دوران جب ایک اور پہیوں والی عمارت ہمارے قریب سے گزری تو ہم نے حسب سابق آنکھیں بند کر لیں مگر اس مرتبہ کچرہ کی بو چھاڑی بجائے ٹرک کی پادربریوں کی سمندری جھگٹا ہمارے کانوں میں اُتری۔ آنکھیں کھولیں تو ٹرک کھڑا تھا اور ہمارے گردہ کا جرمن سیاح آؤ، ڈرائیور سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اُسے ارض روم تک اپنے ساتھ لے چلے چونکہ ڈرائیور بھی جرمن النسل تھا اس لئے اُس نے ہامی بھری اور اپنے ہم وطن کو براہ میں بٹھالیا۔

”ہم بھی بیٹھ جائیں؟“ میں نے مسکین ترین شکل بنا کر پوچھا۔ بقیہ پبلک میری حمایت میں دیہات میں لسی مانگنے والی لڑکیوں کی طرح مسکرانے لگی۔

آتا ہے۔ ”ارض روم جانے والی بس کہاں ہے اور کتنے بجے چل رہی ہے؟“ ہم نے بتاتے ہیں کہ کہیں بھی نہیں ہے اور اس لئے چل بھی نہیں رہی اور پوری صورتِ سب سے آگاہ ہونے کے بعد وہ بے چارہ بھی ہماری برادری میں شامل ہو جاتا ہے کچرہ پاؤں جاتے، منہ لٹکائے یتیموں کی طرح اُس سڑک کو دیکھنے لگتا ہے جس پر اگر چاہا پیسوں والی ایک سواری چلنا شروع کر دے تو سیدھی ارض روم پہنچ جائے۔ اس کی غیر یقینی صورت حال میں سیاح دُنیا کا سب سے بڑا یتیم ہوتا ہے۔ زبان سے وہ نا آشنا ہوتا ہے، راستے وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب مثلاً میرے ارد گرد صنفِ نازک اور صنفِ مضبوط کے گیارہ بارہ سیاح سالگرہ کے کیک میں نصیب چھوٹی موم بتیوں کی طرح کچرہ میں کھبے کھڑے تھے۔ ان کے نقشے بتاتے تھے کہ کاکاز ارض روم ہے، ورنہ انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ ارض روم کیا جگہ ہے۔ آج شام تک وہاں پہنچنا نصیب بھی ہو گا یا خوراک اور چھت کے بغیر رات اسی وادی میں گزرنے لگا جہاں معلوماتِ عامہ کی ایک کتاب کے مطابق بھیسڑتے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے چہرہ قیامت اور بے چارگی باقاعدہ برس برس کر کچرہ میں جذب ہو رہی تھی۔  
 میرے سر پر نوح کا پہاڑ ہے اور پاؤں کچرہ میں ہیں۔

یہ نوح کا پہاڑ بھی عجیب تک چڑھا بڈھا ہے۔ اپنی سفید عبا اوڑھے ترکی، ایران اور روس کی سرحدوں پر مڑے سے بیٹھا رہتا ہے، ہمیشہ سے بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے یاد رہا ہے مگر بچانے سے انکار ہی ہے، آنکھ ہی نہیں ملاتا حالانکہ یہ میری آوازیوں کا گڑبگڑ ہے۔ اس نے مجھے کئی مرتبہ اسی کسٹم ہاؤس سے نکل کر لا پرواہی سے سیٹیاں بجاتے ہوئے اجنبی دلیوں کی جانب جاتے دیکھا ہے۔ ہاں بھی جس پہاڑ کو یہ شرف حاصل ہو کہ اُس حضرت نوح نے بذاتِ خود اپنی کشتی لنگر انداز کی ہوا وہ پھر اسی کے پہلو میں خیمہ زن ہو کر سامنے والی وادی میں انگوروں کی کاشت شروع کی ہو وہ بھلا مجھے لُٹ دے سکتا؟ کہاں بابا نوح اور کہاں ایک نکمّا آوارہ گرد۔

ڈرائیور نیچے اتر آیا۔ ٹرک کی نشست پر بندھے ٹریلر میں سفر کر لو گے؟  
”کر لیں گے۔“ سب نے کھلتے ہوئے نعرہ لگایا۔

”کیسے کر لو گے؟“ وہ تعجب سے بولا۔

”ہم اس وقت کسی بھی ایسی شے پر سوار ہونے کو تیار ہیں جس کے نیچے بیٹے لگ جائیں۔“  
میں نے شبابی سے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ ڈرائیور مسکرایا اور بیچھے جا کر ٹریلر کا دروازہ کھول دیا۔

ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ اس میں ہم سوار کیسے ہوں، کیونکہ  
دروازہ سطح کچھڑ سے تقریباً سات فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ پہلے تو دروازہ تختیاں چھڑ  
نے قسمت آزمائی کی مگر کچھڑ آلود بوٹوں کی وجہ سے پھسل پھسل کر گرتے رہے پھر ہمارے

ڈرائیور آگے آیا اور ایک بازو کی طرح پھرتی سے ٹریلر پر چڑھ گیا۔ اُس نے ہمارے  
ٹک سیک پکڑ کر اندر پھینکے اور پھر ہمیں بھی بادی بادی اُپر کھینچ لیا۔

”یہاں تو ہم آسانی سے فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔“ ڈچ لڑکی جولی فرش پر ڈھیر  
ہوتی ہوئی کہنے لگی۔

”فٹ بال کے علاوہ...“ انگریز سیاح سامن متانت سے کھانسنے لگا۔  
دیگر ان ڈور کھیلوں کے لئے بھی موزوں ہے۔“

”مثلاً؟“ جولی پوچھنے لگی۔

”ایسی ان ڈور کھیلیں جن کے لئے تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔“ سامن نے شرارت

ہو نہٹ دیا اور جیکٹ کی جیب میں سے ایک جاسوسی نادل نکال کر پڑھنے لگا۔

کارلز اور شارٹی نے جن کا تعلق ڈنمارک سے تھا، ایک چھوٹا سا شطرنج بورڈ

سامنے پھیلایا اور اُس پر سر جھکا دیتے۔

امریکی میاں بیوی ارلنٹ اور میری آن پالی تھیں کا ایک فائدہ کھول کر

پر منہ مارنے لگے۔ فرانسیسی جوڑے ہنری اور سی مان نے فرش پر سیلینگ بیگ بچا

چونکہ اُن کے پاس منہ مارنے کو کچھ نہ تھا، اُنہوں نے منہ ملا لئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والی سویڈش لڑکیاں اُنکے، شیرن اور لی آنا تالیوں کی تال پر

لمبی لمبی ٹانگوں والی سویڈش لڑکیاں اُنکے، شیرن اور لی آنا تالیوں کی تال پر

مقبول سویڈش گروپ ”آبا“ کی ڈھن ”بے بی مجھے ایک رقص اور کر لینے دو“ گانے لگیں۔

میں نے سگٹ سٹاکایا اور ایک پُر لطف سفر کی متوقع آمد پر اطمینان کا سانس لیا۔

ڈرائیور نے ٹریلر کا آہنی دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا کھینچ دیا۔ اندر ایک دم

تاریک ہو گیا۔ لڑکیوں نے جان بوجھ کر شرارت سے یوں چہنچیں بلند کیں جیسے اندھیرے

کا ناندہ اٹھایا جا رہا ہو اور شاید اٹھایا بھی جا رہا تھا۔ ہر طرف سرخوشی اور اطمینان بخشنے کی زندگی

کی ایک لہر دوڑ رہی تھی مگر اس کے بعد ٹرک سٹارٹ ہو گیا۔

دھرام سے میرے اُپر کوئی چیز آگئی۔ ”کون ہے؟“

”شاید میں ہوں۔“ انگریز سیاح سامن کی خجالت آمیز آواز کہیں سے آئی۔

میرا وجود بھی میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا، مست ملنگ ہو رہا تھا۔ میں نے سگٹ

لوں تک لے جانے کی کوشش کی مگر وہ ناک سے جا لگا۔ پھر ایک ٹک سیک اُچھلتا ہوا

آیا اور میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ حرکت کرتا ہوا ٹریلر کھونٹے سے زبردستی بندھے

ایک گھوڑے کی طرح دولتیاں چلا رہا تھا، اُچھل رہا تھا اور ہم سب لوہے کے اس

کمرے میں بند بے اختیار سے ہو رہے تھے۔ ہر طرف کمرام بپا تھا۔ لڑکیاں زور زور

سے چہنچیں مار رہی تھیں۔ مردانہ آوازیں مختلف زبانوں میں گالیاں اُگل رہی تھیں۔

مختلف اجسام تیزی سے حرکت کرتے ٹریلر کے فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ڈچ لڑکی

جولی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ ایک شدید جھٹکے نے مجھے بھی آزاد کر دیا اور میں

ایک بے وزن کیفیت میں فرش پر قلابازیاں کھلانے لگا۔ سب لوگ نیم تاریکی میں جھٹکے

کھاتے ادھر ادھر لڑھکتے ہاتھ پھیلا رہے تھے تاکہ کوئی سہارا ملے اور اس غلامی کیفیت

کا خاتمہ ہو۔  
”سٹاپ۔ سٹاپ۔“ ڈینش لڑکے کارلز اور شارٹی شور مچا رہے تھے۔

سامن نے ٹریلر کے اگلے حصے پر کتے مار کر ڈرائیور کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کے آگے ایک اور ٹریلر جتا ہوا ہے۔ پھر کہیں ڈرائیور کی نشست ہے جو اس وقت اطمینان سے آٹو کے ساتھ ٹریلر کی وادی آراءات کے وسیع حسن سے ٹکف اندوز ہوتا ٹرک چلا رہا ہے۔ ٹریلر کی سر سے اترتا تو ہم سب لپٹے فالینوں کی طرح گول ہوتے اگلے حصے میں جا جمے ہوتے اگر چڑھائی شروع ہوتی تو ساری مخلوق بے اختیار دروازے کی طرف لپکے لپکی سطح آتی تو چھت نیچی ہو جاتی اور ہم اس میں بوبکروں کی طرح ٹکریں مارنے لگتے معمولی خراشیں اب چوٹوں میں بدل رہی تھیں۔

ہم نے باز رگان سے صرف تیس چالیس کلومیٹر فاصلہ طے کیا تھا اور اڑھائی ابھی ڈھائی سو کلومیٹر دور تھا۔ اگر وہاں تک ہم اسی بھونچال کی آغوش میں اٹھتے تو سفر کے خاتمے پر ہمیں روست کر کے بلا خطر نوش کیا جاسکتا تھا، ایک بھی ٹریلر سڑے! اگر ہر فرد صرف ذاتی طور پر اچھل کود کر رہا ہوتا تو بھی خیر حتیٰ مگر یہاں تو ہر کبھی کسی کی ٹانگ آپ کے پیٹ پر ہے، کبھی آپ کسی صاحب یا صاحبہ کی ٹانگوں پر ارجحان ہیں۔ کبھی آپ نے کسی کی گردن دبوچ رکھی ہے، اس خیال سے کہ شاید کٹا ہے۔ اس مار دھاڑ میں مجھے سوڈیش لٹکیوں کی ٹانگوں کی خوبصورت بناؤ کے علاوہ ان کی تباہ کن لمبائی کا بھی شدید احساس ہوا... ایک موڑ آیا، ٹریلر گولا اور پھر کئی کھاتی پٹنگ کی طرح ٹیرھا ہوتا گیا۔ ہم اس کی کچی کے زاویے پر اسی طرح ٹھٹکتے چلے گئے۔ پھر لوہے کا یہ بند کمرہ شاید اٹل گیا اور ہم نیم بے ہوشی کے عالم میں جانے کدھر کے کدھر نکل گئے۔ انجن کی آواز بند ہو گئی اور چند لمحوں بعد آہنی دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھل گیا۔ تیز روشنی کے ساتھ ایک قہقہہ بھی اندر آیا جو یقیناً ذہنی مریض کے گلے میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اپنے آپ کو انسانی اعضا کے ایک انبار میں دفن پایا۔ بمشکل تمام اپنی گردن کو

کون کدھر رہا تھا کہ ہم ہر اس شے پر سوار ہونے کو تیار ہیں جس کے نیچے پیٹے لگے ہوں؟ اس نے مجھے کھینچتے ہوئے دانت نکال کر پوچھا۔  
”کہہ تو میں ہی رہا تھا۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”مگر آپ جان بوجھ کر ٹرک کو اتنا تیز چلا رہے تھے۔“

”میں بالکل مناسب رفتار پر جا رہا تھا لیکن چونکہ یہ ٹریلر کئی ٹن بوجھ کھینچنے کے لئے بنایا گیا ہے اس لئے خالی حالت میں اسی طور اچھلتا ہوا چلتا ہے۔ موڑ ذرا پیچیدہ تھا، اس لئے یہ کم بخت سڑک سے اتر گیا مگر ٹرک سڑک پر ہی ہے۔“

ہم آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے، لنگڑاتے ہوئے ٹریلر سے باہر چھلانگیں لگانے لگے۔ باہر دھوپ تھی۔ نوح کا پہاڑ بدستور لا تعلقی سے وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں واقع وسیع چراگاہ میں بھیڑیں چر رہی تھیں اور پوری وادی آراءات میں خاموش امن کی ایک ایسی تازگی تھی جو شہر کے باسیوں سے کلام کرتی ہے۔ تم کتنے برکت ہو کہ عمارتوں اور سڑکوں نے تمہیں اپنے شور میں جکڑ رکھا ہے۔  
ڈرائیور ٹھوڑی سی کوشش کے بعد ٹریلر کو دوبارہ سڑک پر لے آیا اس دوران سیاہوں

کا کنبہ خراشوں اور چوٹوں پر اینٹی سپٹک دوائیاں لگاتا رہا اور ہر فرد اپنے دائرہ پر انہیں ہلاتا رہا کہ کتنے ہل رہے ہیں۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ ڈرائیور ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے بولا کہ ”سواروں نے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس دادی میں رات بسر کرنا قدرے خوفناک ہے۔ بھڑتیے ہوتے ہیں...“ اور پھر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر ہنسا ”اور ترک بھی ہوتی ہے“

”ہوتے ہیں؟“ سوڈش انکے نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”بعد میں قتل بھی کر دیتے ہیں۔“ ڈرائیور بے زاری سے بولا۔

”بعد میں کرتے ہیں ناں...“ انکے ہنسی۔

”بہر حال میں جلدی میں ہوں، تم لوگ فیصلہ کر لو...“ وہ ناگواری سے بڑبڑایا۔

فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ہمیں کم از کم اگلے قصبے ڈوگ بائزید تک لے جائے جہاں سے ارض روم کے لئے آسانی سے سواری ملنے کا امکان ہے۔ اُس نے ہمیں دوبارہ اُسی آہنی ڈربے میں بند کیا اور ہماری درخواست پر عمل کرتے ہوئے انتہائی سست رفتاری سے ٹرک چلانے لگا۔ اس مرتبہ گروہ کے تمام لوگ سانس روکے کم سُم بیٹھے رہے۔ بھول دھچکوں اور ایک آدھ قلابا بازی کے سوا سفر خیریت سے گزر گیا۔

ڈوگ بائزید نیچی چھتوں اور پتھریلے بد رنگ گھروں کا ایک ایسا قصبہ ہے جو دوائی آراءات کی وسیع خوبصورتی کا ساتھ نہیں دیتا۔ متوقع بر فیلے موسموں اور طوفانوں کا جھیلنے کے لئے ہر وقت سمناسما سا رہتا ہے، زمین سے بلند نہیں ہوتا۔ ہمارا گروہ ڈربے سے اُترنے کے بعد اپنے دکھتے جسموں کو گھسیٹنا ایک نزدیکی رستہ قرار میں لیا۔

حسب توفیق کافی یا ترکی میں کشید کردہ ڈنمارک کی کارلز برگک بیئر نوش کی گئی اور اُس کے بعد ہم سب ارض روم جانے والی ٹرک کے کنارے آکھڑے ہوئے۔ گفتگو کے دوران یہ طے پا چکا تھا کہ چونکہ میں ان خطوں میں نووارد نہیں ہوں اور ترکوں کا ہم مذہب بھی ہوں اس لئے بقیہ سفر کے لئے پورے گروہ کی نمائندگی میرے ذمے

ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ترک نوجوانوں کی ٹولیاں ہمارے گرد بٹھلنے لگیں۔ اس گماگمی کا باعث انکے تھی جو ایک پتھر پر ٹانگیں پھیلاتے بیٹھی تھی اور سکرٹ اُونچا کر کے اپنی خوبصورت رانوں پر آئی خراشوں پر کوئی دوائی لگا رہی تھی۔ میں نے جماعی سلامتی کے نام پر اس سے درخواست کی کہ وہ فی الحال یہ عمل ملتوی کر دے۔

”بعد میں قتل کر دیتے ہیں۔“ سامن نے اُسے چھیڑا۔

”بعد میں قتل بھی کر دیں تو کیا فرق پڑتا ہے...“ انکے نے سکرٹ نیچے کرتے ہوئے ایک بھوکے سانس بھری۔

سامن پٹرول پمپ میں ایک بس رُکی۔ میں نے سکرٹ عبور کی اور ڈرائیور سے پوچھا۔ ”ارض روم؟“

وہ نشست چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ ”ارض روم۔ ارض روم۔“ اُس نے ہاتھ ہلا کر سب کو شردہ سنایا۔ پورا گروہ اس طلسمی نام کو سُن کر سحرزدہ حالت میں بس میں جا بیٹھا۔ بس سٹارٹ ہوئی تو اس کا ڈرخ ارض روم جانے والی ٹرک کی مخالف سمت میں قصبے کی جانب تھا۔

”ارض روم تو اُس طرف ہے۔“ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”ہاں ہاں جانتا ہوں... تم نے ٹکٹ نہیں خریدی ہے؟ وہ قصبے کے اندر بس کمپنی کے دفتر سے ملیں گے اور پھر ہم فوراً ارض روم کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔“

بس کمپنی کا دفتر ناہموار پتھروں سے بنی ہوئی ٹرک کے کنارے ایک کوٹھڑی میں تھا۔ میجر سے ٹکٹوں کی درخواست کی گئی تو اُس نے گروہ میں شامل خواتین سے ملازمتیاز شروع کر دیئے۔

”یہ تمہارے ہونٹ سو جے ہوئے کیوں ہیں؟ یہ چہرے پر خراشیں محبت کی ہیں؟... دوائی کا انتظام کروں...“ ہر فقرے پر وہ داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ کر آنکھ ماتا اور جواب میں مجھے بھی زبردستی مسکراتا پڑتا۔

”اس جنس زدہ ٹرکس سلطان سے ٹکٹوں کی بات کرو۔“ ہنری بڑی زاری میں نے بات کی تو وہ زمین پر تھوک کر ٹکٹیں کاٹنے لگا۔ کرایہ وصول کر کے ایک صندوقچی میں رکھا اور دھک کر زور سے بند کر کے کہنے لگا۔  
”بس شام سات بجے چلے گی۔“

”ڈرائیور نے کہا تھا ابھی روانہ ہو جائیں گے، صرف ٹکٹ خریدنے میں آٹھ گھنٹے میں آگیا۔“  
”سات بجے...“ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ مجبوراً ہم نے اپنا سامان کمپنی کے دفتر میں دقت گزارنے کے لئے اس راستے پر ہونے جو وادی آوارات کو جاتا تھا۔ قصبے باہر نکلنے پر سہارا کردہ مختلف ٹکٹوں میں بٹ گیا۔ انگریز سیاح سامن ڈورڈ کے نمونے جمع کرنے لگا۔ فرانسیسی ہنری اور سی مان ایک ٹیلے پر چڑھ کر دال پائے گئے۔ امریکی میاں بیوی ارلنٹ اور میری آن ایک پتھر پر بیٹھ کر دھوپ سینکے۔ کچھ لوگ قصبے کے آخری قہوہ خانے میں دوپہر کے کھانے کے لئے ٹھہر گئے۔ یورپ کی تشریف لے گئے کچھ فاصلہ میرے ساتھ طے کیا اور پھر وہ تھک کر واپس چلی گئیں۔

میرے سامنے ایک دیران کچا راستہ دھوپ میں کاہلی سے لیٹا ہوا ایک خاندان انتہائی جاذبِ نظر پہاڑی سلسلے میں گم ہو رہا تھا۔ ان میں سے بلند ترین پہاڑی کے میں جا کر پھر سی راستہ نمودار ہو رہا تھا اور بالآخر چوٹی پر ایسا وہ کسی قدیم عمارت پہلو میں دفن ہو جاتا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے نقوش واضح نہیں تھے لیکن بھورے پتھر پر کھڑی یہ پتھر لی عمارت انسان کو اپنی جانب بلانے کی طاقت ضرور رکھتی تھی۔ پرترک فوج کی درجنوں بارکیں تھیں۔ خاردار تار کے پیچھے ٹینک اور جیپیں دکھائی دے رہی تھیں اور ان جنگی درندوں کے پس منظر میں اپنا سفید ریش نوح کا پارہ کر رہا تھا۔ دائیں طرف اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ پتھروں کے درمیان گھاس کے

تھے۔ ٹیلوں کی آڑ میں اکا دکا پتھر لیے مکان بھی تھے۔

قصبے سے تقریباً پانچ کلومیٹر باہر اگر جب میں آبادی کے مدار سے نکلا تو وادی آوارات کی کشش مجھ پر حاوی ہو گئی۔ نوح کا پہاڑ میرے اور قریب آگیا۔ اب اس کے اور میرے درمیان گھاس کے وسیع میدان تھے اور ان میں اُگے ہوئے گل لالہ اس کے سفید پس منظر میں بھٹتے ہوئے سرخ رنگ کے ہو رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی وادیاں اس کے وسیع حجم میں ایک گھاؤ کی طرح کشتی چلی جا رہی تھیں۔ ہموار چھتوں کے گاؤں اس کی بلندی کے بوجھ تلے چپکے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کا برف چہرہ پوری وادی پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی بریلی بلکیں صدیوں سے کھلی تھیں۔ اس کا گورا جمال ایک مقناطیس کی مانند ہر آنکھ کو اپنی جانب پھیر لیتا تھا۔ میری آنکھیں تو کیا اس پر طلسم سفید بزرگ نے روشنی نوح کو بھی اپنی جانب آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ سفید معبد مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں دم بخود اس کی جانب سفر کرتا رہا۔ اس کی اذلی برفوں میں سے جنم لینے والی یخ بستہ ہوا میں خدائی احکام کی طرح نازل ہو رہی تھیں... میرا بدن کوہِ طور کا ایک پتھر ہوتا تو اس پر یہ مقدس لفظ کندہ ہوتے چلے جاتے... تم چوری نہیں کرو گے... تم ہفتے کے آخری روز کا احترام کرو گے... تم... تم... تم... مگر میرا بدن پتھر نہ تھا، یہ زندہ تھا، خواہشوں سے دستا ہوا، میرے بس سے باہر... سامری کا شنہری بچھڑا تو کوہِ طور کے پتھر کی ایک سہل نے جلا دیا تھا... اور میرے بدن کی سہل اس کے اندر تو وہ خود چھپا بیٹھا تھا، سامری کا شنہری پتھر، میرے بس سے باہر... میں نے آوارات سے نظریں مٹائیں اور اس راستے کو دیکھا جو اب بھی دھوپ میں کاہلی سے لیٹا ہوا تھا۔ چوٹی پر واقع عمارت اب قدرے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کوئی قلعہ تھا۔ میں تھک رہا تھا اس لئے سستانے کی خاطر راستے سے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلاگالیا۔ کوہِ آوارات سے منہ موڑ کر کہ میری آنکھیں اُسے دیکھ دیکھ کر تھک چکی تھیں مگر پھر بھی اُس کی خنک موجودگی میری نشت پر سرسراتی رہی۔

یہاں سے مجھے دو ٹیلوں کے درمیان گھاس کا ایک پیالہ نما میدان ملا تھا جس میں چند بھیریں سر جھکائے منہ چلا رہی تھیں۔ چہرہ والا ایک عمر رسیدہ مرد جو مجھے پہلے تو کن اکھیوں سے نگاہ رہا اور پھر ایک نوجوان غزال کی مانند ٹیلوں کو پکڑا آیا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر میرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

”السلام علیکم“ میں نے بڑے میاں کی طرف سلام پھینکا۔  
اُس نے ماتھے پر حیرت کے بل ڈالے اور مچھلی پھیلاتے میرے پاس آیا۔  
”وعلیکم السلام“... اُس نے میرا ہاتھ اتنی شدت سے دبایا کہ میں بمشکل اپنے ضبط کر سکا۔

اُس کے سر پر ترکمانوں کی لمبی قرآنی ٹوپی تھی۔ چست پتلون، چمڑے کی جیکٹ اور گھٹنوں تک آتے ہوئے سیاہ بوٹ۔ خنجر کا کالا دستہ پتلون میں سے رہا تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی اور پلکوں میں ایک بال بھی سیاہ نہ تھا مگر اُس کا شیشم کی چھمک کی طرح پچھلا اور شفاف تھا۔

”مسلم؟“ اُس نے لشکری دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے دریافت کیا۔  
اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے مسکراتے ہوئے پھر ہاتھ آگے کر دیا۔ اس مرتبہ کی شکجہ گرفت کے لئے قدرے تیار تھا مگر پھر بھی دانت بھیجنے کو اس مرحلے پر گزرنا پڑا۔ ایک ہموار چھت کی پتھر ملی چار دیواری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ وہ وہاں رہتا ہے اور میدان میں چرنے والی بھیریں اُس کی ہیں۔ باباجی کی زبان تو ترک کی ہی تھی مگر اُس میں گاہے گاہے کچھ آشنا الفاظ تھے جن کی مدد سے ہماری گفتگو آگے بڑھنے لگی۔

”آارات؟“ میں نے نوح کے پہاڑ کی جانب اشارہ کیا۔  
”ہاں۔“ باباجی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔ ”اُس پار روس روسی رہتے ہیں... تم روسیوں کو پسند کرتے ہو؟“

”میں کسی کو بھی ناپسند نہیں کرتا۔“ میں نے مسکرا کر کندھے سکیڑے۔

اس جواب سے باباجی کا موڈ قدرے آف ہو گیا۔ ”خیر میں پسند نہیں کرتا۔“ میں نے اندازہ لگایا کہ نوح کے سفید پہاڑ اور گورے چمڑے ترک بابے کی عمروں میں بس انیس بیس کا ہی فرق تھا۔

باباجی خاموشی سے آارات کی جانب دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک گہری سانس بھری اور انگلی اٹھا کر بولے۔ ”جوانی میں میں اس پہاڑ کو عبور کر کے روس جایا کرتا تھا اور کسی نہ کسی روسی کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ جانتے ہو اُس کے ساتھ میں کیا کرتا تھا؟“

”کیا؟“

باباجی نے خنجر نکالا، آگے بڑھے اور میری گردن پر اٹا رکھ کر گلے اور زبان کے زور سے ”گرٹ“ کی آواز نکالی اور مسکرنے لگے۔ میں نے لرزتے ہوئے خنجر کو اپنے سے دُور کیا اور پھر حفاظتی اقدام کے طور پر دو قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”ہر مہفتے ایک دو روسیوں کو تو ”گرٹ“ کر آیا کرتا تھا مگر یہ تو دس برس پہلے کی باتیں ہیں جب میں جوان تھا۔“ باباجی نے افسوس سے خنجر پتلون میں اڑتے ہوئے کہا۔ جب بھی وہ ”گرٹ“ کا لفظ ادا کرتے، میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ وہ اپنے جھکتے ہوئے دانت لیں بھیختے جیسے کسی درندے کے دانتوں تلے تڑپتا ہوا شکار آگیا ہو۔

پتھر ملی چار دیواری کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا اور پھر پھینٹ کے لمبے لمبے جوتوں میں لمبوس چند نوجوان لڑکیاں باہر آ گئیں۔ وہ زور زور سے ہنس رہی تھیں اور باباجی کو اشارے کر رہی تھیں۔ باباجی نے منہ پر مچھلی رکھ کر غصے سے انہیں کچھ کہا اور وہ بھیڑوں کی طرح فوراً مکان کے اندر چلی گئیں۔

”یہ آپ کی پوتیاں ہیں؟“

”بیٹیاں ہیں۔“ باباجی کے دانت دھوپ میں لشکے۔ ”البتہ ان میں سے ایک میری بیوی تھی، پانچویں بیوی۔“

میں نے اُن کا مکان اندر سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو بابا جی مال  
 ”روسی آپ کو اس لئے بُرے لگتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”روسی اگر مسلمان ہوں تب بھی مجھے بُرے لگیں۔ میں نے اپنا پہلا روسی  
 ”گرٹ“ کیا تھا۔۔۔“ وہ اطمینان سے بولے۔  
 ”تم مسلمان ہی ہونا؟“ گمری نیلی آنکھوں نے مجھے گھورا۔ انہیں شاید  
 میں روسیوں کے لئے ہمدردی کا شائبہ نظر آیا تھا۔ میں نے مسکرا کر سر ہلایا تو  
 بولے۔ ”کالیما سناؤ۔۔۔“  
 میں نے کلمہ سنایا تو انہوں نے خوش ہو کر پھر ہاتھ آگے کر دیا۔ مجبوراً  
 ”میں حاجی ہوں۔۔۔“ انہوں نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے فرمایا  
 ”مکتے مدینہ گیا تھا، تم گتے ہو؟“  
 ”نہیں ابھی نہیں گیا۔“

دیکھا کہ بابا جی کی بھیڑیں یکدم مجتمع ہو کر ایک چٹان کی جانب چل دیں۔  
 نے جلدی سے دست پنجہ لیا اور ”ہو ہو“ کرتے ایک نوخیز کھلاڑی کی طرح اُن کی  
 سپرنٹ لگا دی۔

میں اپنا ہاتھ سہلاتا ہوا واپس اُسی رستے پر آیا اور اُس پہاڑی کی جانب چلا  
 کر دیا جس پر ایستادہ عمارت اب واضح طور پر ایک قلعے کی صورت میں نظر آ رہی  
 تھوڑی دیر بعد فوج کے پہاڑ کے پہلو میں سے بادلوں کی چند گھڑیاں نمودار ہوئیں۔  
 شفاف آسمان پر بکھر کر کہیں کہیں سے دھوپ کا رستہ روک لیا۔ میرے گرد کی تازہ  
 دھوپ اور سالیوں کے شطرنج بورڈ میں بٹ گئی۔ تیز ہوا کی وجہ سے یہ منظر جلدی  
 گیا اور لینڈ سکیپ نے ایک مختلف روپ اختیار کر لیا۔ پہاڑ، پتھر، راستے، گھاٹ  
 اور سائے کے پیرا ہن اُتارنے اور پہننے لگے۔ سامنے کا سلسلہ کوہ ہرل اپنی رنگت  
 تھا۔ کبھی ہلکا بھورا سائے میں اور کبھی مثیلا سفید دھوپ میں۔ یوں لگتا تھا جیسے

بس کمپنی کے دفتر میں واپس پہنچا تو وہاں باقاعدہ فساد مہم رہا تھا۔ ہمارے گروہ  
 کے ارکان اپنی اپنی زبانوں میں چیخ رہے تھے اور منبر شانت بیٹھا لڑکیوں کے ساتھ چلیں  
 کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔

”ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔“ ساتھی ہانتا ہوا بولا۔ ”یہ ترک بے ایمانی  
 کر رہا ہے۔“

”ہم کیا ہے؟“

”کتاب ہے یہ بس اب بھی نہیں جائے گی۔ صبح پانچ بجے چلے گی۔۔۔ اس نے ٹکٹ  
 سے رکھے ہیں۔ ہم سب پولیس سٹیشن جا رہے ہیں۔“

میں نے منبر سے بات کی تو وہ بڑی حقارت سے کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے اپنا سامان  
 اٹھاؤ اور چلے جاؤ پولیس کے پاس۔۔۔“  
 ”مگر تم نے ٹکٹ جاری کئے ہیں۔“  
 ”اچھا؟ وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔ ”ذرا دکھاؤ۔“



اپنے جیوں کو کھجلا رہے تھے۔ ہمارا گروہ چار بیویوں کے درمیان میں سے گزرا تو ان کی کنبھی کی رفتار تیز ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں پہلو بہ پہلو دس بارہ سیلن زدہ بستر بوندے رہے تھے اور اس کمرے کے عقب میں ٹائلٹ کا بے پانی انتظام تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم اس گریڈ ہوٹل کو رکھ سکتے تھے، چھوڑ سکتے تھے۔ ہم نے اسے رکھ لیا اور خلیں کے ساتھ معاملات کرایہ طے کرنے کے بعد دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھالی۔

پہلے مرد حضرات نے کپڑے بدلے اور بستر میں گھس کر بدبودار کبل آنکھوں پر تان لئے۔ اس مردانہ باپردگی کے دوران خواتین نے بھی یہی عمل دہرایا اور ذاتی یا اجتماعی طور پر دروازہ ہو گئیں۔ میں نے گیلی بوڈلے کبلوں کے درمیان اپنا سیلینگ بگ بچھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ تینوں سوڈیش لڑکیاں ایک ہی بستر میں گھسی ہوئی تھیں مگر ان کی چھ عدد نفیس ٹانگیں ایک انسانی لیکڑے کی طرح کبل سے باہر جھانک رہی تھیں۔ سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر کنڈی اتار دی۔ ایک ترک دہقان جبرے کچا پاتا مہنس رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ میں نے بیزاری سے پوچھا۔

”ٹائلٹ“۔ اُس نے ہمارے کمرے سے لمحہ غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

میں راستے سے ہٹ گیا اور وہ بستر کے درمیان میں سے انتہائی کاہلی سے چلتا، آنکھیں لڑکیوں پر سینکتا، دانت کاٹتا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ فوراً جباہر نکل آیا اور پھر اسی طور پر گشت کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں کنڈی چڑھا کر لیٹا ہی تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ اب ایک اور صاحب حماقت آئیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے ”ٹائلٹ، ٹائلٹ“ کر رہے تھے۔ وہ بھی آنکھیں دہیں بائیں گھماتے، مغربی دوشیزاؤں کو بستر میں دراز، دیکھتے مسکراتے ہوئے غسل خانے میں گھس گئے۔ فوراً ہی واپس آگئے اور لڑکیوں کو جھک جھک کر گڈا رنگ کہتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ پھر ایک اور دستک ہوئی... مشتاقان ٹائلٹ کا تانتا بندھ گیا...

میں نے اپنا ٹکٹ اُس کے آگے رکھ دیا۔ اُس نے انگلی تاریخ کے فلڈ پر دھری۔ ”اِس پر درج شدہ تاریخ پڑھی ہے، کل کا ٹکٹ ہے، بس آج کیسے جا سکتی ہے؟“ میں نے جلدی سے ٹکٹ دیکھا، وہ درست کتا تھا۔ اُس پر آگے دنگل لکھی تھی۔ پورے گروہ کے ٹکٹوں پر یہی تاریخ تھی۔ ٹکٹ خریدتے وقت کسی کو شہر نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ فراڈ ہو رہا ہے اور آگے روز کے ٹکٹ جاری کئے جا رہے ہیں۔ طور پر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

باہر ہپاؤں میں تیزی سے چھا جانے والی رات آپکی تھی اور ڈوگ باؤنڈ کی سنسان اور سرد سہو چکا تھا۔ اب شب بسر کا مسئلہ درپیش تھا۔ پورے گروہ نے سوج بچار شروع کر دیا۔

”آپ لوگ یقیناً آج کی رات گزارنے کے بارے میں پریشان ہو رہے ہوں گے“ منیجر کے ہونٹوں پر اب ایک دردمند مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ”خوش قسمتی سے میرے عزیز ترین دوست کے بیٹے خلیلی کا ”ہوٹل گریڈ“ دفتر کے ساتھ ہی ہے۔ آئیے میں مان چلتا ہوں۔“

آٹو نے زیر لب کوئی جرمن گالی دی اور زمین پر جھٹک دیا۔

”اگر کھلی فضا میں رات بسر کرنے کا ارادہ ہے تو اتنا بتا دوں کہ دو تین گھنٹے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جائے گا اور اس سے تھوڑی دیر بعد گلیوں میں پھل چہل قدمی کرنے لگیں گے۔“

خواتین دبک کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا لگیں اور جوبلی زور زور سے دھڑکیں دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔“ میں نے گروہ کو صلاح دی۔

منیجر کے عزیز ترین دوست کے بیٹے خلیلی کا ”گریڈ ہوٹل“ آگے پیچھے بنے ہوئے کمرے پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں جس کا دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا، پھر ترک دہقان چار پائیوں پر لیٹے قہوہ پی رہے تھے، مسکروں کے کش لگا رہے تھے۔

ہیں، پلینز انہیں منع کر دیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں انہیں منع نہیں کر سکتا، ان کے پاکستانی بھائی! وہ سنجیدگی سے بولا۔“ خلیلی کے اس بیان پر اُس کے پیچھے کھڑے مسافروں نے اس پیٹ میں گڑ بڑ ہے۔“ خلیلی کے اس بیان پر اُس کے پیچھے کھڑے مسافروں نے اس طرح مٹہ بناتے جیسے پیٹ کی خرابی کے باعث وہ واقعی بے حد اذیت میں ہیں۔ یہ بہت عمدہ قسم کی اداکاری تھی اور مجھے ماننا پڑا کہ خلیلی ایک منجھا ہوا ایکٹر ہے۔

”اگر آپ لوگوں کو یہ رہائش پسند نہیں تو بے شک کہیں اور چلے جائیے...“

یا پھر ان غریبوں کو اجازت دیجئے کہ وہ ٹائٹل تک جاسکیں۔“ خلیلی کے کندھوں پر سے جھانکتے ہوئے غریب دانت نکالنے لگے۔

”ٹھیک ہے۔“ ہنری نے سی مان کو اچھی طرح کبسل میں لپیٹا اور اٹھ کر دروازے کے پاس آگیا۔ ”تمام مسافر ایک ایک کر کے آئیں اور اس کے بعد اگر کوئی...“ ادھر آیا تو...

یہ بہت مناسب ہے۔“ خلیلی نے سر ہلایا۔

معادے کے مطابق ایک مسافر آگے آتا اور انہیوں کی طرح بستروں کے درمیان شستی سے چلتا ٹائٹل میں گھس جاتا۔ کئی حضرات ٹائٹل کے دروازے کو ہاتھ لگا کر یوں اداکاری کرتے کہ وہ ضرورت ہی نہیں تھی ایسے ہی آگے اور واپس چلے جاتے۔ لیکن اس مرتبہ انہیں صرف لڑکے ہی دیکھنے کو ملے کیونکہ خواتین حفاظتی اقدام کے تحت کبلوں میں روپوش تھیں۔ البتہ سویڈش لڑکیاں اپنی لمبی ٹانگوں کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ ان کے پاؤں نظر آرہے تھے جب آخری امیدوار واپس جا رہا تھا تو ہنری بستر پر کھڑا ہو خلیلی سے کہنے لگا۔ ”اب اگر کوئی...“ ترک ادھر آیا تو۔“ اُس نے مکہ لہرا کر ایک غصہ اشارہ کیا۔ ”میں کر دوں گا۔“

”یہ کیا کہتا ہے؟“ خلیلی مجھ پر چڑھ دوڑا۔ ”بے شک ناپ تول لے ہم اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔“

بالآخر فرانسیسی ہنری کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے تازہ ملاقاتی کو پہچان لیا تھا کہ تیسری مرتبہ ٹائٹل کی آندو لے کر حاضر ہوا ہے۔ ”یہ جنس زدہ ترک صرف ہاں پر کھڑا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ مست کھولو دروازہ۔“ وہ گرجا۔

دوبارہ دستک ہوئی تو میں چپکے سے لیٹا رہا۔ عسٹری دیو بعد کسی نے دروازہ باقاعدہ کھٹکنا شروع کر دیا۔ مجبوراً مجھے پھر اٹھنا پڑا۔ وہاں خلیلی کھڑا تھا اور اُس کے عقب میں تمام ترک و تھان قطار باندھے کھڑے تھے۔ ”آپ لوگ دروازہ کیوں نہ کھولتے؟ ان مسافروں کو بھی ٹائٹل کے استعمال کا حق حاصل ہے۔“ خلیلی نے بڑے رعب سے کہا۔

”ان بلڈی مسافروں میں سے ہر ایک تین تین مرتبہ ٹائٹل جا چکا ہے۔“ نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”اور ہاں...“ خلیلی بولا۔ ”آپ حضرات یوں بغلگیر ہر کر نہ سوتیں، میرے مسافروں کو اعتراض ہے۔“

”یہ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے...“ ہنری غصے سے لہزنے لگا۔

”بیشتر مسافر جوان جہان ہیں اور خواتین کی ٹانگیں...“

”مسافر جاتیں جہنم میں، وہ آتے کیوں ہیں ادھر، ہم اسی طرح سوئیں گے۔“

ہنری چبھٹ پڑا۔

”خیر میرا فرض تھا آپ کو متنبہ کرنا...“ خلیلی تھل سے بولا۔ ”اب اگر کوئی اشتعال میں آجائے اور داڑھی منہ میں دبا کر آپ پر حملہ آور ہو جائے تو میں نہیں ہوں گا۔“

”اوہ...“ ہنری کچھ کہہ نہ سکا۔ صرف غصے سے منہ بناتا رہا۔

”دیئے یہ درست ہے کہ ہر مسافر کسی کسی بار ٹائٹل استعمال کر چکا ہے۔“

میں نے خلیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ میرے ترک...

”بابا حساب کتاب کی بات نہیں ہو رہی۔“ میں نے اُسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔  
 ”ایک قوم کی عزت کا سوال ہے۔“ وہ بے حد غصے میں تھا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“  
 ... کیوں بھی عدنان؟

عدنان جو پاس ہی کھڑا تھا اُس نے سر ہلا کر تصدیق کی۔  
 ”ہمارے آباؤ اجداد اتنی ساری بیویاں کھانا پکانے کے لئے نہیں رکھتے تھے۔  
 خلیل کا مٹہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ طرح طرح کے ناقابلِ بیان اشاروں سے ناقابلِ  
 بیان بیان دے رہا تھا۔ اس دھماچوکڑی میں لڑکیاں بے حد نردس ہو گئیں اور ان  
 میں سے بیشتر نے کمبلوں کے نیچے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ جُولی بے حد درگزر  
 آواز میں رو رہی تھی اور اُس روز بد کو کوس رہی تھی جب اُس کے دل میں پُر اسرار  
 مشرق دیکھنے کی خواہش بیدار ہوتی تھی۔ لڑکیوں کے رونے کی آوازیں سن کر خلیل قہقہے  
 پریشان ہو گیا اور پھر ”اوکے، اوکے“ کہتا کرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا  
 کیا کہ ہاتھ پائی تک نوبت نہیں پہنچی اور کُنڈی چڑھا کر بالآخر اپنے سیلینگ بیگ میں  
 گھس گیا۔

”ہنری؟“ فرانسیسی کی ساتھی لڑکی نے کمبل میں سے مٹہ نکالا۔ ”اب میں ٹائلٹ جانا  
 چاہتی ہوں... واقعی!“

## سوئے شام

”پاکستانی، دیکھو کوہ آارات کی سفید برف کتنی قریب لگ رہی ہے مطلع صاف ہے، جلدی سے ایک تصویر بنا لو۔“ ڈوگ بائزید سے نکلے ہی ہنری نے اپنی نشست سے مڑ کر کہا۔ میں نے مشکل آنکھیں کھولیں اور کھڑکی سے باہر ایک ناراض نگاہ ڈالی۔ آارات کی چوٹی سورج کی پہلی شعاعوں کے مرکز میں کسی عظیم معبد کے نفرتی کلس کی طرح چمک رہی تھی... اولڈ مین اینڈ دی سی...“ نوح کا یہ پہاڑ بھی سمیٹ گئے کا بوڑھا آدمی تھاجو وادی آارات کی سمندر و مستوں میں کشتی نوح کے ایک حصے پر بے غوفی سے براجمان تھا۔ باہر کی دنیا سے بے نیاز، میری موجودگی سے بے خبر، اپنے آپ میں مگن۔ ہم سیلج تو صرف چھوٹی چھوٹی پھیلیاں تھے جو اس کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔ وہ تو کسی بڑی دہل کا منتظر تھا، کسی طوفان نوح کا۔

”مجھے غینہ آرہی ہے۔“ میں نے ہنری کو کہا اور کوہ آارات سے منہ موڑ کر اپنے آپ میں سسے ہوئے اونگھنے لگا۔

بس کچھ عرصہ تو شریفانہ طور پر صراطِ مستقیم پر ہی چلتی رہی اور پھر بے راہ و ہو کر پہاڑوں کی عبول جہیوں میں بھٹکنے لگی۔ چڑھائی کا آغاز ہوا تو انجن جاگنی کی حالت میں بڑی شدت سے ہچکیاں لینے لگا۔ اتنے شور میں اونگھنا قدرے دشوار تھا۔ اس لئے میں سیدھا بوکر بیٹھ گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور دھند کا آسیب کھڑکیوں کے راستے دبے پاؤں اندر آ رہا تھا۔ کہیں موسمِ سرما کی آخری برفوں کے سفید پوند گھاس کے سرسبز

پیراہن پر ابھرے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے نیچے ایک کھائی میں لٹا ہوا  
ٹرک پر بھی نظر آیا جو گہری دھند میں قبل از تاریخ کے کسی جانور کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔  
دو گھنٹے کی مسافت کے بعد انجن کی جھلکیاں ختم ہوئیں اور اس کا سانس درست ہونے  
... ہم نیچے اترنے لگے۔... اگر کی قصبے میں ہم نے اپنے آپ کو ٹرکشن قوس سے  
اور سفر بھر شروع ہو گیا۔ گیارہ بجے کے قریب آس پاس کی لینڈ مسکیپ موہم آستان  
نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”ارض روم۔ ارض روم“ ڈرائیور نے ٹرک مسافروں کو خبر کی۔

”ہونہ، ارض روم“ میں نے رُوٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ بسور کر سوجا۔  
سے میرا سامنا کرے گا یہ شہر؟ چھ برس پیشتر... جب اکتوبر کا آخر تھا۔ سٹیشن سے  
جانے والی سڑک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے درختوں کے خزان رسیدہ پتے نما  
گرنے شروع ہو گئے۔ کاکیشیا سے آنے والی ہوائیں خشک تر ہو چلی تھیں اور چند روز  
برف گرنے والی تھی۔ پہلے کوہ دھند اور گرد و نواح کا پہاڑیوں پر اور پھر وہ شہر کا  
دیکھ لے گی... شہر، جہاں میری جیب میں صرف ایک لیر تھا اور میں نے صبح سے  
ایک پیالی دہی اور چند انگوٹھ کھائے تھے... ارض روم جہاں بالآخر گریے فٹ پاتھ  
بیٹھ کر مجھے اپنا سامان بیچنا پڑا تھا۔ اپنی ٹھوک مٹانے کے لئے، وطن واپس پہنچنے کے  
... ارض روم میرے لئے سردی، بیچارگی اور ٹھوک کا دوسرا نام تھا۔ ارض روم  
مائی فٹ!

میرے گردہ کے سیاہ ارض روم پہنچ کر مجھ سے علیحدہ ہو گئے اور سٹیشن  
چلنے لگے جہاں سے استنبول کے لئے ڈائریکٹ گاڑی چلتی تھی۔ لاہور سے اٹھنا  
تک کی — زمین اور آسمان سے میری جان پہچان پرانی تھی مگر اب یہاں سے  
ملک شام کی جانب کوچ کرنا تھا اور یہ راستہ میرے لئے ایک گہرے جنگل میں  
میں اس سے نا آشنا تھا۔ میں نے ترکی کا نقشہ کھولا اور میز پر پھیلا دیا۔

”انتپ...“ اُس نے نقشے پر کوئی توجہ نہ دی اور ٹکٹ کاٹ دیا۔  
”میں شام جانا چاہتا ہوں، یہی راستہ ہو گا ناں؟“  
”انتپ... بکس...“ اُس نے میرے پیچھے کھڑے مسافر سے ہاتھ ملایا اور گپ لگانے لگا۔  
بس کی رداگی میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ سرد یادوں والے  
اسی شہر سے دوبارہ میل کروں مگر پھر سوچا کہ بس دوسری صبح غازی انتپ پہنچے گی۔  
دوران سفر کے لئے خشک خوراک کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ چنانچہ میں ایک چڑھی ہوئی  
تیرہری اور حقارت کی نظر لئے بس سٹیشن سے باہر آ گیا۔

مجھے شہر کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس کی ایک ایک  
ایٹ میرے ذہن پر نقش تھی اور ان اینٹوں کے درمیان شدید سردی، بھوک اور غریبانی  
کا سخت سیمنٹ تھا۔ ڈبل روٹی، خشک گوشت اور ابلے ہوئے انڈے خرید کر میں اس کے  
بڑے بازار میں آ گیا۔ ایک رستوران کے بڑے شیشے کے پیچھے شوارما گوشت کا ایک ٹکلا  
سستی سے گھوم رہا تھا۔ چھ برس پہلے میری جیب میں ایک لیر تھا جو میں نے مدرسے  
کے نیچے بیٹھے ہوئے فقیر کی جھولی میں ڈال دیا تھا مگر آج... میں اندر چلا گیا۔ شوارما کے  
ایک ٹکے، سلاڈ اور حبس اور اس کے ساتھ بدن کو یخ کر کے پھر حرارت دینے والا  
مغرب۔ میں نے نفیس خوراک سے بھرے پیٹ کی آسودگی ہی محمود ہوتے ہوئے سگرٹ  
سٹکیا اور شیشے کے اس پار بازار میں دواں لوگوں کو دیکھنے لگا... لوگ خوبصورت تھے۔  
فٹ پاتھ پر گیس کے غبارے بیچنے والا کھڑا تھا۔ سینکڑوں رنگین غباروں میں سے ایک  
رنگ لہجہ ہر کہہ رہا تھا۔ دراصل وہ پیپلے فرک میں ملبوس ایک ننھی سی پل ہوئی تھی۔  
نے اچھا بھی ایک غبارہ خریدا تھا۔ یونیورسٹی کی چند لڑکیاں کھلتے جسموں کے لئے

نا کافی پیراہنوں میں بھنپی غباروں کے قریب سے گزریں۔ پہل بھر کے لئے ان رنگوں میں مدغم ہو کر شناخت کھو بیٹھیں اور پھر اسی لمحے ظاہر ہو کر آزاد ہو جائیں۔ نمکھری ہوتی چلی گئیں۔ دھوپ کا قلعی گرا ارض روم اور اس کے چہروں پر غبار کا نوٹا در چھڑک کر انہیں چمکیلا بنا رہا تھا۔ میں نے بل ادا کیا اور رستہ تول لے آگیا۔

ہوا میں خشکی تھی مگر دھوپ میں گچھلتی ہوتی پرانے گھروں کی سرخ چھتیں آواز حال ہی میں مینٹ کی گئی تھیں۔ ان کی چمکتی رنگت مسترت دینے والی تھی شیفٹ کا وہ مینار جس نے میرے بھوکے بدن کو بارش سے پناہ دی تھی، نیلے آسمان میں برف بٹاش کھڑا تھا اور اس کا صحن دھوپ کی سوہنی سفیدی میں سانس لے رہا تھا اور سے پرے کوہ دھند اور نواحی پہاڑ کا کیشیا کی حسیناؤں کی طرح خود بھی خوبصورت۔ ایک تخت مجھ پر وار دہوا کہ میں تو اس شہر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ یہ وہ بستی تھی جہاں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شاید ارض روم کو احساس ہوا ہو کہ میں نے چھپ چھپ کر اس غریب الدیار کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اب صرف مجھے منانے کی خاطر وہ اپنے حسین ترین رخ میرے سامنے لا رہا ہے۔ جی چاہا کہ غازی انتپ کا گٹھ دالیں کہ چند روز کے لئے یہیں ٹھہر جاؤں۔ لیکن نہیں شاید یہ روپ صرف آج کے لئے ہو سکتا ہے کل رنگ اتر جائیں، دھوپ سرد ہو جائے اور شہر کی عمارتیں اور میرے لئے پھر ایک دیوانے کا خواب بن جائیں!

سفر کے آغاز پر میں نے اپنے رک سیک میں سے ٹافوں کا ایک پیٹ لے لیا۔ بس میں سوار بچوں میں تقسیم کر دیا۔ خواتین کے سامنے نظریں نیچی رکھیں اور مردانہ سگریٹ پیش کئے۔ یوں میں نے اپنے آپ کو ایک قابل اعتماد مسافر کی حیثیت سے اس خاندان میں شریک کر لیا جو اگلے چودہ گھنٹوں کے لئے میرا ہم سفر تھا۔

ترک زوجین کی تھی جو اسکندرون کے راستے قبرص جا رہے تھے۔! بس نے ارض روم کو چھوڑا تو میں ایک دوست شہر سے جدا ہوا۔ میرے اور اس شہر کے درمیان اب رنجش کا ایک تاری بھی باقی نہ تھا اور اگر کہیں تھا تو اس منظر نے توڑ دیا جو ایک رنگین شعبہ کی صورت میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دائیں ہاتھ پر نیلے پھاٹوں کا ایک سلسلہ اونٹوں کے کوبانوں کی طرح ہموار میدان کے آخر میں سے ابھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے وہ سمندری نیلا ہٹ کے تودے نظر آتے اور پھر دھوپ کا زادیہ بدلنے سے ان پر برف کی سفید لکیریں چمکنے لگیں جو نیچے میدان میں اتر رہی تھیں۔ پھاٹوں کے دامن سے لے کر مجھ تک پھیلا ہوا میدان اکتاہٹ کی حد تک سبز تھا اور ہریا دل کے اس وسیع کینوس میں لا تعداد ڈنٹھل گل لالہ کے سرخ پیالے تھلے ساکت کھڑے تھے جیسے ابھی ابھی بارش ہوئی ہو اور زمین میں سے ان گنت بیر ہوٹیاں نکل کر گھاس میں سے جھانک رہی ہوں یا شاید کسی نے ہزاروں غباروں میں سرخ پانی بھر کر انہیں ایک سبز قالین پر رکھ کر سوئی کی نوک سے پھاڑ دیا ہو اور سرخی جذب ہوتی گئی ہو۔ بس کے چلنے سے یہ منظر مجھے دھیرے دھیرے ہٹا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی مصوٰر تصویر بنا کر شام ڈھلے اسے کھلی فضاؤں میں چھوڑ گیا اور رات بھر کی اوس نے رنگوں کو قدرے پھیلا دیا ہو۔ فرانسسیسی مصوٰر دیناٹر کی تصویر ”گل لالہ کا کھیت“ اگر زندہ ہو سکتی تو یہیں ہوتی۔ پچھلے پہر کی ہلکی دھوپ نے قدرت کے اس روپ کو اس طرح نیم روشن کیا ہوا تھا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں تھکتی نہیں تھیں۔ پھر ساکت زندگی کی تصویر کا ایک حصہ متحرک میں یوں بدلا کہ ایک چمونا سا بچہ سرخ سویر پہنے گھاس میں آزادی سے دوڑتا دکھائی دیا۔ چند قدم پیچھے اس کا باپ اسے پکڑنے کی خاطر ہنستا ہوا اچھا گا چلا آ رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک بیانا خیر نصب تھا اور اس کے باہر ایک غیر ملکی عورت آنکھوں پر پتیلی جھاتے ان دونوں کو کھلے میدان میں جھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کا حیات آور جسم ایک اور زندگی کی

کی نوید دے رہا تھا اور اسی لئے وہ اس مسرت آمیز دوڑ میں شریک نہیں... کوئی سیاح خاندان جو میری طرح ارض روم سے نکلا اور اس منظر کا راز میری طرح بے اختیار نہ تھا، اپنی کارروائی اور آج کی شب گزارنے کے لئے پہاڑوں، ہرے میدان اور گل لالہ کا مہمان بن گیا۔

یہ لینڈ سکیپ سرکتے سرکتے پیچھے رہنے لگی اور پھر پلک جھپکے میں ہمارے ساتھ میں چلی گئی۔ ایک کٹا پھٹا پہاڑی سلسلہ شروع ہوا اور ہم ایک ایسی ہمسائیگی میں چلنے لگے جسے پہلی نظر میں میں نے چشمہ جانا مگر پھر اس کا پانی ہر جہز کے بعد باقاعدگی سے نمودار ہونے لگا۔ چڑھائی طے کرتے ہوئے ہم سائے درخت اور زرد مرتی ہوتی دھوپ ہمیں اپنے تعاقب میں دیکھ کر بلندیوں پر سمٹ رہے تھے۔ ہم نے درجنوں مال بردار بڑے ٹرلیروں کو اور ٹریک کیا جو ہمیں بال کے ہاتھ کی مانند اس سلسلہ کو کوشست الوجہی سے عبور کر رہے تھے۔ اب باہر کی آنکھیں تھکی تھکی تھیں۔ روشنی اور نیم تاریکی کی درمیانی کیفیت میں اشیاء کا تعین مشکل تھا۔ یکدم ہماری بس معمولی طور پر چھوٹی جیسے سرکس کا مسخرہ سادہ پانی پی کر نشے کی گیند طاری کر کے ڈولنے لگتا ہے اور پھر کھڑی ہو گئی۔ تمام مسافر باہر نکل آئے۔ اور گرد منظر پہلے سے بھی زیادہ آؤٹ آف فوکس ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں پتھروں اور گرد کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ حرکت میں نہ ہوں اور وہ تھے کیونکہ نے بس اس لئے روک دی تھی کہ ان پہاڑوں میں ایک خفیف سا زلزلہ آ رہا تھا۔ ترکی کا یہ سلسلہ کوہ اکثر زلزلوں کی زد میں آیا رہتا ہے اس لئے مقامی مسافروں معمولی نوعیت کے ان جھٹکوں کو زیادہ اہمیت نہ دی اور بار بار گھڑیاں بجنے کہ زلزلہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اپنا سگریٹ ختم کر کے ڈرائیور سرکے بیٹھا اور اطمینان سے زمین کے ساتھ کان لگا کر آنکھیں بند کر لیں، تھوڑی دیر نے آنکھیں کھولیں اور سر کے اشارے سے مسافروں کو بس میں سوار ہونے کو کہا۔

ہم اندھیرے میں سفر کر رہے تھے اور باہر کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کونسا خطہ زمیں گزر رہا ہے۔ یہاں کے لوگ کیسے ہیں، دوست یا دشمن۔ اندھیرے میں سفر کرتے والوں کو بھی فائدہ ہے۔ یہاں کہ وہ اپنی مختصر دنیا میں محو رہتے ہیں اور باہر کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں ہیں۔ میں نے خوراک کا پیکٹ نکال کر ایک ہلکا سا ڈنر نوش کیا اور پھر کھڑکی کے ساتھ کیوں ہیں۔ میں نے خوراک کا پیکٹ نکال کر ایک ہلکا سا ڈنر نوش کیا اور پھر کھڑکی کے ساتھ مریٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پچھلی نشستوں پر چند فوجی حسب عادت بلند آوازیں گنگو کر رہے تھے۔ بس کے جھٹکوں کے ساتھ میں نیم غنودگی کی طرف مائل ہوا۔ مسافر باتیں کرتے رہے، میں غنودگی اور نیم غنودگی کی جانب بڑھتا اور واپس آتا رہا۔ ان دونوں میں سے تہ نہیں کونسی کیفیت تھی جب میں نے محسوس کیا کہ پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر خالص پنجابی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنے اذیت کو سمجھا یا کہ میں اس وقت ترکی میں ہوں، مسافر بھی ترک ہیں اور ترک زبان میں ہی بات چیت کر رہے ہیں مگر جانے یہ کیا معاملہ تھا کہ مجھے ان کا ایک ایک لفظ سمجھ آ رہا تھا اور یہ لفظ پنجابی کے تھے۔ نہ صرف یہ کہ آوازیں میرے دوستوں کی تھیں، میرے جاننے والوں کی۔ یہ ہونٹیں سلکتا تھا، مگر ایسا تھا، اس کیفیت میں ایسا ہوا۔ میں نیند اور ہوش کی کسی منزل پر ان کی باتیں سن رہا تھا، سمجھ رہا تھا، وہ آپس میں کسی لطیفہ کا تبادلہ کرتے تو میں چپکے سے مسکرانے لگتا، اپنے دھکوں کا ذکر کرتے تو میں رنجیدہ ہونے لگتا۔ لفظ سرگوشیوں میں بدل جاتے تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں اور میرے کان تیز ہو جاتے... لیکن ترک پنجابی کیسے بول سکتے ہیں؟ یہ مجھے معلوم نہیں مگر اس وقت اس پہاڑی سلسلے کی رات میں رینگتی ہوئی بس میں وہ بول رہے تھے۔

”انتپ، انتپ“ کوئی میرے کندھے جھٹک جھٹک کر چیخ رہا تھا۔ میں ہڑپڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر صبح کی دھوپ تھی اور بس ایک ہموار میدان میں انگوروں کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔

”انتپ“ کندھ کٹرنے پھر مجھے جھنجھوڑا۔

”غازی انتپ؟ میں نے پوچھا۔

”انتپ، انتپ۔“ اُس نے ڈرامہ کو آواز دے کر بس رُکوائی اور مجھے ہرے نیچے اتار دیا۔ ایک مسافر نے کھڑکی میں سے میرا رُک سیک کر پوچھا کہ بس چلی گئی۔ میں نے آنکھیں ملے ہوئے چاروں طرف دیکھا تو شہر نہ تھا۔ انگوڑی کھیت تھی۔ میں ابھی سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور بس رُکی اور کھڑکی پر نکل کر ”انتپ، انتپ“ کہتے ہوئے میرا رُک سیک اٹھایا اور مجھے بس کے اندر لیا۔ نشست پر بیٹھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ارض روم دالی بس دایں ہاتھ پر نکلون جانے والی شاہراہ پر مڑ رہی ہے۔ چونکہ میں غازی انتپ کا واحد مسافر اس لئے مجھے اس بس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

صبح کے سات بج رہے تھے جب ہم غازی انتپ میں داخل ہوئے۔ ایک بچے سکول جا رہے تھے۔ مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز چل رہے تھے۔ لوگ سائیکلوں پر دوہرے ہو رہے تھے، کاریں ٹریفک کے جھوم میں ہارن دینگ رہی تھی۔ اور لوگ تھے بے شمار، ایک شہر۔ میں منہ میں بیداری کے کیلئے لئے بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ان سب کو دیکھتا رہا۔ یہ کتنی لمزادینے والی بات کہ غازی انتپ ایک لفظ تھا جسے صرف ایک روز پہلے آپ کی آنکھوں نے ایک پر دیکھا۔ آپ نے اس لفظ کی جانب سفر کیا جس سے آپ زندگی میں پہلی مرتبہ ہوتے تھے اور وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ تیز چل رہے ہیں، مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز چل رہے ہیں۔ دفتری لوگ پر دوہرے ہو رہے ہیں۔ کاریں ٹریفک کے جھوم میں... اور آپ کو آج سب کے وجود کا شائبہ تک نہ تھا۔ ادویہ لمزادینے والی بات ہے کہ دنیا بھر اسی طرح ہی شہر ہوں گے اور پھر بھی ہم اپنے آپ کو مکمل سمجھتے ہیں۔ بس سٹیشن پر اتر کر میں نے شامی سرحد کے بارے میں فوراً یوں استفسار کیا

جیسے شام تو یہ سامنے والے بڑے بازار کے اختتام پر شروع ہوتا ہوگا مگر بتایا گیا کہ ہنز ملک شام دور است اور مجھے ابھی یہاں سے خاصے ناصیے پر واقع کلس کے قصبے تک جانا ہوگا۔ کلس کے لئے بس ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ چنانچہ فارغ وقت میں میں نے جسم کو ہلکا کرنے کے لئے بس سٹیشن کے غلیظ غسل خانے سے استفادہ کیا۔ پھر میٹھی ٹرکس روٹی کے چند ٹولے قمرے کی مدد سے نکلے اور اس کے بعد غازی انتپ میں گھومتا رہا۔ ایک شہر، دروازے کھڑکیاں، بازار اور لوگ۔

غازی انتپ کی گماگمائی کے بعد کلس کی جانب سفر کرتے ہوئے مجھے شدید یرانی کا احساس ہوا۔ انگوڑوں کے باغوں میں دور دور تک کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ہماری بس ایک میڈی اور بالکل خالی سرک پر چل رہی تھی۔ کلس ایک مختصر مگر جاذب نظر ترک قصبہ تھا جس کے بڑے چوک میں جہاں بس رُکی اتار کر کا ایک مجسمہ نصب تھا میں نے سامان اٹھایا اور اپنے تئیں ملک شام میں قدم رکھنے کو تھا کہ ایک مرتبہ پھر اطلاع ملی کہ ابھی سرحد دور ہے۔ یہاں سے ٹیکسی میں سوار ہو کر جانا ہوگا چنانچہ ایک جتنا ٹیکسی میں سوار ہوا جس نے بالآخر مجھے ترک شامی بارڈر پر جاتا رہا۔ شامی کسم نمر نے پاسپورٹوں کے ڈھیر میں سے بطور خاص میرا پاسپورٹ نکال کر الگ رکھ دیا۔

”یہ صاحب کوئی قصہ کھڑا کریں گے۔“ میں نے قریبی کمرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ تمام مسافروں کو فارغ کرنے کے بعد انہوں نے میرے پاسپورٹ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ”مائی پھرے باز نے بھی تو اسی کسم ہاؤس کی کھڑکیاں تو ڈدی تھیں۔“ میں نے ہر اسل ہر کسوچا۔ یہ صاحب یقیناً پاکستانیوں کے خون کے پیاسے ہوں گے۔ سرحد عبور نہیں کرنے دیں گے۔“

اتنے میں انہوں نے گرجہ دار آوازیں کوئی نام پکارا۔ باہر کھڑا سپاہی اتنی بیٹائی



”آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا... میں اب بھی صورتِ حال کے بارے میں کچھ دھندلاہٹ میں تھا۔“

”یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک پاکستانی بھائی ہمارے پاس آئے اور ہم اسے یوں خشک خشک اپنے ملک میں داخل کر لیں۔“

”تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔“ میں نے قدرے نارمل ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”باقیوں کو چھوڑ دیجیے۔“ وہ منہ بنا کر بولے۔ ”لیکن پاکستانی... آپ ہمارے بھائی ہیں۔“

دشمن پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شامی پاکستانیوں کو اتنا عزت و تکریم جانتے ہیں۔

تو وہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگائی اور پھر اپنی

کرسی سے اٹھ کر میرے ساتھ ایک پرجوش مصانچہ کیا۔ ”میں آپ کو شام میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اہلاً و سہلاً۔“

میرا گلا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں بمشکل ”شکریہ“ کہہ سکا۔

ماضی کے تلخ تجربات کے مقابلے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اور

شام کے دوران کوئی سرحد نہیں، اگر تھی تو وہ صرف میرے لئے کھول دی گئی ہے۔

شامی لوگوں کی وہ بے باک خوش اخلاقی جس نے مجھے شام میں گزارے ہوئے شنبہ رز

میں حیرت زدہ کئے رکھا۔ اس کی پہلی خوراک مجھے اس کی سرحد پر ہی مل گئی تھی۔

تارکول کی گھنی تاریک سڑک پر ٹیکسی ایک ہموار رفتار سے حلب جا رہی تھی ۲۱

اور بائیں گندم کے سنسناتے لشکارے مارتے زرد کھیت نیل رنگے آسمان کے کناروں

پر چمکے تھے۔ مصروفانِ لوگ کی تصویروں ایسی شفاف زردی میں کہیں کہیں دیونا

کے ڈانٹ مار ڈھکائی جڑے کھولے ان کھیتوں کو چہا رہے تھے اور بھروسے اور گندم

کے دانوں سے بھری ہوتی بوریاں اپنی دُموں میں سے ایک خراب ہاضمے والی بکری کی

ٹیکسی کے اندر ہو کے بھرتی ہوئی ایک گہری مترنم آواز، ڈھولکی کی تھاپ پر

سے اندر آیا کہ سیلوٹ مارتے ہوئے اُس نے مجھے لہزا دیا۔ عربی زبان میں کچھ

وہ اجازتی سیلوٹ کے بعد جیسے یکدم وہیں غائب ہو گیا ہو۔

”نصرت یہ کہ سرحد عبور نہیں کرنے دیں گے بلکہ یہ تو گرفتار کرنے کے نوڈ میں

دیتے ہیں۔“ جیسے گلا اسی لمحے پک گیا ہو۔ میں حقوک بھی نہیں نکل سکتا تھا کہ

عبور کرتے ہوئے سیاح خوف اور بے چینی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے کہ جانے کیا

کر دیں، اگر روک لیا تو پھر کیا ہوگا۔ اور پھر ایسی سرحد جس کے بارے میں آپ

ہو کہ چند ماہ پیشتر اپنے پاکستانی برادران نے اس کی عمارت اور عملے پر بار بار

کی تھی۔

کسٹم افسر نے پاسپورٹ کے ورق الٹانے کے بعد اُسے پھر مزید پھینک دیا۔

کنپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ ”پاکستانی ہو؟“

”جی“ میں نے اقرار کر لیا اور کیا کرتا، پاسپورٹ پر بھی لکھا تھا۔

”ہوں۔“ وہ جھوم کر بولے۔

”میں سرحد عبور نہیں کر سکتا؟“ میں نے کھسیانے ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ کہنے لگے۔

اس ”نہیں“ سے ایک بنجار کی سی کیفیت میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔

میں وہی سپاہی ایک ٹرے ہاتھوں میں لئے اندر داخل ہوا۔

”آپ تب تک سرحد عبور نہیں کر سکتے جب تک کہ میرے ساتھ توہ ہے۔“

گلاس نہ پئیں۔ ”سگریٹ؟“ انہوں نے ایک بڑھیا برانڈ کا پیکیٹ کھولتے ہوئے

آگے بڑھا دیا۔

میری حیرت قابلِ فہم طور پر عروج پر تھی۔

”تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں، مگر دوسرے مسافروں کی موجودگی میں

کو توہ کی دعوت دینا قدرے معیوب سی بات ہوتی۔“ وہ کھل کر مسکراتے ہوئے

عربی میں کوئی گیت الاپ رہی تھی اور اس کے زیر اثر میرے جسم میں ایک پھیل رہی تھی... واللہ مستغفر باللہ تم بالآخر اپنے پہلے عرب ملک میں جو بے گناہ کی بجائے صحرا ہوتا، گندم نہ ہوتی، بھجوروں کے درخت ہوتے یا چائے کی درختیں ہی سہی اور مکینکل ماروٹر کی جگہ ایک آدھ مرل اونٹ تھو تھی اٹھائے ملال کر رہا ہوا دکھائی دے جاتا تو قصور عرب در زیادہ راحت آمیز ہو جاتا لیکن خیر میرے وجود میں گونجا نغمہ تو بہر طور عربی میں ہی ہے ناں... میں نے ایک مرتبہ جب دیو کی تھاپ پر درامر کو جنبش دی تو ڈرائیور نے اسے پسندیدگی کی علامت جان کر گھمایا اور آواز مزید بلند کر دی۔

”سبحان اللہ اُم کلثوم کی آواز میں بھی کیا سحر ہے“ میں نے سر ہلا کر ٹیڑھی آواز میں کہا۔ ”ناں...“ اُس نے زبان پٹانے کی طرح بجا کر سر ملایا۔ ”یہ فیروز ہے“ ”اچھا“ میں کھسیانا ہو گیا ”فیروز ہے۔“ آواز تو لڑکیوں کی سی ہے۔ ”لوٹنی ہی ہے“ وہ ہنس دیا۔

پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے مسافر آغا ز سفر سے ہی نیم سجدے کی کیفیت چلے گئے تھے اور فیروز بی بی میں مگن تھے۔ اتنی دیر میں فیروز نے کوئی تان لگا کر ڈرائیور نے حلق میں سے ایک ”سبحان اللہ“ نکال کر ایکسپریس پوری قوت سے ٹبکیسی ایک برق رفتار موٹر بوٹ کی مانند گندم کی زر و جھیل میں تیرنے لگی۔

یہ لفظ جو میں لکھ رہا ہوں، یہ حرف جو آپ پڑھ رہے ہیں، ملک شام نے ہی مجھے اور آپ کو عطا کئے۔ حروف تہجی کی ایجاد اسی خطے میں ہوئی۔ قدیم اور پجاریوں نے اپنی ضرورت کے لئے حروف کی شکلیں بنائیں اور پھر یہ کتبہ یونانیوں اور رومنوں سے ہوتے ہوئے یورپ پہنچ گئے۔ دوسری جانب یہ ایران کے راستے ہندوستان میں آئے... شام کا اولین نام ”آرام“ تھا جو صرف اس وجہ سے ”الشام“ کہلایا کہ یہ خطہ خانہ کعبہ سے بائیں ہاتھ پر واقع تھا۔

مناجے میں جو دائیں جانب آتا تھا۔ کعبے کو شام سے ایک نزدیک کی نسبت پہل نام ایک بت بھی تھا جو سرخ عقیق سے تراش کر انہی علاقوں سے معبد عرب میں بھیجا گیا۔ انسانی اخلاقیات اور روحانی ترقی کے حوالے سے اس خطے کو باقی دنیا پر ہمیشہ برتری حاصل رہی۔ یہودیت اور عیسائیت نے اس کے آس پاس جنم لیا اور اسلام کا پھیلاؤ ہمیں سے شروع ہوا۔ ایک کہادت ہے کہ ایک مسلمان، یہودی اور عیسائی دنیا میں کہیں بھی ہو اس کی روح شام کو لوٹتی ہے۔

دوپہر کے قریب ہم حلب پہنچ گئے۔ میں نے موسیقی میں مگن ڈرائیور سے ہاتھ ملایا اور پھر دست جانے والی ایک نر کلکف و پیر ہجوم بس میں سوار ہو گیا۔ میرا پہلا شامی گروہ تھا۔ دودھ میں گھلے شربت انار ایسی رنگتیں، ترشے ہوئے مین نقش اور نفاست سے حرکت کرتے ہوئے۔ بس روانہ ہوئی تو چھت میں نصب سپیکروں میں سے ایک سُر ملی آواز کا جادو مسافروں کے سروں پر چڑھ کر بولنے لگا۔ جملہ حضرات نے نیم سجدے کی کیفیت اختیار کی اور آواز پر کان دھرے سُر اے موسیقی پانے کی دھن میں غرق ہو گئے۔

”سبحان اللہ فیروز کی آواز میں بھی کیا سحر ہے“ میں نے اپنے مہمنا سے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔

اُس نے گردن سے تلگتی سونے کی صلیب کو انگلیوں پر رکھ کر چوما اور پھر زبان سے پٹا نہ سا بجاتے ہوئے کہا۔ ”ناں... یہ اُم کلثوم ہے۔“

اُم کلثوم اور فیروز کی آوازوں نے آئندہ چند روز کے لئے شام اور لبنان میں میرے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا۔ اس دوران نیند کے علاوہ مجھے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں جب کہ ان کی گہری رچی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں نہ اترتی ہوں۔ جھٹکتے اور بازار تو خیر ان کے محل کوہن کے الاپ سے گونجتے ہی ہیں مگر ٹیکسیوں، بسوں، قہوہ خانوں، میان کد کے کھلے میدانوں اور دیرانوں میں بھی یہ دو خواتین ہمہ وقت آپ سے ہم کلام رہتی ہیں۔ اُم کلثوم اور فیروز ان ملکوں کی آب و ہوا ہیں۔ شک ہونے لگتا ہے کہ

عمار توں اور انسانوں کے وجود ان کی گونجتی صداؤں کی گرفت میں ہیں۔ قائم ہیں اور اگر کبھی یہ یک نخت خاموش ہو جائیں تو شاید اس سناٹے سے عمارتیں جاتیں اور انسان گونگے ہو جائیں۔

ہم حلب سے باہر آتے تو حلب کا احساس ہوا۔ میرے ہمسائے نے مارے پسینہ پونچھا اور کھڑے ہو کر چھت میں نصب ایئر کنڈیشنر کے سوراخوں کے آگے سر دی۔ کچھ دیر پرامید کھڑا رہا اور پھر حجب میں سے ٹکٹ نکال کر اس پر لکھی عبارت کی پڑھنے لگا۔ ”یہ بس مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔“ ہلکی مسکراہٹیں مسافروں کے چہرہ اور وہ مطمئن ہو کر اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد ایک اور بڑی اور بڑی خصوصیت سے کنڈیشنر کے آگے ایک انگلی کھڑی کر دی۔ ”یہ بس مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔“ اُس نے بھی اپنے ٹکٹ کو انتہائی سنجیدگی سے پڑھا۔ ”بالکل سب سے صرف کنڈیشنڈ ہے۔“ وہ اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور کہا: ”تو نام و نشان نہیں۔“ مسافروں نے ایک ہلکا سا تہقیر منہ کر دیا۔ اتنی دیر میں ایک اور صاحب مہربانی پھیلائے ایئر کنڈیشنر کی طرف بڑھے۔

”خواتین و حضرات! بس کا خوب رو اور خوش لباس کنڈکٹر پیشیاں گی میں مسافروں سے مخاطب ہوا۔ میں آپ کے علامتی احتجاج کا مطلب بخوبی سمجھا ہوں۔ افسوس ہے کہ ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا۔ مجھے پہنچنے پر اسے درست کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔“ تمام مسافروں نے نہایت وسیع القلبی سے فریاد کنڈکٹر مسکراتے ہوئے ٹرے میں سچی ٹافیاں اور سوئیس ہمیں پیش کرنے لگا۔

”حاضر! حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کا شہر، خالد بن ولید کا مدفن۔“

”مجلس یہاں سے کتنی دُور ہے؟“ میں نے اپنے ہم نشست سے دریافت کیا۔

”مجلس تو بہت پیچھے رہ گیا ہے۔۔۔ جہاں کافی کے لئے بس رُکی تھی۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بس کے عقبی شیشے میں سے ایک طویل شاہراہ بستی ہوئی

دُور ہو رہی تھی اور اُس کے آخر میں کسی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایک آواز تھی

شاید حص کی جانب سے۔

آنا فارس الضدید

آنا خالد بن الولید

آنا سیف اللہ

دور سے یہ رجز سناتی دیتی اور دشمنوں کو علم ہو جاتا کہ ایک ناقابلِ تسخیر نایاب میدان جنگ میں داخل ہونے کو ہے جو نوپلین اور چنگیز خاں کی حکمتِ حرب رکھتا ہے جس کی تدبیرِ حربِ تیمور لنگ ایسی ہے اور جزوِ ذاتی شجاعت میں رستم کے ہم پلہ ہے اور یوں وہ ان تمام فاتحین پر سبقت رکھتا ہے۔ ایک رومی جنرل نے آغازِ جنگ سے پہلے طعنہ دیا۔ ”اے خالد! میں نے سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر نے تمہیں ایک ایسی تلوار عطا کی ہے جو تمہیں ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے تو اس میں تمہارا داخلہ بن ولید، کا کیا کمال ہے خالد نے جواب دیا۔ ”ہر جنگ میں درجنوں تلواریں میرے ہاتھ میں ٹوٹتی ہیں، شجاعتِ تلواریں نہیں، خالد بن ولید میں ہے۔“ وہ ہمیشہ میدان میں اترنے سے پہلے آپس خود کے بچے ایک ٹوپی پہنتا جس میں حضورِ صلعم کے موٹے مبارک سبلے ہوتے تھے۔ آنا زور آور جوان تھا کہ ایک رومی جرنیل کو بازوؤں میں کس کر زور لگایا تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ سکندر اور چنگیز کے علاوہ وہ واحد فاتح تھا جو شکست سے کبھی آشنا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ایامِ غزنی مسلمانوں کے خلاف جنگِ اُحد میں بھی کامران ہوا۔

اسی حص میں حضرت حمزہ کو بے دردی سے شہید کرنے والے شخصِ وحشی نے اپنے زندگی کے آخری ایام حالتِ خماریں گزارے۔ شراب نوشی کے جرم میں حضرت عمرؓ نے اسی دُوروں کی مسزادی مگر وہ پھر بھی اس سے جدا نہ ہوا اور بالآخر حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر چشمِ پوشی اختیار کر لی کہ شاید حضرت حمزہ کے خون کی وجہ سے اللہ وحشی کو دیے بھی معاف نہیں کرے گا۔ حص کے ضعیف الاعتقاد لوگ اس کی زیارت کو آتے تو وہ انہیں حضرت حمزہ اور مسالمہ کے قتل کی تفصیل سناتا اور برچھے کو بلند کر کے کہتا۔ ”اس برچھے سے میں نے

ایامِ کفر میں ایک بہترین آدمی کو قتل کیا یعنی حضرت حمزہ کو اور پھر اپنے ایامِ ایمان میں ایک بدترین آدمی کو یعنی دشمنِ اسلام مسالمہ کو۔“

خالد بن ولید کی کامرانی صرف میدانِ جنگ تک محدود رہی، وہ سیاست میں مات لگا گیا۔ جبری طور پر برطرف ہوا اور پھر حص میں آکر ایک زخمی جیتے کی طرح تنہائی اور خاموشی میں پڑا رہا۔ بازو جو ہمیشہ فضا میں بلند رہتے تھے خالی ہو کر بستر میں قید ہو گئے۔ ایک روز اس نے اپنے واحد قرابت دار حاتم سے بڑے دکھ سے پوچھا۔ ”اے حاتم میرے جسم کو دیکھ اور دو انگلیاں جوڑ کر کسی ایسے حصے پر رکھ جہاں زخم کے نشان نہ ہوں۔“ حاتم نے کہا۔ ”اے خالد ایسا کوئی حصہ نہیں۔“ خالد نے بے بسی سے سوال کیا ”تو پھر میں شہید کیوں نہ ہوں؟“ حاتم کا جواب تھا۔ ”اس لئے ابوسلیمان کہ اللہ کی تلوار کو کوئی شہید نہیں کر سکتا۔“ شام ہوئی تو خالد نے اپنی اذیت کو اس تاریخی فقرے میں ڈھالا۔ ”میں ایسے مرد ہا ہوں جیسے ایک اونٹ مرنے سے، میں بستر میں ایک شرمناک موت مر رہا ہوں۔“ مدینہ میں کھرام مچ گیا۔ حضرت عمرؓ اپنا دُورہ لے کر حجرے سے باہر آ گئے کیونکہ ان کا حکم تھا کہ جہاد میں کام آنے والوں کا ماتم نہ کیا جائے۔ باہران کی بیٹی حفصہ بھی گریہ کر رہی تھیں۔ ”لوگ مرنے والے جنگجو خالد بن ولید کا سوگ منا رہے ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔ حضرت عمرؓ نے وہ دُورہ لٹکا دیا اور اپنے تمام اختلافات بھول کر کہا۔ ”جو خنوزم کی عورتوں کو ابوسلیمان کا ماتم کرنے دو، اس لئے کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہیں کہ رونے والے ابوسلیمان جیسے شخص پر ہی روتے ہیں۔“

آنا فارس الضدید

آنا خالد بن الولید

آنا سیف اللہ

بس کے شیشے میں سے ایک طویل شاہراہ بہتی ہوئی دُور ہو رہی تھی۔ حص پیچھے نکلتا تھا۔

## دم دمشق اندر۔ ۱

شام ہو رہی تھی، چھ بجے کے قریب ہم ایک خاموش سے شہر میں داخل ہوتے  
جودش تھا۔

اوپر اٹھتی ہوئی دیواریں خاصی بلندی پر جا کر آسمان کے ایک مختصر ٹکڑے کو کندھا  
دے رہی تھیں۔ میں مسافر خانے کے صحن کی گہرائی میں براجمان اوپر دیکھ رہا تھا جیسے  
کسی کنوئیں میں اتمکات میں بیٹھا ہوں مگر عبادت میں دل نہیں لگا رہا اور بائیں کل جانا  
چاہتا ہوں۔ عبدالرحمن بھی ایک کونے میں نیم دراز آسمان کو تنک رہا تھا اور اس کی انگلیوں  
میں چرس کا ایک سگریٹ کاہلی سے رکھ ہو رہا تھا۔ صابر سرکار بار بار دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر  
بھاپ میں ناک لہراتے ہوئے پکینے والے مٹر آلوں تک مرچ کی مناسبت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

تران میں مائی پھیرے باز نے مجھے نہایت شفقت سے مشورہ دیا تھا کہ پتہ دمشق میں  
عبدالکریم الہندی کے ہوٹل فندق الکبیر میں قیام کرنے پر گھر کا سا آرام ملے گا۔ چنانچہ میں نے  
بس سے اتر کر ایک راہ گیر سے سبک دار کا راستہ پوچھا تو وہ صاحب اپنا راستہ بھول کر میرے  
ساتھ چلنے لگے۔ پہلے مرکزی چوک میں کھڑے ہو کر ریڑھی پر بکنے والا سیاہ رنگ کا ایک  
بوزہ اور انبکائیاں لانے والا شربت بھد اصرار پلایا اور پھر فندق الکبیر تک میرا ساتھ دیا۔  
عبدالکریم ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور الہندی ہی تھا مگر مائی پھیرے باز کے حوالے  
کو اس نے چنداں اہمیت نہ دی، بس سر ہلاتا رہا اور ایک جہازی سا تزکا حقہ گڑ گڑاتا رہا۔  
... کچھ دیر کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی اداکاروں کی تصویریں کھینوں کی آلاش سے سیاہ

”اچھا...“ وہ بے یقینی سے بولا ”صرف گھوڑے پھرنے، سیر کرنے؟“  
 ”ہاں۔ میری بیزاری انتہا کو پہنچنے لگی۔“ الہندی صاحب میں آپ کے فائو سٹار  
 ہوٹل میں اس لئے آگیا ہوں کہ مائی پھیرے باز نے آپ کی سفارش کی تھی، مجھے ایک کمرہ  
 چاہیے، ہے یا نہیں؟“

”ہے“ وہ جلدی سے بولا اور ایک رنگ آلود چابی میرے آگے رکھ دی۔  
 کمرے نے مجھے بالکل مایوس نہ کیا۔ حسب توقع خوب خستہ حال اور ناقابل رہائش حد  
 تک بدبودار۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کی پھلتی کھڑکی کھول دی مگر اندرونی آب و ہوا  
 کی توں رہی۔ سین زدہ بو کا سرشتیہ وہ بستر تھا جس پر بچھی چادر کی شکلوں پر میل کی لکیریں  
 یوں ابھری ہوئی تھیں جیسے شیر خوار بچے کی بندھتی کھولی جائے تو مہتھیلی کی لکیروں میں  
 نیل بھنسی ہوتی ہے غسل فرمانے کے لئے راہداری میں واقع مشترکہ غسل خانے کی جانب  
 رجوع کیا تو وہاں فریش اس حد تک کافی زدہ تھا کہ اُس پر باقاعدہ سکی انک ہو سکتی تھی۔  
 بہر حال بازی گردوں کی طرح توازن قائم رکھتے ہوئے میں نے تین روز کی کھردری فصل  
 اپنے پھرے سے اتاری۔ بالوں کو شیمپو کیا جو اتنے طویل سفر کے بعد بالکل پتھر ہو چکے  
 تھے اور پھر کمرے میں داپس آگیا... صابر سرکار شاید میری تاک میں تھا، وہ بھی فوراً  
 دستک دے کر اندر چلا آیا۔

”سرکار، شام کے کھانے کے لئے مٹرا اور آلو کی بھجیا تیار کر رہا ہوں۔ روٹی ہاتھ  
 کی ہوگی تین عدد۔ دس روپے پاکستانی میں حاضر کر دوں گا اور ساتھ میں چائے بھی۔  
 خاکسار کو صابر کہتے ہیں سرکار...“ وہ دیسی خانساموں کی طرح اپنے موٹے پیٹ پر  
 ہاتھ باندھ کر سر جھکاتے مودب کھڑا ہو گیا۔

افغانستان، ایران اور ترکی کے بے مریج کھانوں کے بعد میرے تالو میں سے مریج  
 کے نرے کی خواہش چھوٹنے لگی۔ ”مرچیں تیز ہوں گی؟“  
 ”نہ ہوں تو اور چھڑک دوں گا سرکار“

ہو رہی تھیں اور اُن کے درمیان میں بی بی زینب کے روضے کی ایک تصویر آویزاں تھی  
 جس کے عین اوپر زیر و کا ایک سبز بلب جل بجھ رہا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے ایک بوسیدہ  
 بدبو چھوڑتے قالین پر چار پانچ رعشہ زدہ کرسیاں تھیں جہاں چند حضرات سرگرم  
 کھسکے پھیس کر رہے تھے... ہو سکتا ہے وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوں مگر ہٹل کی  
 بوسیدگی میں گونجتی ریشیاں اور نور جہاں کی آوازوں کے شور میں وہ کھسکے پھیس کر رہے  
 تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے عبدالکریم جو کہ الہندی ہی تھا، ایک جہازی سا تزکاؤتہ گڑگڑاتا تھا  
 ”اس میں تمہارا سامان ہے؟“ اُس نے میرے رک سیک پر ایک کسٹم انفرسٹال  
 ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”ہاں“

”کیا کیا ہے؟“

یہ سوال قدرے غیر متوقع تھا، بھلا عبدالکریم کو کیا غرض کہ میں اپنے رک سیک  
 میں کیا کیا اٹھائے پھرتا ہوں۔ بہر حال میں نے بتایا، چند کتابیں، ایک جین جیکٹ  
 ہراتی بوٹ، بنیانیں، انڈر ویئر...  
 ”انڈر ویئر ریشمی ہیں؟“ اُس نے کاہلی سے سراٹھایا۔

”نہیں“

”خیر...“ وہ مایوسی سے بولا ”ریشمی ہوتے تو عرب لڑکیاں زیادہ پسند کرتیں۔“  
 ”کچھ کچھ بیہودہ سی بات نہیں کہ عرب خواتین یہ سو گھنٹی پھریں کہ میں ریشمی انڈر ویئر  
 پہنتا ہوں یا سوئی...“

عبدالکریم الہندی نے ایک شک آلود نگاہ سے مجھے نوازا ”تم پھیرے باز نہیں؟“

”نہیں“

”تو پھر کیا ہو؟“ وہ قدرے چوکتا ہو گیا۔

”سیاح ہوں، دمشق دیکھنے آیا ہوں“

”لے آؤ۔“

”سرکار زحمت نہ ہو تو صحن میں تشریف لا کر تناول کر لیجئے، کھلی فضائیں روٹی گرم گرم اترے گی تو سے۔“

... اور اب صابر جو ہر کس و ناکس کو سرکار سرکار کہتا خود بھی سرکار ہو گیا تو بار بار دیکھی میں سے اٹھنے والی بھاپ میں ناک لہرا رہا تھا اور اس کا دوسرا کمرہ عبدالرحمن جو پہلے دیوار سے ٹیک لگاتے بیٹھا تھا، انتظار کرتے کرتے فرش پر گر رہا ہو چکا تھا۔ شام میں میری پہلی شام۔

بھجیا تیار کرنے کے بعد صابر نے نہایت اہتمام سے اپنے چھوٹے ہونے پر ایک ایپرن لپیٹا اور مشکوک صفائی کی حامل دو رکابوں میں سالن ڈال کر پیش کر دیا گرم روٹی کے پہلے نوالے نے ہی میرے بیشتر طبق روشن کر دیئے۔ مچیں تیزی سے ناقابل برداشت تھیں مگر اب ہاتھ کھینچنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ ادھر صابر میرا سر پر کھڑا کسی الف لیلوی جتن کی طرح ہاتھ باندھے میری راتے کا منتظر تھا۔

”واہ کیا خوب کرا رکھا ناپکاتے ہو صابر بھائی۔“ میں نے چھنگلی سے آنکھوں میں تیرتے پانی کو پونچھتے ہوئے دھڑکے ہوئے گلے سے کہا۔

”ذرا نوازی ہے سرکار کی۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا اور کورنش بالائی ایپرن اتار کر رکھا۔ میری طرف شرمندہ نظروں سے دیکھا اور صحن میں اندھے ایک گیلے کو اٹھایا۔ نیچے کسی نامعلوم برانڈ کی سستی شراب کی چوتھائی بوتل رکھی تھی۔ ”اجازت ہے سرکار؟“ اُس نے بے حد فرمانبرداری سے دریافت کیا ادھر چوڑا منہ لگا کر ایک گہرا گھونٹ بھرا۔

”صابر سرکار تمہیں کتنا عرصہ ہو گیا ملک سے نکلے ہوئے؟“ میں نے دربان ڈیو کے طور پر پوچھا۔

”کچھ زیادہ ہی ہو گیا سرکار۔“ وہ دو ہانسا ہو گیا۔ ”زمانے گزر گئے صابر سرکار۔“

”نکلے ہوئے۔“

”پاکستانی ہونا؟“

”ہاں تو سی سرکار مگر بہت نہیں بڑتی کہلانے کی... ہم تو بے آسرا لوگ ہیں گناہگار ہیں... نیک نام دے سکتے تو کہلاتے پاکستانی...“

”دمشق میں کس طرح پہنچ گئے؟“

”اٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کوٹے کے ہائی سکول میں۔ ماں باپ تھے خاندان تھا، زندگی کے مزے تھے۔ پھر سرکار بری عادتوں نے مجھے خرید لیا۔ تین سال کی سزا ہوئی جیل سے بھاگا تو گرفتاری کے خوف سے سرحد پار کر کے ایران چلا گیا... بس وہ دن اور آج کا دن اکس ٹھکانہ ہی نہیں... کچھ عرصہ بھیک مانگی ایران میں۔ پندرہ برس عراق میں درزی کا کام کیا۔ پھر وہاں ایک پاکستانی تاجر کو جاسوسی کے الزام میں برسبر عام پچانسی دی گئی تو ہم سب کی شامت آگئی۔ یہاں چلا آیا۔ چار سال بی بی زینب کے رخصتے کے باہر شربت بیچتا رہا۔ پچھلے سال وہاں سے بھی اٹھا دیا گیا... پھر یہ بھگت رام اپنا یار بن گیا...“

”کونسا بھگت رام؟“

”یہ جو جس کے نشے میں ڈوبا ابھی تک اپنے پہلے نوالے کو گھور رہا ہے۔“

”مگر یہ تو عبدالرحمن ہے۔“

”جسے بھگت رام مگر جب اس کا ہندوستانی پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا تو اس نے یہاں سے پاکستانی پاسپورٹ خرید لیا۔ اُس پر بھگت رام کیسے لکھواتا... عبدالرحمن ہو گیا... تادمہ کلر پڑھ کر ہو کر سرکار... بھگت رام! اُس نے اپنے یاہ کو پکارا۔“ کلمہ پڑھ کر سابر کا رکو۔

بھگت رام نے اپنے پہلے نوالے کو واپس رکابی میں رکھا اور نہایت خشوع و خضوع سے کلمہ پڑھنے لگا۔

نہیں کہاں کہاں چلے گئے ہیں۔“ اُس نے آخری گھونٹ بھرا اور بوتل کو احتیاط سے گیلے کے نیچے چھپا دیا۔

”آپ سیر کرنے آتے ہوں؟“

”ہاں۔“

”مگر گھر تو جاؤ گے ناں واپس؟“

”ہاں۔“

”ہاں آپ تو گھر جاؤ گے، گھر والے جوہوتے۔“

”گھر کے لفظ پر جیسے صابر کے چہرے پر جلا وطنی کی دھول کے لاکھوں ذرے

جھلکتے اور دم پڑ جاتے۔

میں نے صابر سرکار کو کھانے کی قیمت ادا کی اور کمرے میں آ گیا۔

کھڑکی سے باہر گلی چُپ تھی۔ دشت کی بستی دیر تک جاگنے کی عادی نہ تھی۔

رُک سیک میں سے سفری ڈائری کھینچ کر میں نے چند سطریں لکھیں اور پھر کپڑے

بدل کرتے ہوئے بستر کی طرف دیکھا۔ حسب سابق صفائی کے معاملے میں انتہائی پس ماندہ،

خود ملائکہ حد تک غلیظ اور بوباش۔ میں نے اپنا سلپنگ بیگ دل کڑا کر کے بستر پر

بچایا اور اُس کے نرم پردوں میں دراز ہو گیا۔

دو دن اور ایک رات کا متواتر سفر ایک آہنی شہتیر کی طرح مجھ پر آن گرا۔ جسم کے

خسکتے خستے تھکاوٹ کی برف میں منجمد ہونے لگے۔ آنکھیں بند رکھنے کے لئے مجھے باقاعدہ

دست بچھنی پڑے۔ اس بے آرامی میں کچھ وقت گزرا اور پھر ایک عجیب سی بے چینی تہم

پڑنے لگی۔ کروٹ بدلتا تو دوسانس لینے کے لئے رُک جاتی مگر پھر فوراً ہی رواں ہو

جاتی۔ میں ایک بیزار مگر چھچی طرح کر وٹیں بدلتا رہا مگر یہ بے چینی کم نہ ہوتی۔ بدن پر

جیسے جیسے بھر پڑتے رہے بالآخر جب ضبط نہ ہو سکا تو بستر سے اٹھ کر روشنی آن کر دی۔

”تو سرکار جھگت رام اپنا یا رہن گیا... اس نے کہا، صابر سرکار نکال پڑو۔“

ہے تیرے پاس، سو گنا کردوں گا۔ میں نے نکال دیا۔ ہم نے چرس خرید کر

جانے کے لئے۔ قاهرہ ایئر پورٹ پر اترے تو اگے سرکار پولیس ہی پولیس۔

لگا دی۔ دوسا تھی کپڑے گئے اور اُنہیں پچھلے مہینے دس دس سال کی قید پر

بس سرکار میں نے تو توبہ کر لی حرام کی کمائی سے۔ اب یہاں عبدالکریم الہندی

بھرتا ہوں، شام کو کھانا پکا کر ہوٹل لگاتا ہوں، تھوڑا سا کڑوا پانی پیتا ہوں اور

پڑ رہتا ہوں صحن میں۔ مگر یہ سب تو آج کا کھیل ہے سرکار، کل پھر کوئی ٹھکانہ

پڑے گا...“

”کیا کل سے عبدالکریم الہندی محقق پینا چھوڑ رہا ہے؟“ میں نے ہنسنے لگا۔

”نہیں سرکار یہ ہوٹل بک گیا ہے۔ کل بارہ بجے نئے مالک قبضہ لینے کے

رہے ہیں۔“

”مگر عبدالکریم الہندی نے تو مجھے یہ نہیں بتایا۔“ میں پریشان ہو گیا۔

”آپ نے پوچھا کہ کیوں عبدالکریم الہندی یہ ہوٹل بس ایک رات کا ہی

... نہیں پوچھا ناں؟“ صابر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ شراب کا ہلکا سرود اُس کے

تن و توش میں گھل رہا تھا۔

مرچوں کی عادت ہونے کے بعد اب سالن بہت مزیدار لگ رہا تھا۔

اور مل جاتے گی صابر؟“

”کیوں نہیں سرکار؟“ وہ پھرتی سے اٹھا، ایپرں زیب تن کیا اور جھک کر

پلیٹ میں ایک اور روٹی رکھ دی۔ ”دو روپے ہوں گے ہر فالٹو روٹی کے۔“

بعد اُس نے ایپرں اتارا اور اپنے مشغل میں محو ہو گیا۔

”صابر تم وطن واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”میری جڑوں کو ہوا لگ گئی ہے سرکار، اور پھر وہاں جادوں کس کے؟“



پرائیگا۔ شہر سرد ہاتھا اور میں بھی ایک خالی فٹ پاتھ پر سیلینگ بیگ بچھا کر اس کے ہمراہ سو گیا۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور قدم رک گئے۔ سامنے سے پھر وہی لڑکی چلی آرہی تھی۔ وہ پہلے سے قدرے ڈبلی تھی مگر تھی وہی۔ اور اس سے پہلے جب دیکھا تھا تو قد اس کی نسبت نکلتا ہوا تھا۔ ہر مرتبہ اُس کا لباس بھی مختلف ہوتا۔ وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے کہیں نہ کہیں نظر آ جاتی۔ شوق الحمید یہ کہ کسی دکان میں، شارع درویش کے کسی تھوہ خانے میں، فٹ پاتھ پر اپنے خاوند کے ہمراہ، البورومانیہ میں اپنے کسی دوست کے ساتھ، شارع صالح میں اپنے بچے کے ساتھ، شارع الباکستان میں ایک گھومتی ہوئی... اور ہر مرتبہ میرا قدم عمل طے شدہ ہوتا۔ میرا منہ کھل جاتا اور قدم رک جاتے۔ میں بنیادی طور پر ایک نظر باز قسم کا بندہ نہیں ہوں، اُڑتی چڑیا کو دیکھ کر لیتا ہوں لیکن پرگننے نہیں بیٹھ جاتا یعنی چہرہ پر کُشش ہوا تو زیادہ سے زیادہ آنکھیں جھپکنے میں معمولی سا تاثر کر لیا اور بس... لیکن دُشقی میں نظر آنے والی یہ لڑکی میری اخلاقیات کی جڑوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اُس نے مجھے انتہائی آپ سبٹ کر دیا تھا۔ مختصر وقفوں کے بعد وہ میرے سامنے سے یا پیچھے سے چلتی ہوئی آتی اور میں اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوا اُسی مقام پر پتھر بنا منہ کھولے اُسے ہونٹوں کی طرح دیکھنے لگتا۔

اُس کا سراپا بیان کرنے کی کوشش مضحکہ خیز ہوگی کیونکہ تمام لفظ تو عکس کی مدح کی نظر ہو چکے اب سراپا سامنے آیا تو کاغذ کو رے نکلے... پتہ نہیں اُس کی جلد کچھ ایسی تھی جیسے... اُس کا بدن... اور آنکھیں ایسی تھیں جیسے... بال اتنے لمبے تھے جس طرح... یعنی یہ جیسے اور جس طرح کو مکمل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اُس نے دُشقی میں میرا چلنا پھرنا دیکھ کر دیا تھا۔ وہ نظر آتی اور میں

... نہ صرف میرے جسم پر بلکہ پورے بستر پر کھٹی کے حجم جتنے سینکڑوں کھٹل کھٹل جنیں اگر میں دن کی روشنی میں دیکھتا تو ہر بوٹیاں جان کر شدید رو میں نکلتا۔ ان کے رومانس کے نشان تو میرے بدن پر ثبت ہو رہے تھے۔ یہ کسی بھی کھٹل سے پہلی ملاقات تھی... میں نے ایک پانی میں شراوہ جسم کو خشک کرنے کے انداز میں دھو کر اور بازوؤں کو پھیلایا میں بھینچ کر ان نازک انداموں کو اتارا، پھر سیلینگ بیگ کو اُٹھار کر لگا تو فرش پر نظر پڑی، ایک سُرخ قالین دھیرے دھیرے ہل رہا تھا، دیواروں پر چہل پہل کے رواں آثار تھے، کمرہ بہت سے میرا وجود کھینچنے لگا۔ سوچا اس کی بات میں یقیناً نہایت منظم طریقے سے اُن کی فصل کو اپنے ہراتی لوٹ کی مدد سے لیا جائے گا مگر یہاں تو نقشہ کچھ یوں تھا جیسے کسی سنیما سکوپ فلم کے لئے افواج جنگیزی کی جڑوں بلندی سے فلیمنڈ ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی چپل سے تقریباً ایک مربع فٹ کے علاقے میں سے اُن کا صفایا کیا اور پھر چپل کو ہاتھ میں تھامے ایک بت کی طرح آزادانہ سر زمین پر کھڑا ہو گیا... اب کیا کیا جائے؟ ساری رات تو اس حالت میں نہیں جا سکتی اور پھر ہر پانچ منٹ کے بعد مجھے اپنا علاقہ صاف رکھنے کے لئے چپل ہلاتی تھی۔ میں نے اس صورت حال کے بارے میں عبدالکریم الہندی سے مشورہ کرنا شروع کر دیا... اُس کے کمرے کا دروازہ بہت دیر بعد کھلا۔ مجھے دیکھ کر وہ قدرے ہلکا ہو گیا کیونکہ چپل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے ایک اور دستک دینے کے لئے فضا میں بلند کر رکھا تھا۔

”اوہ معاف کیجئے گا۔“ میں نے ہاتھ نیچے کر لیا۔

”کیا ہے؟“

”میرے کمرے میں کھٹل ہیں۔“

”اچھا، وہ تو میرے کمرے میں بھی ہیں۔“ اُس نے جسم کھجالتے ہوئے دروازے میں نے کمرے میں آکر سامان پیک کیا اور ہوٹل سے باہر نکل کر ایک

اُس کے حسن کا خراج منہ کھولنے اور قدم روکنے کی صورت میں بلاتا خیر اور اگر نہ  
کہا جاتا ہے کہ یہ لڑکی یہودی، فلسطینی، آرمینی اور کاتھولک خون کی امیزش سے  
ہے اور واللہ کیا خوب بنی ہے۔ اگر نیندیں اُڑا دینے والے سن میں کچھ حقیقت ہے  
تو انسان دمشق میں اگر ہمیشہ کے لئے بے خوابی کا شکار ہو جائے۔ اور یوں یہ لڑکی  
بھی کچھ ناقابل یقین سی لگتی ہے کہ یاروں نے قحط کے دوران دمشق میں شش کوڑا  
کر دیا تھا، اگر ان دنوں یہ لڑکی دمشق میں موجود تھی تب!... بہر حال جب یہ لڑکی  
میرے قریب سے گزر گئی تو میں نے اپنے ساکت قدم اُکھڑے اور پھر سے چلنا شروع کر دیا  
میں آج صبح تک فٹ پاتھ کی سینٹ سطح پر بڑے اطمینان کے ساتھ سوار اور  
پھر خوش قسمتی سے مجھے ایک قریبی ہوٹل فندق الکبیر میں جگہ مل گئی۔ کمرے دمشق  
اور بستر اتنے سفید کہ اُن میں لیٹنے یا کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ شکنیں  
جائیں گی۔ نفیس چھتاتے غسل خانے میں تیار ہو کر جب میں باہر نکلا تو سب سے پہلے  
مسجد اُمیہ دیکھنے کا ارادہ تھا مگر پھر میں نے اپنے آپ کو دمشق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے  
کے لئے شہر کی آوارہ گردی شروع کر دی۔

اس شہر نے مجھے قبول کیا اور میں نے اس کی ہوا کو پسند کیا۔ اس کی عمارتیں اور  
ماحول کچھ کچھ خزاں کے تانبے ایسے رنگ کی گھلاوٹ کے سے تھے۔ اس کے باسیروں  
نے مجھے دوست جانا اور مجھے ایک بھی ایسا شامی نہ ملا جس سے میں نے راستہ نوجوان  
اُس نے اپنے رستے، اپنے کام کا کچھ کھلا کر کھلی مسکراہٹ کے ساتھ میری رہنمائی کی  
ایک تقریباً مریٹ بھاگتے ہوئے شامی کو روک کر جب میں نے کچھ دریافت کیا تو وہ  
یکدم شانت ہو کر مجھ سے گفتگو میں محو ہو گیا اور پھر گھڑی دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا۔ "اوہ بھئی"  
اس وقت صد داسد کے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔

اپنی کاریں بیٹھتے ہوئے اُس نے مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میں شہر  
اٹارنی جنرل ہوں، وہ سامنے میرا آفس ہے، ضرور آنا۔" سو یہ شہر اور اس کے

مجھے انہوں کی طرح ہی نہ ملے بلکہ میرے اپنے ہو گئے۔ دمشق میں میرا قیام انتہائی طمان  
بخش اور پرسکون رہتا... اگر وقفوں سے یہ لڑکی نمودار نہ ہوتی رہتی۔ موسم پاکستان  
کے مقابلے میں گرم تو نہ تھا مگر پیدل چلنے سے اور بار بار آتش حسن کی قربت سے پیاس  
کا احساس ہوا۔ غلطی خے پھر وہی سیاہ شربت پینے کو ملا جو بخار کے کسچر ایسا تھا مگر جسے  
شامی برادران نہایت اہتمام سے نوش کر رہے تھے۔ پھر لچ کے طور پر ایک ساندوچ  
فلافل کھایا جو چنوں کی دال کا ذائقہ لئے ہوئے تھا اور سوت الحمید یہ کارخ کیا جس کے  
پہلیں دنیا کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ایک جامع اُمیہ واقع ہے۔

سوت الحمید یہ وہ جگہ ہے جسے اکڑے ہوئے بالائی ہونٹ والے انگریز صاحب بہادر  
"دی گرینڈ بازار" کا نام دیتے ہیں۔ تہران اور استنبول کے بازاروں کی مانند ایک ایسا وسیع  
شاہک مندر جس کی درجنوں بل کھاتی گلیوں کو مشرقی سورج کی تمازت سے محفوظ رکھنے  
کے لئے ڈھک دیا جاتا ہے۔ بازار کے خاتمے پر ایک رومی عہد کے کھنڈر تھے اور ایک  
آبی ذخیرے کی چند محرابیں اور ستون، درمیان میں ایک گلی تھی۔ سامنے مسجد اُمیہ کا بلند  
دروازہ نظر آ رہا تھا جس کی چوکھٹ پر بیٹھ کر زائرین اپنے جوتے اتار رہے تھے۔

مسجد اُمیہ میں حزن تو ہے مگر حزن نہیں ہے۔ آنکھوں کی زبان قدامت کے ذائقے  
سے آشنا ہوتی ہے مگر خوبصورتی کی جلالت کی خواہش نا تمام رہتی ہے تین ٹھیل نمادیلو اوس  
کے ساتھ بلند برآمدے کھڑے ہیں۔ درمیان میں صحن اور چوتھی جانب مسجد کی عمارت ہے۔  
بائیں میں قدیم بازو نظائے نقاشی کے نمونے ملتے ہیں جن میں درختوں اور بیل بوٹوں  
کے درمیان جنگلی جانوروں کی شکلیں بھی ہیں۔ بنو اُمیہ شکار کے دلدادہ تھے اور یہ جانور  
اُسی شوق کی غمازی کرتے ہیں۔ اس عمارت میں اگر اذان بلند نہ ہو تو اس کی روح ایک  
دینی عہد یا کلیسا کے قریب آ جاتی ہے۔ حضرت عمر فاروق کے عہد میں جب دمشق فتح ہوا  
تو یہاں سینٹ جان دی میسٹ کا کلیسا اعظم تھا جسے مسلمانوں اور عیسائیوں نے  
ایک معاہدے کے تحت مشترک عبادت کے لئے مخصوص کر لیا۔ مسلمان داتیں جانب

سے داخل ہوتے اور عیسائی بائیں طرف سے اور پھر ایک ہی چھت تلے نماز پڑھتے۔

میس کہتے۔ ۷۰۵ء میں ولید اول نے پورا اقلیسا خرید کر مسجد کی تعمیر شروع کروائی۔ ایرانی، ہندوستانی، یونانی اور شامی کارگریوں نے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کر نماز گاہ کی تخلیق کئے۔ سونے کے میوڑاں بناتے گئے اور سات برس کے عرصے میں مسجد اور منبر کو پہنچی۔

مسجد کے صحن میں شاید دنیا کا قدیم ترین کنواں واقع ہے۔ روایت کے مطابق حضرت یحییٰ لوگوں کو حضرت عیسیٰ کی آمد کے لئے پوچھ کر گئے تھے کہ پانی سے بیتما کیا کرتے تھے۔ ہمارے لئے حضرت یحییٰ اور عیسائیوں کے لئے سینہ جل دی بیسٹ کا مزار بھی مسجد کے عین درمیان میں واقع ہے۔ میں اس سے پیشتر استنبول کے ٹوپ کاپی میوزیم میں اس پیغمبر خدا کا پنجہ دیکھ چکا تھا جو سونے کی تاروں سے جوڑا گیا ہے۔ مسجد کے اندر ایک نیم تارک تھی ہوتی خاموشی تھی۔ عبادت گزاروں کے جھکے ہوئے سر ہوتے ہوئے ہونٹ، حضرت یحییٰ کے مزار کی جالی سے آسودگی حاصل کرتے ہوئے ہاتھ رکھنا ہاتھ مسلمان ہے اور کونسا عیسائی؟ مرکزی فانوس کے نیچے پُر وقار سراپے کے مالک ایک بارلش بزرگ اس پاس مودب بیٹھے ہوئے لوگوں سے محو گفتگو تھے۔ میں بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لوگ مذہب کے علاوہ اپنے ذاتی مسائل کا حل بھی دریافت کر رہے تھے۔ علی کے خاتمے پر انہوں نے سب کے لئے دعا کی۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا تو انہوں نے پاکستانی ہونے کا سن کر بے حد شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لئے خصوصی دعا مانگی۔

کچھ دیر سنانے کے بعد میں باہر صحن میں آگیا جہاں دُھوپ ڈھل رہی تھی۔ اسی صحن میں خلیفہ سلمان نے فاتح امڈلس موسے بن نصیر کا شاہانہ استقبال کیا تھا۔ پھر جب ہی روز بعد معز دل کر کے مسجد کے باہر ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔ سائنس مینار ہے جس پر ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزل ہو گا بھی ہے۔

کچھ دیر سنانے کے بعد میں باہر صحن میں آگیا جہاں دُھوپ ڈھل رہی تھی۔ اسی صحن میں خلیفہ سلمان نے فاتح امڈلس موسے بن نصیر کا شاہانہ استقبال کیا تھا۔ پھر جب ہی روز بعد معز دل کر کے مسجد کے باہر ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔ سائنس مینار ہے جس پر ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزل ہو گا بھی ہے۔

”اس گاڑی پر کربلا کے اسیروں کو دمشق لایا گیا تھا۔“ قیس نے لا پرواہی سے بتایا۔

”لیکن یہ تیرہ سو برس پرانی تو نہیں لگ رہی۔“ پیٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے حیرت سے پوچھا۔ بالکل ہمارے ہاں کی گڈ کی طرح تھی۔

”ہاں مجھے بھی شک ہے مگر ہمارے ہاں روایت ہے اور چھت سے لٹکتے اُس بچے کو بھی اسیران کربلا کو اذیت دینے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔“

برآمدے کے خاتمے پر دائیں ہاتھ ایک بند کمرہ تھا جس کی دیوار میں ایک چوکور جالی نصب تھی۔ زائرین اس جالی کو چھوئے، آنکھوں سے لگاتے اور ایک جانب ہو کر آہ زاری کرنے لگتے۔ کچھ اُس کے سامنے ہاتھ سینے پر باندھے تصویریں اتردا رہے تھے۔... پرچم سیاہ تھے، البادے سیاہ تھے، ماتم کا ماحول۔ یہاں کچھ ہوا تھا، یہاں کچھ ہے۔ چوکور جالی کے اوپر کوئی عبارت رقم تھی۔

میں نے قیس کی طرف دیکھا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ ”یہاں... یہاں شہید کربلا حضرت امام حسین کا سر مبارک رکھا گیا تھا۔“

میرے حواس ستائے میں آکر سُن ہو گئے۔ ہاں، یہاں کچھ ہوا تھا۔ اُن دنوں مسجد کے ساتھ شاہی محل کی دیواریں تھیں۔ یزید کے محل کی دیواریں۔ یزید جہاں ہم ٹکڑے ہیں، قید خانہ تھی جس میں اسیران کربلا کو رکھا گیا اور اس مقام پر

جہاں جالی ہے، امام کا سر ایک طشتری میں نمائش کے لئے رکھا گیا تھا۔  
”کیا یزید کا محل باقی ہے؟“

”نہیں... کیسے باقی رہتا... یزید بھی باقی نہیں رہا۔ اُس کی قبر پر اب پتھر کی ایک تپتی ہوئی بھٹی ہے جو دن رات جلتی رہتی ہے۔“  
اور جس مقام پر حسینؑ کے سر نے لمحہ بھر کے لئے آرام کیا تھا وہ جگر بوسہ تر رہتی ہے۔ ہاں یہاں کچھ ہوا تھا۔

ع سردادہ داد دست دردست یزید

کچھ دیوار تنگ گلی کے آخر تک چلی جا رہی تھی جہاں محراب کے نیچے بلند کوئلے والا ایک دروازہ تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ مسجد اُمیہ سے نکل کر میں دمشق کے پرانے شہر میں چلا آیا تھا اور پچھلے دنوں سے ایک ایسے شخص کی طرح جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی، ہستی سے تدمر منہ اٹھائے پرانے گھروں اور کچی دیواروں میں نصب منقش کھڑکیوں کا شکار ہوتا۔ قدیم شہر کے باوقار باسیوں کو گتھا چل رہا تھا۔ داییں بائیں جو بھی گلی نکلتی کسی کچے کا آغاز ہوتا اور میں بڑی فرمانبرداری سے بلا سوچے سمجھے اپنا رخ موڑ لیتا۔ اس پر آوارگی نے بے حد تھکا دیا تھا اور پیاس کی شدت نے مجھے اس دروازے پر دستک دینے کو اکسایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی آہنی کھڑے کی سخت آواز آئی اور کوڑے چراتے ہوئے کھل گئے۔ ایک خیمہ نما چوغے میں کھڑے شامی نے بصدر حیرت میرا معائنہ کیا۔ مجھے منہ کو لگا کر ”العطش“ پکارا اور وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے اندر جھانکا۔ مجھے افسوس ہوا کہ آخر اس شامی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے اندر آنے کے لئے کیوں نہیں کہا... دنیا جہاں سے گٹا ہوا ایک صحن تھا۔

دیواروں کی تہیں، بے ترتیب جھاڑیاں اور اُن کے درمیان میں خاموشی سے چلتا ایک تڑپا، دیواروں پر رنگین گملے ٹنگے ہوئے تھے جن میں سے تلکتی بیللیں درختوں سے جھولتے بندروں کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ نیلی محرابیں اور بند کھڑکیاں۔ یہ صحن مجھے آشنا سا لگا۔ یہ آشنائی چھ برس پیشتر قرطبہ کی ایک گلی میں ہوئی تھی جس کے ہر مکان کے اندر یہ صحن تھا۔ صرف اس کا نام وہاں ”پاتو“ تھا۔ پرانے قرطبہ اور دمشق کے اس صحن کو اگر پہلے پہلو رکھ دیا جائے تو اس میں چلنے والے کو کسی سرحد کا احساس نہ ہو کیونکہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جنگ عظیم میں تباہ شدہ تاریخی شہروں کو جس طرح پرانے نقشوں کی مدد سے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا تھا، کچھ اسی طرح بنو اُمیہ نے اپنے کھوتے ہوئے وطن دمشق کو اُن کی نئی سرزمین پر قرطبہ کے روپ میں ڈھال دیا۔ مسجد قرطبہ بھی مسجد اُمیہ کے نقشے پر تعمیر کی گئی۔ اگرچہ یہ نقل خوبصورتی میں اصل کو ماند کر گئی۔ دمشق کے باغ و صفادہ کی کاپی قرطبہ کے باغ و صفادہ کی صورت میں ہوئی۔ حویلیاں، نوادے اور قصر اس طرح نئے شہر میں بلند ہوئے کہ اُس کے آسمانی منظر پر دمشق کا دھک کہہ نہ سکتے۔ کچھوڑ کے پودے کو دیکھ کر شام کی یادیں آہیں بھرنے والے اُمیہ انہی گلی کوچوں سے نکلے تھے قرطبہ کے بعد ابیں دمشق میں تھا اور یوں ایک آوارہ گرد کو بنو اُمیہ پر فوقیت حاصل ہوئی کہ وہ اُن کے دونوں گھروں کی خوبصورتی کا شکار بنے۔

لبے چوغے والا شامی برآمدے میں سے نکل رہا تھا اور اُس کے ہمراہ ایک ملازم شہر میں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ یہاں بھی مجھے سادہ پانی کی بجائے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا۔ انکار کیسے کرتا، صبر کا گھونٹ بھر کر پی گیا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بہانے ایک رقبہ بھر صحن میں جھانکا مگر گھر کا مکین ایک سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کوڑے پر ہاتھ رکھ کر غرار ہوا۔ میں پیچھے ہٹا تو اُس نے دروازہ بند کر کے قرطبہ کو میری نظروں سے غائب کر دیا۔

اسی بے ہمار آوارہ گردی کے دوران ایک بازار میں بالکل غیر متوقع طور پر حضرت

رقیب بن امام حسینؑ کا مزار نظر آگیا۔ میں نے اندھا کر زیارت کی۔ مزار کے چاروں طرف  
منتیں ماننے والوں نے بچوں کے کھلونے اور ننگھوڑے سجائے ہوئے تھے۔ قریب  
جامع التوبہ واقع ہے جو مسجد اُمیہ کی ایک مختصر شکل ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک  
پر درج ہے کہ یہ مسجد سلطان الملک الاشرف موسیٰ الاوی نے ۳۴۲ھ میں تعمیر کروائی  
شام ہو چکی تھی۔ جامع التوبہ سے نکل کر میں ایک قریبی قہوہ خانے میں سہارا  
کے لئے داخل ہوا جو اتنا مختصر تھا کہ ہر آنے والے کا وجود اُسے بھر دیتا تھا اور اُس میں  
موجود لوگ قہوے کی پیالیوں پر پڑتے سائے سے جان جاتے تھے کہ کوئی نیا گاہک آیا  
ہے۔ قہوہ خانے کا مالک پیتل کے ایک منتقش فغان میں سے بھاپ چھوڑتے قہوے کا  
ایک پیالہ بھر لایا۔ وہ ایک بے ڈول توند والا عمر رسیدہ شخص تھا جس کی منہ لکھ  
اتنی گھنی اور لامبی تھیں کہ آنکھوں پر ٹلک رہی تھیں، ایک پیالہ سا بڑھا شگ  
میری غیر ملکی شبابت کو اُس نے آنکھ میچ کر دیکھا اور چلا گیا۔

قہوہ خانے میں دس پندرہ گاہک براجمان تھے اور وہ سب کے سب مالک  
کے ہم عمر تھے یا شاید اُس سے بھی بڑھے۔ قہوے میں کسی کو رتی بھر بکچی نہ تھی۔  
چند ایک تاش کا کوئی خصوصی عرب کھیل کھیل رہے تھے اور باقی کرسیوں میں پڑے  
آرام سے تھے کڑکڑا رہے تھے۔ دیواروں پر ان زمانوں کی تصاویر آویزاں تھیں جب  
کیمرو تازہ تازہ ایجاد ہوا تھا، بھورے رنگ اور مٹی ہوئیں۔ درمیان میں ایک رنگ آواز  
تلوار اور سیاه ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔

میں نے قہوہ ختم کیا تو ایک نیم دروازہ بڑھے نے جتنے کی نال آگے کر دی۔ کش کی  
لطف آگیا۔ عجیب نشہ آور قسم کا تمباکو پی رہے تھے یہ دھندلاتے ہوئے بڑھے قہوہ  
دیر بعد مالک اپنا کام پٹیا کر ہمارے پاس بیٹھ گیا اور حقہ کڑکڑانے لگا چند لمحوں  
کھانسی آ کر کش کھینچ کر اُس نے دیوار سے ایک تصویر آٹاری اور جھاڑ پونچھ کر یہ  
سامنے رکھ دی۔ معدوم ہوتی ہوئی ایک شکل، ایک بھاری بھر کم نوجوان کی

میں لمبوس ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال تھا۔ شمشیر زنی کا کوئی پینٹر اکھاڑا  
غائب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک دودھ پیتے بچے کی پو پھی مسکراہٹ  
قی تصویر اُسی کی تھی۔ پھر اُس نے تلوار اور ڈھال آٹاری اور تصویر کے انداز میں  
پینٹر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی بڑھے جو شاید روزانہ اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے اُس پر  
نفرے لگے مگر وہ بت بنا کھڑا رہا۔ پھر کلیم اُس نے پھرتی سے پینٹر بدلا اور اٹریوں  
پکڑتے ہوئے تلوار کو اس زور سے کمرے میں گھمایا کہ وہ گاہکوں کے سروں پر سے شاخیں  
شاخیں کرتی گزرنے لگی جیسے کسی تیز رفتار پنکھے کا ایک ہی پَر ہوا اور وہ آپ کے اوپر سناتا  
ہرگز نہ لگے۔ میرے بالوں اور شرلاٹے پھرتی تلوار کے درمیان واجبی سا فاصلہ تھا پناچ  
میں اپنا سر کندھوں کے بیچ میں دھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ کہن زودہ بڑھے کا دوسرا  
ہاتھ ڈھال کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے مد مقابل کے وار روک رہا ہو۔

اُس کے عمر رسیدہ دوست بے فکری سے مسکراتے رہے اور میری پریشانی سے لطف اندوز  
ہوتے رہے۔ درجن بھر گھن گھیریاں کھانے کے بعد وہ ہانپنے لگا اور پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے  
نچھاورے دیوار پر سجادیے میں نے بھی پسینہ پونچھا اور حقہ پینے لگا۔ اُٹھنے سے پیشتر  
جب میں نے قہوے اور تمباکو نوشی کا مکمل بل طلب کیا تو بڑھے مالک نے میرا کندھا تھپکے  
سکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر اُس نے تیوڑی چڑھالی اور تلوار کی جانب اشارہ  
کیا میں نے شکریہ ادا کیا اور چپکے سے باہر آ گیا۔

درشن کی مسجدوں سے نماز عشا کے لئے مؤذنوں کے بلادے بلند ہو رہے تھے۔ ان  
مؤذنوں میں بلا کی خوش الحان تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس شہر کی مٹی میں بلال حبشی جو دفن  
تھے۔ موزارت کی نفیس نما دیوار کے پہلو میں چلتے ہوئے مؤذنوں کی صدائیں مجھ تک پہنچ رہی  
تھیں۔ میں اس دیوار کے ساتھ یوں چپک رہا تھا جیسے باقی ساری زمین سمندر ہے اور یہ  
موزارتیں۔ مجاہدوار مینار کے نیچے پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اوپر اذان دینے والوں کا ایک  
زودہ زوہب کھڑا تھا۔ اُن میں سے ایک اللہ اکبر کہتا تو باقی مؤذن یہی الفاظ قدرے مختلف

## دم دمشق اندر - ۲

شارع معادیہ پر واقع انور کیمال سٹور کے شوکیں میں جھانک رہا تھا کہ ایک شامی باہر آیا اور خوش دلی سے پوچھا ”فرمائیے“  
شامی کہنے کے بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ خوبصورت بھی تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر کہا ”بس یونہی تانک جھانک کر رہا ہوں، بچوں کے طلبہ سات بہت سائنس ہیں“

پوچھا ”پاکستانی؟“ میں نے سر ہلایا تو وہ بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا اور وہی وہاں جان سیاح شربت منگو کر پیش کر دیا۔ قریبی کاؤنٹر پر گلابی رنگت کا ایک چھینکا سانو جوان کھڑا تھا جو گا کہوں کو چھوڑ کر فوراً میرے پاس چلا آیا ”آپ پاکستانی ہیں؟ اہل اسلام، آپ بھائی ہیں“ اس کے بعد اُس نے انگریزی کے چند الفاظ کی مدد سے گفتگو شروع کر دی جس کا محور پاکستان تھا... میں ابھی تک خاصا پریشان تھا کہ آخر ان شامیوں کو پاکستانیوں سے خدا واسطے کا پیار کیوں ہے۔ بشاد کیمال بڑے کیمال صاحب کا جیتجا تھا اور فادخ اوقات میں اپنے چچا کے سٹور میں سیلزمین کی حیثیت میں رہتا تھا۔ شربت ننگنے کے بعد جب میں نے اجازت چاہی تو بشاد بولا ”اب کدھر رہتا ہے؟“ میں نے کہا ”پاکستانی سفارت خانہ تلاش کرنے کا ارادہ ہے۔ شنید ہے کہ مغربی ممالک ایک شناسا ادھر فرسٹ سیکرٹری وغیرہ ہوا کرتا ہے، وہاں سی ملاقات بن کر اُس نے گھاس ڈالی تو سبحان اللہ ورنہ اہل اسلام کدھر داس آجائیں گے“

اندام میں ڈھرتے۔ اسی طور جب اُشہد اُن لَآ اِلَہَ اِلَّا اللہ کی صدا بلند کرتا تو میری ساتھی وقفے کے بعد انہی الفاظ کی قرأت کرتے... میرے لئے اذان دینے کا یہ نیا اور پرکشش تھا۔

مسجد اُمیہ کے سایے میں میں نے ایک خاموش صحن دریافت کیا جس کا بڑا ستونوں پر آرام کرتی ایک محراب میں سے تھا۔ محراب پر محراب بنی انگوٹوں کی سی سیاہ تھی۔ صحن کے درمیان میں ایک تالاب تھا۔ کنارے پر ایک درویش سر جھکا کچھ پڑھ رہا تھا۔ محراب کی سیدھ میں تالاب کے پار ایک دروازہ کھلا تھا اور اندر قبر حقیقی۔ قبر پر سنگ مرمر سے تراشی ہوئی ایک پگڑی تھی۔ دُور سے یوں لگ رہا تو مرنے والے نے اپنی پگڑی احتیاط سے اتار کر لوح پر رکھی اور خود قبر میں آکر گلاب درویش کے مراقبے میں مغل ہوا اور اشادوں سے دریافت کیا کہ یہ کس بزرگ کا قبر ہے۔ اُس نے سر اٹھایا، میری لاعلمی کی حیرت چہرے پر ظاہر کی اور مجھے غریب بھائی ”سلطان صلاح الدین ایوبی“۔ میں ایک دم یوں ٹھٹکا جیسے اُس کر کے کہ وہ بنفس نفیس موجود ہیں۔ تاریخ کے ہزاروں اوراق میرے ذہن میں پھیلنے لگے۔ نے انہیں بے توجہی کے طاق میں رکھا اور اندر چلا گیا۔ داستان... تاریخ... حقیقت... شجاعت... صلیب... ہلال... خاک اندر خاک۔ نام پڑ گیا۔ نکلا، درویش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تالاب کا پانی تاریکی میں سیاہ رات تھا۔ محراب باہر جانے سے پیشتر میں نے مڑ کر دیکھا، دروازہ کھلا تھا۔ وہاں ناکانی روشنی تھی۔ میں نے انتہائی غور سے قبر کی طرف دیکھا، میرا واسہ تھا، پگڑی کے نیچے ایک ہونے دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب واسہ تھا مگر اس کے نقوش واضح تھے۔ زندہ تھے۔ واسہ تھا۔ داستان۔ تاریخ۔ افسانہ۔ حقیقت۔ صلیب۔ ہلال۔ اندر خاک۔

میں نے سوچا فرسٹ سیکرٹری صاحب نے پہچانا نہیں چنانچہ گویا ہوا کہ جناب جن دنوں آپ واپس آئے تھے اور فرانسیسی پڑھتے تھے اور مال روڈ پر گھومتے تھے تو ہم بھی... میری تقریر کے دوران وہ میز کے کناروں کے ساتھ ساتھ فاصلہ طے کرتا ہوا میرے میرے قریب پہنچ گیا۔ "یار مستنصر اب اتنے تکلفات کی بھی ضرورت نہیں" اور ہاتھ لگے کر دیا۔ "کب آئے ہو؟... ٹھیک!... کہاں ٹھہرے ہو؟... فندق الولید، مناسب ہے... اگر پسند نہ ہو تو میرے فلیٹ میں آؤ... اور ہاں میں لہجے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا، میرے پاکستانی باورچی نے کرلیے گوشت پکا رکھے ہیں، آؤ چلتے ہیں..." دوست دوستی کے درگھولے تو ایسا ہونا ہی چاہیے لیکن ایک شناسا اپنائیت کے بازو داکر دے تو انسانی برادری میں شامل ہونا کچھ کم ناگوار ہو جاتا ہے۔ منظر کے روتے نے مجھے بے حد متاثر کیا... ہم منظر کی سفارشی مراعات کے تحت درآمد شدہ نویں کورفرانسیسی کاریں سوار دمشق میں سے شوکتے ہوئے گزریں اور اس کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

"اب تمہیں دمشق دیکھنا ہے؟" اس نے کھانے سے فارغ ہو کر کافی میں ایک شکر کرکوب ڈراپ کرتے ہوئے پوچھا۔  
"نہیں" میں نے تکلف برتا۔

"ہاں دیکھنا ہے" وہ بولا۔ "لیکن ان دنوں سفیر صاحب پاکستان گئے ہوئے ہیں اس لئے میں اپنے دانتوں تک مصروف ہوں... آج اور کل میرے بغیر گزارا کرو، پرسوں شیڈول کو آگے پیچھے کر کے دو تین گھنٹے نکال لوں گا... تم نے باب الہفیز کاؤنٹن تو نہیں دیکھا... نہیں دیکھا تو میں منصور کو فون کرتا ہوں" اس نے منصور کو فون کیا اور پھر بیان جاری رکھا۔ "آج قبرستان دیکھو... کل سفارت خانے آجانا، قمر علی سے ملنا وہ دمشق کا انسائیکلو پیڈیا ہے... اور پرسوں... اور اس دوران کھانا بزار سے نہیں کھانا" اس نے نیپکین طے کر کے سائڈ پلیٹ میں جھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی پاکستانی سفارت خانے کی طرف ہی جا رہا تھا" بشار بولنے لگا۔  
دوسرے ہی لمحے اس نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی روک رکھی تھی اور مجھے اندر بٹا اشارہ کر رہا تھا۔

"البورومانہ" اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "ڈنڈ شیلڈ پر لڑائی... سرخ نشان ثبت تھا۔

"آج ہی خریدی ہے" ڈرائیور نے بتایا۔ "نظر بد سے بچانے کے لئے بلیڈ خون کا ہے۔"

"انسانی خون کا؟" میں نے پرتشیش لہجے میں پوچھا۔

"نہیں نہیں" وہ ہنسا۔ "آج صبح بکرا ذبح کیا تھا، اس کا ہے۔"

یہ نشان میں نے دمشق کے قیام کے دوران گھروں کی جبینوں پر ثبت دیکھا۔ کہاوت کہ بیشتر یونانی اور مصری دیوتاؤں کا مسکن ملک شام تھا۔ یہ سرخ خون کی یادگار دکھائی دیتا تھا۔

البورومانہ کی ہیبت ترکیبی سراسر فرانسیسی تھی۔ درختوں، پارکوں اور شاہی پیرس کا بوئے ڈی بولون جھلک رہا تھا۔ غیر ملکی سفارت خانے زیادہ تر اسی واقع تھے۔

"اب آپ اپنے دوست سے ملاقات کیجئے میں چلتا ہوں" بشار نے سفارت خانے کے گیٹ پر پہنچ کر کہا۔ "اور براہ مہربانی شام چار بجے ہیٹ کافی ضرور پہنچے گا" اس نے اپنا کارڈ دیا اور اسی ٹیکسی پر واپس چلا گیا۔  
شک تھا کہ وہ شامی مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر صرف میرے لئے میان تک منظر قیوم ایک وسیع ہال نما کرے میں ایک ہاکی کے میدان جتنی میز کے سر جھکاتے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر سر اٹھایا۔ سفارت کاروں والی ایک ابرو بھر بغور مطالعہ کیا اور پھر بولا۔ "اب کس کی تلاش میں نکلے ہو؟"

”آد چلیں۔“

جانبے سے پیشتر اُس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کی کل کائنات کی ایک محبت پر جہا کر اس طرح پیار سے کنگھی کی جیسے ایک ماں بچے کو سکول بھیجنے پہلے سنوارتی ہے اور پھر انہیں سر پر رکھ لیا۔ میں بھی حیران تھا کہ منظر کے بال بیلے گھنے کیسے ہو گئے۔ وگھتی... سفارت خانے کے راستے میں اُس نے مال کی گھنٹہ بچتے کے قریب کار روک دی۔ میں تمہیں دمشق کا بے مثل مشروب پلاتا ہوں۔ اندلیہ قریبی ریٹھی والے سے اُسی سیاہ شربت کے دو گلاس لے آیا۔

”ہماری نومو لو دوسری اپنی جگہ...“ میں نے بدک کر کہا۔ لیکن یہ دوائی نہیں پیرا۔  
”دوائی؟“ منظر نے چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو سوس ہے۔“  
”ہوگا۔“

”خمر مانی اور انجیر کے پتوں سے بنا ہوا ہے، پیاس کے لئے اکسیر، معدے کے لئے پھر بھی نہیں سپوں گا۔“  
سفارت خانے پہنچے تو منظر کے ہال کمرے میں گھٹے ہوئے بدن کے ایک عینک صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

”یہ منصور ہیں۔“ منظر نے تعارف کر دیا۔ ”تمہیں قبرستان دکھائیں گے۔“  
”آئیے قبرستان چلیں۔“ منصور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

منصور پی آئی اے میں انجینئر تھے اور دمشق آنے والی پروازوں کی کنٹیکٹنگ ان کے دتے تھی۔ بنو امیہ کی تاریخ کو دیمک کی طرح چاٹتے تھے اور فارنا اور کوئی دبیز کتاب کندھے پر رکھے دمشق کے گلی کوچوں میں اُس کے حوالے ڈھونڈتے آتے تھے۔ مطالعہ آتنا وسیع تھا کہ اگر جنگ جمل کا ذکر چل نکلا ہے تو حضرت علی کے گلیے میں لگتی گھنٹیوں کی تعداد سے بات کا آغاز کریں گے۔

ہم دھوپ سے بچاؤ کی خاطر دمشق کی قدیم فصیل کے سائے میں چل رہے تھے۔

انا خالد بن ولید  
انا فارس الضدید  
انا سیف اللہ

۱۳ھ میں خالد کی یہ رجز عذرا اور قتیفہ نامی قصبوں کے قریب واقع ایک دتے میں سنا دی اور اُس نے پرچم عقاب غوطہ دمشق کی زنجیری میں گاڑ دیا۔ یہ زرد پرچم جنگ خیبر میں حضور صلعم نے خالد کو عطا کیا تھا... دمشق کا محاصرہ شروع ہو گیا باوجود بغیر کے سامنے یزید بن ابوسفیان، باب تو ما کے سامنے شرجیل، باب فردیس کے سامنے عمرو بن العاص اور باب جابہ کے سامنے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح خیمہ زن ہو گئے۔ شہر کی دوسری جانب خالد بن ولید کا پڑاؤ تھا۔ ایک طویل محاصرے اور شدید یلغاروں کے بعد جب دمشق کے رومی حکمران ہتھیار ڈالنے کو تھے، حضرت عمر کی جانب سے خالد کی معزولی کا حکم آیا، ایک ایسے قاصد کے ہاتھ جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی، حضرت بلال حبشی۔ حضرت بلال نے سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہ کو آگاہ کیا کہ خالد کو معزول کر کے آپ کو سپہ سالار مقرر کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ نے صلاح دی کہ دمشق ترک کر کے کوہے۔ اس نازک لمحے میں خالد ایسے پسندیدہ سپہ سالار کی معزولی سے سپاہ میں انتشار پھیلے گا اس لئے چند روز انتظار کر لیا جائے... دوسرے روز ایک نئے نامے کے تحت حضرت ابوعبیدہ دمشق میں داخل ہو گئے مگر شہر کی دوسری جانب خالد کو اس معاہدے کا علم نہ ہو سکا اور انہوں نے حملہ کر دیا۔ شہر کے درمیان میں کیسے کے قریب دونوں کمانڈروں نے ایک دوسرے کو کچھ اس طرح دیکھا کہ حضرت ابوعبیدہ دمشق کو جیتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور دوسری جانب سے خالد تلوار سونتے دلتے۔ میں نے اپنے اختیارات کے مطابق رومیوں سے معاہدہ کر لیا ہے کہ شہر



ہمارا اور اس کا مال و دولت ان کا۔ خالد طیش میں آگئے اور کہا پرہیزگار اور میں نے یہ شہر بزرگ شمشیر حاصل کیا ہے اس لئے مال و دولت پر بھی ہمارا اثر ہے۔ آپ کو یہ معاہدہ کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہ نے بھی تلواریں نکال لی اور فرمایا۔ میں قول دے چکا ہوں، آگے بڑھو اور مجھے راستے سے ہٹا دو۔ حضرت ابو عبیدہ ایک جنگ میں حضور صلعم کے سامنے ڈھال بنے کھڑے رہے۔ ان کے جسم میں دھنسی زدہ بکتر کی کڑیوں کو نکالتے ہوئے ان کے دو دانت ٹھیکہ تھے۔ دانتوں میں یہ خلا ہر شخص کے لئے تعظیم کا باعث بنا اور خالد نے فاشی نہ تلواریں ڈال لی۔ یہ حضرت ابو عبیدہ کی عظمت تھی کہ انہوں نے ایسے وقت میں کثرت دیا اور خالد کی معزولی اور اپنے سپہ سالار ہونے کا راز فاش نہ کیا۔

تسخیر دمشق کے بعد ایک کھلے میدان میں افواج کے سامنے حضرت بلال نے فدا پگڑی اتار کر ان کے ہاتھ باندھے اور پھر ان پر عائد کردہ الزامات کی نہرت ناکارہ معزولی کا حکم سنایا۔ اس کے بعد حضرت بلال نے فرمایا۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی طرف سے حکم کے مطابق کیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا لیکن اب معاملہ میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ انہوں نے خالد کے ہاتھ کھولے اور اپنے دست مبارک سے پگڑی ان کے سر پر دوبارہ باندھ دی۔

حصص میں مجھے خالد کی خاک کا قُرب حاصل نہ ہو سکا مگر اب یہاں باب حصص کے وسیع قبرستان کے ایک کچے کمرے میں عشرہ مبشرہ میں سے ایک، تمام غزوات شامل صحابی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا مدفن میرے سامنے تھا۔ قبرستان کے جانب ان کی تعمیر کردہ دمشق کی اولین مسجد دکھائی دے رہی تھی۔

پھر میں منصور کی رفاقت میں سبز گنبد والے ایک مختصر مقبرے میں داخل ہوا۔ ایک ایسے شخص کا سفر زندگی تمام ہوا جس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی، والد کا نام تھا۔ والدہ حماہ تھیں۔ وہ طویل قامت تھا اور گھنے بالوں والا تھا، دُبلاتہ تھا۔

باب الصغير ووصف میں صحرا تھا جس میں اُبھرے ہوئے ٹیلے قبریں تھیں اُن لوگوں کی جن کے نام مرتب ہو چکے تھے جاسکتے ہیں۔ حضرت امام حسین کی صاحبزادیاں فاطمہ، معزنا اور سکینہ۔ اُن کی ہمیشہ اُم کلثوم، اُم المومنین حضرت حفصہ بن عمر فاروق، اُم حبیبہ، اُم سلمہ، حضرت ابوبکر کی بیٹی سیدتنا حفیظہ، حضرت عثمان کا بیٹا ابان، خالد بن ولید کا رکن اسعد، اصحابِ صفیں شامل ادس بن ادس... اور یہاں اُن لوگوں کی قبریں بھی تھیں جن کے نام سننے ہی نہیں جاسکتے... ایک قبر محمد بن ابوبکر کی تھی جو حضرت عثمان کے تالوں میں سے تھا۔ اُس نے جب دو ساتھیوں کے ہمراہ دیوار چاند کر حضرت عثمان کی ریش مبارک پکڑ لی تو انہوں نے فرمایا۔ اے محمد، اگر تیرا باپ ابوبکر یہ دیکھتا تو سخت ناپسند کرتا۔ امیر معاویہ نے اُسے بکرے کی کھال میں سلوا کر تنور میں ڈالا اور پھر چائے لاش باب الصغير پر لٹکا دی... معاویہ بن ابولسلی بھی یہیں پر ہے جو صرف چالیس روز کے لئے خلافت پر متمکن ہوا۔

منصور ہر ٹیلے کے قریب رگتا اور تاریخ کے حوالوں سے اس کے بوجھ تلے دبے شخص کو میرے سامنے زندہ کر دیتا۔

باب الصغير اپنے میانی صاحب کا بھائی بند قبرستان تھا جس میں سایہ و شجر کا نشان نہ تھا۔ وُصوب کی شدت دماغ کی رگوں اور شریانوں کو پگھلا کر اُلجھی ہوئی گرم سوتوں میں بدل رہی تھی۔ ہم باہر نکلنے لگے تو منصور نے عینک اتار کر ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کہا۔ کیا تم اُس شخص کی قبر دیکھنا چاہو گے جس نے کہا تھا کہ جہاں میرے دُورے

پسنا اور کہا بابا کبھی دل پسنا تو بلا لیجئے گا، بندہ کچھ رقم خرچہ کو بھی تیار ہے...  
تقریباً ایک برس بعد وہ بوڑھا میرے دفتر میں نمودار ہو گیا۔ "السیدی منصور میں کبھی نہ  
آؤں اگر مجبور نہ ہوتا، مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے، کل آکر امیر معاویہ کی قبر

دیکھ لیتا..."

"اس کا مطلب ہے کہ بوڑھے کے ساتھ دوستی ہو گئی؟"

"نہیں، منصور ہنسنا میں دوبارہ ایک دوست کے ہمراہ آیا تو اس نے پہچاننے

سے انکار کر دیا۔"

"میں دیکھتا ہوں کہ میری جیب میں کتنی رقم ہے اور اس میں سے کتنی امیر معاویہ  
پر خرچ کر سکتا ہوں۔"

"نہیں اب وہ نہیں مانے گا... تم میرے دانتیں ہاتھ پر کھڑے ہونا، میں دروازہ  
کلکھاؤں گا اور بوڑھا تھوڑا سا کواڑ کھول کر مجھے دیکھتے ہی لعن شروع کر دے گا۔  
تم اس دوران کوٹھڑی کے دانتیں کوٹنے کو دیکھنے کی کوشش کرنا۔"

ہم ماہر جاسوس بنے پھرنک پھرنک کر قدم رکھتے دھوپ میں سفید کچی کوٹھڑی  
کی طرف بڑھے اور منصور نے آہستہ سے بند دروازے پر دستک دی..... ایک

بے ترتیب داڑھی والا بوڑھا کواڑ کے پیچھے دکھائی دیا اور اس نے منصور کو دیکھتے ہی  
غلی میں کچھ ناشائستہ قسم کی گفتگو شروع کر دی... میں نے ایڑیاں اٹھا کر منصور کے

کمرے کے اوپر سے کوٹھڑی کے اندر جھانکا... دانتیں ہاتھ پر کوٹھڑی کے حجم کو نصف  
تقریباً کرنا ایک چوکور ٹیلا دکھائی دیا۔ ٹیلے پر چند غلیظ کپڑے تھے، چند پرانی کتابیں

تھیں اور ایک پیچہ دھرا تھا۔ پیچے میں قید طوطا بڑی حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔  
ٹیلے پر سب مرمرا کا ایک کتبہ بھی نصب تھا جس کی عبارت نیم تاریکی اور دودی کی

بنا پر مبنی نہیں جا سکتی تھی۔ طوطے نے یکدم پر پھر پھڑا کر ایک لمبی "ٹس" کی اور بوڑھے  
نے دروازہ بند کر دیا... بے آف بسکے سے سندھ اوجھن تک، آراں سمندر ایک طرف

سے کام چل جاتے وہاں میں تلوار نہیں اٹھاتا اور میں وہاں دروازہ استعمال نہیں کرتا۔  
میری زبان کا دارکاری ہو..."

"منصور صاحب آپ کچھ مزید روشنی نہیں ڈال سکتے..." میں نے گڑبڑ  
ہوتے جواب دیا۔

"اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میرا ایک بال بھی لوگوں سے بندھا ہو تو میں  
نہیں دھلے گا۔ اگر وہ کھینچیں گے تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا اور اگر وہ ڈھیلا چھوڑ  
تو میں کھینچوں گا۔"

"میں بے حد شرمندہ ہوں لیکن میری تاریخی بصیرت اتنی عمیق نہیں کہ میرا  
حوالے سے شخصیت کا نام بوجھ لوں۔"

"یزید کے باپ کی قبر دیکھو گے؟"  
"امیر معاویہ کی؟" میں فوراً رک گیا۔ "مگر ان کی قبر تو نامعلوم ہے۔"

"میرے لئے نہیں۔" منصور بولا۔ "امیر معاویہ کہاں دفن ہیں، اس کے بارے  
میں شراہل دمشق لاعلم ہیں۔ سیاحتی کتابچوں میں بھی کوئی حوالہ نہیں ملتا کسی گائیڈ

تو وہ لاہور والی سے کہے گا۔" اس کی قبر؟ صرف اللہ جانتا ہے۔" چنانچہ میں  
تاریخ میں غرق ہوا اور کھوج لگاتا ہوا اس قبرستان تک آپہنچا۔ میری توقعیں

ان کی قبر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دانتیں ہاتھ پر ایک کچی کوٹھڑی میں ہونی چاہیے  
... میں نے جب اس کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھے نے کواڑ کے پیچھے

جھانکتے ہوئے درشتگی سے پوچھا۔ "کیا ہے؟" میں نے کہا، "زیارت۔" کہنے لگا،  
"یہاں کوئی زیارت نہیں۔" اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ قبرستان کا چوکیدار تھا۔

بیٹے کے ہمراہ اس کوٹھڑی میں رہائش پذیر تھا۔ جب بھی موقع ملتا، میں قبرستان  
بوڑھے کی منت کرتا کہ صرف ایک منٹ کے لئے اندر دینی حصہ دیکھ لینے دوں۔

یہی جواب ملتا کہ کوئی زیارت نہیں۔ بالآخر ایک روز میں نے اپنا کارڈ ڈھونڈ

اور دوسری سرحد دریائے نیل، امیر معاویہ کی سلطنت... ایک کچی کوٹھی پر کپڑے، چند کتا ہیں اور ایک طوطا، امیر معاویہ کی سلطنت!

ہم پانچوں فرانسیسی طرز کی بالکونی میں بیٹھے سڑک پر سے گزرتی گاڑیوں کی چھتوں اور لوگوں کے سروں کو دیکھ رہے تھے، کافی پی رہے تھے اور گفتگو کرتے تھے بلکہ میں اور بشار گفتگو کر رہے تھے اور اُس کی تین بہنیں ہم دونوں کو مڑبڑ رہی تھیں۔

میری آمد پر بشار کیمال بے حد نہال ہوا اور مرحبا مرحبا کہتا ہوا اپنے خوش آمد سب سے کمرے میں لے گیا۔ دیواروں پر مغربی گلو کاموں، ادا کا دل اور جوڈو کر کے کے جہازی پوسٹر آویزاں تھے۔ اُس نے اپنا ڈیک پلیئر آن کر دیا اور کونوں پر بیٹھ کر دھم دھم کی آوازیں برآمد ہونے لگیں، جیسے کوئی دھو بی کپڑے دھو رہا ہو اور مینڈکوں نے ٹرانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کسی ساٹھانا صاحب کی دھن ہے۔ دونوں بے حد مقبول موسیقار ہیں۔ اس دوران بشار کی تینوں بہنیں بھی کمرے میں سپیکروں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور قلیل مدت میں ہی وجہ میں آگئیں اور نے مختصر بلاؤزوں کے ساتھ لمبے لمبے سکرٹ پہن رکھے تھے اور ان کے نام شاعر شہیدہ قسم کے تھے۔ موسیقی کا سیشن اختتام کو پہنچا تو ہم پانچوں بالکونی میں آ بیٹھے جانے بشار اشاروں کنایوں اور انگریزی کے چند لفظوں کی مدد سے گفتگو کرنے لگے۔ تین بہنیں یعنی شعاع اور شہیدہ وغیرہ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے لگنے لگیں کیونکہ وہ انگریزی کا لفظ بھی نہ جانتی تھیں۔ کبھی وہ بشار پر برس پڑتیں کہ اکیس باتیں کہتے جا رہے ہیں۔ ہمیں بتاتے کہ یہ کالے رنگ کا پاکستانی کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ایک آدھ فقرے پر ٹرخا کر پھر میری طرف متوجہ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر تو وہ خاموش بیٹھ رہتیں مگر کرنے لگتیں۔ ایک مرتبہ ان تینوں نے بشار پر سوالوں کی یلغار کر دی اور

خاصی جدوجہد کے بعد ترجمہ کر کے مجھے بتایا کہ پوچھتی ہیں مذہب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مذہب چونکہ ہم پاکستانیوں کا چھیتا موضوع ہوتا ہے اس لئے میں نے ایک مدلل تقریر جھاڑ دی کہ صاحب عرب لوگ مذہب سے بیگانے ہو گئے ہیں۔ دیکھتے جینیں پہنتے ہیں اور آپ شعاع اور شہیدہ وغیرہ غیر اسلامی لباس سکرٹ زیب تن کرتی ہیں، دھم دھم والی موسیقی پر سر ملاتی ہیں۔ اسلام خطرے میں ہے... اتنے میں مغرب کی اذان بلند ہوئی اور وہ تینوں اجازت لے کر نماز پڑھنے چلی گئیں۔ اور میں نے اپنی تقریر جاری رکھی کہ صاحب عرب لوگ مذہب سے بیگانے ہو گئے ہیں، غیر شرعی لباس پہنتے ہیں...

اگلے روز میری ملاقات محمد علی سے ہوئی جو پاکستانی سفارت خانے کا سب سے قدیم رکن تھا... دنیا کے ہر سفارت خانے میں کم از کم ایک محمد علی ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ عام طور پر ڈرائیو، چوکیدار یا کلرک ہوتا ہے یا اُسے ہونا چاہیے مگر وہ ہوتا نہیں۔ اُسے ایک ہینڈی میں یا ہرفن مولا کہہ سکتے ہیں۔ سفارت خانے میں آنے والا ہرنیا سفارت کار اُس کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ صاحب اس شہر میں انڈے کمان سے سستے مل سکتے ہیں۔ مسجد اُمیہ کے کس حصے میں نفل پڑھنے سے مراد پوری ہوتی ہے، کار کی بیٹری کہاں سے چارج کروانی ہے، کس سفیر کی دعوت میں بھوک رکھ کر جانا چاہیے اور کون سے سفیر کی دعوت سے بھوکے آنا پڑتا ہے۔ دانتوں کا کونسا ڈنٹر بھی دانتوں کا ڈاکٹر ہے۔ رات کو دیوار بچاند کر کس بس سروں سے بیروت باکر میں ٹک داپس آیا جاسکتا ہے جبکہ بگم صاحبہ ہنوز محو خواب ہوں... یہ دالا کوٹھی شامی تھا اور اردو فر فر بولتا تھا...

گفتگو کے دوران جب مسجد اُمیہ کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا کہ اس کے برآمدے میں کوئی بل گاڑی پر کیا واقعی اسیران کر بلا کو دمشق لایا گیا تھا؟ محمد علی ہنسنے لگا۔

”صاحب اس صدی کے آغاز میں مسجد اُمیہ کا ایک بہت بڑا حصہ آگ لگنے سے تباہ کیا تھا چنانچہ جب دوبارہ تعمیر شروع ہوئی تو معماروں کے علاوہ اہل دمشق نے بڑا رضا کارانہ طور پر اس میں حصہ لیا۔ میرے والد محترم جناب ابو السعود بھی ان معمار مزدوروں میں شامل تھے۔ ایک روز ایک میل گاڑی کے پیٹے تلے آگے اور ان کی ہڈی ٹوٹ گئی... ان گاڑیوں پر تعمیر کا سامان ڈھویا جاتا تھا... بس یہ وہی میل گاڑی ہے۔“

”ادھچھت سے لٹکتے ہوئے وہ خوفناک پتھر ہے...“

”وہ پتھر ہے نہیں پرانے فانوس ہیں جن میں شمعیں روشن ہوتی تھیں، اب بجلی کی روشنی سے بیکار ہو چکے ہیں۔“

اس سے پیشتر کہ وہ مزید انکشافات کرتا، ایک نوادر سفارتی افسرانے کمرے نکلا اور بڑے موزدانہ طریقے سے پوچھا۔ ”محمد علی بیروت کی سبزی منڈی میں کس دکان کا کیا نام ہے جو شملہ مرغ اور پیاز سستے داموں فروخت کرتا ہے؟ یا اسے فون تو کر دو۔“ اور محمد علی اس حاجت مند کے ہمراہ بیروت فون کرنے چلا گیا۔

میں ریسپنشن روم میں بیٹھ کر مظر کا انتظار کرنے لگا جس نے آج صبح فون پر اطلاع کی تھی کہ ایک بچے چلے آنا، لہج کے بعد کچھ فراغت ہے، تمہیں سیر کرواؤں؟ کچھ دیر بعد ڈیفنس اتاشی کمانڈر یونس کا ادھر سے گزر رہا تو وہ مجھے اپنے کمرے لے گئے جہاں ایک ڈبلا پیلا، چھدرے بالوں والا شخص کمرہ آئے ایک رسالے کے صفحوں میں مگن تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بڑے تپاک سے ملا۔ میری ایک آدھ کپڑے کا حوالہ دیا، کسی ڈرامے کا ذکر کیا اور پھر دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار کر کے چلا۔

”آپ کے دوست کی شکل کچھ کچھ شناسا لگتی ہے لیکن میں پہچان نہیں پایا۔“

”ایر فرس میں ہیں... دمشق پسند آیا؟“

”ان کا پورا نام کیا ہے؟“

”ایم۔ ایم۔ عالم... منسا ہے آپ پرسوں بیروت جا رہے ہیں۔“

”اپنے ایم۔ ایم۔ عالم؟“ میں نے چوکتے ہو کر پوچھا۔ ”۶۵ء کی جنگ کے ہیرو، ہالکے ایس پائلٹ؟“

”جی بالکل۔“ کمانڈر یونس نے جھینپ کر کہا۔

”یہ دمشق میں کیا کر رہے ہیں؟“

”سیر کرنے آتے ہیں... آپ چائے پیچھے گاناں؟“ انہوں نے گھنٹی بجادی۔

میں کچھ کچھ کنفیوز ہو رہا تھا۔ دمشق میں اکثر راہ چلتے یا کسی قومہ خانے میں بڑے

نعرے ہوتے، کسی ایسی حجام کی دکان میں تراشیدہ سروں والے پاکستانی نوجوان دکھائی

دیتے۔ پوچھا کہ صاحب دمشق میں کیسے آئے؟ ارشاد ہوتا، سیر کرنے آتے ہیں...۔

حالانکہ ٹورسٹ غریب تو شکل سے دھکتے کھانے والا لگتا ہے اور یہ حضرات دھکتے دینے

والے لگتے تھے... بہت بعد میں کھلا کہ پاکستان نے ۳۷ء کی جنگ رمضان کے دوران

شام کا ساتھ زور پر بیان سے نہیں زور بازو سے دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کے

دوران شامی پائلٹ تو اسرائیل پر برستے تھے اور دمشق کا آسمان پاکستانی پائلٹوں کی

حفاظت میں ہوتا تھا۔ شامی توپ خانے میں جس نے اسرائیلیوں کا منہ پھیر دیا، کچھ

پاکستانی توپچی بھی شامل تھے اور شام کی جانب آنے والے ہزار اسرائیلی پائلٹ کو ایم عالم

کے تربیت شدہ شامی شاہینوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا... شاید اسی لئے شام میں

لفظ ”پاکستان“ جادو تھا اور اس ملک میں داخل ہونے والے ہر پاکستانی کو شاہینوں کی

طرف سے دوستی اور پیار کا بلینک چیک پیش کر دیا جاتا تھا۔ ایسا چیک جو انسان

کبھی کبھی نہیں کر داتا، سینے سے لگاتے دکھتا ہے۔

”اور وہاں حضرت موسے کا مصلیٰ ہے اور حضرت ابراہیم کا مصلیٰ ہے اور...  
 وہیں لے چلنا۔“  
 ”چونکہ میں پہنچنے کے لئے پیدل بھی چلنا پڑتا ہے، گرمی بہت ہے۔“  
 ”بس وہیں جانا ہے۔“  
 ”ہم ایک اور سمت میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔“  
 ”مثلاً؟“  
 ”مثلاً میں تمہیں اسرائیل کی سرحد پر لے جاسکتا ہوں۔ گولان کی پہاڑیوں کے  
 درمیان...“  
 گولان!

گولان کا لفظ میرے جسم پر بارود کے گولے کی طرح پھٹا۔ یا سرعزات، جارج حباش  
 اور یسے خالد کے جلتی آنکھوں والے چہرے جیلا وطنی کے جنگلوں میں انتقام پر اترے ہوئے  
 تھے۔ ”کیا واقعی؟... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“  
 ”ہم دونوں جگہ نہیں جاسکتے۔ تمہیں موسے کے مصلیٰ اور گولان میں سے ایک کو  
 منتخب کرنا ہو گا۔“

”تم نے تو مجھے امتحان میں ڈالا ہی نہیں منظر! اتنا آسان فیصلہ شاید میں نے آج  
 تک نہ کیا ہو... میں ماضی کے دھندلے نشانوں کے تعاقب کی بجائے حال کی حقیقتوں  
 کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں... گولان!“



خاردار جھاڑیوں کے درمیان گم ہوتی ریت آلود سڑک پر منظر کی کاروائیوں نے  
 جاہری ہمتی اور عقبی شیشے میں سے دھول کا سرا سیمہ وجود ہمارے تعاقب کی ناکامی پر  
 کمر باندھا۔ منظر نے کار کے تمام شیشے چڑھا رکھے تھے تاکہ گردانہ نہ آئے اور اس نے  
 بھی کہ اس کی دگ تیز ہوا سے پریشان ہو کر کہیں سر کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ دایں باز  
 پر ایک نیم صحرائی دمعت تھی۔

”یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ایسی جگہ ہے جہاں حضور تجارت کرتے  
 تشریف لایا کرتے تھے۔“ منظر نے بتایا۔  
 ”ہم وہاں جاتے تو نہیں سکتے ناں؟“  
 منظر نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر انکار میں سر ہلایا۔ اس کے پاس وقت نہ تھا اور میرے  
 پاس اختیار نہ تھا۔

دوبجے کے قریب ہم اُم المصائب بی بی زینب کے مزار ”زینوبیہ“ پر پہنچ گئے غلاب  
 توقع زائرین کا زیادہ جھوم نہ تھا۔ ہم نے بوٹ آتارے اور سردوں کو ڈھانپ کر درخت  
 اندر چلے گئے۔ ایرانی فن تعمیر کا ایک محل نما مقبرہ۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ کچھ دیر جھکے  
 جالی کے قریب بیٹھے رہے اور پھر باہر آ گئے۔

”کل میں نے اپنے آپ کو سارے دن کے لئے فارغ کر لیا ہے۔“ منظر ایک ہاتھ سے  
 اپنی دگ کو دستارِ فضیلت... کی طرح سنبھالتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔ ”کہاں جاؤ گے اور  
 کیا دیکھو گے؟“

”تم کہاں جا سکتے ہو اور کیا دکھا سکتے ہو؟“

”دشمن سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جو روایت کے مطابق بائبل اور تائیل کی  
 لڑائی کا گواہ ہے۔ تائیل کے قتل پر اس کا سینہ شق ہو گیا، زبان باہر نکل گئی اور آنسو  
 بہہ نکلے...“

مجھے تران دالی مائی پھیرے باز کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ یاد آ گیا۔

## گولان

گولان -

بارود کی سیاہی پتھروں کے چہروں پر ملی ہوئی تھی۔  
کھبے ابھی تک جھکے ہوئے تھے، جلعے ہوئے تھے، کچھ یوں خمیدہ ہو چکے تھے جیسے  
کسی نے اُن کی گردنیں مروڑ دی ہوں۔  
دُشک کے پہلے شہری ایئر پورٹ کے رن وے پر تباہ شدہ جہازوں کے ڈھانچے  
بچے ہوئے آتش دانوں کی طرح سرد تھے۔

تیز ہوا میدانوں میں تھی اور بھیڑیں چر رہی تھیں مگر ہر لمحہ بدگنتی ہوئیں، خطرے  
کے سگنل وصول کرتی ہوئیں۔ دائیں جانب جبل الشیخ بارود کی سیاہیوں سے بلند برف  
پوش تھا... اپنے سر کی برف سفیدی کی نسبت سے ”بوڑھا پہاڑ“۔  
منظر کی کارٹرک کی سیاہ لکیر پسیدھی چلی جا رہی تھی۔

تیز ہوا میدانوں میں تھی اور ہلکا اعتبار اٹھ رہا تھا مگر کار کے اندر صرف انجن کی  
نامعلوم سی آواز تھی اور ریڈیو سے بہتی ہوئی کسی عرب موسیقار کی صدا... ”ناٹاؤں آدمی  
جُب کے سامنے ختم ہو جاتا ہے اور قوی شخص جُب کی قربت میں مکمل ہو جاتا ہے۔“  
کیس کیس کسان کھیتوں میں جھکے ہوئے تھے۔ مشقتی ہاتھ زمین کے ماتھے سے  
بارود کی سیاہی مٹا رہے تھے۔

ریڈیو دُشک سے عطشی کی پُرسوز آواز ہم نکت پہنچی... ”اور میرے وجود کے لئے

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ میں کہاں ہوں... اور ہم دونوں کہاں ہیں۔“

جبل الیشخ کی برف میدانوں میں اٹھتے غبار میں مدھم مدھم ہوتی تھی۔

”تم بیروت نہ جاؤ، وہاں حالات بہت خراب ہیں۔“ منظر نے سٹیئرنگ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”حالات تو گولان میں بھی خراب ہیں لیکن ہم وہاں جا رہے ہیں۔“

”آج صبح میں نے بیروت میں پاکستانی سفیر سے بات کی تھی، اٹھ دس قتل اور پندرہ زخمی۔“

دھماکے تو اب بھی معمول ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اگلے چند روز میں بیروت پوری تباہ ہو جائے گی۔

فلنجیوں نے تین پاکستانیوں کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ حالات بہت ہی ناگوار ہیں۔

”مجھے بہر طور بیروت پہنچنا ہے کیونکہ مصر کے لئے بحری جہاز صرف وہیں سے چلے گا۔“

اور پھر موت تو برحق ہے۔“

”بالکل ہے۔“ منظر نے اپنی وگ درست کی۔ ”لیکن پردیس میں موت کا بیچا کرنا تو دانشمندی نہیں۔“

”سیاح دانشمند نہیں ہوتا منظر بلکہ ایک نافرمان بچہ ہوتا ہے۔ فرماں بردار ہوتا ہے والدین کی گلشنی چھاؤں اور بچوں کے آسمانی سپار کو چھوڑ کر اپنی من مرضی سے گھبراتے ہیں۔“

کیوں ہو جاتے... امیر معاویہ نے لوگوں کے بارے میں کہا تھا مگر میں موت سے کبھی ہراسہ نہیں توڑتا۔

اگر میرا ایک بال بھی موت سے بندھا ہو تو میں اسے ٹوٹے نہیں کروں۔ اگر وہ کھینچے گی تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا اور اگر وہ ڈھیلا چھوڑے گی تو میں کھینچ دوں گا۔

... یوں ہم برابری کی سطح پر رہتے ہیں جس روز یہ ناطہ ٹوٹا تو وہ مجھ پر غالب آیا۔ منظر نے اپنی سفارتی ابرو ناگواری سے چڑھائی اور ریڈیو آن کر دیا۔

میدانوں میں اور پتھروں پر بارود کی جلن تھی۔ کھینچے کھینچے ہو کر ہماری کار کو حیرت تک رہے تھے۔

زمین میرے دایسے پر مین پھیلی شام ایک بس پر سوار ہو کر دمشق کے بلند ترین

نہ جین چلا گیا۔ چٹان پر ایک سائن بورڈ تھا۔ ”محافظہ مدینہ دمشق جبل تاسیون۔“

اور جبل تاسیون واقعی ایک باپ کی طرح اپنے پاؤں میں پھیلے دمشق پر شفقت بنا کھڑا تھا۔

قہار کی گود میں دیکے ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کر میں نے ایک ساندیش فلافل اور سنڈوچ کے رس کا آرڈر دیا۔ سامنے پارک میں شامیوں کا ایک ہجوم تفریح کی کیفیتوں میں تھا۔

اُس کریم اور ابلے ہوتے مجھے فردخت ہو رہے تھے... اُس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرے خیمے کے نیچے گھاس اُگ آتی ہے، مجھے یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ مجھے جو

دش دکھائی دے رہا تھا، اب اوپر انہیں لگتا تھا، اپنا لگتا تھا، گھر لگتا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ جوں جوں وقت گزرے گا یہ شہر خوبصورت ہوتا چلا جائے گا کیونکہ کوئی شے جس لمحے وجود میں آتی ہے اُسی گھڑی وقت اُس پر اثر انداز ہونے لگتا ہے، زمانے

گورتے رہتے ہیں اور وقت اُس شے پر، اُس عمارت پر، اُس شہر پر حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس میں سرایت کرتا رہتا ہے اور ہم جب اُس شے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو دراصل وقت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ شے بذات خود معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی تمام تر خوبصورتی وقت ہوتا ہے۔ دمشق کا شہر مجھے یقین ہے یوم ظہور پر

خوبصورت نہ تھا۔ اب ہے کیونکہ آج وہ وقت ہے... ”مہاجرین“ سے دایسے پر پرانے دمشق کے کوچہ ذکات نقاشات میں میں نے ایک کھڑکی کھلتی دیکھی اور اُس کھڑکی میں اسی

بچہ کا چہرہ تھا جو اس شہر میں ہر چند قدم کے فاصلے پر میرے پاؤں روک دیتی تھی اُس بچہ پر ایسے دکھ تھا جیسے ناخن تلے مارچ چل رہی ہو۔ وہ کھڑکی نیم تار ایک کوڑے

میں غبار ہو رہی تھی۔ چند قدم آگے جانے کے بعد میں اُسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش محسوس ہوئی۔ ہاں میرے خیمے کے نیچے گھاس اُگ رہی ہے، مجھے یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔

کارڈک گئی... ایک چیک پوسٹ... ہمارے راستے میں ایک رکاوٹی شہنشاہ

نہ خاتہ شامی فوجی سب مشین گن پر مقبلی رکھے ہماری طرف آیا اور کھڑکی پر جھکا۔ پاسپورٹ

دشمن دوسری طرف تھا۔

گولان !

چند کلومیٹر تک کوئی کوئی مکان نظر آتا رہا، بکریاں چرا رہی تھیں جامنی چوڑے اور گلابی شلوار والی ایک لڑکی نے رک کر کار کو دیکھا۔ پھر لینڈ سکیپ دیران ہو گئی۔

اجازت اور انتظار میں ....

کسی دھماکے کے انتظار میں ....

جیسے زمین دم بخود ہے، سانس روکے سن رہی ہے۔

مرٹک ایک لکیر کی صورت سیدھی چلی جا رہی تھی۔ بائیں طرف درختوں کا ایک گھٹا جھنڈ آیا۔

”عرب نشتر یعنی جنگِ رمضان میں شامی توپ خانہ اس جھنڈ میں روپوش تھا۔“

منظر نے بتایا۔

ہمارے سامنے میدان میں مرٹک کے دونوں طرف مٹی کے بلند تودے تاحد نظر صورتِ دیوار کھڑے تھے۔ دفاعِ دمشق کے لئے شامیوں نے گولان سے شروع ہو کر مشرق کی آخری حدِ دل تک ہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر اس قسم کے حفاظتی بند کھڑے کر رکھے تھے۔ درجنوں بل ڈوزران بلند مورچوں کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے۔

طیارہ شکن توپوں اور ٹینکوں کی نالیاں فضا میں منہ اٹھاتے ساکت تھیں... منتظر تھیں، سانس روکے سن رہی تھیں۔

فوجیوں کا ایک گروہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر میدان میں بھاگنے لگا اور پھر قریب زمین سے لپٹ کر زمین رنگ ہو گیا... وہ بھی سانس روکے سن رہے تھے۔

گولان !

ہم ایک چھوٹے سے پہل پر سے گزر رہے جس کے ارد گرد چند درخت کھڑے تھے۔ یہ ساسا کا پہل ہے۔ اسرائیل جنگ کے ابتدائی ایام میں یہاں تک آگئے تھے۔

پاسپورٹوں کی واجبی سی ورق گردانی کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے منظر سے کچھ کہا اور منظر نے اُسی شدت سے مسکراتے ہوئے بیک گیر لگا کر کار دیران کی طرف موڑ لی۔

”کل رات اسرائیلیوں نے قنبرہ پر شدید گولہ باری کی ہے اس لئے منظر سخت کر دیئے گئے ہیں۔ وزارتِ دفاع کی خصوصی اجازت کے بغیر ہم گولان نہیں عبثی شیشے میں سے چیک پوسٹ کا حفاظتی شہتیر دُور ہوتا دکھائی دے گا۔“

”پھر؟“

”پھر دمشق چلتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں ورنہ مونس کا مسئلہ...“

دمشق واپس پہنچ کر منظر نے مجھے ایک قہوہ خانے میں بٹھایا اور مونس کا شہتیر میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ میں ایک مایوس مریض کی طرح دنیا جہان سے ہزاران کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں ملٹے کے ایک چار بج بلند شریف النسل لگ جاتے ہیں اور یہاں تو وزارتِ دفاع تھی اور معاملہ اسرائیل کی سرحد کا تھا۔ صد شکر کہ شامی ابھی پاکستانی نہیں ہوئے اور منظر ایک گھنٹے کے بعد ہی اجازت جیب میں ڈالے واپس پہنچ گیا۔ نام کے خانے کے آگے... البتہ مستند حسین قرار دے گا۔“

”اب تم گواہ رہنا کہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے سید بنا ہوں۔“ میں نے منظر سے منہس کر کہا اور فرطِ مسترت سے مونس کا وہ گلاس جواب تک میرے سامنے جڑا دھرا تھا، اٹھا کر پی گیا۔

چیک پوسٹ پر شامی فوجی ہماری رکتی ہوئی کار کے قریب آیا اور سیدٹھک گیا۔ میرا اجازت نامہ چیک کرنے کے بعد اس نے حفاظتی شہتیر اٹھا کر عبثی شیشے میں سے چیک پوسٹ کا حفاظتی شہتیر دُور ہوتا دکھائی دے گا۔“



پھر شامیوں نے انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور گولان تک لے گئے... اگر جنگ ہوا تو گولان پر شامیوں کے قدم ضرور پہنچتے۔“

جون ۶۷ء میں اسرائیل کے قطرہ وجود کے سامنے عربوں کا سمندر سانپ جیڑ دیا۔ بند ہوا اور پھر مرنے چھا گئی وہ ذلت آمیز تھا۔ عربوں نے ہزیمت کی دھول چائی اور رسوائی کا لبادہ پہنا۔ پھر ۷ اکتوبر ۷۷ء کو گھڑی کی سوئیاں چلنے لگیں۔ باز کے پرائے اور پرواز کے قابل ہوا۔ چٹانوں تلے پوشیدہ پانی سطح پر آیا۔ درختوں کی جڑیں پھوڑنے لگیں۔ ۸ اکتوبر ۷۷ء کو حرب نشرین کا آغاز ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک کے نصیب مارا جاتا کی تحریر ہوتی ہے، مکمل فتح تو عربوں کو نصیب نہ ہوئی مگر وہ ہزیمتوں کی دھول سے لڑے اور مکمل وقار حاصل کر لیا۔

ساسا کے بعد کچی سرک نظر آتی جو داتیں ہاتھ پر دوزین کے قصبے تک جا رہی تھی۔ قریہ صخیرہ کے بعد قریہ مدیمہ آیا۔ سرو، زیتون اور سفیدے کے درختوں میں زندہ قصبے۔ ایک دفاعی ریلوے لائن گولان تک جا رہی تھی۔ ہر مایول کم ہو رہی تھی، زمین جفاکش نظر آنے لگی۔ میں نے کار کا شیشہ نیچے سرکایا، ہوا کا گھرا شور اندر آ گیا۔ ویران لینڈ سکیپ بے چینی سے بھری تھی جیسے پہلے دھماکے کا منتظر سیایا ہوا بدلتا ہے۔

دھول کے پر شور غبار میں سے ایک سلسلہ کوہ نظر آیا۔ گولان!

ہم قریب ہوئے تو ایک دھیل نما پہاڑی ہماری کار پر حاوی ہونے لگی۔ ”گولان کی اہم ترین اور سب سے بلند پہاڑی، تل البوند“ منظر نے کار ہر طرف دامن سے لے کر چوٹی تک ہزاروں امیریل اور مختلف آلات گھاس کی طرح کی سطح پر اگے ہوتے تھے۔

”ایک بڑی آنکھ جو ہر لمحہ دمشق کو دیکھتی ہے۔“ منظر نے ریڈیو بند کر دیا۔ ”اسرائیلیوں نے اسے رادار کا ایک جنگل بنا دیا ہے۔ اس میں پوشیدہ سینکڑوں ڈور مار توپوں کا منہ دمشق کی طرف ہے... لیکن فی الحال...“ وہ ایک لمحے کے لئے رکا... اس کی نظر سرک کی جاتے البوند پر تھیں۔ ”فی الحال ان کی ڈور مینیں دمشق سے آنے والی سرک پر دوڑتی ایک کار پر ہیں اور وہ اس میں سوار دو افراد کی تصویریں اُتار رہے ہیں... مجھے یقین ہے کہ ہم فوکس میں ہیں۔“

البوند پر آگئی تفصیلات اور امیریل مجھے ایک آکٹوپس کی طرح دکھائی دیتے جو میں گھور رہا تھا۔

”جب تک ہم البوند کے پہلو میں پہنچیں گے۔ اسرائیلیوں کو حیف سے اطلاع مل جائے گی کہ اس نمبر کی کار کس کی ہے اور اس میں سوار دوسرا شخص کون سے ملک کا ہے۔“ میں آج واقعی اہم محسوس کر رہا ہوں، پہلے شامیوں نے مجھے اکھڑ جانا کو الیسی کے لقب سے نوازا اور اب اسرائیلی انشیل جنس میرے کو الف معلوم کرنے کے لئے نڈھال ہو رہی ہے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں ایک ایسے جڑے کی طرح محسوس کر رہا تھا جسے ایک بڑی خوردبین سے دیکھا جا رہا ہو۔

”تل البوند کے ساتھ دوسری پہاڑی کا نام تل عرام ہے اور اس کے پہلو میں تل کتاہ دکھائی دے رہی ہے۔“ گولان!

خان در بند سے شام کا علاقہ ختم ہوا اور نوین لینڈ شروع ہو گئی۔ نوکلومیٹر کا یہ علاقہ اقوام متحدہ کی فوج کے زیر انتظام ہے مگر اس میں شامل بیشتر فوجی شامی ہیں۔ نوین لینڈ ختم ہوتی تو کار کا راستہ ایک نو تعمیر دیوار نے روک لیا۔ دیوار کے پیچھے ایک سرخ دین بے حد اہستگی سے حرکت کر رہی تھی۔ دین کی سائڈ پر حضرت داؤد کا نبی سا رد نقش تھا... ادھر اسرائیلی تھے۔

دیوار سے چند گز اداھر سرک نوے درجے کے زاویے پر دائیں ہاتھ کوڑھ کر ایک بورڈ پر تر جب بک، لکھا تھا یعنی خوش آمدید۔ اور ہم قنیطرہ میں داخل ہوئے جب میں غازی انتہی میں صبح سات بجے داخل ہوا تھا تو میں نے دیکھا تھا ایک شہر، بچے سکول جا رہے تھے۔ مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز چل رہے دفتری لوگ سائیکلوں پر ڈھیرے ہو رہے تھے، کاریں ٹریفک کے جھج میں مارن کی رہی تھیں اور لوگ تھے بے شمار، ایک شہر... مگر یہ کیسا شہر تھا جس میں ہم داخل ہوئے تو وہاں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو آگے بڑھ کر ہمیں کہتا کہ میرے شہر میں آئیے تو کارہننے والا ہوں، وہاں کوئی بھی نہ تھا، صرف تیز سواستی جو اداسی کی بنا پر نہیں۔ شہر بربادی کے غم میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بازار کی تمام عمارتیں بیچ کر سرک پر بیٹھی بکھری پڑی تھیں۔ ڈھلوانوں پر مکانوں کے ڈھانچے تھے سینکڑوں فٹ بلند دلوں پر پلٹی ہوئی تھیں۔ دکانوں کے دروازے برآمدوں میں پڑے تھے اور چھتیاں بچاؤ مسجد کا مینار صحن میں آرام کر رہا تھا اور کلیسا کے گنبد میں دراڑیں آئی ہوئی تھیں۔ ہم قنیطرہ کے کھنڈروں میں اُن پیاسے، تھکے ہارے کاڈو اتار کر کی طرح گھومتے جو کسی دیران بھوت کاڈ میں اُنکے ہوں۔

ایک ٹیلے پر شہر کے ہسپتال کے آثار تھے۔ سلاخوں میں کنکریٹ کے ٹکڑے بکے کہیں اس طرح پھنسے ہوئے تھے جیسے برف گھلنے پر درخت کی شاخوں میں چند گز رہ جاتے ہیں۔ لوہے کے شہتیروں میں سوراخ جھانک رہے تھے۔ کل شام اسرائیل نے اسی ہسپتال پر چاند ماری کے طور پر گولے برساتے تھے۔ ہم اس کی ننگی سیڑھیوں قدم رکھتے چھت پر پہنچ گئے۔

جنگلی گھاس اور سرکنڈے، اُن سے پرے کھیت اور آخر میں گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کا کچھ حصہ اور تباہ شدہ قنیطرہ کا وسیع منظر۔ میں تیز ہوا کی بوچھاڑ میں کوریت کے ڈروں سے بچتا اُس سرزمین کی جانب دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ

مناور اور قدیم درختوں کو اکھاڑ پھینکا گیا اور اُن کی جگہ دُنیا جہان سے مختلف قسم کے ایسے پودے لاکر وہاں بودیے گئے جو ان فسادوں میں سانس لینا بھی نہیں جانتے تھے... لیکن وہ درخت اپنی سرزمین کو نوٹیں گے کہ ان کی جڑیں وہاں پر ہیں، پھر سے تانہ ہوں گے۔

ڈور کھیتوں میں ایک شامی ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہسپتال تک آیا اور ٹول ٹول کر قدم رکھتا چھت پر آگیا۔ وہ ان پانچ خاندانوں میں سے ایک باسراہ تھا جنہوں نے دمشق میں جانے کی بجائے اپنے سمار شدہ گھروں میں رہنے کو ترجیح دی۔ اُس کی کر قدر سے خمیدہ تھی اور چہرہ جیسے دھات کا بنا ہوا، کھدی ہوئی سلوٹیں اور تراشا ہوا تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ ۶۷ء میں گولان کی پہاڑیوں کے ساتھ قنیطرہ بھی کھو گیا۔ ۷۳ء میں شامیوں نے واپس لے لیا، پھر اسرائیل آگے آگئے۔ ایک مرتبہ پھر شامی اپنے شہر میں داخل ہو گئے... جب جنگ بندی ہوئی تو قنیطرہ کا بیشتر حصہ اسرائیلیوں کے قبضے میں تھا۔ اس وقت شہر میں صرف دو کین باقی تھے ایک بی ادب ایک بوڑھی عورت۔ ۷۴ء میں اقوام متحدہ کے تحت ایک معاہدہ ہوا اور قنیطرہ شام کے حوالے کر دیا گیا۔ صدر اسد نے اس شہر پر شامی جھنڈا لہرایا مگر اس پرچم نے صرف کھنڈر تھے جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد جتنی عمارتیں اور مکان محفوظ رہے اسرائیلیوں نے جانے سے پیشتر انہیں مل ڈوزروں کی مدد سے سمار کر دیا۔ ستونوں سے زنجیریں باندھ کر انہیں اس طرح کھینچا گیا کہ ان پر قائم عمارتیں زمین پر آدھ میں جب شام نے اس تباہی پر احتجاج کیا تو جواب ملا کہ معاہدے میں یہ کہیں شامل نہ تھا کہ شہر سالم واپس ہوگا۔ یعنی انہوں نے اپنے بزرگوں کی روایت پر عمل کیا۔ شاید لاکھ نے بھی اُن طرح معاہدے کی پابندی کی تھی۔

”ہم جان بوجھ کر اسے دوبارہ تعمیر نہیں کر رہے تاکہ دُنیا دیکھ لے کہ کسین چیمبروں نے اُسے بیودیلوں کی اولاد کس طرح نازیوں کے ہی نقش قدم پر چل رہی ہے۔“

جھکا ہوا شامی کمرہ ہاتھا۔

اسرائیل کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔  
”آپ آگے چلے جائیے۔“ شامی نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔  
”آگے اسرائیل تو نہیں؟“

”نہیں اُدھر بھی شام ہے۔“ اس نے اپنی ناگواری کو مسکراہٹ میں دبائے رکھا اور مجھے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

دوسرے پھاٹک کے ساتھ لکڑی کی ایک کسین تھی، ہم نے اندر جھانکا۔ ایک شامی سپاہی کن کی کمانیوں کے عربی ایڈیشن پر جھکا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ باہر آگیا۔ اس کے کندھے سے کلاش نیکو و نامی سب مشین گن لٹک رہی تھی اور گلے میں دُور بین تھی۔ اتنے میں اقوام متحدہ کی ایک سفیر جیب ہمارے قریب آدگی۔ شامی نے جیب کے چاؤں طرف گھوم کر معائنہ کیا، پھر اندر جھانکا اور کاغذات چیک کرنے کے بعد پھاٹک کھول دیا۔ دوسری طرف جیب کو اسرائیلی سپاہیوں نے ہاتھ دیا اور اتنی دیر میں پھاٹک پھر سے بند ہو گیا۔

نیلی آنکھوں اور صاف ستھری رنگت والا شامی اب ہماری طرف متوجہ ہوا۔ اجازت نامے پر نظر ڈالتے ہی اُس نے میرے کندھوں کو تھام لیا۔ ”آپ بھائی ہیں“ اور میرے رصاصوں پر برادرانہ شفقت کے بوسے دیتے۔ پھر منظر کی طرف بڑھا جس نے سفارتی آداب کے تحت ہاتھ آگے بڑھا رکھا تھا مگر شامی نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اُس کے کندھے تھام کر بھی یہی عمل دہرایا۔ ”آپ بھائی ہیں، ہمارے پاس آتے ہیں، شکریہ...“ میں نے شام کی پسندیدگی اور شامیوں کے بے پناہ خلوص کا ذکر کیا۔ قنیتھرہ کی برادری پر اپنے رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔

”آپ جانتے ہیں۔“ اس سے پیشتر کہ ہم انکار وغیرہ کرتے وہ تیزی سے کسین میں گیا اور اُنہی باہر آگیا۔ ”افسوس چائے تو ختم ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا... پھر کچھ سوچ کر اپنی دلدی کی مختلف جیبوں کی تلاشی لی۔ تین چار بسکٹ ڈھونڈ نکالے اور اپنی دونوں

چھت پر ہوا شدت کی تیز ہفتی اور میری جیکٹ کے کالر میرے گالوں پر پڑے ہوئے اذیت دے رہے تھے۔ ”کیا آپ کبھی اس شہر کو آباد نہیں کریں گے؟“ ”کیوں نہیں۔“ بوڑھے لب بے اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کی مسکراہٹ ملنے لگی۔ ”اسرائیلیوں کا خیال ہے کہ اُنہوں نے ہمارے قنیتھرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ ہم پھر سے اسے تعمیر کریں گے لیکن صرف اس وقت جب ہم گولان کی پہاڑیوں پر نہ اسرائیل کی جنگی آنکھ ہمیشہ کے لئے پھوڑ دیں گے۔“

قنیتھرہ بربریت کا ایک وسیع ادین ایریا ڈال تھا جس میں گھومتے ہوئے انسان خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی بربادی کا ذمہ دار محسوس کرتا ہے۔ ہم ہسپتال کی چھت سے نیچے اترے تو سیاہ کاروں کا ایک قافلہ قنیتھرہ میں داخل اور کلیسا کے ڈھانچے کے قریب رُک گیا۔ قبرص کا صدر آرج لیشپ جو اُن دنوں شام کی سرکاری ددرے پر آیا ہوا تھا، ایک کار میں سے اپنا سیاہ چوغہ سنبھالتا ہوا نکلا۔ ہمراہ اس کی پارٹی کے ارکان تھے۔ عجیب سیاہ خواہوں والی ایک ڈرائیو سی تصویر بنی۔ تباہ حال شہر کے کھنڈر اور ان میں گھومتے ہوئے درجنوں سیاہ پوش پادری اور تیز ہوا قنیتھرہ سے نکلنے ہوئے پھر وہی بوڑھو دکھائی دیا۔ ”ترحب بکم...“ دلیک ٹو قنیتھرہ۔

گولان!

قلعہ الوند کے گرد لپٹی سڑک پر ایک اسرائیلی ٹرک آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے انجن کی گھٹی گھٹی آواز تیز ہوا کے دوش پر کبھی کبھار کانوں میں اتر آتی۔ دامن میں انگوٹھ کے باغوں کے سبز پتوں خود کار فوادوں سے سیراب ہو رہے تھے۔

ہم سرحد کی جانب چلنے لگے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چیک پوسٹ تھی جس پر اقوام متحدہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شامی سپاہی نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کے کانڈاچیک کے اور سیلوٹ مار کر پھاٹک کھول دیا۔ تقریباً بیس قدم پر ایک اور پھاٹک تھا۔ پہلے

ہتھیلیوں پر رکھ کر قدرے شرمندگی سے دعوت دی۔ ”پلیز آپ ضرور لیجئے۔“  
میں نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا مگر وہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔  
لئے نہیں کہ وہ سخت تھا بلکہ اُسے پیش کرنے والے کی محبت سے میرا گلہ نہ گیا تھا۔  
”آپ گولان کی پہاڑیوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں؟“ اُس نے دُور میں گئے  
سے اُتار کر مجھے تھما دی۔ میں اُسے آنکھوں کے قریب لایا تو وہ کہنے لگا ”نہیں اُس پر  
پر جا کر دیکھئے۔“ وہ ٹیلا چیک پوسٹ کے دائیں ہاتھ پر اسرائیلی پرچم سے بھی قدرے آگے تھا۔  
”آپ کو یقین ہے کہ وہ ٹیلا...“ منہ نے گھبرا کر دریافت کیا۔

شامی نے اپنی کلاش نیکو کی بلبی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس آپ بارڈر کی سیاہ لکیر  
قریب نہ جاتیے گا، وہاں مائنز بھی ہوتی ہیں۔“

میں دُور میں ہاتھوں میں تھامے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران ایک  
آئل ٹینکر پر سواری کا اتفاق ہوا تھا اور میرے ہم سفر علی نے اُس کی چھت پر لیٹ کر سڑک  
سنگانے کے لئے ناچس جلا لی تھی۔ اس شعلے کو دیکھ کر جس طور میرے اندر کا خوف بھڑکا  
تھا، کچھ اُسی قسم کی کیفیت سے میں یہاں دوچار ہوا۔ گولان کا علاقہ بھی ایک وسیع آئل ٹینکر  
تھا۔ ۶۷ء میں شامی فوجیوں نے تل ابوند کو بچانے کی خاطر اپنے آپ کو زنجیروں میں  
باندھ لیا تھا تاکہ جنگ کے پاگل پن کے دوران کہیں جسم فرار کا راستہ نہ تلاش کر لے کر  
لوہے سے بندھے ہوئے اُن کے ہزاروں مردہ جسم بد قسمتی کا راستہ نہ رد کر سکے۔

دُور بین میں تل ابوند اپراگی ہوتی تنصیبات کا گھنا جنگل قریب آگیا۔

میں نے ایک اسرائیلی جیب کو فوکس میں لیا، وہ دُور بین کے شیشوں میں کسی ناقص  
فلم کے منظر کی طرح ہلنے لگی۔ پہلے اُس کی باڈی پر حضرت داؤد کا نیلا ستارہ نظر آیا۔  
ڈرائیور جو منہ میں سکرٹ دبائے کاہلی سے بارڈر کے ساتھ ساتھ جیب کو چلا رہا تھا۔  
بچھلے حصے میں ایک مشین گن نصب تھی جس کا رخ قابل فہم طور پر میری طرف تھا۔  
کے ساتھ کھڑا فوجی جب میری زد میں آیا تو اسی لمحے مسکرا دیا۔ اُس کی آنکھوں پر

ایک دُور بین جمی تھی اور وہ مجھے داج کر رہا تھا۔... میں نے اپنی دُور بین نیچے کر لی۔  
تل ابوند پر اُگے ایریل اور رادار ایک دم دُور چلے گئے۔ جیب ایک کھلونے کی طرح  
دکھائی دینے لگی۔ ایک لاپرواہا گائے بارڈر کی سیاہ لکیر کے بہت قریب گھاس چر رہی  
تھی۔... اور ہر طرف تیز ہوا تھی۔ گولان کے محاذ پر مکمل خاموشی تھی۔

میں ٹیلے سے نیچے اُترا تو شامی فوجی سب مشین گن کی بلبی پر انگلی لیپیٹے انتظار کر رہا  
تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنی دُک سنہالے دوسرے ہاتھ سے پشکن کی کہانیوں کی ورق  
گردانی میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ کھڑا  
ہوا۔ ”شاہراہ دمشق شام ڈھلے بند کر دی جاتی ہے، ہمیں واپس لوٹنا چاہیے۔“

ہم اپنے میزبان کا شکریہ تو خیر کیا ادا کرتے، خوب زور زور سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔  
مسکراہٹ بھی ہمارے بس میں نہ تھی اور پھر جانے کے لئے واپس مڑے۔ چند قدم چلنے  
کے بعد میں رُک گیا۔ ایک سوال رہ گیا تھا۔ میں واپس شامی فوجی کے پاس گیا جو ابھی  
تک اپنی کلاش نیکو کی بلبی پر انگلی جھائے کھڑا تھا اور سوال پوچھا۔ ”آپ گولان کب  
واپس لے رہے ہیں؟“

وہ شاید اسی سوال کے انتظار میں تھا۔ تل ابوند کو ایک نظر دیکھا اور دیوتاؤں  
ایسے گہرے یقین سے بولا۔ ”شاید آج ہی۔... نہیں تو کل ضرور انشا اللہ۔“

اے آل اسرائیل ایسا اُترا بھی کیا،  
غزنی کی سونیاں اگر آج ڈک گئی ہیں  
تو لڑنے پر سے ہل پڑیں گی۔  
زین کے چھین جانے کا غم نہیں ہے۔  
بڑے پرچمی تو جھڑپا کیا کرتے ہیں۔  
اور اس طویل تشنگی کا بھی خوف نہیں۔  
پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہ میں ہوتا ہے۔  
تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ لیں  
مگر جڑیں باقی رہ گئیں۔  
نزار قبانی۔ ترجمہ محمد کاظم

## بیروت - خانہ جنگی

آرمڈ کار ایک کچھوے کی طرح دیران چوک کے عین درمیان میں آرام کر رہی تھی۔  
 دھاتی بدن میں قریبی کھبے کی روشنی بجھ رہی تھی۔ تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک سیلی فون  
 بُوٹھ کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک مسخ فوجی فون پر جھکا بیٹھی ہوتی آواز میں کسی سے بحث  
 کر رہا تھا... میں فٹ پاتھ سے اُتر کر چوک عبور کرنے لگا... فوجی نے گفتگو ختم کی،  
 بُوٹھ سے باہر آنے سے پیشتر ارد گرد کی بلند اور تاریک عمارتوں پر ایک نظر ڈالی اور آرمڈ کار  
 کی طرف چلنے لگا... بُوٹھ... ایک فائر کی آواز آئی، فوجی ٹھٹکا، میں بھی رُک گیا، ایک  
 ارد گرد ہوا، میری آنکھیں پھیل گئیں اور پھر اُسی لمحے پورا چوک ایک ایسی ٹھٹی میں بدل جس  
 میں مٹی کے ہزاروں دانے چٹخ رہے تھے۔ فوجی فون بُوٹھ کی طرف لپکا۔ میں ایک  
 شاپنگ سنٹر کی جانب بھاگا... آرمڈ کار کے کچھوے کی گردن اُٹھی جو ایک مشین گن کی  
 نالی تھی اور نو اچی عمارتوں پر گولیاں تھوکنے لگی۔

وقت: رات کے نو بجے

مقام: الیونیر جنرل فواد شہاب کے قریب ایک چوک

شہر: بیروت

ملک: لبنان

اور میں: مشین گن کے گرم لورہ سے بچنے کے لئے شاپنگ سنٹر کی طرف بھاگا ہوا۔  
 آٹھ بج دس بجے ایک چرب زبان ڈرائیور کی پرانی مگر شرلاٹے بھرتی ہوئی شریٹ

ٹیکسی دشت کے امن سے نکلی۔

راستے میں میلسون آیا، یہاں بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر شامیوں نے زینبر کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی تھی۔ سامنے دہرا لبد تھا جس کی چوٹیوں پر بڑبڑاں سرحد پر جو ایک بلند پہاڑی پر واقع تھی، لبنان سے نکلنے والوں کا ایک عظیم قحار ادھر کو جانے والے کم کم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کم کم میں ایک کم میں بھی تھا ڈرائیور مسافروں کے پاسپورٹ جمع کر کے کسٹم ہاؤس کے اندر چلا گیا اور میں ٹرک سے ہٹ کر ایک خوشبودار پتوں والے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر سگریٹ پی رہا۔ نشیب میں آل مصنع نامی لبنانی گاؤں نظر آ رہا تھا جس کے سرخ چھتوں والے گھر جنوبی اطالیہ کے کسی ساحلی قصبے کے بھی ہو سکتے تھے۔

لبنان، یعنی دودھ کی طرح سفید، ۴۳۴ سے پیشتر ملک نہ تھا بلکہ بلاد شام ایک برف پوش پہاڑ کا نام تھا۔ رقبہ صرف چار ہزار مربع میل کے قریب مگر خود کا قدرہ کئی آفتابوں سے زیادہ چمکتا ہے۔ جہاں عرب صحرا ہے، مصر نیل ہے، عراق فرات ہے وہاں لبنان پہاڑ ہے اور اس لئے لبنانی اپنے آپ کو اہل الجبل کا نام دیتے ہیں ایک عرصہ فرانس کے زیر نگیں رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سفید نام رخصت اور ۴۳۴ میں لبنان ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا۔

میں نے لبنان کو دو شخصیتوں کے حوالے سے پہچانا... بچپن میں خلیل جبران نیم معجزانہ تحریروں میں، صوفی نوجوان، خوبصورت مگر غریب و مقان دوشیزا تیں اور جابر زمیندار ایک پراسرار جنگلوں اور برافانی چوٹیوں والی سرزمین میں ظاہر ہوتے اور پھر مسجد قرطبہ میں تصویریں اتارتی ناثر لاسعد نے مجھے اس خطے کے جہانی خطے سے آگاہی دی۔ خلیل جبران کا ادب اور ناثر لاسعد کا فن، میرے لئے لبنان تھے۔ اور اب پہاڑی سے نیچے دیکھتے ہوئے المصنع کا گاؤں اور چارہ چوہیرے کی لینڈ مائک مجھے انتہائی مایوس کر رہی تھی۔ تیز و موہوب، مجبستی ہوئی خشک پہاڑیاں اور...

بائنے والا صبح۔  
مرد عموں کرتے ہی ڈرائیور نے شور لٹ کا انجن بند کر دیا اور ہم خاموشی سے نشیب میں اترنے لگے۔ شتورہ کا قصبہ گزرا۔ مکس سے پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ صوفی نام کا ایک پرنٹنگ گاؤں آیا۔ وادی میں انگوروں کے باغ تھے اور سرسبز ڈھلوانوں پر سیاہ چیرے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ گھروں اور راستوں میں بادل اُتر رہے تھے چیر کی غذائی باس میں چند گھرے سانس اور شام کے صحرائوں کی گرمی بدن سے رخصت ہونے لگی۔ یہاں سے ایک راستہ ڈوگ راول یعنی نمرالقلب کی جانب جاتا ہے۔ روایت کے مطابق اس دریا کے کنارے عہد قدیم سے کتے کا ایک مجسمہ نصب تھا جو دشمن کی آمد پر بھونک بھونک کر اہل لبنان کو خبردار کر دیا کرتا تھا۔ ۶۳۵ء میں جب امیر معاویہ کے بھائی یزید کی سرکردگی میں عرب.... یہاں تک پہنچے تو انہوں نے اس نام مقبول کتے کو اٹھا کر دریا میں ڈبو دیا۔ ان دنوں بیروت کے عجائب گھر میں رکھا ہے اور بالکل نہیں بھونکتا۔

صوفی کے اسودہ موسم زیادہ دیر سا تھا نہ دے سکے ٹیکسی ایک خاص بلندی پر پہنچ کر نیچے اُتری تو لبنان میں سکون کے لمحے ختم ہوئے، نیچے ایک پُر شور شہر کے آثار رہ گئے دکھائی دے رہے تھے۔ شاہراہیں جیسے کاروں اور میکائنی ٹریفک سے بھری تھیں۔ ایک بوڑھے سانپ کی طرح رک رک کر حرکت کرتی ہوئیں، جدید نمائندوں کے ہزاروں مستطیل ڈبے اور سمندر... ٹیکسی صوبہ سکوتر میں جا کر ٹوک گئی۔ اور اب جب ہم خود ٹریفک کے پُر شور بوڑھے سانپ کے جسم کا ایک حصہ بن کر رہ گئے تو چند جلی ہوئی عمارتوں کے ڈھانچے نظر آئے۔ ایک چوک میں دو آرمڈ فیل گھری تھیں اور ان میں سے جھانکتے ہوئے فوجی فٹ پاتھ پر چلتی لڑکیوں پر فائر کر رہے تھے، اُن کی طرف ہوائی بوسے اُچھال رہے تھے۔ ایک گلی کے آگے ریت کی بوڑیوں کی دیوار تھی۔ بیری کیڈ پر چند فلسطینی کھڑے تھے جو شناختی کاغذات

چیک کر کے لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے رہے تھے... ٹیکسی میں سوار ہو کر جا کر رک گئی۔ ترک ٹوپی اور سوٹ زیب تن کئے لبنان کے پہلے وزیر اعظم ریاض مرعشہ کا مجسمہ چوک میں ایستادہ تھا۔

شارع الامیر پر واقع خندق معرض الکبیر کا وکٹورین سٹائل ہوٹل کم از کم میرے ایسے فقرے سیاح کے لئے بے حد پاش اور ہنگامہ دکھائی دے رہا تھا۔ اندر گیا تو ہنگامہ دکھائی دیا البتہ جو کرایہ بتایا گیا وہ بیروت کی مناسبت سے انتہائی مناسب نہ کہ وہ ڈبل بیڈ کا تھا اور صبح سویرے ترکی جانب کھٹنے والی فرانسیسی کھڑکی چھت سے فیر ہو کر بستر کی پانچویں تک چلی آئی تھی۔ بالکنی پر قدرے پرخطر انداز میں لٹکنے سے دائیں پر تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بیروت کی بندرگاہ کا ایک حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے نیچے ایک بھرا ہوا پرنٹ شدہ بازار ہوتا تھا۔

سنگ مرمر کے ایک وسیع غسل خانے میں شاور کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کئے اور تازگی کی باس میں ہنگامہ کا ڈنٹر پر چابی جمع کروانے چلا گیا۔ جنگلی گھاس ایسے گنے بالوں اور مضبوط گردن والے میجر نے چابی بورڈ پر لٹکائی اور بڑے کاروباری انداز میں بولا "تمہارے پاس چیلانے کے لئے کچھ ہے نا؟"

ایک مسکین سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی یعنی میں سمجھانیں۔

"پستول یا سب مشین گن وغیرہ..."

میری مسکراہٹ غائب ہو گئی مگر منہ کھل گیا۔

"رات فوجی سے پہلے واپس آ جانا اور سونے سے پیشتر دروازہ قفل کرنا..." اسی اپریل کی بات ہے، بد بخت فلائجیوں نے ہوٹل میں گھس کر چند ممالی ہلاک کر ڈالا تھا..."

"میرا منہ بند ہوا اور دہشت زدہ آنکھیں کھل گئیں۔ "اسی ہوٹل میں؟" "ہاں۔" وہ آرام سے بولا۔ "ہم فلسطینی ہیں اور فلائجیوں کو شک رہتا ہے کہ..."

تتبع آزادی - فلسطین کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں... "اور آتے جاتے رہتے ہیں؟"

"تم واحد غیر فلسطینی ہو..." وہ دبے ہونٹوں مسکرایا۔

میں نے فی الفور طے کر لیا کہ اگلی صبح اس مورچے کو چھوڑ کر کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا... آپ کا ہوٹل قدرے پرخطر سی مگر بے حد آرام دہ اور مناسب کرائے کا ہے۔

"مذہب کے لئے درنہ ہمارا کرایہ اس سے دو گنا ہے... تم براہر ہو الیسی حسین۔

میں نے سوچا انجانے میں کسی فلائجی ہوٹل میں چلے گئے تو... "فون کی گھنٹی بلند ہوئی تو اس نے فقرہ ادا چھوڑ کر چونکا اٹھا لیا۔

بیروت ایسے بین الاقوامی چپکے ہوئے شہر میں آوارہ گردی کا شوق فوجی کی مار دھار سے بھرپور گفتگو سننے کے بعد پھوار میں بھگی ہوئی پتنگ کی طرح ڈھیلا پڑ گیا۔ منہ ڈیرنے لگاؤں جاتے ہوئے درست کہا تھا، بیروت میں حالات خراب ہیں۔

فون سے فارغ ہو کر اس نے میرے چہرے پر برستی بے چارگی سے متاثر ہو کر نہایت فین بخور اختیار کر لیا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں الیسی، اگر وہ آئے تو اتنے ہی واپس نہیں جائیں گے... بہر حال اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"یہی گھومنے کا ارادہ تھا، آپ کہتے ہیں تو نہیں جاتا۔"

"نہیں، حالات اتنے بھی خراب نہیں... ہوٹل کے سامنے ہی سروس گیراج ہے

جہاں سے تین الحمر کے لئے ٹیکسی مل جائے گی، روشے یعنی ساحل بھی قریب ہی ہے

... ٹیکسی فوجی سے پہلے ہر صورت واپس پہنچ جانا..."

میں ہوٹل سے نکلا تو شارع الامیر بائیں کی گھاٹی اور پرنٹ شدہ چہروں نے

فلسطینی فوجی کی تمام گفتگو میرے ذہن سے زائل کر دی۔

میں نے فوجی گیراج میں پانچ چھ ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ میں پہلی ٹیکسی کا

مذہب کو اندر بیٹھ گیا۔ "الحمر"

ڈرائیور نے سر کے اشارے سے اگلی ٹیکسی میں بیٹھنے کو کہا۔

اگلی ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کو تھا کہ اُس کے ڈرائیور نے عربی میں تندر درشت الفاظ استعمال کئے اور پھر مجھے غیر ملکی پہچان کرنرم لہجے میں کہنے لگا: سب سے اگلی ٹیکسی پہلے چلے گی، اُس میں بیٹھو۔“

سب سے اگلی ٹیکسی میں چار مسافر بیٹھ چکے تھے۔ پانچویں کی آمد کے ساتھ ہر ایک سے تیس قرش وصول کئے گئے اور مرسیڈس ٹیکسی گیراج کی نیم ٹانگیوں پر نکلی اور بیروت کے پُرسورہ سمندر میں ایک شارک کی طرح تیرنے لگی۔ شارک اس کے کہ ڈرائیور کی میباک ڈرائیونگ کی وجہ سے باقی ٹریفک ہم سے دُور دُور رہے گی۔ عافیت جان رہی تھی۔ اُس نے ڈیش بورڈ پر سے ایک کیسٹ اٹھا کر پلیئر میں ڈال دی اور آواز بلند کر دی۔ سارنگیوں کی ایک وجہ اور اٹھان سے آغاز ہوا اور پھر ڈپر پرتھاپ پڑی۔ تھاپ کی اس دھمک پر میرے برابر میں نیم خوابیدہ ایک عربی بزرگ کا سر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔ آنکھیں مڑوہ پھیلی کی طرح کھل گئیں اور ڈرائیور کے کندھے پر شاباش کی تھپکی دے کر پوچھا۔ ”اُم کلثوم، بالیک فیسیٹول۔“

اور پھر یہ صاحب سر جھکا کر ڈھولکی کی تھاپوں کا ساتھ دینے لگے۔ قاعدہ کے بعد جب اُم کلثوم کی گہری آواز نمودار ہوئی تو وہ بالکل ہی ساکت ہو گئے۔ ایک جب تان اٹھتی ہی چلی گئی تو میں نے ذرا سوسٹل ہونے کی کوشش کی۔ ”اپنے عمارت بناری نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُم کلثوم کے بدن میں پھیپھڑوں کی بجائے تپ سے بھرے ہوئے مشکیزے لگا دیئے ہیں۔“ اُن صاحب نے سر اٹھا کر مجھے دُور سے دیکھا اور پھر منجمد ہو گئے۔

آخری شاہِ انحر اسٹریٹ تھا۔ ٹیکسی میں اب صرف دو مسافر تھے۔ شام موسیقی میں فنا شدہ وہ لبنانی حضرت۔

”حمرا“ ڈرائیور اس طرح دھاڑا کہ اب اُتر دو گے بھی یا نہیں۔

وہ حضرت بھی باقاعدہ خفا ہو گئے۔ ”اُم کلثوم گارہی ہوا اور میں چھوڑ کر چلا جاؤں... کفر، کفر...“

ڈرائیور یکدم شرمندہ ہو کر سٹ سا گیا اور عاجزی سے کہنے لگا۔ ”معاف کیجئے گا خیال ہی نہیں رہا... لیکن مجھے دراصل اب شہر واپس جانا ہے...“

”تو مجھے بھی واپس لے چلو...“ اُن صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

”جی بہت بہتر۔“ ڈرائیور نے سر جھکا لیا۔

میں عربوں کے خون میں شامل اُم کلثوم کے سحر کا قاتل ہوا اور مسکراتا ہوا ٹیکسی سے اُتر گیا۔

”احمر“ جسے پیار سے ”حمرا“ کہا جاتا ہے، بیروت کی شانزہ لینے سے ہے۔ ایک مکمل یورپی سٹریٹ جہاں قومہ خانوں کے قالین فٹ پاتھ تک چلے آتے ہیں۔ پیرس میں ڈیزائن شدہ لمبوسات اُسی قیمت پر دستیاب ہوتے ہیں۔ مرسیڈس کو بطور گدھا گاڑی استعمال کیا جاتا ہے اور تازہ ترین ماڈلز کی سپورٹس کاروں کے ٹائروں کی چھینیں ہر لمحہ دل دلاتی ہیں کہ کس حادثہ ہوا کہ ہوا گرہتا نہیں، بس کان بریکوں کی چنگھاڑ سننے ہوئے منتظر رہتے ہیں۔ فٹ پاتھی قومہ خانوں میں براجمان پبلک انگوڑوں کی قدیم شراب سپ کرتے ہوئے اکاؤنٹانٹر کی آواز یا کبھی کبھار کے دھماکے کو بظاہر نظر انداز کرتے دکھائی دیتی ہے۔ اُس وقت بیروتی خواتین کا تازہ ترین فیشن کریمز ”سی تھرو بلاؤز“ یا بالائی حجم کو ڈھکنے کے لئے جو بھی لباس استعمال کیا جاتا ہے، اُن دنوں ڈھکنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ یہ لباس اتنا باریک تھا کہ ڈھاکہ کی ٹٹل بنانے والے کارمگر اگر دیکھ لیتے تو فی الفور خودشی کر لیتے کہ وہ تو انگوٹھی میں سے تھان گزارتے تھے اور یہاں دود و دھقان چار چادر گرہ میں بول بندھے چلے آتے تھے کہ کپڑے کا رنگ کچھ بھی ہو گلابی ہی نظر آتا تھا۔ مجھ ایسا ناٹری فٹ پاتھ پر چلتے چلتے سامنے سے آتی نیک بی بی کو دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ ”پلے بوائے“ دسلے بوز میانی کیلنڈر صرف سکرت پہنے چلا آ رہا ہے۔ جو مال اچھا ہے اُسے حاجی طور پر



الگ باندھ کے رکھا تو گیا ہے مگر اس طرح کہ مال کی کوالٹی صاف دکھائی دے۔  
پھاڑوں میں ملکی بادش کے دھوئیں کے پیچھے مناظر قدرت اگرچہ قدرے دھندلے  
تو نظر آتے تھے مگر وہ پیمانہ نظروں کو بلند یوں کا اندازہ بخوبی ہو جاتا...

میں غریب ملک کا باسی امداد کے ان مظاہر سے مرعوب ہوتا فٹ پاتھ پر  
چل رہا تھا کہ تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک اسی نوعیت کی بی بی آتی ہوئی دکھائی  
دی۔ اُس کا چہرہ بھی خوبصورت تھا۔ اُسی لمحے ایک سپر سٹور میں سے ایک لبنانی شاپنگ  
شاپنگ کے ہنڈل اٹھاتے باہر نکلے۔ اُن کی پشت میری طرف تھی۔ اُنہوں نے نظروں  
کو آتے دیکھا، فوراً اپنے ہنڈل نظریں ہٹائے بغیر نیچے رکھے اور ایک ہاتھ بلند کر دیا۔  
اس دوران میں اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا نہیں، وہ جیانی  
ہی رہا اور ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بربان عربی کوئی قصیدہ پڑھنے لگے۔ وہ باجیا  
خاتون ہمارے قریب سے گزریں تو صاحب اپنے پاؤں پر آہستہ آہستہ کھومتے اُس کا  
عقبی نظارہ کرنے لگے۔ مجھے بھی اُن کے ساتھ کھڑک کر اپنا زاویہ نظر درست کرنا پڑا۔  
وہ ایک رومانی سرشاری کے عالم میں بے تکان بولتے چلے گئے۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھ رہا۔“ میں نے مسکرا کر انگریزی میں کہا۔  
اُنہوں نے میری طرف دیکھا نہیں، ہجوم میں گم ہوتی خاتون کی طرف اشارہ کر کے  
بولے۔ ”کیا تم یہ بھی نہیں سمجھتے؟“ اور اپنے ہنڈل اٹھا کر اُسی کیفیت میں مت چلے گئے۔  
الحمر میں نصف سے زیادہ عمارتیں بین الاقوامی بینکوں کی ملکیت ہیں۔ ایک  
اندازے کے مطابق ان کے مالی ذخائر دس کھرب ڈالر سے تجاوز کر چکے تھے مگر خانہ بدوش  
کی حدت سے ان میں تیزی سے کمی آنے لگی۔ لبنانی بینکر یوسف بیداس نے درست  
تھا کہ زر دنیا کی بزدل ترین چیز ہے۔ گڑبڑ کے پیش نظر سیاحوں کی آمد بھی تقریباً  
ہو چکی تھی۔ جو لوگ دنیا میں کہیں بھی آتے جاتے، بیروت میں قیام کر کے کیسینو  
میں جو اکیلے اکیلے کھیلنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب اپنی ٹکٹوں پر بیروت کا شاپ

دیکھ کر سرسیمہ ہو جاتے تھے۔ اخبار میں کارٹون چھپا کہ ایران سرحد پر ایک لبنانی  
ہاتھ اٹھاتے دُعا مانگ رہا ہے۔ ”یا اللہ! اگر کچھ نہ دے تو رست دے۔“ بہر حال  
خانہ بدوش کے آثار کے باوجود اگر بیروت کی رونقیں اتنی شدید اور سی تھردھیں تو جانے  
میں دامان کے دنوں میں کیا سلسلے ہوتے ہوں گے۔

میں نے اپنے قریبی دوست کو رے قہرہ خانے کے قریب ہوا تو باہر کھڑا ڈیرہ جاتی روک کر سسکا دیا۔  
میں نے اپنی کل پوچھی مگر وہ دس گز کے فاصلے پر کھڑے کھڑے گم بھی یعنی چار ڈالر۔ مینو پر  
سستا ترین مشروب ساڑھے تین ڈالر کا تھا جو میں نے آرڈر کیا اور فٹ پاتھ پر کھلی  
کری میں دراز ہو گیا۔ دیر مشروب لایا تو ساتھ میں ایک موٹا تازہ چکن سینڈویچ بھی تھا۔  
”میری طرف سے۔“ اُس نے بڑی آزادی سے میرا کندھا تھپکا جیسے کہہ رہا ہو کہ بچہ  
عیش کرو اور دیسے بھی یہ کہاں فروخت ہوتا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ”حمرا“ کی  
تعریف کی۔

”حمرا نہیں حمرا کہو۔“ وہ بولا

”حمرا...“

”نہیں جس طرح تم کہہ رہے ہو اُس حمرا کا مطلب ہوتا ہے سُرخ بالوں والی  
طوائف۔ حمرا نہیں حمرا...“ وہ کچھ کچھ حلق سے براؤں کر رہا تھا۔

میں نے دوچار مرتبہ اُسی طور کہنے کی کوشش کی مگر وہ بدستور سر ملاتا رہا۔  
”چلتے سُرخ بالوں والی طوائف ہی سہی، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں نے تنگ  
اُکر کہا اور سینڈویچ کی طرف رجوع کیا۔

سوائے اُن لمحوں کے جب فٹ پاتھ پر سے گزرتی کوئی سی تھرد خاتون میری  
توجہ کے پُرسکون پانیوں میں دو مرغابیاں چھوڑ دیتی، میں آئندہ سفر کی منصوبہ بندی کرتا  
رہا۔ بیروت میں حالات فی الحال اتنے تو خراب نہیں مگر طویل قیام شاید زندگی کے لئے  
ضرورت ہو، اس لئے پانچ روز۔ پھر کسی ایسے بحری جہاز کی تلاش جو مجھے عربیہ کے

کسی کو نے میں بیٹھنے دے اور سکندریہ پہنچا دے۔ اہرام مصر اور ابوسہیل کی رفائز میں چار مہینے... پھر وہاں سے یونان... جزیرے اور دیوالا... ایک مہینے میں سکون روانی میں ایک مہینے انداز کی ٹمک ٹمک کی پرخطر آواز سنائی دی۔ لوگوں کا کان کھڑے ہو گئے۔ ایک دکان کا شٹر زور سے بند ہوا، کاروں کی رفتار تیز ہو گئی... دراصل یہ ایک جھٹے فروخت کرنے والا تھا جس نے گاؤں کو متوجہ کرنے کے لیے اپنا چٹا مختلف انداز میں بجا دیا تھا۔ لوگوں کی سرسبکی دیکھ کر اُس نے شرمندگی سے ایک مرتبہ پھر یہی عمل دہرایا جیسے بچانا چاہتا ہو کہ بھی مشین گن نہیں چلی، میرا پورا پھر بھی پبلک کی تسلی نہ ہوتی اور جھٹے والے سے گزارش کی گئی کہ آئندہ بے دھانی میں اس انداز سے چٹا نہ بجانا، تیرے بچے جیتیں۔ فٹ پاٹھ کی رونق ختم ہو گئی چند دکانیں بند ہو گئیں۔ کیا تیرا اگلی ٹمک مشین گن کی ہی ہو۔ میں بھی خواہ مخواہ خوفزدہ ہو گیا ان بل ادا کر کے سمندر کی جانب اُترنے لگا۔ چھانچ چکے تھے۔

روشنے، سفید چٹانوں میں روشن ایک ایسا ساحل جو سمندر سے بلند ہے اور سینکڑوں طویل قامت ہوٹل دیوہیکل مجسموں کی طرح اُس پر ٹھکے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل بیروت بال بچوں سمیت سڑک ایونیو ڈیگال پر سیر کر رہے تھے۔ جھٹے فروخت کرنے والے یہاں بھی موجود تھے مگر اپنے چپٹوں کو شریفانہ انداز میں بجاتے ہوئے اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر ”دُرُع مشوی“ کی صدا دیتے ہوئے سفید ٹوپوں والے آبنوسی سوڈانی ”فستی فستی“ پکارتے رہے تھے جسے میں نے بھی خریدا، مونگ پھلی حتی۔ روشنے کے درمیان میں پہنچ کر وہ مشہور زمانہ سفید چٹانیں نظر آئیں جو نیلے سمندر میں دیوارِ اکبروں کی طرح ٹھکی ہوئی ہیں۔ ایک موٹر بوٹ اُن کے گرد چکر لگاتی ہوئی کسی نامعلوم راستے سے اندر گئی اور دوسری جانب سے جھاگ اڑاتی ہوئی نکل گئی۔ بیروت میں خودکشی کرنے والوں کا یہ محبوب چٹان ہے۔ ایک اردنی نوجوان نے جب ان پگن راکس سے کود کر فضا بونے

کی کوشش کی تو سمندر میں گرنے کے بعد مڑے سے تیرتا ہوا ساحل پر آ گیا۔ پوچھا گیا کہ ڈوبے کیوں نہیں؟ کہنے لگا: ”میں اتنا اچھا تیراک ہوں کہ لاشعوری طور پر ہی تیرتا رہا نہ کون بدبخت جینا چاہتا ہے۔“ سوال ہوا کہ آخر آپ نے خودکشی کے لئے پگن راکس کو ہی کیوں چنا؟ اُس نے جواب دیا کہ اتنی بلندی سے سمندر ایک ہرے جنگل کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس سے زیادہ خوبصورت منظر دیکھنے کو اور کہیں نہیں ملتا۔

روشنے کے فٹ پاٹھ پر چلتے ہوئے جب میں ساحلی سڑک کے اختتام پر پہنچا تو بتدریج گرمی ہوتی ہوئی شام میں دو آرمڈ کاریں سڑک کے درمیان میں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے سوراخوں میں سے مشین گنوں کی ٹوختیاں جھانک رہی تھیں... اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ روشنے کی رونق ایک سراب ہے جو صرف میری آنکھیں دکھتی ہیں ورنہ اس پر چل قدمی کرتے اہل بیروت اپنے اندر آرمڈ کاروں کی سیاہ شبیہیں لئے پھرتے ہیں... انہیں معلوم ہے کہ کھیل شروع ہونے کو ہے۔ وہ اپنے اپنے پتے سنبھالے انتظار کر رہے ہیں، کس کے ہاتھ میں بادشاہ ہے، کس کے ہاتھ میں جوکر ہے، کوئی نہیں جانتا۔ کھیل شروع ہو گا تو تیر چلے گا۔ باندی جان کی ہوگی، سب انتظار میں ہیں۔

میں داپس آ رہا تھا تو پگن راکس کے قریب پھولوں سے لدی کاروں کا ایک قافلہ ہارن بجاتا گزر گیا۔ کھلی کاروں میں ایک بارات تھی۔ اگلی کار میں دو لہا اور دو لہن شادی کے لباس میں ایک دوسرے کے گالوں پر لب سے دیتے ہوئے، راہ گیروں کو ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ بقعہ کاروں میں دوست اور اہل خاندان خوشی سے جنگلی ہو رہے تھے اور نشستوں پر اچھل رہے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی قریب سے گزرتی کاروں نے بھی ہارن بجانے شروع کر دیئے۔ اور روشنے پر عارضی مسرت کا ایک شور برپا ہو گیا۔

اس قافلے نے ساحلی سڑک کا ایک چکر لگایا اور پھر چھٹی برکیوں سے درمیان میں روک لکھاس کے قطعے میں کھڑا ہو گیا۔ باراتی کو دتے ہوئے کاروں سے باہر نکل آئے۔

جاہلگاہ اور وہاں سے ایونیر جنرل فواد شہاب کی جانب... صوبہ سکوتر اس کے  
انہیں تھا۔

آرمڈ کار ایک کچھوے کی طرح دیران چوک میں... دھاتی بدن پر قریبی کھبے  
کی روشنی... ڈز... ایک فائر... ایک اور ڈز... چوک میں مکی کے ہزاروں  
دانے چم رہے تھے... مشین گن نواحی عمارتوں پر گولیاں تھوک رہی تھی...  
ادیں اپنی پوری قوت سے شاپنگ سنٹر کی طرف بھاگتا ہوا... چوک کی پتھریلی سطح پر  
شرارے پھوٹ رہے تھے اور عمارتوں کے شیشے چور ہو کر فٹ پاتھ پر برس رہے تھے۔  
شاپنگ سنٹر کے برآمدے میں گھستے ہی میں نے اپنے آپ کو ایک شوکیں کے پیچھے  
چھپانے کی کوشش کی... ہوا میں شاید آکسیجن ختم ہو چکی تھی... پسینے سے بھیگا چہرہ  
اور منہ کھلا ہوا، بدن میں ایک بے اختیار کپکپاہٹ... ایسے لمحوں میں انسان سوتلا  
ہے کہ انہیں یہاں کیا کر رہا ہوں... میری موجودگی جو فوٹیدگی میں بھی بدل سکتی  
ہے، کا مقصد کیا ہے... گھر کے بستر کی سفید پیرامن چادر یاد آتی ہے... میں کنوئیں  
کا میڈل تھا، کو لو کا میل تھا، ایک ہی مقام پر روٹین کے دائروں میں گھومتا، کتنی  
محفوظ اور خوبصورت زندگی تھی... اور اب اگر اس پناہ گاہ پر شوکیں پراگر ایک  
گوں ہی آگے تو اس کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر گرے گا اور مجھے ننکا کر دے گا... لیکن  
ایسے لمحوں میں انسان سوچتا نہیں، صرف اپنے آپ کو کوستا ہے، لعن طعن کرتا ہے کہ  
تو یہاں کیا لینے آئے تھے، گھر کی عافیت سے کیوں نکلے؟

قریباً دو منٹ بعد چوک کی سطح جہاں شرارے پھوٹتے تھے، حسب سابق تاریک  
ہوئی۔ باہر سے آنے والا فائر ختم ہو چکا تھا۔ صرف آرمڈ کار کی مشین گن دھنوں سے  
بے ادب برسات چلا دیتی... میں شوکیں کے پیچھے دُبا دیکھتا رہا... بالآخر مشین گن  
جینز اور شوکیں ہوئی نالی نیچے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد فون بوتھ میں

ایک نوجوان نے ڈھولکی گھٹنے پر جہاں اور تھاپ دینے لگا۔ ایک قبر سیدو تم کر  
نے بیلی ڈانس شروع کر دیا۔ اگرچہ اُن کا تھل تھل کرنا جسم اس پتھر تیلے رقص کے  
قدرے نامناسب تھا مگر موصوف کو موسیقی کی دھمک کا آشنا شعور تھا کہ اُن کے گرد  
جمع تماشاہیوں نے بے اختیار نوٹ بچھا دینے شروع کر دیے۔ تمام باراتی جو تیار  
محمور بھی تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور گارہے تھے۔ ایک صاحب پاس سے گزرے،  
ہنگامہ دیکھ کر رہ نہ سکے، کار سے اترے، تھوڑا سا ملٹ کر پھر کار میں بیٹھے اور چلے  
دو لہا اور دس بچوں ایسی بے پروا مسرت سے ہنک رہے تھے۔

ڈھولکی بجانے والے نوجوان نے رقص کرتے بزرگ کو تنگ کرنے کے لئے تھاپ  
آہستہ آہستہ تیز کرنی شروع کر دی۔ بزرگ بھی صاحب کمال تھے ساتھ دیتے گئے مگر  
جب تھاپ اتنی تیز ہوئی کہ ڈھولکی پر پڑتا ہاتھ ایک دامہ لگنے لگا تو انہوں نے غراں  
میں ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے جواب میں تمام باراتی اور تماشاہی رقص میں شامل ہو کر  
بھنگڑا ڈالنے لگے... ان رقص کرنے والوں میں کون فلاںجی تھا اور کون فلسطینی، بھنگڑا  
ناممکن تھا کیونکہ دونوں ہی ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگا رہے تھے لیکن اندر  
ہی اندر وہ سب ناچتے ہوئے بھی، موسیقی کے آگے خود سپردگی کے باوجود ڈھولکی  
کی تال پر سر ہلاتے ہوئے بھی انتظار میں تھے۔ وہ اپنے اپنے پتے سنبھالے انتظار  
تھے۔ کس کے ہاتھ میں بادشاہ ہے اور کس کے ہاتھ میں جوکر... کوئی نہیں جانتا...

گہری شام رات میں بدل چکی تھی اور ڈھولک بجانے والا بری طرح ڈھال چلا  
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دو لہا دس خاموشی سے کارسارٹ کر کے چلے گئے۔ باراتی جہاں  
کاروں میں سوار ہوئے اور چلے گئے۔ اب ہر طرف تھپی ہوئی خاموشی تھی۔ رشتے پر  
اکا دکار وشنیاں تھیں، لوگ نہیں تھے۔ اگر تھے تو عمارتوں کی کھڑکیوں میں سے جھپٹتے  
نوج چپکے تھے، میں اگر واپس حمر جانا تو مزید تاخیر کا امکان تھا اس لئے تین  
بیروت شہر کا نقشہ دیکھا... یہ ساحل ہے، یہاں سے مجھے دو میڈم کیوری کی طرف

## بیروت - واپسی کا دن

چھپا فوجی باہر نکلا، انگلی بلبلی پر جاتے، سب مشین گن کو ران پر دبائے اُس نے اُس کے اُس مجبورے کی طرف نگاہ کی جن میں پوشیدہ کسی سنا سپر نے انہیں پریشان کیا تھا۔ نے چوک کے درمیان میں آکر شاہنگ سنٹر کے برآمدے کو دیکھا اور پھر ایکسٹری کے بعد آہستہ آہستہ میرے شوکیں کی طرف بڑھنے لگا۔ سب مشین گن کی ٹوٹی ہوئی قریب آ رہی تھی۔ میرے پیٹ کے قریب... اُس نے یقیناً مجھے چوک میں سے بھاگ شوکیں کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ میری طرف آ رہا تھا، یقیناً کے ذہن میں شکوک تھے۔

میرا رنگ اگرچہ گندمی تھا مگر تاریکی میں کیا پتہ چلتا ہے اور میں نے ایک میز پر پہن رکھی تھی جو عام طور پر فلسطینی گوریلے پہنتے ہیں... اگر میں وہیں چھپا رہتا تو شاید برآمدے میں داخل ہونے سے پہلے ایک برسٹ چلاتا اور پھر سوال پوچھتا اور اگر اپنے آپ کو ظاہر کر دوں تو بھی ہو سکتا ہے، وہ سراسیمہ ہو کر گولی چلا دے... ٹوٹی ناٹ ٹوٹی... میں نے جیکٹ میں سے پاسپورٹ نکالا اور دونوں ہاتھ جتنے بلند سکتے تھے اتنے کر کے آہستہ آہستہ باہر آگیا... تاریکی میں سے نمودار ہوتی میری جیکٹ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔

”پاکستانی۔ پاکستانی۔“ میرے سونکھے حلق نے مشکل ادائیگی کی۔

اُس نے خالی ہاتھ سے مجھے مزید آگے آنے کا اشارہ کیا میں نے قریب پہنچے ہا ہاتھ نیچے کر کے پاسپورٹ آگے کر دیا۔ اُس نے پاسپورٹ پر اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اور چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور منہ موڑ کر آرمڈ کار کی طرف چلا گیا۔ فندق المعرض البکیر کے بڑے چوہی دروازے کی چوٹ پار کرتے ہی مجھے یوں جیسے میں آندھوں، جادوگروں اور بلاؤں کے جنگل سے بھاگ کر پناہ کے اُس قلعے میں ہو گیا ہوں جہاں ایک زرد شہزادی اپنی لامبی بانہوں میں سمیٹ کر مجھے اپنے نورت میں جذب کرتے ہوئے کہے گی۔ ”تم گھر آگئے ہو۔“

بہی گرم ہے۔

دراتی کا نصف چاند گرم ریت کو سمیٹا ہوا پلٹتا ہے۔

نالی کے دانے سُرخ ہو چکے ہیں۔

پہلے ایک دانے کی سُرخ جلد پھوٹ کر سفید پھول میں بدلے گی، ترخ !

پھر دو تین دانے بھی میں سے اُچھلیں گے، ترخ، ترخ !

بدن اگر بہت منتظر ہوتا ہے مگر اولین پٹاخوں سے چونک کر کپکپاتا ہے۔

پھر تین کی چھت پر پڑتے اولوں کی طرح بے شمار دانے بھی میں اُچھلتے ہیں،

پڑتے ہیں۔ اب بدن کپکپاتا نہیں، اسے عادت ہو چکی ہے۔

دانے پھوٹ رہے ہیں، ترخ، ترخ... ڈز، ڈز... گولیاں چل رہی ہیں

آرمڈ کار میرے شیشے کے شوکیں کی طرف رنگیتی ہوئی آ رہی ہے اور اس کی مشین گن

نالی مجھے سونگھ رہی ہے... میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرا ایک کان جو تکیے میں دھنسا ہے، سماعت سے محروم ہے اور دوسرا کرے

نہ نفا میں ایک حسِ تائی آئے کی طرح سُن رہا ہے... میں سیدھا ہو گیا۔ میرے دونوں

نفس نے فائرنگ کی آواز سنی، کہیں قریب ہی، شاید شیشے کی گھڑکی کے عین نیچے بازار

میں نے وقت دیکھا، چار بج رہے تھے۔

دوسرے بستر پر نصر امینان سے سو رہا تھا۔ وہ پچھلی شب گیارہ بجے کے قریب

بہت دیر تک میرے عقل دروازے پر دستک دیتا رہا مگر میں نے میجر کی ہدایت پر کرتے ہوئے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ پھر میجر کی ہی آواز آئی۔ ”السید جی! نصر ہمارے دوست ہیں، ابھی پہنچے ہیں۔ ایک رات قیام کریں گے۔ دروازہ کھولیں۔ نصر ایک چُپ چاپ اور حزن آمیز فلسطینی تھا جو اسرائیل میں رہتا تھا اور حکومت سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر کے چند روز کے لئے اپنے رشتہ داروں سے ملنے بیروت آیا تھا۔

”نصر... میں نے اُسے پکارا۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے جھوٹ موٹ سو رہا تھا، صرف میری آواز کا اثر تھا۔ ”کیا ہے؟“  
”باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔“

اُس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور مسکرا دیا۔ ”ادھر آؤ۔“

میں قدرے تاقل سے اُٹھا اور اُس کے جسم کی آڑ لے کر نیچے دیکھا... دریائے کا ایک لبنانی ران پر سب مشین گن جاتے تھے لگا رہا تھا اور اس کے گرد بانارسا پڑا تھا۔ پھر اُس نے نشانہ لئے بغیر ایک اور برسٹ چلا دیا جو کسی عمارت کی کھڑکی لگا۔ شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ پھر ہنستے ہنستے نڈھال ہو گیا۔

”تم کھڑکی سے ہٹ جاؤ۔ ہو سکتا ہے اگلا برسٹ ادھر کو آجائے۔“

”میں اس کی نالی پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ مجھے معلوم ہو جائے گا۔“ نصر نے فریادیں کرتے ہوئے کہا۔

”یہ فلاحتی ہے یا فلسطینی؟“ میں نے بستر میں گھستے ہوئے پوچھا۔  
”پتہ نہیں۔ ویسے بے ضرر لگتا ہے۔ یونسی تفریح کے لئے فائرنگ کر رہا ہے۔“  
ایک اور برسٹ چلا اور ہماری کھڑکی کا شیشہ کورے کاغذ کی طرح کھڑکی سے پھرا ایک بھر پور قہقہہ سنائی دیا۔

”اور اگر اس... تفریح کے دوران کسی کو گولی لگ گئی تو؟“

نصر نے میری طرف دیکھے بغیر کندھے اُچکائے۔ ”کیا فرق پڑتا ہے۔“

دقوں کے ساتھ مزید چار برسٹ اور چار زوردار قہقہے... نصر کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ ”چلا گیا ہے۔“ اُس نے سوٹ کیس میں سے سگریٹوں کا بیٹ نکالا۔ ”پیو گے؟“

میں نے شکریے کے ساتھ ایک سگریٹ سلگایا۔ ”تلخ ہے۔“

”اسرائیلی سگریٹ ہے۔“

”اسرائیل کیسا ہے نصر؟“

”میں تو اپنے گھر میں رہتا ہوں، اپنے گاؤں میں، جو فلسطین کا ایک گاؤں ہے۔“

...اُس کے چہرے پر اپنے وطن میں رہنے والوں کا سکون نہ تھا۔ جلاوطنوں کا ملال تھا۔

اسرائیل ہمارے چاروں طرف موجود ہے، قید خانے کی سلاخوں کی طرح... کچھ فلسطینی

میں تنگ کی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ ہم اسرائیل میں رہتے ہیں، اسرائیلی کاغذات پر پھر

لکھتے ہیں ہم ذلت کے باوجود اپنے گھروں میں دیکے بیٹھے ہیں، وطن نہیں چھوڑا...

نہی تاؤ حسین کہ اگر تمام فلسطینی اسرائیل چھوڑ دیں تو کیا یہودیوں کے لئے یہ خوشی کی

بات ہوگی؟ ہم جب تک وہاں موجود ہیں اس زمین کے دعویدار ہیں۔ کمزور ہی سہی،

مگر اپنا دعوے قائم رکھے ہوئے ہیں...

میں نے اُسے پچھلی شب کی واردات سنائی تو اُس نے کم عمری کے باوجود مجھے

بے نہماں بزدلانہ نگاہ سے نوازا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو آرام سے اپنے راستے پر

تہمت لگاؤں۔ ایک دم بھاگ اٹھنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بہر حال تمہیں عادت ہو جائے گی۔“

میں اپنی بری عادتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا... میں جلد از جلد بیروت چھوڑ

دیتا ہوں... پردیس میں مرنا ایک حماقت ہے۔“

فلسطینی تو ہمیشہ پردیس میں ہی مرتے ہیں...

”آپ مجھے غلط نہ سمجھتے۔“ میں نے قدرے شرمندگی سے کہا ”میں صرف اپنا کر رہا ہوں۔ آپ تو اپنے کھوتے ہوئے وطن کے لئے جان دیتے ہیں... دُنیا کے مسلمان ملک آپ کے ساتھ ہیں، خاص طور پر عرب ملک...“

اُس نے اسرائیلی سگرٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر تلخی کا دھواں جلتے سے اُٹا کر دھڑک دیا۔ پھر اردن، شام، مصر اور لبنان میں فلسطینیوں کو کیوں قتل کیا جاتا ہے ہم عرب ملکوں سے بھیک نہیں لیتے۔ فلسطینی پوری عرب دُنیا میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں۔ عرب ممالک میں کام کرنے والے فلسطینی ڈاکٹر، انجینئرز اور دیگر ماہرین اگر ہاتھ کھینچ لیں تو ان کی معیشت شب بھر میں تباہ ہو سکتی ہے۔ ہم بھیک نہیں لیتے۔“

نصرا اپنے اور اپنی قوم کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا اور میں ایک ہمدرد اور جاننے کی خواہش رکھنے والا سامع تھا۔ وہ اسرائیلی سگرٹ پھونکنا اور ادا کرتا رہا۔

۱۹۶۲ء میں صدر جمال ناصر کی کوششوں سے بے گھر فلسطینیوں کو لبنان کے بے آباد علاقے میں پناہ لینے کی اجازت ملی۔ اردن کے حسین نے بلیک تمبکھانہ کے بعد یقینی فلسطینیوں اور فلسطین محاذ آزادی کو بھی لبنان میں دھکیل دیا۔ ۱۹۶۳ء میں فلسطینیوں نے فلسطینیوں کی طاقت سے ہراساں ہو کر انہیں ملیا میٹ کرنے کی خاطر آٹھائے گھر بری طرح ناکام ہوئی۔ پھر اسی برس یعنی اپریل ۱۹۶۵ء میں فلاحی دہشت پسند نے فلسطینی باشندوں کی ایک بس کو روکا اور انہیں ایک قطار میں کھڑکے کرکے مشین گولی مار کر ڈالا۔ فلاحیوں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ ہم نے دشمن کو دوپہر میں ہی ہلاک کر ڈالا۔ فلاحیوں کے کہ وہ رات کو ہمیں لقمہ بنا لیتا... لیکن یہ تو الا ان کے خون اٹک گیا تنظیم آزادی فلسطین کسی بھی ایسی مسلح جنگ سے گریز کر رہی تھی جو اسرائیلی نہ پہنچاتی ہو مگر لبنان میں نمودار ہوتے ہوئے حالات نے انہیں اس میں کھینچ لیا۔

کرو لبنان تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف مذاہب کے باغی فرقوں کی پناہ گاہ بنی۔ ان میں عیسائی مارونائٹ، یونانی آرتھوڈاکس، یونانی کیتھولک، یہودی اور مسلمان شیعہ اور دروز شامل ہیں۔ ۴۲۰ء میں جب ملک ایک وحدت کی صورت میں سامنے آیا تو ایک قدیم مردم شماری کے حوالے سے طے کیا گیا کہ مستقبل میں پارلیمنٹ کا پانچواں حصہ دروز، وزیر اعظم سنی مسلمان اور صدر عیسائیوں میں سے چنا جائے گا۔ یہیں جب فلسطینی لبنان میں داخل ہوئے تو ان کی آمد سے مسلمانوں اور ترقی پسند عیسائیوں کو قوت حاصل ہو گئی مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مردم شماری دوبارہ کی جائے کیونکہ آبادی میں ان کا تناسب ستر فیصد تک پہنچ چکا ہے اور وہ اسی حساب سے حکومت میں نمائندگی چاہتے ہیں فلسطینیوں کی مسلح موجودگی ان کا ٹرمپ کارڈ ہے... ادھر عیسائیوں کی کوشش ہے کہ دستور میں ایسی ترامیم کر دوائی جائیں جن کے تحت مردم شماری بالکل نہ ہو اور موجودہ صورت حال ہمیشہ کے لئے برقرار رہے۔ ان کی دہشت کا بنیادی نشانہ فلسطینی ہیں اور یوں تنظیم آزادی نہ چاہتے ہوئے بھی اس خانہ جنگی میں الجھ گئی ہے۔ چنانچہ اب لبنانی حکومت اور دوائیں بازو کی جماعتیں ایک طرف ہیں اور لبنانی مسلمان فلسطینی اور ترقی پسند عیسائی دوسری جانب... فوج کبھر چکی ہے۔ ہر گروہ نے اپنی الگ پیشیا بنا رکھی ہے۔ دن کے وقت شہر ایک دکھائی دیتا ہے مگر رات کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو جاتا ہے... عیسائیوں نے لبنان کی تقسیم کا شوشہ بکھرا ہوا ہے اور چرچ بھی اس سازش میں ملوث ہے۔ پادری سامان نے کہا ہے کہ میں نے پادریوں والا چوغہ اُٹا دیا ہے کہ یہ مسلح کارروائی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ہم ناشتے کے لئے ہوٹل سے باہر نکلے تو سپورٹس کاروں کے مائٹریج رہے تھے۔ یہ سب اس جرم کا حصہ تھے جو اپنی اپنی روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ ان جرموں کے لئے جن میں سے اکثر اگلے تیرہ ماہ میں تیسرے ہونے والے تھے کیونکہ بیروت

کی خانہ جنگی میں تینتیس ہزار افراد زندگی سے بالکل الگ کر دیئے گئے اور پانچ ہزار جزوی طور پر معطل ہو گئے۔

ناشتے کے بعد نصر نے بتایا کہ وہ بیروت کے مشرقی حصے میں جا رہا ہے۔ ایک کیمپ میں اس کے رشتے دار پناہ گزین ہیں۔ یہ کیمپ ”غزالوں کا سلسلہ“ ہے اور مارونائٹ عیسائی دیہات اور بیروت کی عیسائی آبادی کے درمیان واقع ہیں۔

”وہاں حالات کیسے ہیں؟“

”فلائنجی ہرات راکٹ پھینکتے ہیں، اور ظاہر ہے جواباً ہم بھی ہی حرکت میں آئے۔“ اُس نے ہاتھ ملایا۔ ”بیروت کو چھوڑ دو چند روز میں بہت کچھ ہونے والا ہے۔“

”ابھی کچھ اور بھی ہو گا؟“

”ابھی تو تفریح ہو رہی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”خدا حافظ“ اور اسرائیلی سگ کے کش لگا تا بیروت کے هجوم میں شامل ہو گیا۔

قتال بلڈنگ میں واقع ترک شپنگ کمپنی کے بکنگ کلرک سے جب میں نے والے جہازوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بے حد سستی اور قدرے بد مزہ سے بولا۔

”ہمارا اگلا جہاز پانچ روز بعد اطالیہ کی بندرگاہ نیپلز کے لئے روانہ ہو گا۔“

بے شک سکندریہ اتر جانا مگر کرایہ نیپلز تک ہی چارج کیا جائے گا۔

نادرل حالات میں تو بیروت ایسے رنگین شہر میں پانچ روز مونگ چلی گئے کے برابر ہوتے مگر ان دنوں وہ بندوق کی گولیاں تھیں۔ ”مگر میں تو آج ہی چھوڑنا چاہتا ہوں۔“

”بہت سارے لوگ آج ہی بیروت چھوڑنا چاہتے ہیں۔“ وہ خباثت سے مسکرایا۔ ”میرا وقت ضائع نہ کرو، جاؤ۔“

میں نے اس کی بدتمیزی کا بدلہ یوں لیا کہ خدا حافظ کہے بغیر واک آؤٹ کر گیا۔ مصری جہاز دان کمپنی کا دفتر بھی قریب ہی تھا۔۔۔ مصری بھائی کا دوبارہ کے موڈ میں بیٹھتے۔ تبوہ پی رہے تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے آدھ گھنٹہ ایک بیچ پڑھانے رکھا اور پھر بتایا کہ سکندریہ کے لئے جہاز بیس روز بعد ملے گا۔ وہاں سے ابوس ہو کر میں مینا یعنی بندرگاہ کے علاقے میں گیا جہاں روسی شپنگ کمپنی کا ذمہ داری دفتر واقع تھا۔ اُن کا کرایہ دیگر شپنگ کمپنیوں سے دو گنا تھا۔

”مزدوروں کی مملکت کے جہاز میں سفر اگر مفت نہیں تو دیگر ملکوں کی نسبت تو انہاں ہونا چاہیئے۔“

سفید وردی میں لمبوس ستھری صورت کی روس مسکرا دی۔ ”صرف روس میں یہاں ہم سرمایہ داروں کے لئے جہاز چلاتے ہیں۔“

”مگر میں تو بے چارہ پروتاریہ ہوں۔“

”پروتاریوں کے لئے ٹرکش شپنگ سے سستا اور کوئی نہیں۔“ اُس نے ایک چم کیمرنسٹ کی طرح صلاح دی۔

واپس قتال بلڈنگ میں جہاں ترک شپنگ کے بکنگ کلرک نے مجھے دوبارہ بلو کر اس طرح ناک چڑھائی جیسے میں کوئی بدبودار لکڑ بکڑ ہوں۔

”ایک ٹکٹ برائے نیپلز۔“

”فرسٹ کلاس کا؟“ اُس نے پوچھا۔

”اس سے نیچلی کلاس کو سنسی ہے؟“

”کیس کلاس۔“

”اور اس سے نیچلی؟“

”ٹیک کلاس۔“

”اور اس سے نیچے؟“

”اور اس سے نیچے سمندر ہے برادر...“

اور کافی کی ایک پیالی کے بعد میں نے اجازت چاہی اور انحراب جانے کے لئے سر دس گریج  
 میں آگیا۔  
 انکی نیکی بالکل خالی تھی۔ میرے بیٹھے ہی ڈرائیور نے چابی گھما دی۔  
 ”سافرت کم ہیں...“ اُس نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے سر ہلایا۔  
 راستے میں پک کرتے چلیں گے۔“

وڈ سکرین پر ایک سٹیکر چسپاں تھا۔ ایک طرف ہلال دوسری جانب صلیب،  
 درمیان میں لبنان کی علامت تگونا چار نما درخت سیڈار، نیچے لکھا تھا ”لبنان الوطن“  
 یہ نعرہ فلاںجیوں کی طرف سے ملک کی تقسیم کے جواب میں تھا۔ ڈرائیور فلسطینی تھا اور  
 بے حد غوش گفتار۔ کہنے لگا۔ ”بیروت کو نظر لگ گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اکیلے سفر  
 کے ساتھ انحراب جا رہا ہوں۔“

میں نے پوچھا ”لبنان کی وحدت پر یقین رکھتے ہو؟“  
 کہنے لگا۔ ”اسی میں ہماری سلامتی ہے۔ لبنان تقسیم ہو جائے تو فلاںجی حصہ فوراً  
 اسرائیل کے ساتھ الحاق کر لے اور ہم پھر بھڑونے جائیں، یہ نہیں ہونے دیں گے۔“  
 میں نے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر یہ پوسیدہ سادہ درخت سیڈار اہل لبنان  
 کو اتنا پیار کیوں ہے؟“

اُس نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے اُس کی محبوبہ کی توہین کر بیٹھا ہوں اور بولا کبھی  
 شہابی جاکر ہزاروں برس پرانے سیڈار کا جنگل دیکھو، تب تمہیں معلوم ہو کہ یہ پوسیدہ  
 سادہ درخت کتنا پر جلال اور شہانہ ہے... سیڈار پیغمبروں کا پسندیدہ درخت جسے  
 ارض الرب بھی کہتے ہیں یعنی خدا کا درخت۔ بائبل میں اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں  
 زیتون کو برکت والا درخت کہا گیا ہے اور لبنان کیا ہے؟ زیتون اور سیڈار کی سرزمین  
 بلکہ زیتون تو نضول سا...“

”بہت بہت شکریہ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ...“

ڈیک کلاس یعنی عرشے کا ٹکٹ ایک سو دو ڈالر میں ملا جسے جیسے ہی  
 مجھے ایک سب مشین گن کی ملکیت اتنا تحفظ کا احساس ہوا۔ جہاز کا نام ”الکلیف“  
 تھا اور روانگی پانچ روز بعد رات ساڑھے دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے  
 اُمید تھی کہ اگلے پانچ روز تک اہل بیروت اپنے آپ کو تفریح تک ہی محدود کریں  
 ... ٹکٹ کی خریداری سے بکنگ کلرک کی نظروں میں میرا وقار خاصا بلند ہو گیا اور  
 نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے میز پر رکھے ٹیلی فون پر ہاتھ ڈال  
 پاکستانی سفارت خانے کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دمشق میں مظہر نے بیروت میں تعینات  
 فرسٹ سیکرٹری طالب میر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر کوئی ایمر جسنی ہو  
 میر سے رابطہ قائم کرنا۔ دانشور قسم کا آدمی ہے مگر ہے قابل اعتماد... اب پانچ  
 یہ تھی کہ اگلے پانچ دنوں میں اگر میں مر مرا جاؤں تو گھر والوں کو کم از کم دسواں گز  
 سے پیشتر اطلاع تو ہو جائے... میر صاحب نے انتہائی تحمل سے میرے خیالات  
 کے مسائل سنے اور مجھے بلاتا خیر انحراب کے ایک قہرہ خانے میں پہنچنے کو کہا۔

قتال بلڈنگ سے نکل کر میں شارع سوریا پر واقع عربی زبان کے معرود پر  
 ”الآداب“ کے دفتر میں پہنچا۔ وہاں ایک پرمسترت بھاری جسم کی خوش شکل خاتون  
 جھکی کسی فرانسیسی ناول کا عربی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ میں نے محترم دوست  
 کا تعارفی خط پیش کیا جو عربی میں تھا اور انہوں نے مجھ سے گفتگو شروع کر دی  
 ہی تھی۔ میں لا علمی میں مسکرایا تو وہ فرانسیسی بولنے لگیں۔ میں نے انگریزی کا  
 تو وہ لا علمی میں مسکرائے لگیں۔ بہر حال کچھ ملی جلی اردو عربی میں بات ہوئی۔  
 نے بتایا کہ ڈاکٹر سہیل ادیبی جو ”الآداب“ کے مدیر ہیں تشریف نہیں رکھتے اور وہ  
 اہلیہ ہیں۔ میں نے اپنے ایک پسندیدہ فلسطینی شاعر محمود درویش سے ملاقات کی  
 کا اظہار کیا تو پتہ چلا کہ وہ ان دنوں بیروت سے باہر ہیں۔ چنانچہ چند دنوں





”چلو“ میں نے اُگتا کر کہا۔

اُس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا کیونکہ بعلبک کا حوالہ اُس نے میں اس وقت دیا تھا جب وہ لیون ٹریولرز کے دفتر کے سامنے کھڑا ہو چکا تھا۔ بہر حال سوداگرانہ تھا۔ میں نے اگلی صبح کے لئے بعلبک کا ٹور خرید لیا۔ دس ڈالر میں بیروت سے دُور رومی کھنڈروں میں ایک دن... کم از کم وہاں سکون تو ہوگا۔

خدا خدا کر کے جب ہم الحمرا پہنچے تو اُس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ ”تم ایک دست ملک سے آتے ہو۔“

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی سے باہر نکلتے ہوئے کہا ”اچھا تو پھر سیڈار بڑا زبردست درخت ہے؟“

”ہاں“ وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ ”پیغمبروں کا پسندیدہ درخت، خدا کا درخت اور خدا حافظ۔“

طالب میر صاحب قہوہ خانے میں میرا انتظار کرتے کرتے نڈھال ہو چکے تھے۔ ”آپ قدرے دیر سے پہنچے“ انہوں نے سفارتی آداب کے تحت نرم سا احتجاج کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے سیڈار درخت پر لیکچر سن رہا تھا۔ لیون ٹریولرز کی خریداری کر رہا تھا اور بعلبک کے لئے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ کہنے لگے۔ کمال ہے اتنا عرصہ ہو گیا بیروت میں رہتے ہوئے مگر ہمیں کبھی ایسا ٹیکسی ڈرائیور نہیں ملا... میں نے کہا آپ کو اتنا عرصہ ہو گیا بیروت میں رہتے ہوئے کبھی آپ کی کھڑکی تلے کسی نے لیون ٹریولرز کے برسٹ چلاتے ہوئے قہقہے لگائے ہیں؟ کہنے لگے، نہیں۔ میں نے کہا تو پھر؟ برے تو پھر یہ کہ دوپہر سو چکی ہے، چلتے گھر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔

کلاسیم سنیما کے سامنے ایک دکان کا انداز باہر سیاہ ہو رہا تھا۔ کل شب کسی نے دکان پر پھینکا تھا۔ فائر بریگیڈ کی چند گاڑیاں طوفانی رفتار سے الحمرا میں داخل ہوئیں، ان کا چمچتی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی دکانوں کے شٹر گرنے لگے اور راہ گیروں کے

دریافت کیا۔ ڈرائیور نے میرے کندھے پر پرانے یاروں کی طرح ہاتھ رکھا اور کچھ تفصیلات بیان کرنے لگا... دکاندار نے شٹر گرایا، روشنی جلائی اور پھر شیلٹ سے ایک بظاہر چاکلیٹ کا بڑا ڈبہ اُتار کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اُس نے ڈھکن اٹھایا تو ایک نوپس نکودر چیکو سلاویکیہ کی بنی ہوئی سیٹیں گن بلب کی روشنی میں چمکنے لگی... گولیوں کی ایک سیلٹ بھی ساتھ تھی۔

”اگر رات ہوتی تو تم اسے باہر بازار میں جا کر ٹرائی بھی کر سکتے تھے۔ بہر حال عمدہ چیز ہے...“ وہ بڑے پیار سے آہنسی شیلٹ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ ”قیمت صرف نوے ڈالر... گولیوں کی سیلٹ مفت۔“

”نوے ڈالر میں تو میں یورپ پہنچ سکتا ہوں۔“

”اگر بیروت سے نکلے تب پہنچ گے ناں؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”بہر حال مجھے معلوم تھا کہ تم خرید دگے نہیں۔ شکل سے ہی ڈرپوک لگتے ہو... آؤ چلتے ہیں۔“

دکاندار نے چاکلیٹ کا ڈبہ بند کر کے شیلٹ پر رکھا اور بڑی خوش اخلاقی سے ہمیں رخصت کیا۔

ہم پھر الحمرا کی طرف روانہ ہوئے۔

”تم نے بعلبک دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“

”تم نے بشاری کا سیڈار کا جنگل نہیں دیکھا اور بعلبک بھی نہیں دیکھا؟ دیکھو؟“

”تم مجھے پلیز الحمرا لے چلو فی الحال...“

”ابھی تو نہیں لے جا رہا۔ بہت دُور ہے۔ تم لیون کر دو کہ فی الحال لیون ٹریولرز کی ٹورسٹ بس کائنات خرید لو کل صبح کے لئے۔ دوپہر کا کھانا بعلبک میں، موسیقی اور لبنانی و اتن... بعلبک کے ستون، سوڈج کا شہر ہیلی پولیس، بعلبک جہاں صلاح الدین ابیل کا بچپن گزرا تھا... رومی کھنڈرات... اور صرف دس ڈالر میں، لے چلو لیون ٹریولرز؟“

قدم تیز ہو گئے۔

میر صاحب کے فلیٹ میں کھانے کی میز پر پھر خانہ جنگی کا ذکر چھڑ گیا۔

”روزانہ سینکڑوں شہری اغوا کر لئے جاتے ہیں اور پھر بھاری رقوم کی ادائیگی پر انہیں آزادی نصیب ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ رقم بھی غائب اور شہری بھی غائب پچھلے روز تین پاکستانی اغوا ہو گئے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ فلائنجیوں کے پاس ہیں۔ چنانچہ سفیر صاحب نے اُن کے ہیڈ کوارٹر میں فون کیا کہ ہمارے آدمی رہا کر دو ورنہ... انہوں نے کہا یہ دھمکی ہے؟ سفیر صاحب نے بے دلی سے کہا بس جناب یہی سمجھ لیجئے۔ انہوں نے پاکستانیوں کو چھوڑ دیا۔ ایک اور پاکستانی نوجوان کو ایک بلند عمارت کی آٹھویں منزل پر قید کر دیا گیا۔ وہ غریب کھڑکی کھول کر باہر لٹک گیا اور لرزے لگانے لگا۔ ”پاکستانی پاکستانی“ خوش قسمتی سے کسی راہ گیر نے اس کی دہائی سن لی اور پولیس کو اطلاع کر دی... آپ بھی ذرا احتیاط برتتے گا... فائرنگ تو اکثر ہوا کرتی ہے، کل تین آدمی مارے گئے۔ آپ کا قیام کس ہوٹل میں ہے؟“

ہوٹل کا نام سن کر وہ باقاعدہ سراسیمہ ہو گئے۔ ”بھئی وہ تو پورٹ کے قریب ہے اور پورٹ تو بس... امن کے زمانے میں ایک طرف سے سستی راکٹ پھینکتے ہیں شیوں اور دوسری طرف سے شیعہ حضرات بھی راکٹ بھرا کٹ جواب دیتے ہیں اور دمیلا میں رہائش پذیر عیسائی مزے سے اپنے سروں پر سے گزرنے والے راکٹ دیکھتے ہیں البتہ جب خانہ جنگی تیز ہوتی ہے تو شیعہ سستی متحد ہو کر عیسائیوں پر راکٹ برسانے لگتے ہیں... بہت خطرناک ایریا ہے، آپ میرے فلیٹ میں آجائیے...“

پچھلے پر میر صاحب کے دو بھانجے تشریف لے آئے جو دنیا دیکھنے کے چاہتے ایک بحری جہاز پر ملازمت کرتے تھے۔ بارش، گفتگو کرتی آنکھوں والے تیز ملاح اُن کے ہمراہ سفیدے کی طرح نکلتے ہوئے قذ کا ایک نوجوان تھا۔ آنکھیں مڑے مگر چہرے کی نقوش میں زندگی ہی زندگی۔

”یہ ہمارے دروز دوست ہیں، غسان۔“ ملاحوں نے تعارف کروایا۔ ہم ذرا سمند

ے اُداس ہو گئے ہیں، نہانے جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیئے۔“

”میں بس اتنا سائیراک ہوں کہ اگر گہرے پانی میں دھکا دے دیا جائے تو ہاتھ مار کر

باز نکال سکتا ہوں اور بیروت کا سمندر میری صلاحیتوں سے بالآخر دکھائی دیتا ہے۔“

”غسان زبردست تیراک ہے، آپ کو بچالے گا۔“ ملاح نمبر ایک ہنسا۔

”چلے گا؟“ میں نے میر صاحب سے دریافت کیا۔

انہوں نے اپنے صحت مندی پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”ساحل پر جس قسم کے بم دیکھتے ہیں

آتے ہیں وہاں اسے دکھانا بد ذوقی ہوگی۔ آپ ضرور جاتیں مگر نوبجے سے پشیر مٹل پہنچ جاتیے گا۔ میں فون کر کے آپ کی آمد کے بارے میں تسلی کروں گا۔“

سمندر کی طرف اُترتے ہوئے ہمارا گزرا اس بستی میں سے ہوا جہاں دروز رہتے

تھے ہماری کچی آبادیوں ایسے بے ترتیب مکان مگر اندر چلے جاتے تو یوں لگتا ہے کہ پنجاب

کے کسی سگڑا اور صاف ستھرے گاؤں میں آنکھ میں ٹرنکوں پر کردشیے کے غلاف چھنی

کے برتن شیلفوں پر سجے ہوئے اور مٹی کی ٹھنڈی مہک۔ غسان کے والدین نے ہمیں

توبہ پلایا اور گھر کی بنی ہوئی میٹھی روٹی کھلائی۔

دروز ایک ایسا فرقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن میں نامناسب حالات

سے مقابلے کی سپرٹ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ ہے اور وہ آزادی، اتحاد اور مذہب

سے مکمل وفاداری پر آخری دم تک قائم رہتے ہیں۔ دروز لیڈر کمال جنبلاط لبنانی سیاست

کے اہم ترین ناموں میں سے ہے۔ دروز علوی فرقتے کی ایک شاخ ہیں جو پہلے نصیریہ

تھے، کمالات تھا۔ ان کا کلمہ عام مسلمانوں سے مختلف ہے۔ مردوں کو پورے لباس میں

دن کرتے ہیں۔ تناسخ کے قائل ہیں اور جنت دوزخ سے انکاد ہی ہیں اور ابن تیمیہ

کے قبول شراب کو حلال سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ حجر اسود کو لوٹ کر لے گئے اور ایک حج

کے موقع پر متعدد حاجی صاحبان کو آب زمزم میں ڈبو کر شہید کر دیا تھا... بہر حال

غسان آنا خطرناک نہیں لگتا تھا اور ہم حج پر بھی نہیں جا رہے تھے، سمندر کی طرف جا رہے تھے۔

آج روشے کے ساحل پر کل کی نسبت زیادہ ہجوم تھا۔ ہم ساحل کی طرف سے اتر کر نیچے سمندر کے نزدیک چلے گئے جو خاصا پر جوش دکھائی دے رہا تھا۔ پانی میں اترتی لڑکیوں کے مختصر لباس مغربی تھے مگر جب باہر آتیں تو بھیگے ہوئے جسموں کو مشرقی لڑکیوں کی طرح سمیٹتی ہوئی چلیں۔ پورے خاندان ساحلی چٹانوں پر قایل ہو چکا تھا۔ کھلی فضا اور دھوپ میں آباد تھے۔ وقت جس کا تھا، جہاں تھا تھا ہوتا تھا۔ لیون داری اماں سیاہ چوٹے میں ہیں، بیٹی سکریٹ میں بیٹھی ہے اور پوتی سومنگ کا سر پر میں اٹھلا رہی ہے۔ دادا آبا اپنا جہازی سا تر حلقہ اڑکیلا بھی ساتھ لائے ہیں اور نیم غنودگی میں کش لگا رہے ہیں۔

میں نے بھی مرد سمندر ہونے کی نیت سے ایک تالاب نما حصہ منتخب کیا جس کے نوکیلی چٹانوں کا حصار تھا۔ لہریں دیوار کی صورت آتیں اور تالاب کو بھر کر کچھ بٹ جاتیں مگر آہستہ آہستہ پانی واپس سمندر میں بہہ جاتا۔ میں اندر گیا تو نوکیلے سنگریزے پائے کو اذیت دینے لگے۔ بیٹھنے کی کوشش کی تو ڈکیاں کھاتیں۔ چنانچہ سومنگ کا سیٹم کوٹھکا ساحل پر واپس آگیا۔ دونوں تلاح اور غسان بے خطر سمندر کی پر جوش سطح پر چپکے لے رہے تھے اور بار بار مجھے اندر آنے کے لئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مجھے اُن کی پرالہ تو یقین تھا مگر سمندر پر یقین نہ تھا۔ اور میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ایک نوجوان لڑکا جو میری طرح تالاب کی عافیت میں اچھل کود کر رہا تھا، جوش میں آکر گہرے پانی میں کود گیا۔۔۔ تیرنا آنا دشوار نہ تھا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ دُور سے آتی ہوئی گونجتی لہریں رفتار کا اندازہ کرنا، پھر اس کی آمد پر سانس روک کر اپنے آپ کو تیب تک قائم رکھنا جب تک کہ وہ سر سے گُور کر ساحل سے ٹکرائیں جاتی۔ یہ نوجوان چند لہروں میں سے تو کامران گُورا مگر پانی کی ایک دیوار اُسے بے اختیار کر کے سمندر کے اندر تک لے گئی۔

وہ بڑی طرح غوطے کھانے لگا۔ غسان نے جب اسے دیکھا تو اُس کا ہاتھ آخری مرتبہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا تھا۔ اُس نے فوراً بھاگ کر چھلانگ لگائی اور خود بھی پانی میں غائب ہو گیا۔ پورا ساحل دم سادھے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً بیس سیکنڈ کے بعد غسان سطح پر اُٹھا۔ اُس نے نیم بے ہوش نوجوان کو ایک بے بس بچے کی طرح بغل میں داب رکھا تھا۔ ملاحوں نے ایک ٹیوب اس کی جانب پھینکی اور وہ اُس کے سہارے تیرتا ہوا ساحل پر آیا۔ اچھا تیراک ہے مگر ڈر گیا تھا۔ اگر تم پانی سے غرق نہ ہو جاد تو بس ختم۔۔۔“ نوجوان نے ہوش میں آتے ہی کپڑے پہنے اور پیراکی سے توبہ تا تب ہر گھر کی راہ لی۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر تھی مگر میں نے ہوٹل واپسی کا اعلان کر دیا۔ ابھی ٹھہریے، سومنگ کے بعد ہم لوگ ایک قہوہ خانے میں غول کھانے جا رہے ہیں۔

زبون کے تیل کے ساتھ گرم گرم پھیلیاں۔“

میں نے معذرت کی اور پچھلی شب دیر سے نوٹنے پر جو درگت بنی تھی، بیان کی۔

”چلے آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔“ دونوں تلاح اور غسان میرے ساتھ ہوئے۔

صوبہ سکریٹ میں پہنچے تو دونوں تلاح سازشی انداز میں کھسکے پھر کرنے لگے۔ آپ تو بڑی خطرناک جگہ رہتے ہیں۔“

”ہاں میں نے سر ملایا۔“ یہاں جان کا خطرہ رہتا ہے۔“

”جان کا نہیں جسم کا۔۔۔“ تلاح نمبر ایک شرارت سے بولا۔ آپ کے ہوٹل کے عقب کی گلی کا علاقہ ہے۔۔۔ ایسا علاقہ جہاں اگر تلاح گھس جائیں تو انہیں پولیس ہی آکر پکارتی ہے۔“

”پگال تو پیرس کا بدنام ترین ایریا ہے۔“

”یہ بھی کچھ کم نہیں۔۔۔“ تلاح نمبر دو تجربہ کار نظر آنے لگا۔ آپ کا ہوٹل تو یہ سامنے ہے۔ آئیے کچھ دیر کے لئے اُدھر ہوائیں۔“

میں نے مجبوراً ہاں کر دی جو قدرے پُرشوق تھی۔

پگال میں وہ تمام لوازمات موجود تھے جن کی غیر موجودگی میں ملاح سمندر پر پیر رہتا ہے۔ ناچ گھر، شراب خانے، نیلی خلیں اور نیلی کیسٹ، کاروبار کی حسینا کی اور ہتے کٹے غنڈے...

دو تین گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد میں نے پوچھا: "چلیں؟" کہنے لگے: "آپ کو بتایا بھی تھا کہ اگر ملاح اس علاقے میں آجائے تو پھر اسے پولیس ہی باہر نکال دے گا... ابھی پولیس نہیں آئی۔"

میں نے پولیس کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس ہٹل آگیا کرے پر داخل ہوا تو نصیر کے خالی کردہ بستر پر ایک اور عرب نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ساڈ ٹیبل پر پکھرے چند کاغذات سمیٹے اور سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔

"میرا نام مستنصر ہے اور میں آپ کا روم میٹ ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے آگے کر دیا۔ اُس نے خاموشی سے ہاتھ ملایا اور کونے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ "آپ انگریزی جانتے ہیں؟"

اُس نے صرف سر ہلایا اور بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔ "آپ بھی شاید فلسطینی ہیں؟"

اخبار سے پل بھر کے لئے نظر ہٹائی، گردن کو خم دے کر مجھے دیکھا اور جواب بے غیر مطالعے میں محو ہو گیا۔

آپ بے شک جہنم میں جاتیں۔ میں زیر لب بڑبڑایا اور اپنے آپ کو کرتے شلواری آرام دہ کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ سونا محال تھا کیونکہ اُس نے بیڈ ٹیپ جلا رکھا تھا۔ آج کو آخری سطر تک کھنگال کر وہ اٹھا اور اپنے بیگ میں سے ایک گول توپ نکال کر ساڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ سرد چہرہ، گھنگھریالے نیم سنہری بال، دراز قد اور کسرتی جسم۔

"آپ پاکستانی ہیں؟" وہ سرد مہری سے بولا۔ "آپ کو آپ تو بول بھی لیتے ہیں۔" میں نے ناگواری سے کرٹ بدل لی۔

"پانی ہوں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے بیروت میں۔"

"آپ نے تین سیر کرنے آیا تھا؟"

"ہٹل معرض الکبیر میں کس طرح آگئے؟"

"دش سے آنے والی ٹیکسی نے مجھے صبح سکوٹر میں اتار دیا اور یہ اس کے عین سامنے تھا، اس طرح آگیا۔"

"آپ عرق پیس گئے؟"

"کیا؟" میں تنگ آکر اٹھ بیٹھا۔

"عرق۔" اُس نے بوتل کو اپنی انگوٹھی کے پتھر سے بجایا۔ "عرق۔"

"جی نہیں شکریہ... میرا ہاضمہ فی الحال بالکل درست ہے۔"

"پلیز آپ میرا ساتھ دیکھتے... آپ دوست ہیں۔"

"کس چیز کا عرق ہے؟"

"سوف کا..." اُس نے گلاس کا چوتھائی حصہ بھرا اور بقیہ پانی سے برابر کر دیا۔ پانی کی داوٹ سے بے رنگ عرق دودھیا ہو گیا۔ میں نے چکھا، گراںپ ڈاٹر ایسا ذائقہ تھا اور گلاس خالی کر دیا۔

"انہی تیزی سے نہیں پیتے..." اُس نے ایک داجبی سی پیسکی لے کر گلاس مینیر پر رکھا۔ "میرا نام احمد ہے اور آپ کا اندازہ درست تھا، میں فلسطینی ہوں۔ آج ہی بیروت پہنچا ہوں۔ پلیز اور عرق لیجئے۔" اُس نے گراںپ ڈاٹر کا ایک اور گلاس بنا دیا۔ میں نے تسلی کی خاطر بوتل اٹھا کر دیکھی، اُس پر عرق ہی لکھا تھا اور سوف کی ہلکی

نہر کو آہی رہی تھی۔

"بیروت میں آپ کے رشتے دار ہیں؟"

"ہاں، بہت سارے..." اُس کے جڑے بھینچے ہوئے تھے اور یقیناً اُس وقت

وہ میرے ساتھ نہیں تھا، کہیں اور تھا۔

”کتنے روز گھومنے کا ارادہ ہے؟“

”یہ حالات پر منحصر ہے...“ وہ چونک اٹھا۔ ”ادب آپ؟“

”میں نے اُسے پانچ روز بعد چلنے والے بحری جہاز کے بارے میں بتایا۔“

”ہاں آپ کو بیروت چھوڑ دینا چاہیے... آپ خوف زدہ تو ہوں گے؟“

”صورت حال سے؟“

”موت سے کون خوف زدہ نہیں ہوتا؟“

اُس کا سر جھکا ہوا تھا، میرا خیال ہے کہ وہ مسکرایا۔ اس کا نصف چہرہ کہ  
کی نیم تاریکی میں تھا اور بقیہ خند و خال ٹیل لمبپ سے روشن ہو رہے تھے۔

احمد ایسے لوگوں میں سے تھا جو قدیم کھنڈروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کھدائی کے

ساتھ مختلف تہیں برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی آخری تہ کے بارے میں بھی ہمیشہ

رہتا ہے شاید اس کے نیچے ایک اور عہد پنہاں ہو، ایک اور تاریخ نگہ ہو۔ اُن کے

تجربات انہیں شانت اور خاموش کر دیتے ہیں۔ اوپر سے اُلوں کی سفید لکڑی

اندر سے ایک ایک مسام دکھتا ہوا۔ فلسطینی شاعر محمود درویش نے ایک انٹرویو

کہا تھا۔ ”مجھے اپنا وہ زمانہ یاد ہے جب میں چھ برس کا تھا اور ایک سرسبز پہاڑی

واقع خوبصورت اور پُر سکون قصبے البرودہ میں رہتا تھا... گراما کی ایک رات

گاؤں کے لوگ حسبِ عادت چھتوں پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو میری ماں نے

مجھے اچانک نیند سے بیدار کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو گاؤں کے

سینکڑوں لوگوں کے ساتھ جنگل میں پھپھتے اد بھاگتے ہوئے پایا۔ گولیاں ہاتھ

سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

رات کے مسلسل سفر کے نتیجے میں میرے بہت سے عزیز واقارب ادھر ادھر

اور میں ان میں سے ایک عزیز کے ساتھ ایک اجنبی گاؤں میں آ گیا۔ جہاں کے

یاد دہری طرح کے تھے۔ میں نے سادگی سے کسی سے پوچھا۔ ”میں کہاں آ گیا ہوں؟“

برے کان میں پہلی مرتبہ ”لبنان“ کا لفظ پڑا... احمد بھی محمود درویش کی طرح بچپن

بچپن سے آبادی قصبے سے نکالا گیا اور لبنان میں پناہ گزین ہوا جہاں اُسے حقیقت

سہرا دکھائی دینا چاہیے۔ وہ بھی اس تجربے کو نہیں بھولا تھا جب زندگی میں

پہلی بار وہ ایک طویل قطار میں کھڑا ہوا تھا، امدادی کھانا حاصل کرنے کی خاطر۔ وہ

بچپن کے نام سے پکارا گیا۔ احمد پناہ گزینوں کے کیمپ میں پلا۔ امدادی کھانوں کے

تقارین کھڑے ہو کر جوان ہوا اور اپنی آنکھوں سے باپ اور بہن بھائیوں کے جسم

پر پہلی بار مسخ ہوتے دیکھے... یہ زندگی کی مختلف تہیں تھیں جو اس کی شخصیت

بن گئیں... ان کے نیچے کہیں احمد تھا، مجھے نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ مصائب کے

دور اس نے تعلیم حاصل کی اور اب لبیا میں انگریزی کا اُستاد تھا۔ دُستے زمین پر منتشر

ہو گئے۔ فلسطینیوں میں سے ایک جو واپسی کے دن کے انتظار میں ہیں۔

میں سینکڑوں فلسطینیوں سے مل چکا تھا مگر احمد ایک مختلف انسان تھا۔ وہ تعارت

نہیں کرنا پسند کرتا تھا بلکہ ایک سپاٹ اور کاروباری انداز میں۔ وطن اس

کا ایک خواستہ بچہ تھا جو جذباتی ہونے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی تلاش میں اس

شخص نے گھومتے تھے اور ایک سرد منسوبہ بندی سے خراکار کیمپ تک پہنچا تھا۔ وہ

لوہیے لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔



## بیروت۔ بادشاہ یا جوکر

حسب معمول بیروت کی دلفریب اور پرسکون صبح کا آغاز ایک سٹین گن کے چھانے سے ہوا۔ برسٹ کی پہلی گولی کی آواز نے ہی مجھے جگا دیا اور ساتھ ہی تفریح کے شوقین لبنانی صاحب کا ہنسناتا ہوا تہقہ سنائی دیا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ صبح کے دھندلے آثار میں وہ ران پر سٹین گن کا دستہ جمائے منہ کھولے کھڑا تھا۔ پھر نالی سیدھی ہوتی اور اس میں چند بے نتیائے شے بڑکے... اُس نے ایک بچے کی طرح داد طلب نگاہوں سے ہر سو دیکھا...

اُجائی میں نے سٹین گن چلائی ہے اور پھر منس منس کر دوہرا ہو گیا۔

”کھڑکی سے ہٹ جاؤ مستنفر“ احمد بھی بیدار ہو چکا تھا۔

”میں اُس کی نالی پر نگاہ رکھے ہوتے ہوں، مجھے معلوم ہو جاتے گا...“

تیسرے تہقے کے بعد دُور سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی جیسے سڑکھی ٹہنی ٹوٹی ہے... لبنانی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے... تڑاخ کی ایک اور جھمٹنی ٹوٹی... یقیناً پستول کا فائر تھا، جواب اُس فائر کے طور پر۔ اُنہوں نے سٹین گن کو فوراً سینے سے لگا لیا اور شکایت آمیز نظروں سے اُدھر دیکھا جہاں سے فائر ہوا تھا۔ وہ غیر تو یونہی دل لگی کر رہے تھے۔ آپ خواہ مخواہ سنجیدہ ہوتے جاتے ہیں میری زبان نے اُن کے اُس پاس سیٹی بجائی اور وہ ہراساں ہو کر لڑھکے ہوئے قریبی سڑکوں پر اُن میں غائب ہو گئے۔ میں اپنی ہنسی دبا تا بیچھے ہٹا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ احمد اپنے

کاغذات پر سرخ دائرے بنانے میں مصروف تھا۔ یہ بیروت کے مختلف مصلوہ تفصیلی نقشے تھے۔

”تم آج فارغ ہو؟“  
”نہ“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”بعلبک... عظیم رومی معبد... پہلی پولس... سورج کا شہر... آج میں پہلی مرتبہ خلیل جبران کا لبنان دیکھوں گا... اس آہٹوں پر چونکنے والے شہر سے لے کر وادی لبنان کے سرد اور سیڑا کے جنگلوں میں... میں وہاں پہنچنے ہی رومی معبد کے کسی ہمدرد دستوں سے لیٹ کر سو جاؤں گا کہ میں آبادیوں سے تنگ آچکا ہوں۔ احمد نے سر اٹھایا۔ اُس کے منہ جپرے سے ہرنٹ مسکراہٹ کی حرکت بن علیحدہ ہوتے۔ ”تم دور وزیں ہی تنگ آگئے ہو اور ہم اتنے برسوں سے...“

”تمہاری بات اور ہے، تم خطی لوگ ہو، اتنے برس بعد بھی واپسی کے دن کے انتظار میں ہو، اس مقصد کے لئے جہاز اٹھا کر تے ہو، دھماکے کرتے ہو، خود مر تے ہو دوسروں کو مارتے ہو، بال بچوں کے پرچے اڑتے دیکھتے ہو اور پھر بھی بھرتے ہی نہیں ہو مٹی کو... ہم صاحب لوگ ہیں، صابر لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ بتاتی ہے کہ صاحب لوگ ہیں...“

”تمہارے منہ میں کڑواہٹ کے ذائقے ہیں...“

”اور یہ سب تم دہشت پر اترے ہوئے فلسطینیوں کا قصور ہے... ہم صاحب لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتے ہو۔“

احمد نے سرخ مارکر میز پر رکھ دیا۔ ”وہ کیسے؟“

”تم بے گھر ہو مگر تمہارا وطن ہے اور ہم گھروں میں رہتے ہوئے بھی جلاوطن پاکستانی ہونے کے باوجود ہمیں قومی سیٹج پر نمودار ہونے والے مسخروں سے جلاوطن

ہرٹ لپٹا پڑتا ہے... کیا کبھی کسی فلسطینی سے کہا گیا ہے کہ وہ سرے سے فلسطینی ہی نہیں ہے؟ تمہاری جدوجہد کو دیکھ کر، تمہارے وجود کو داپسی کے ناک چاہت میں فنا ہوتے دیکھ کر ہمیں احساس کمتری ہو جاتا ہے کہ آخر ہم ہیں کیا ایک تک یونی رہیں گے...“

”اُس دن کو قریب تر لانے کے لئے مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔“

”ہم تراشک اور بیان دے سکتے ہیں، ساتھ نہیں دے سکتے...“ کڑواہٹ کے باوجود میں منسا۔ ”ویسے میں کچھ جانا چاہوں گا...“

”جانے کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”کہاں؟“

”یہیں بیروت میں۔“

”کب؟“

”جب بھی تمہیں فراغت ہو۔“

”فی الحال تو میں بعلبک کے قدیم کھنڈروں میں پناہ لینے جا رہا ہوں، کل سہی۔“

الحمر اسٹریٹ کے آغاز میں لیون ٹریولرز کا دفتر تھا، باہر ایک خالی لکڑی کوچ کھڑا تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک ایسے صاحب سے سامنا ہوا جو ہر دوسرے سانس کو بوجھ جانی لے رہے تھے اور بڑبڑھتی ہوئی شیو کو بڑے انہماک سے کرید رہے تھے۔ میں نے اپنا ٹکٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔

”آج کا ٹور کینسل ہو گیا ہے۔ کل بعلبک سے واپسی پر شتیاہ میں سے گزرتے ہوئے کوچ پر فائرنگ ہوئی تھی، آپ ذاتی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔“ اُس نے ٹکٹ پر نشان لگائی اور گیارہ ڈالر واپس کر دیئے۔



”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری کوچ شیاخ کے علاقے میں سے گزر کر بعلبک کے لگ بھگ... بعلبک تک کا نقشہ بنا ہوا تھا اور راستے میں پڑتے قصبوں کے درج تھے۔ ان میں فنا نامی تھا جس کے عین اوپر گولی کا سوراخ تھا... لبنان کے دیو دار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی جو نازلا سعد تھی... مجبوراً وہ میکینک ہیٹ پہنے فلیش گن سے تصویریں اتارتی نازلا جس کے ساتھ خلیل جبران نے میرا تعارف کروایا تھا... آج سے پانچ برس پہلے وہ اشدیلہ سے میڈرڈ جرنل کی گاڑی میں سوار ہوئی تھی اور پھر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ نازلا فنا لیبازٹریز میں کام کرتی تھی بعلبک کے راستے میں پڑتا تھا... میرا ارادہ تھا کہ میں واپسی پر فنا نامی اور جبران مجھے معلوم تھا کہ مجھے سامنے پا کر اس کے پہلے الفاظ کیا ہوں گے... واللہ مستغفرہ“

”لیکن فنا نامی کے عین اوپر گولی کا سوراخ تھا... سوری نازلا سعد۔“

”کیا تو ان راتوں کو یاد کرے گی جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے۔ تیرے نفس کی شعاعیں ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں۔ کیا تو ان جنبی کی بلیوں کو یاد کرتی ہو گی جن کی شاخوں کے سائے میں ہم بیٹھے تھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ نگیں تھیں کہ ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپاتے ہوئے ہیں۔ کیا تو ان نگلیوں کو یاد کرے گی جو ہم چلتے تھے۔ تیری انگلیاں میری انگلیوں میں اس طرح پویست تھیں جیسے نازلا کی انہی انگلیوں میں آج یقیناً ایک سٹین گن پویست ہو گی کیونکہ کارڈ میں ہم نازلا اور مستنصر تھے اور آج لبنان میں... ایک رومن کیتھولک اور ایک مسلمان... دل گرفتہ۔“

”میں نے ایک سروس ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور ہٹل واپس آ گیا۔ احمد بدستور اپنے نقشوں میں مگن تھا۔ اُس نے آہٹ پر سر اٹھایا۔“

”نہیں گئے؟“

”شیاخ میں فائرنگ کی وجہ سے پورے کینسل کر دیا گیا ہے۔“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری کوچ شیاخ کے علاقے میں سے گزر کر بعلبک کے لگ بھگ... بعلبک تک کا نقشہ بنا ہوا تھا اور راستے میں پڑتے قصبوں کے درج تھے۔ ان میں فنا نامی تھا جس کے عین اوپر گولی کا سوراخ تھا... لبنان کے دیو دار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی جو نازلا سعد تھی... مجبوراً وہ میکینک ہیٹ پہنے فلیش گن سے تصویریں اتارتی نازلا جس کے ساتھ خلیل جبران نے میرا تعارف کروایا تھا... آج سے پانچ برس پہلے وہ اشدیلہ سے میڈرڈ جرنل کی گاڑی میں سوار ہوئی تھی اور پھر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ نازلا فنا لیبازٹریز میں کام کرتی تھی بعلبک کے راستے میں پڑتا تھا... میرا ارادہ تھا کہ میں واپسی پر فنا نامی اور جبران مجھے معلوم تھا کہ مجھے سامنے پا کر اس کے پہلے الفاظ کیا ہوں گے... واللہ مستغفرہ“

”کیا تو ان راتوں کو یاد کرے گی جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے۔ تیرے نفس کی شعاعیں ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں۔ کیا تو ان جنبی کی بلیوں کو یاد کرتی ہو گی جن کی شاخوں کے سائے میں ہم بیٹھے تھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ نگیں تھیں کہ ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپاتے ہوئے ہیں۔ کیا تو ان نگلیوں کو یاد کرے گی جو ہم چلتے تھے۔ تیری انگلیاں میری انگلیوں میں اس طرح پویست تھیں جیسے نازلا کی انہی انگلیوں میں آج یقیناً ایک سٹین گن پویست ہو گی کیونکہ کارڈ میں ہم نازلا اور مستنصر تھے اور آج لبنان میں... ایک رومن کیتھولک اور ایک مسلمان... دل گرفتہ۔“

”میں نے ایک سروس ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور ہٹل واپس آ گیا۔ احمد بدستور اپنے نقشوں میں مگن تھا۔ اُس نے آہٹ پر سر اٹھایا۔“

”نہیں گئے؟“

”شیاخ میں فائرنگ کی وجہ سے پورے کینسل کر دیا گیا ہے۔“

باہر بیٹھے ہوئے تھے، بچے سائیکل چلا رہے تھے اور چند ریڑھی والے خورد و نوش کی اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ ایک بظاہر بوسیدہ عمارت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک ڈھلتی عمر کی خاتون باہر نکلی اور پھر احمد کو دیکھ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ بیڑھیان ط کرنے کے بعد ہم ایک نہایت جدید طرز سے سجے ہوئے مختصر کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمارا رہبر فلسطینی اور خاتون باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد تین فلسطینی کمرے کے اندر آئے۔ ان میں دو احمد کے ہم عمر ہوں گے اور تیسرا ایک عمر رسیدہ بوڑھا، اور وہ سب مسلو تھے۔ احمد نے میرا تعارف کرایا اور پھر ان سے باتیں کرنے لگا۔ اُس نے انہیں وہ نقشے دکھائے جن پر وہ پچھلے دور وز سے سُرخ لکیریں کھینچتا رہا تھا اور پھر فلسطینیوں کے کئے ہوئے کچھ رد و بدل کرنے لگا۔ اتنے میں وہ خاتون پھر آگئی، تھوہ اور میٹھی روٹی ایک ٹرے میں سجاتے۔ ہم سب تھوہ پینے لگے۔

نوجوان فلسطینی تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ ان میں سے ایک کا جانی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں زیر تعلیم تھا اور وہ پاکستانیوں کے اخلاق اور مہمانداری کا بے حد مداح تھا۔

”ہم پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں۔“ اُس نے انگلیوں سے اُفٹح کا ”و“ بناتے ہوئے کہا۔

”اور بھو تو کو نہ بھولو“ بوڑھا فلسطینی بولا۔ ”بھو تو گڈ مین“

احمد نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ ”کیا کوئی ایسا

کام ہے جو ہم اس دوست کے سپرد کر سکتے ہیں؟“

انہوں نے خوشگوار حیرت سے میری جانب دیکھا۔ عربی میں چند فقرہ کہنا

ہوا اور پھر بوڑھے نے پوچھا۔ ”کیا تم شادی شدہ ہو؟“

”ہاں“

”بچے بھی ہیں؟“

”سبوت اور سمیر“

وہ اتنی بے ساختگی سے ہنسنے جیسے میرے بیٹے ان کے سامنے کوئی اُوٹ پٹانگ دیکھ کر رہے لگے ہوں۔

”کیا آپ کوئی ہتھیار چلا سکتے ہیں؟“

”بلی دبا کو نسا شکل کام ہے؟“ میں انہیں کیسے بتانا کہ خطرناک ترین ہتھیار جس کے استعمال پر مجھے دسترس حاصل ہے غلیل کہلاتا ہے۔

”آپ بریت میں کتنا عرصہ قیام کر سکتے ہیں؟“

”زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ...“ میں نے گھریلو مجبوریوں کا ذکر کیا۔ بہن بھائیوں کی شادیاں، بوڑھے والدین اور منتظر بیٹے۔

انہوں نے سر جوڑے اور کھسکے پھسکے گئے۔ میں اس دوران انٹر ویو کے لئے حائف کسی امیدوار کی طرح پاؤں کی انگلیاں سکپڑتا بیٹھا رہا۔

”السیڈی مستغفر!“ بالآخر بوڑھا گویا ہوا۔ ”ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا اور آپ پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے ایسا کیا ہو ہمارے لئے ہتھیار اٹھانے والوں میں پاکستانی بھی ہیں... پچھلے ماہ اسرائیل کے اندر ہمارے چھاپہ مار گروپ کے جو نوجوان شہید ہوئے، ان میں سے ایک آپ کا ہم وطن تھا...“

”اور ہمارے ساتھ چند یہودی بھی ہیں، ترقی پسند اور صیہونیت کے خلاف ہماری

بہر جدوجہد پر یقین رکھنے والے...“ نوجوان فلسطینی کہنے لگا۔

دنگ ہوئی، ان تینوں کی آنکھیں مجھ سے اٹھ کر دروازے پر گئیں۔ وہی خاتون

آواز تھوڑے کا ایک صراچی منابر تن لے کر اندر آگئی۔

”تو آپ مہربان دوست ہیں...“ بوڑھا پھر متوجہ ہوا۔ ”ہمارے لئے یہی

نہ ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ خیال ہمیں تقویت بخشتا ہے لیکن... آپ تین چار



یونیکو کے کسی سکا لرشپ کے حقدار ٹھہرے اور پچھلے ایک برس سے بیروت یونیورسٹی کے ڈپلومہ کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کے آزاد ماحول، لکڑیوں کے بے حیا لباس، بیروت کی بیباکی اور اسی قسم کی دیگر خوبصورت چیزوں سے تنگ نہ ہوتے تھے اور بار بار چیک نمبر ۲۰۳ گ۔ ب فیصل آباد کی اخلاقی قدروں اور شرفانہ ماحول کو یاد کرتے تھے۔ قدرے شرمیلے بھی تھے چنانچہ یونیورسٹی کے سونگ لڑل میں اندھیرے جا کر نہا آتے تھے کیونکہ بقول اُن کے اس کے بعد وہاں ننگی ننگی لڑکیاں نہا نہانے لگتی تھیں۔ میں پاکستانی سفارت خانے جانے کے لئے اٹھا تو وہ اندراہ ہمدردی سے ہوتے، الحما ربیچ کر وہ شروع ہو گئے۔ ”بس مستنصر صاحب آپ کو کیا تیرہ کم ہم اپنے آپ کو کتنی مشکلوں سے ————— یہاں محفوظ رکھتے ہیں... صرف اس الحما کے میل ڈیڑھ میل کے علاقے میں سو سے زیادہ شراب خانے ہیں۔ میں نے خود گئے ہیں یعنی ہر سپرہ میں گز کے فاصلے پر ایک بار... وہ جو سیڑھیاں نیچے اتر رہی ہیں، کیجئے اُن کے نیچے بار ہے اور اُدھر وہ جو کتابوں کا سٹورنگ رہا ہے اُس میں بھی شراب خانہ ہے... اور لڑکیاں تو صاحب بالکل برہمنہ گھومتی ہیں، ننگ پٹنگ... وہ دیکھتے وہ لڑکی راکھ کے رنگ کے بالوں والی، مٹرخ شوز، نارنجی سکٹ اور گلابی نیل پالش میں جو بالکل طرف آرہی ہے تو اُس نے بلاؤز کے نیچے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا...“

”اچھا...؟“ میں نے باچھیں کھلا کر کہا۔

”جی؟“ اُنہوں نے تیورسی چڑھا دی۔

”میرا مطلب ہے لاسمول ولا...؟“

”بالکل... بسی بھرو کپڑے کی بنیان سی مین ہوئی ہے۔ سب کچھ تو نظر آ رہا ہے۔ تو سی... حد ہے بے شرمی کی...“ اتنے میں وہ خاتون ہمارے قریب آ کر کھینچنے صاحب گردن گھما کر اُسے پیچھے سے دیکھنے لگے اور بدستور بدنی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ ”اور ذرا دیکھیں بل کس طرح رہی ہے چلتے ہوئے... حد ہے...“ الحما

پاکستانی سفارت خانے میں طالب میر ایک عجیب و غریب مشکل سے دوچار تھے۔ پندرہ پاکستانیوں کا ایک گروہ سفارت خانے میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ جناب ہم دروازے بھوکے ہیں، ہمارے پاس ایک دھڑی بھی نہیں جس فندق میں ٹھہرے تھے، وہاں سے نکالے گئے ہیں اس لئے آپ کھانا کھلائیے، رہائش کا بندوبست کیجئے اور ہمیں جرنی پہنچانے کا بندوبست کیا جائے، ہم وہاں سمگل ہونا چاہتے ہیں... چونکہ سفارت خانے کے پاس اس قسم کا کوئی ایمر جنسی فنڈ موجود نہ تھا اس لئے طالب میر صاحب نے اپنے پتے سے اُنہیں خوراک کے لئے رقم دی اور ایک شب کے لئے سفارت خانے کی چھت پر سونے کی اجازت دے دی۔ قسمت کے یہ شکاری اگرچہ بُرے حالوں میں تھے مگر اُن کا ایک ذوق ساتھی باقاعدہ لٹک رہا تھا۔ بال تیل سے چھڑے ہوئے، بوسکی کی شلوار قمیض، کپڑوں کی انگوٹھی، کلائی پر کھڑکی، چمکتے بوٹ، گورا چٹا اور چمکتا ہوا، کبھی اس ساتھی کے ہاتھ لگتا تھا کہ کبھی دوسرے کی کمر میں کتنی مار کر ہنستا ہنستا دھڑا ہوا جاتا۔ اُس پر ہاتھ لگتا تھا کہ میر صاحب نے قدرے دُرشتگی سے کہا۔ ”اگر آپ واقعی دروازے بھوکے

ہیں تو اپنے اس ساتھی کی گھڑی اور انگوٹھی فروخت کر کے خوراک حاصل کر لیتے۔ انہوں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ اس طرح کیا جیسے یہ بات ان کی گھڑی نہ آئی ہو۔ میر صاحب نے پھر سوال دہرایا۔ وہ سب قدرے خفا ہو گئے اور ان میں سے ایک جو خاصا اُدھیر عمر تھا، بولا ”صاحب، بال بچوں سے دُور، وطن سے دُور، بیویوں سے دُور... کچھ تو خیال کریں، کبھی کسی نے گھر والی کے گھسنے بھی نیچے ہیں؟“ میر صاحب نے صدمے سے دوچار ہوتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ہونٹ دانت تلے دبا کر مسکراہٹ روک رہا تھا۔ انہوں نے اپنے پائپ کو بھرا دانتوں میں دبا لیا۔

بیروت یونیورسٹی کے نواح میں ایک اچھ منزلہ عمارت کی لفٹ تیزی سے اُپر جا رہی تھی۔ آٹھویں منزل پر میں اور میر صاحب باہر آ گئے۔ ”اس طرف؟“ میں نے طویل برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ ”نہیں اس طرف“ میر صاحب ایک تاریک کونے میں روپوش آہنی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

”یہ تو غالباً چھت پر جانے کے لئے ہیں؟“

”ہاں“ وہ پُریچ سیڑھیوں پر گھومنے لگے۔ میں بھی پیچھے ہو گیا۔

آج پچھلے پر میر صاحب کے ایک دوست کے ہاں بیروت یونیورسٹی میں تین چاند پاکستانی نوجوانوں نے نہ صرف میری تحریروں کے پُر شوق حوالے دیئے بلکہ خوش فہمی میں مجھے اپنے فلیٹ پر رات کے کھانے کے لئے بھی مدعو کر ڈالا۔ اب میں سیڑھیوں پر گھومتا ہوا اُپر جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فلیٹ تو آٹھویں منزل پر ختم ہو گئے، چاند جانے کو نئے آسمان پر مقیم ہیں۔

یکدم سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور ہم ایک نیچے چھت کے برآمدہ نما کمرے میں جا رہے۔

بیروت کے بازاروں میں رنگینی تاریک دہشت بہت نیچے تھی۔ پوری آٹھ منزلیں نیچے یہ وسیع صحن جس میں شعلیں ہلکی ہلکی ہوا میں پھڑپھڑاتی جا رہی تھیں۔ شہر سے کٹ کر اُپر آچکا تھا آسمان کی خاموش نزدیکی میں۔ اس پاس کی عمارتوں کی پہلی چند منزلوں پر والی گھر لگیاں یا تو بند تھیں اور یا ان کے اندر کی روشنی پردوں میں مٹی ہوئی تھی۔ ان سے اُپر کہیں کہیں ایک آدھ گھر کی کھلی تھی کہ وہ نیچے بازار میں سے فائر ہونے والی گول کی زد سے تقریباً باہر تھیں۔ اندر کمرے میں کسی نے ”ہیرا رنجھا“ کا کیسٹ آن کر دیا۔ آسمان کے ساتھ گھر بھی قریب آ گیا۔

بلند عمارتوں کے چہرے کہیں کہیں سے روشن تھے مگر ان کے پاؤں شہر کی گلیوں میں تاریک تھے اور ان میں لوگ تھے، انتظار کرتے ہوئے، اپنے اپنے پتے چھپاتے، ان کے پاس بادشاہ ہے اور کس کے پاس جوکر؟

جب جی کوئی گمان جانے کے لئے اُٹھتا تو میں بھی اپنی نشست پر پہلو بدلتا مگر ”پ“ نہیں جاسکتے۔“ اور میں خود اس عارضی عافیت کی چھت سے اتر کر دکھتی ہوئی

زمین پر قدم رکھنے سے گریزاں تھا۔

میر صاحب کھانے کے فوراً بعد چلے گئے کیونکہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں فکر مند تھے۔

## بیروت - خدا حافظ

روشنے کا ساحل سیاہ تھا۔ اس پر جھکے شاندار ہٹلوں کے سلسلے نے آئندہ چند روز میں آگ سے روشن ہو کر اپنی بنیادوں پر گرنا تھا۔

کمرے میں سے آتی ہوئی ہیر کی آواز مجھے فریب دے رہی تھی۔ یہاں سے اٹھو گے تو کھر چلے جاؤ گے۔

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا، ایک بج رہا تھا۔ مشعلوں کی لوجھی تاریکی کے بڑے سے تھکتی ہوئی سمٹ رہی تھی۔

ایک نوجوان مجھے نیچے چھوٹنے آیا تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ نوبے سے پیشہ واپسی کے قانون کو توڑے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے ہیں اور میں بیروت میں ہوں اور

ہوٹل صبح سکوتر میں ہے۔ قابلِ فہم طور پر سڑک خالی تھی اور سیاہ تھی۔ ہم غامی دیواروں

میں کھڑے انتظار کرتے رہے، بالآخر ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ ڈرائیور کے ہمارے پاس

ایک ساتھی بھی تھا۔ میرے میزبان نے عربی میں اُن سے کچھ کہا اور میں ٹیکسی میں سوار

ہو گیا۔ اگلی نشست پر دونوں لبنانی نہایت مدہم آوازیں باتیں کر رہے تھے۔ اُن

کے سروں کا زادیہ بدلتا تو میں چونک جاتا، شاید وہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہے

ہیں۔ تاریک راسوں میں ٹیکسی کے اندر جلنے والی روشنی سڑک پر کچھ کہہ رہی تھی۔

میرے چاروں طرف شہر کے گھر اور محلے رات کے سمندر کی سطح کے نیچے رہتے تھے۔ کس کا دم ساتھ دیتا ہے اور وہ قائم رہتا ہے اور کس کا دم اُلتا ہے اور

جنگ کے پانیوں کو پھینچڑوں میں بھر کر سطح پر چھوٹے ہوئے بدن سے تیرتا ہے۔

ہاتھ میں بادشاہ ہے اور کس کے ہاتھ میں جوکر... انتظار!

دھاک آنا شدید تھا کہ میں بے اختیار لڑھکتا ہوا بستر سے فرش پر منتقل ہو گیا۔ اسی لمحے کا ایک بڑا شیشہ فریم سے جدا ہو کر تالین پر آگرا۔ میں سانس روکے سفید چادر میں

باتی کی طرح لپٹا پڑا رہا۔ باہر رات تھی۔ کمرے کے ٹھہرے ہوئے اندھیرے میں حرکت

نہیں... احمد حمیری طرح فرش پر پھینک دیا گیا تھا، دھیرے سے اٹھا اور زمین میں چلنے

لے ایک بچے کی طرح ہاتھ پھیلاتے پھر بستر پر دراز ہو گیا... ایک اور زوردار دھماکہ

راکھڑی کے بقیہ شیشے کانپے۔

”احمد!“

”کیا ہے؟“ وہ تکیے میں سے بڑبڑایا۔

”یہ دھماکہ کیسے ہیں؟“

”سوجاؤ، کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن کیسے سوجاؤں؟ میں نے جھلا کر کہا۔“ باہر تپہ نہیں کیا کیا چل رہا ہے۔“

”سینڈ گریڈ پٹھے ہیں، شاید اسی عمارت کے کسی حصے میں... سوجاؤ، سوجاؤ۔“

الٹکی بے اعتنائی میرے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ باہر جو کچھ بھی پھٹ رہا ہے اگر کھڑکی

ساتھ اندر آگے اور کمرے میں پھٹ جائے تو، مگر وہ دودھ سے شیراب ہو کر سونے

کے بچے کی طرح پاؤں پسارے چھوٹے چھوٹے خراٹے لے رہا تھا۔ میں بدن پر لپٹی ہوئی

بدنیت لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور دیکھتا ہوا بستر پر لیٹ گیا... تھوڑی دیر بعد شیش گن

بنیادوں کی تہ میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا اور مجھے تھما دیا۔ ”بھرا ہوا ہے، دروازے والی دیوار کے کونے میں بیٹھ جاؤ اور اگر دروازہ بکرم کھلے تو... شوٹ“ ”شوٹ؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔  
وہ شاید اندھیرے میں مسکرایا ہوگا۔

میں کونے میں جا کر ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ حقوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ میں نے پستول کو دیسے ہی تھام رکھا ہے، بلبی پر انگلی نہیں جاتی اور نہ ہی نالی کا رخ دروازے کی جانب کیا ہے چنانچہ بڑی مشکل سے بلبی تلاش کر کے انگلی پیٹی اور اُسے سیدھا کر دیا۔  
”اب تو خوفزدہ نہیں ہو؟“

”اب بھی ہوں... دروازے کا تو بند و بست ہو گیا مگر کھڑکی میں سے آنے والے مینڈ گرنیڈ کا کیا ہوگا؟“

”اس کے بارے میں کچھ نہیں ہو سکتا...“ اُس نے پاؤں بستر پر رکھے اور لیٹ گیا۔  
”کھڑکی بند تو کی جا سکتی ہے ناں؟“  
”شیشے کی ہے، فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ اُدھکھنے لگا۔ موت کا ایک دن معین ہے پراس کا ایمان غیر متزلزل دکھائی دیتا تھا۔

باہر متواتر فائرنگ ہو رہی تھی، چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔  
میں نے یوں کونے میں چپکے ہاتھ میں پستول تھامے اپنے آپ کو کچھ کچھ محسوس کیا۔ تمہیں اتنے شور میں مینڈ آ جاتی ہے؟  
”ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”کون سے شور میں؟“ اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔  
”اے...“ اُس نے سستی سے پھر اپنا سوٹ کیس کھولا، ایک اور پستول نکالا اور کمرے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ ”اب خوش ہو؟“

میری آنکھیں دروازے پر اتنی شدت سے چپکی ہوئی تھیں کہ پوٹے دکھ رہے تھے۔ کراہتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بلبی پر پیٹی انگلی پسینے سے تر تھی، پھسلتی ہوئی۔

کا ایک برسٹ فائر ہوا... میں ایک منہماتے ہوئے قہقہے کے انتشار میں رہا مگر چونکہ نہ پہنچا۔ صرف دوڑتے ہوئے قدم اور آوازوں کا ملا جلا شور... اس فائر کا جواب کہیں دُور سے آیا اور پھر باقاعدہ تبادلہ شروع ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز بے معرور اور جعلی لگ رہی تھی جیسے کوئی کھوپڑی دانت کٹکتا رہی ہے یا مین کی جھت پر گرا برس رہے ہیں۔ اس دوران ایک اور دھماکہ سنائی دیا، کانوں کے قریب، شاید ہماری کھڑکی کے عین نیچے۔ فائرنگ اتنی گھنی اور شدید ہو رہی تھی کہ کسی ایک منٹ کا آہنی بہاؤ علیحدہ نہیں ہو پاتا تھا... یکدم میرے ذہن میں یہ خدشہ اُبھرا کہ اس سکتا ہے حملہ آور فلاحی ہوں اور پچھلے اپریل کی طرح آج بھی اس ہوٹل میں قتل مہمان حضرات کو شہید وغیرہ کر دیں۔

”احمد۔“ میری آواز میں خطرے کا گھگھکیانا ہوا سارن تھا۔  
”سو جاؤ۔“ ایک انتہائی بیزار آواز آئی۔  
”احمد کیا تم جانتے ہو کہ فلاحیوں نے پچھلے اپریل اس ہوٹل میں مقیم چند ماہوں کا ہلاک کر ڈالا تھا؟“

”ہاں۔“  
”تو پھر؟“  
”تو پھر کیا... ہوتا ہی رہتا ہے، سو جاؤ۔“  
میں بستر سے اٹھا اور جھکا ہوا احمد کے قریب چلا گیا۔ اگر کسی نے کوئی سے مینڈ گرنیڈ پھینک دیا تو؟  
احمد مجبوراً اٹھ بیٹھا۔ ”تم خوفزدہ ہو؟“  
”بڑی طرح۔“

”ہاں انسان ہتھیار کے بغیر بے سہارا محسوس کرتا ہے۔“ وہ جامہ پالنے سے بستر سے اُترا، اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالا اور استری شدہ فیضان

باہر سے آنے والی فائرنگ کی آواز جتنی شدت اختیار کرتی، اُسی حساب سے ہتھوڑوں میں گرتی گرتی میری گزرتی ہو جاتی جیسے میری نم انگلیوں میں گرم ہوتی یہ دھات میرے جسم کو ٹپٹ پر فٹ بنا دے گی۔ یہ طلسمان ہے جو مجھے محفوظ رکھے گا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے دروازے سے نظریں ہٹائیں اور پستول کی نالی کو دیکھا جو میری ناک سے پھانسی کے فاصلے پر خفیف سی لرز رہی تھی اور پھر دروازے پر آنکھیں چپکا دیں... میں نے پستول کی طرف دیکھا... میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس گھر سے پیاس کیوں بجھائی جس میں دیوانگی سیاحت کے پانی تھے۔ کوہر کے بیل کی زندگی کتنی خوبصورت تھی، ایک ڈگر پر، شب و روز ایک ہی روشنی کی تاب، برس بار برس گزر جاتے ہیں اور وہی چہرے، وہی ایک ناشتہ دکان، پھد آنے پائونڈ اوتے یوسف... گھر واپسی پر ٹیبلٹیں کے سامنے بت بنے بیٹھے رہنا لیکن اپنے گھر میں... پُرسکون، دھماکوں سے پاک، ٹھیک ہے اُس زندگی کا حساب نہیں تھا۔ انسان متواتر زندہ تو رہتا ہے۔ کبھی اُس کی کھڑکی تلے گر نیڈ نہیں پھٹتے مہینوں کے برسٹ نہیں چلتے اور وہ ایک بھرے ہوئے پستول کو تھامے خون میں توجہ اور سکوت کی جتنی قوت ہوتی ہے اُسے آنکھوں کے راستے دروازے پر منتقل کرتا ہوا لگے سانس کی بے یقینی میں تو سانس نہیں لیتا... متواتر زندہ تو رہتا ہے۔

آج رات دس بجے ترک جہاز اکنڈیز بیروت کی بندرگاہ سے لنگر اٹھا رہا تھا۔ میں اُس کا متوقع مسافر تھا... پچھلے چند روز زیادہ تر اسی جھٹ کی نیم غایت میں احمد ایک ہمدرد اور اپنے پتھر کے چہرے کے نیچے ایک سیاہ جس مزاج رکھنے والا تھا اور ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں صرف خوراک خریدنے کے لئے باہر جاتا یا کبھی کبھار کی نشست پر واقع ایک دیسی قسم کے تھوہ خانے میں چلا جاتا جس کا تھوہ شاید کسی کو ٹوٹی سے کشید کیا جاتا تھا کہ میرے اعصابی تناؤ کو یکدم نازل کر دیتا اور حقے پر کش مجھے آس پاس سے لمحاتی طور پر بے خبر کر دیتے۔ ایک دو مرتبہ انحراف کرنے

نہایت سے زیادہ دکانیں بند تھیں اور سی تھرو خواتین یکسر غائب ہو چکی تھیں البتہ بنانے تھے والالبنانی کبھی مایوس نہ کرتا۔ وقت کی پابندی کرتا اور صبح شاید ہائی ہی تفریح کی خاطر دو چار برسٹ ضرور چلاتا اور سہنس سہنس کر دوسرا ہو جاتا... میں اُس کی آمد کا انتظار رہتا اور ایک صبح اُس کے پہلے فائر کو سن کر میں نے اپنی نرہی درست کی، چار بج کر دس منٹ...

تقریباً ایک گھنٹے سے مہینڈ گرینیڈ کا کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا البتہ فائرنگ وقفوں سے ہر ہی تھی... اور آج رات دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے ترک جہاز اکنڈیز لڑاں ہونا تھا، اذیتوں سے محبتوں اور رعنائیوں کی طرف... صبح کے آثار کے ساتھ جیسے متباب تو توں کے ہاتھ تھکنے لگے اور چھ بجے کے قریب فائرنگ بالکل ختم ہو گئی۔... تھوڑی دیر بعد قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی، بازار میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ روزمرہ کی آوازیں سے بھر گیا... احمد منہ پر پھیلی رکھے تھکاوٹوں کو روکتا اٹھا... میں نے خالی ہاتھ سے پستول کی نالی تھامی اور دستے پر سمیٹ ہوتی انگلیوں سے مشکل غلطیہ کیا۔

احمد نے پستول سوٹ کیس میں رکھے اور اپنے نقشے نکال کر بیٹھ گیا۔ یہ آوازیں آگ نہیں ہیں۔ خواجہ فروشوں کی دہائی، ٹریفک کا شور، بچوں کی آوازیں، فائرنگ اور دھماکے، یہ سب ایک ہی جہاد میں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ اگر ہم ہر دھماکے پر چلنے ہو کر پستول نکالتے رہیں تو زندگی معطل ہو جاتے۔ "اور اگر فلائجی سچ ہوٹل میں گھس آتے یا کھڑکی کے راستے مہینڈ گرینیڈ چھینک دیتا تو؟"

وہ ہنسا "تو پھر ہم یقیناً مارے جاتے۔ ویسے بھی پستول تھام کر نیڈ خراب کرنے میں کوئی فائدہ نہ ہوتا... اگر فلائجی آہی جاتے تو وہ دروازہ توڑ کر پہلے مہینڈ گرینیڈ پھینکے پھر داخل ہوتے اور ظاہر ہے تم اندر ہی رہتے مگر قدرے بکھرے ہوتے..."



عزیز کیا، دھلتی عمر کا ایک گورا چٹا مچکا مچکا شخص۔

”عزیز دیے تو ہمارے ہاں ڈرائیور ہے مگر بیروت شہر کو اس سے بہتر کوئی نہیں

باتا۔“

گویا یہ شخص بیروت کے سفارت خانے کا محمد علی تھا۔

میر صاحب نے میرا تعارف کروایا کہ یہ میرے دوست ہیں، آج رات دس بجے

کا جہاز چلے گا اور بندرگاہ سے چلے گا... تم کیا کہتے ہو؟

”یہ نہیں جاسکتے۔“ عزیز نے سستی سے کہا۔

”آپ نہیں جاسکتے۔“ میر صاحب نے فوراً تائید کی۔

”کیوں؟“

”جہاز میں سوار ہونے کے لئے آپ کو بندرگاہ پہنچنا ہوگا اور وہاں آپ پہنچ

نہیں سکتے کیونکہ آج صبح بیروت پولیس نے ریڈیو پر جن خطرناک علاقوں کا اعلان

کیا ہے بندرگاہ ان میں سر فہرست ہے۔“

”عزیز صاحب اگر میں اپنی بالکونی سے جھانکوں تو بندرگاہ نظر آ جاتی ہے... میرے

خیال میں تو...“

”بندرگاہ تک پہنچنے کے لئے آپ کو اس علاقے میں سے گزرنا ہوگا جہاں حرکت

کئی ہوئی ہر شے پر فائرنگ ہو رہی ہے... مجھے انسو ہے کہ آپ اس جہاز پر

سوار نہیں ہو سکتے۔“

”اگر میں اس جہاز پر سوار نہیں ہوتا عزیز صاحب تو ملکٹ کے ایک سودو ڈالرفناٹ

بمٹے ہیں...“

”اگر آپ سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔“ عزیز اُسی لاپرواہ سستی سے بولا

”آپ کی زندگی ضائع ہوتی ہے۔“

میں نے پچھلے پانچ روز اس آس میں گزارے تھے کہ بالآخر میں زندہ عذاب میں

اور اگر کھڑکی کے راستے ہینڈ گرنیڈ ہمارے قالین پر آگرتا تو کیا تم اسے پہنچا

شوٹ کر دیتے؟... انسان کو ذہنی طور پر دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیے۔“

نے تمہارے لئے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہوگا۔

میں نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے شیشے پھینچے اور ٹوکری میں پھینک دیئے۔

پرایا تو نیچے بازار میں زندگی ایک بے خوف روانی سے حرکت کر رہی تھی جیسے ہندو

کسی نے سڑک کے بیچ ایک سٹیئر یوٹیک رکھ کر لوگوں کو دھماکوں اور گولیوں کی آواز

سنائیں اور پھر کیسٹ ختم ہونے پر چلا گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ناشتے کے بعد میں سروس ٹیکسی کے ذریعے سفارت خانے پہنچا تو میر صاحب

کمرے میں موجود نہ تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب وہ آئے تو قدرے پریشان آئے۔

دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔ ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”بیروت چھوڑنے سے پیشتر خدا حافظ کہنے آیا تھا۔“

”خدا حافظ۔“ انہوں نے شتابی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ ”آپ ہوٹل سے فون پر

بات کر لیتے تو بہتر تھا... مگر آپ یہاں تک آ کیسے گئے؟“

”سروس ٹیکسی سے۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ صبح سو کوٹر کے قریب آج صبح کیا ہوا ہے؟“

”جو کچھ ہوا ہے وہ میری کھڑکی کے عین نیچے ہوا ہے مگر اب تو حالات بدلنے

فی الحال۔“ میر صاحب کچھ زیادہ ہی فکر مند تھے۔ ”آپ کا جہاز کتنے بجے چل رہا ہے؟“

”رات دس بجے۔“

”اور بندرگاہ سے چلے گا؟“

”ظاہر ہے۔“

”مگر بندرگاہ تو...“ انہوں نے فقرہ ادھر اچھوڑ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

کلرک اندر داخل ہوا۔ ”عزیز کو بلاؤ۔“

”ہوں۔“ اُس نے چند لمحے قالین کو گھوڑنے میں گزارے اور پھر سر اٹھا کر بولا۔  
 ”بزدلی تو نہیں کہ تم رات کو ہی یہاں سے نکلو، جہاز تو اس وقت بھی بندرگاہ میں  
 کڑا ہو گا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فوراً چلے جاؤ۔“

”اور اگر جہاز وہاں موجود نہ ہوا تو؟“  
 ”تم بندرگاہ کے اندر انتظار کر سکتے ہو۔ وہاں نسبتاً محفوظ رہو گے۔“  
 تین بجے ہم ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ میں رُک سبک کا ندھے پر رکھے  
 اور احمد جیکٹ کی جیب میں پستول رکھے۔

ٹیکسی رکتی، ”احمد ٹینا“ کا لفظ ادا کرتا اور ڈرائیور ہماری سادہ لوحی پرسکرتا  
 پانچاٹا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور کا احمد ہماری  
 رینک اُس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔

”میں ساتھ نہ جاؤں تو تمہارے لئے بہتر ہے۔“ احمد نے ایک پُر جوش معانقہ کیا۔  
 میں فلسطینی لگتا ہوں اور میں بھی۔ تم اکیلے عجیبو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔“  
 ”کل صبح اُس مہناتے ہوئے گھوڑے کو میرا سلام کہنا جو ہر صبح کھڑکی کے نیچے  
 سین گن چلانے آ جاتا ہے۔“

”میں صرف تمہاری خاطر ٹھہرا ہوا تھا، آج میں بھی چلا جاؤں گا۔“  
 ”کہاں؟“

”کہیں۔ واپسی کے دن کو قریب لانے کے لئے۔“ پتھر چہرے سے ہرٹ علیحدہ  
 بڑکھڑکھاتے ہوئے مسکراتے۔

ٹیکسی چلنے لگی تو وہ کھڑکی پر جھکا۔ ”اسے پانچ ڈالر ادا کر دینا۔“  
 ”پانچ ڈالر؟“ میں نے حیران ہو کر ڈرائیور سے پوچھا۔ ”ایک کلومیٹر کے لئے پانچ ڈالر؟“  
 ”میں نے جواب دینے کی بجائے ایک ناراض نظر سے دیکھا کہ بھی بڑے ناشکرے ہو۔  
 لٹوڈی کا پوچھنا تک ٹیکسی مہوار زرقار سے چلتی رہی۔ ٹریفک بھی تھی، لوگ بھی

مبتلا اس شہر سے نکل جاؤں گا۔ اس سے پیشتر کہ وہ زمین بھی گرم ہو جائے جس پر ہم  
 کھڑا تھا۔ اور اب میرے سامنے ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس کو ہاتھ لگا کر کھولنا ہی نہیں  
 ہوں تو ہو سکتا ہے اس میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو، اور اگر نہیں کھولتا تو شاید بجلی کی  
 وہی لہر دھیرے دھیرے اُس زمین میں بھی آجائے جس پر میں کھڑا تھا۔ نہ بھاگا جائے  
 ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جاتے ہے مجھ سے۔

”میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے بولا۔  
 ”میں پہنچ جاؤں گا۔“

عزیز نے فون اٹھا کر بیروت پولیس کے ہنگامی دفتر سے بات کی اور پھر شہر کے  
 ایک نقشے پر سرخ نشان لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس پر بندرگاہ تک جانے  
 کے لئے ایک روٹ بنایا ہے جو پولیس کے مطابق نسبتاً کم خطرناک ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور  
 سے کہنے لگا کہ صرف اسی راستے پر چلے اور اللہ آپ کی مدد کرے۔

”خدا حافظ۔“ میرا صاحب نے جلدی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ اُن کے چہرے پر  
 میری آخری رسومات تھیں۔

ٹیکسی کے لئے انحراف پانچا تو احساس ہوا کہ عزیز کی اطلاعات درست تھیں۔ رُک  
 ہر اسان خرگوشوں کی طرح چوکتے ہو رہے تھے، جھانک جھانک کر چل رہے تھے۔ گلا  
 گلی آتی تو رُکے، جھانک کر اطمینان کیا اور پھر جلدی سے عبور کر گئے۔ ان کے تہ  
 تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔... صبح سکورٹیں  
 کیفیت تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے احمد کو پوری تفصیل بتائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔  
 اور بالکل ہی جاکر دایں ہاتھ پر بندرگاہ کی طرف دیکھا، واپس آیا اور بہتر  
 ”حالات چاہے کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں سڑک پر سے گزرنے والی ہر ٹیکسی  
 پر فائر نہیں ہوتا۔ تمہارا جہاز کتنے بجے چلنا ہے؟“

”رات دس بجے۔“

نظر آ رہے تھے۔

ایک چوک آیا، آگے کا سماں بالکل غفلت تھا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھ کر گردن گھما کر کہنے لگا۔ ”مہم سٹرک کے دائیں ہاتھ پر چلیں گے اس لئے بائیں کوئی نہیں بیٹھ جاؤ۔ اپنا سامان ڈھال کے طور پر سینے کے آگے جالو تاکہ اگر ادھر سے... اور اگر ٹیکسی ایک دم رُک جاتے تو باہر کوڈ جاؤ...“ میں نے اُس کی ہدایات پر عمل کیا اور رُک سیک کو گھٹنوں پر رکھ کر کوئی نہیں دیکھ گیا۔

ٹیکسی پھر چلی۔ چوک کے آگے جیسے کوئی نیا شہر شروع ہو گیا ہو، سرحد پار کوئی نئی آب و ہوا تھی... ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ایک آدھ سر جھانکتا ہوا اور خاموشی۔ ٹیکسی دھیرے دھیرے چل رہی تھی، شاید دس کوڑ کی رفتار سے... کیونکہ تیز رفتار ٹیکسی پر ہمیشہ فائز ہوتا ہے۔ اُنہیں شک ہوتا ہے کہ اس میں سوار افراد گریڈ پھینک کر فرار ہونا چاہتے ہیں۔

میں کبھی کبھی کچھو سے کی طرح گردن اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھ لیتا... ڈرائیور اپنے سامنے نظریں ساکت کئے ہوئے ایک ہموار اور سست رفتار سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا انتظار تھا... ایک برسٹ فائز ہونے کی آواز کوئی ڈرائیور نے ایکسپریٹ اس شدت سے دیا جیسے وہ پاؤں تلے آتے کسی موزی سانپ کو کچل دینا چاہتا ہے۔ میں دیکھنے کی بجائے اتنا ہراساں ہوا کہ پہلے تو گردن اٹھا کر مزے سے باہر دیکھنے لگا اور پھر فوراً ہی اپنے آپ کو تشست سے گرا کر رُک سیک اپنے اوپر گھسٹ گیا۔ ٹیکسی کا انجن دھاڑتا ہوا شاید سوا سو کلومیٹر کی رفتار پر جا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی شاید سیٹ کے نیچے بیٹھا ہاتھ سٹیئرنگ پر رکھے ڈرائیو کرتا چلا جا رہا تھا۔ شاید دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ایک شدید دھچکے سے رُکی۔ میں باہر کوڈ دے کو تھا کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

”آجاؤ۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ہم بندرگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔“

میں باہر آیا تو وہ ٹیکسی کے گرد گھوم کر معائنہ کرنے لگا۔ رُکا، جھکا اور دو انگلیاں دستانہ تھرے سوراخوں میں ڈال دیں۔ ”میرا خیال ہے امریکی ساخت کی سٹین گن فنی سوراخوں کا سائز تو وہی ہے۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ گولیوں کے پھید میری طرف کے دروازے میں تھے۔ کرایہ ادا کیا تو وہ پھر سوراخوں کا جائزہ لینے لگا۔ ”تم کہتے تھے کہ پانچ ڈالز بہت ہیں۔ ان سوراخوں کی قیمت پر پورے پانچ ڈالر خرچ ہوں گے۔“ وہ قہقہہ مار کر منہسا اور اپنے فقرے پر محفوظ ہوتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی چانگ سے باہر نکل کر سیرت شہر کی طرف گئی تو میں نے پہلی مرتبہ بندرگاہ کو دیکھا۔ جاز “ایکڈنیز” ڈاک میں کھڑا تھا۔ ترکی اور لبنان کے جھنڈے مستولوں کے ساتھ لپٹے لہرا رہے تھے... آزادی۔

دائیں ہاتھ پر کسٹم ہال تھا، میں اندر گیا۔ خالم خالی، بے آباد اور بھلا بھلا کرتا ہوا۔ ایک کمرے میں سے ٹائپ مشین کی آواز آرہی تھی۔ دروازہ کھولا، اندر ایک ٹم ٹم ٹم ٹم ٹم ٹم پر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر وہ چوکتا ہو گیا۔ مجھے دیکھا اور غصے سے بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”میرا سامان چیک کر لیجئے، میں لبنان چھوڑ رہا ہوں۔“

اُس نے ٹھٹھک کر مشین سے انگلیاں اٹھالیں کہ یہ سیاح کیا کہہ رہا ہے اور پھر انتہائی بے چارگی سے کہنے لگا۔ ”بابا جاؤ جاؤ، کوئی چکنگ نہیں۔“

ایکڈنیز کی خالی سیڑھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں رُک سیک اٹھائے بندرگاہ کے خالی میدان میں سیٹیاں بجاتا اُس کی طرف چلنے لگا۔

ایک لبنانی پولیس افسر کرسی میز سجائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں قریب سے گزرا تو اُس نے پوچھا۔ ”پاسپورٹ؟“ میں نے پاسپورٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اُس نے تمام ذائقہ لپٹے اور پھر اپنے آپ میں مگن ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم لبنان نہیں چھوڑ سکتے۔“

گرم جیونیٹوں کا ایک لشکر میرے مساموں میں ریگنے لگا۔ کیوں؟

”تمہارے پاس لبنان پولیس کا اجازت نامہ نہیں ہے۔“ وہ اپنے اخباریں پڑھ رہے تھے۔  
”لیکن میرے پاس لبنان کا ویزا ہے اور میں لبنان چھوڑ رہا ہوں، اس میں کوئی بات نہیں ہو رہی۔“

”تم اس وقت تک لبنان نہیں چھوڑ سکتے جب تک تمہارے پاس پولیس کا ”خروج“ اجازت نامہ نہ ہو۔“

میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان وہیں پھینک کر سرپٹ بھاگتا ہوا جہاز میں جا گھسوں اور ترک بھائیوں سے سیاسی پناہ طلب کر لوں... لیکن یہ لبنانی بھائی بہنوں سے مستحق تھا اور خوفزدہ خرگوش کو شکار کرنا کتنا آسان ہوتا ہے... چاہے وہ سرپٹ ہی کیوں نہ بھاگ رہا ہو۔

لبنانی پولیس کا دفتر ظاہر ہے شہر بیروت کے کسی حصے میں ہو گا اور اگر میں وہاں تک پہنچ بھی جاؤں تو اجازت نامہ حاصل کرنے میں ایک دو روز تو لگیں گے چنانچہ خدا حافظ اکتوبر اور سہیلو مائی ڈیرسٹی آف بیروت میں تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔  
”یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ جا کر اجازت نامہ لے کر آؤ۔“ وہ میری موجودگی سے بیزار ہو گیا۔ ”تم اس کے بغیر جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے۔“

”کیا آپ اندازہ مہربانی بنا سکتے ہیں کہ یہ اجازت نامہ کہاں سے دستیاب ہوتا ہے؟“ میں دنیا جہان سے بیزار ہو چکا تھا۔

”بندر گاہ کے پھاٹک سے باہر، دایں ہاتھ پر روڈی پورٹ ہے تقریباً دو میٹر کے فاصلے پر پولیس کا دفتر ہے، وہاں سے۔“

بندر گاہ سے باہر، اُس علاقے میں جہاں مہربان ڈرائیور کی ٹیکسی چھیدلے سے نوازی گئی تھی۔ میں نے سوچا آہستہ آہستہ چلنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے، اس لئے کیوں نہ سامان یہاں رکھ کر ایک اولپک طرز کی دوڑ لگا کر پولیس کے دفتر پہنچ جا جائے۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اُس نے مجھے رُک سیک کاندھے سے اتار کر زمین پر رکھتے دیکھ لیا۔  
”سامان رکھ رہا ہوں، ذرا اجازت نامہ لے آؤں۔“

”لے جاؤ، لے جاؤ۔“ وہ رُک سیک کو اپنی چھڑی سے دھکیلتا ہوا بولا۔ ”اگر تم اُدھر راتے میں مارے گئے تو میں اس سامان کے بارے میں خواہ مخواہ وضاحتیں کرتا ہوں گا۔“

بندر گاہ کے پھاٹک کے باہر وہی دیرانی تھی جو اندر تھی مگر اُس میں گھنی پختی ہوئی ہر گھاس کا خوف تھا جس میں سانپ رینگتے ہیں۔

میں نے دایں ہاتھ پر جھانکا، دو سو میٹر کے فاصلے پر ایک عمارت کے ماتھے میں سے نکلتے ہوئے بانس پر لبنان کا پرچم لٹک رہا تھا۔ لبنانی پولیس کا دفتر... دو سو میٹر... جو مجھے پیدل طے کرنا تھا۔

میں نے دانت بھینچے۔ رُک سیک کے سٹریپ میں انگرٹھے ڈالے اور سر جھکا کر ٹرک کے عین درمیان میں آہستہ آہستہ چلنے لگا... مجھ پر رُک سیک کے علاوہ اُن نام نہاد لڑکیوں اور دروازوں کا بوجھ جھک رہا تھا جو میرے دایں اور بائیں مکانوں کے ماتھے دیکھ رہے تھے اور اُن چہروں اور دھاتوں کا بوجھ بھی تھا جو دیران سٹریٹ کے وسط میں چلتے ہوئے ایک پکڑی کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کی تو میت اور رنگ کے باپے نے تہذیب میں تھے، اس کی حماقت کے بارے میں تہذیب میں نہ تھے... خوف کا ہاتھ جسم کے پہنچ رہا تھا۔ اس میں سے سینہ پھوٹ رہا تھا... وہ مجھے دیکھ رہے تھے! انگلیں اور شاید پتلیوں کے درمیان میں چل رہا تھا مگر اس میں میت اور عمل کو دخل نہ تھا، بس میرے پاؤں میکا کی سپاہی آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ دھپ، دھپ۔ دایں اور بائیں، دوسری اور تیسری منزل پر کھڑکیاں تھیں، ان کے پیچھے پردے تھے، پردوں کے درمیان میں خلا کی

... شرب میرے گلے میں آگئی کانٹوں کی فصل کو نرم کرتا بخار زدہ جسم میں پھیلنے لگا۔ ایک اسیشن کتا ایک جرمن سیاح کو کھینچتا دفتر کے اندر آیا۔ سیاح نے اجازت مانگنے کے لئے درخواست کی۔ پولیس افسر نے اُس کے پاسپورٹ پر فوراً مٹر لگا دی اور مٹر کو آپ جہاز سے دوست کو اپنی ٹیکسی میں بندرگاہ تک لے جا رہے ہیں۔

”فرد“ جرمن نے سر ہلایا۔

ٹیکسی بندرگاہ میں رُکی۔ میں نے اجازت نامے پر پولیس افسر سے مٹر لگوائی اور... اندیز کی سفید سیڑھی پر تھکے قدموں سے چڑھنے لگا۔ رُک سیک کا بوجھ ناقابل برداشت ہوا تھا۔ آخری سیڑھی پر ایک لینکس امریکی کھڑا تھا، ڈھیلے بازوؤں اور ٹانگوں والا۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرا رُک سیک اُچک لیا۔ ”دیکھم البورڈ“ عرشے پر قدم رکھتے ہی اُس نے پرانے دوستوں کی طرح گرجوشتی سے میرا استقبال کیا۔ ”میں تمام کارروائی یہاں سے دیکھ رہا تھا... بوائے جب تم بندرگاہ کے چھاٹک سے باہر نکلے ہو تو میں اپنی زندگی کی شرط لگانے کو تیار تھا کہ تم واپس نہیں آؤ گے... دیکھم البورڈ اکنڈ نیز“

جہاز کے ترک غلے نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ جمع کر کے رسید لکھ دی ڈیک کلاس اپنے نام کے مطابق عرشے پر نہ تھی بلکہ جہاز کے پیٹ میں تھی، انجن روم سے ملحقہ۔ ایک بال ناگرہ جس میں یوتھ ہوشوں کی طرز پر دو منزلہ بستروں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ایک بالٹن بستر پر سامان رکھا اور سیلون میں آگیا جہاں گر تھ میرا انتظار کر رہا تھا۔

”کچھ پیو گے؟“

”بیرا خیال ہے مجھے اعتراض نہ ہو گا۔“

”سب سے پہلے تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ، پھر میں سناؤں گا۔“

میں نے مختصراً اپنی زندگی کی کہانی بیان کر دی۔

گورو دشتی کے امریکی سکول میں ٹیچر تھا اور آج صبح امریکہ جانے والی پرواز کے لئے تیار تھا۔ میں بیروت سے ایریپورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ایریپورٹ سے

ایک سیاہ لکیر تھی، اُس کے پیچھے کچھ بھی ہو سکتا تھا... دستک ہو رہی تھی، دل کے دھڑکنے کی دستک۔ جیسے ہاؤن دستہ موجد کوٹ رہا ہو، دھم۔ دھم۔ دھم۔ ایک میٹر نوڈل میرے اندر پوری دالیوم پر کھلا تھا۔ شریانیں اس کی دھمک سے لرز رہی تھیں دھم۔ دھم۔ دھم۔ ادب باہر کھڑکیوں اور دروازوں میں سے اترتی دہشت سے حاملہ تھی۔ جس گولی نے تمہارے لئے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہوگی... لیکن کونسی کھڑکی میں سے، کس دروازے کی اوٹ میں سے... جب گلے کا گلوں کو لگے تو احساس ہوتا ہے کہ انسان نے ابھی اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا اور تم... دنیا کی وحشی خوبصورتی کے نئے رنگ دماغ میں نیون سائنس کی طرح بھڑکتے ہیں... میں کیسے ان سے جدا ہوں گا... دھم۔ دھم۔ دھم۔ دھم... کل آسمان پر ایک پرنڈہ میرے گلا اور میرے پاس اُسے دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ ہوں گی...

پولیس افسر نے اجازت نامے کی مٹر پاسپورٹ پر ثبت کی اور میری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے السیدی تمہارا چہرہ سفید ہو رہا ہے، آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہوں“ میں نے پاسپورٹ جیب میں رکھا اور نزدیکی صوفے پر گر گیا۔

”آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟“

”بندرگاہ سے۔“

”میں نے باہر ٹیکسی رکنے کی آواز نہیں سنی۔“

”میں سپیل آیا ہوں۔“

جیسے سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اپنے آگے کھاتی دیکھ کر بدکتا ہے وہ ٹھٹھکتا... صبح سے تین لاشیں آچکی ہیں... آپ کو یہ رسک نہیں لینا چاہیے تھا... اب یہاں آرام کیجیے، کوئی نہ کوئی مسافر اجازت نامہ حاصل کرنے آئے گا اور ہم آپ کو اپنے گھر کے ہمراہ بھیج دیں گے... وہ تیزی سے پھیلے کمرے میں گیا اور ایک خنک شربت

چند میل ادھر شاہراہ پر تلاخچی دہشت پسندوں نے بیری کیڈ کھڑا کر رکھا تھا۔ بس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی اور ڈرائیور نے پھرتی سے بس کو واپس شہر کی جانب موڑ لیا۔ شہر کے قریب پہنچے تو انہیں ایک اور بیری کیڈ کا سامنا کرنا پڑا جو فلسطینیوں کا تھا۔ بیری کیڈ پہلے موجود نہیں تھا بلکہ اُس وقت کے دوران کھڑا کیا گیا جب وہ اس مقام سے گزر کر ایئر پورٹ کی طرف جا چکے تھے۔ یہاں بھی مشین گنوں نے انہیں پیچھے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ایک جانب فلاخچی ایئر پورٹ کا راستہ روکے ہوئے تھے اور دوسری طرف فلسطینی شہر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بس میں سوار تین امریکی فوجیوں نے فیصلہ کیا کہ سڑک چھوڑ کر یہاں سے سمندر تک پیدل جانا چاہئے اور وہاں سے کسی طور شہر پہنچا جاتے۔ باقی مسافر تو کسی غیبی امداد کے انتظار میں بس میں دیکے رہے اور گرتے اور دو امریکی چھپتے چھپاتے سمندر کی طرف چل دیے۔ سال پر پہنچ کر انہوں نے ایک مچھیرے سے اُس کی کشتی کا سودا طے کیا اور اُسے کہتے ہوئے بندرگاہ میں آگئے اور پھر یہاں پر بقول گرتے ”بوائے اود بوائے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بندرگاہ میں ایک جہاز یورپ جا رہا ہے اور آج ہی جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے فاضی کی تمام خبریں ان کو یاد کیا۔ اُن کے مونٹ چومے اور جہاز میں داخل ہو گئے۔ خوش قسمتی تم ایک نیا ہوا اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔“

”مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے۔“ وہ سیاہا ہو کر بیٹھا گیا اور مٹہ کھول کر ہنسنے لگا۔ ”جہاز حرکت نہیں کر رہا، میں شاید تھوڑا سانسے میں ہوں۔“ ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور وقت روانگی دس بجے رات دیا گیا ہے۔

اگرچہ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں مگر مجھے بھی کچھ دیر سے محسوس ہو رہا ہے جہاز ہل رہا ہے۔۔۔ مگر یہ ہونہیں سکتا۔“

ہم دونوں اُٹھ کر باہر عرشے پر آگئے۔۔۔ ہم بندرگاہ سے تقریباً دو کلومیٹر پر آچکے تھے۔۔۔ مگر تھہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ کیا اس وقت دس بجے ہیں، اور

مرف پانچ بجے ہیں تو جہاز کیوں چل رہا ہے؟ بالآخر عملے کے ایک رکن نے بتایا کہ بیروت کے حکام نے جہاز کو وائسنگ دی تھی کہ وہ تاریکی ہونے کے بعد مسافروں اور عملے کی سلامتی کے ذمہ دار نہ ہوں گے اس لئے فی الفور بندرگاہ خالی کر دی جائے۔

”اور اُن مسافروں کا کیا ہو گا جو پروگرام کے مطابق رات نو بجے کے قریب جہاز پر سوار ہونے کے لئے آئیں گے؟“

شام کے بعد بندرگاہ تک آنے کے لئے تو ہیلی کاپٹر درکار ہوں گے۔ جتنے مسافر آنے چاہئے۔“

عرشے پر صرف چند مسافر تھے جو ڈری ڈری آنکھوں سے بیردت کی پیچھے ہٹتی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بندرگاہ کا دیران علاقہ فٹ بال کے خالی میدان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے پیچھے عمارتیں خاموش تھیں۔ ان عمارتوں میں لوگ انتظار کر رہے تھے، کس کے ہاتھ میں غلام ہے اور کس کے ہاتھ میں بادشاہ، کوئی نہیں جانتا۔۔۔۔۔

بندرگاہ سے دور ہو کر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بچن را کس نظر آئے لگیں اور اُن کے پیچھے روتے کی دیران سڑک۔۔۔ اکلوتی کار کا ایک نقطہ سڑک پر رنگ رہا تھا۔ شہر کا آسانی منظر خوف سے عبارت تھا۔ کسی گھنی آبادی میں سے دھوئیں کا ایک ڈولنا آنا آسمان کو اٹھتا ہوا بکھر رہا تھا۔ یہاں سے بیردت مجھے بہت اکیلا دکھائی دیا۔ ساحل پر بیٹھا ہوا ایک دیوار دم شدہ بچہ جو آنے والے کل کی دہشت سے سہما ہوا تھا۔ لیکن میں اُس کا ماتہ نہیں دے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں نہ بادشاہ تھا اور نہ غلام۔ میں صرف ایک ناشائی تھا اور موت کھیلنے والوں سے پہلے تماشا سٹیوں کی طرف بڑھتی ہے۔ کیا میں واقعی است کہ بیردت میں چھوڑ آیا تھا؟ ڈیلی کی اور کیل خاموش تھا۔۔۔ مگر اس جہاز نے یونانی دیو مالا کے شخصوں میں سفر کرنا تھا۔ اوڈیسس کے سمندر میں سے، اور میں راستے میں ڈیلی کے ادیکل کی دیوار کا گھر دیکھ سکتا تھا۔۔۔ تم عمارتیں بناتے ہو گھر جاتے ہو گھر تماری ڈھان بکھری ہوتی ہیں۔ وہ صرف ہمارے لئے کجا ہوتی ہیں۔ جتنی دیر تک ہر سکے، ان ڈھریوں کو سمیٹ کر چلتے رہو۔

## قبرص

لبنان کی زمینی لکیر پر سمندر حاوی ہو رہا تھا اور پھر وہ بتدریج پانیوں کے پیچھے  
غرب ہو گئی۔ اب صرف سمندر تھا۔  
صرف سمندر۔

نملکین ہر ابدن کے بے چین خلا میں ایک بے قابو ہجوم کی طرح داخل ہوئی اور  
بے چین کو رخصت کر دیا۔ بے دانت بوڑھوں ایسے جبرٹے کھولے کودتی کھلیں کرتی  
ڈولفن جہاز کے پیچھے چلی آرہی تھیں۔  
”ڈزپر ملاقات ہوگی“ گرتھ نیچے چلا گیا۔

سمندر پر تاریکی کا سانس گہرا ہو رہا تھا۔ ڈولفن کی ہمت جواب دے رہی تھی اور  
اب جہاز اور اُن کے کودتے بدنوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر خاصی دیر تک وہ  
کچل پر دکھائی نہ دیں۔ میں دیکھتا رہا۔ یکدم ایک ڈولفن پوری قوت سے اچھلی اور قبل الیٹ  
ایک آداس روشنی میں ڈولفن یوں تیری جیسے پتھر سے تراشی ہوئی ہو۔ اور سمندر میں گم ہو گئی۔  
تاریکی کا سانس پھیل رہا تھا۔ سمندر کے آبی کھیت میں چلتا جہاز کا ہل جو راستہ پیچھے چھوڑ  
رہا تھا وہ خالی تھا۔ سفر کے نیک شگون نے ساتھ چھوڑ دیا۔

راہداریاں خالی تھیں، مسافر اپنے کمروں کی عافیت میں روپوش تھے۔ جہاز چپکے  
چپکے چل رہا تھا، ایک مغرور کی طرح جیسے بیروت کی خانہ جنگی اب بھی اُس کے تعاقب میں ہو۔

میں بیچاری فقیرنی سفر میں ہوں اور میری ہڈیوں کی گٹھڑی کو ہر کوئی کچکے دیتا ہے۔ اے  
کھول دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ”بول فقیرنی تیری گٹھڑی میں کیا ہے؟“ اور میں اسے سینے  
سے لگاتے رہی، سیٹھے رہی افغانستان میں، بیروت میں۔ میری ہڈیاں میں مائی باپ  
... جب تک میرا ایک بال بھی موت سے بندھا ہوا ہے۔ ....  
”مستنصر ہمارا سفر نیک شگون سے شروع ہوا ہے“ گرتھ نے سمندر میں اُبتے اُبتے اُس  
راستے کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے جہاز کے گزرنے سے وجود میں آ رہا تھا۔  
”دیکھو۔“

اور میں نے دیکھا، درجنوں ڈولفن مچھلیاں اُچھلتی کودتی، سیٹیاں بجاتی ہوائے  
جہاز کے پیچھے چلی آرہی تھیں۔  
جہاز رانوں کی قدیم کتابوں میں آیا ہے کہ جس جہاز کے سفر کے آغاز میں ڈولفن  
مچھلیاں اُس کا بیچا کریں، اُس کے مسافر سلامتی سے اپنی منزل کو پہنچتے ہیں... کیا  
قدیم کتابوں میں لکھا ہر حرف سچ ثابت ہوتا ہے؟



نیچے میرے ہال نما کرے میں تمام بستر خالی پڑے تھے۔ میں نے رُک سیکھ کر بیٹھ گیا اپنے پسند کردہ بالائی بستر پر بچپایا جو سمندر پر کھلنے والی گول پاٹ ہول کوئی کی گئی تھی اور پھر غسل خانے میں جا کر شاور کے نیچے ایک طویل عرصے تک منہ کھولے کھڑا رہا۔ کچن کے باہر گھنٹا سمندر اور سیاہ شام ایک تھے۔

کمر کے گرد تولیہ باندھ کر جب میں کمرے میں واپس آیا تو اب یہاں کا منظر قدرے مختلف تھا۔ میرے بستر پر ایک بھاری تن دوش کا شخص نیم دراز تھا اور اُس کا پیٹ بڑی طرح ہل رہا تھا۔ وہ شاید اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اُدھر خالی بستر کے درمیان ایک پھریرے بدن کا ناٹا سا نوجوان ”ہا“، ”ہی“ کی چیخیں بلند کرتا ہوا کراٹے کے کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ خوفناک چہرہ بنائے کبھی کسی گدے پر ٹوٹ پڑتا اور اپنی پھٹیلی اُس میں ذبح کر دیتا اور کبھی کسی خیالی بد مخالف کی گردن پر وار کرنے لگتا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً ساکت ہو گئے اور موٹا شخص کان میں انگلی پھیرتا ہوا میرے بستر سے اُتر آیا۔ دونوں نے مجھے اور خاص طور پر میری کمر کے گرد بندھے تولیہ کو بڑی شگ ننگاہوں سے دیکھا اور پھر ہال کے دوسرے کونے میں جا کر سرگوشیاں کرنے لگے میں اپنے پرلیٹ کر ڈائری لکھنے میں محو ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں بڑے بن ہو کر برآمد ہوئے۔ پھریرے نوجوان نے مجھ سے عربی میں مخاطب ہو کر کچھ کہا اور مجھے خاموش باگ فوراً ہی انگریزی میں کہنے لگا۔ ”میں سام ہوں اور یہ میرا دوست جارج ہے۔ ہم اس کمرے میں آپ کے شریک ہیں۔“

میں نے بستر سے اُتر کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔  
”میں جارج نہیں ہوں...“ موٹا شخص بڑے ٹھٹھے سے بولا۔ ”کنگ کانگ ہوں آرمینیا کا...“

”اوہ جارج...“ سام نے پیار سے اس کی توند پر کراٹے کی ایک پھٹیلی چلائی۔  
”ابھی تک تمہارا نشہ نہیں اُترا... دراصل بیروت سے بچ نکلنے کی خوشی میں ہم جارج بنے“

یعنی ہی قدرے ڈرنک ہو گئے تھے... بلکہ خاصے... اب بھی ہیں... اس لئے...  
”پہلے کیا سوچتے ہوں گے؟“

”یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں آپ بیروت کی خانہ جنگی کو اس جہاز پر تو نہیں لے آئیں گے، کیونکہ آپ عیسائی ہیں اور میں مسلمان...“  
”ہم نفعی نہیں ہیں اور آپ بھی یقیناً فلسطینی نہیں... اور پھر بھگوڑے ہمیشہ امن

رہتے ہیں، اور وہ ہم ہیں۔“  
”تیا ج ہمیشہ ڈڈپوک ہوتا ہے...“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”بیروت میرا گھر ہوتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔“

”میرا خیال ہے میں ایک لاش کی بجائے بھگوڑا ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔“ جارج ہنسنے لگا۔ ”اور اس ہال میں بھاگنے دوڑنے کے لئے خاصی جگہ ہے، خالی پڑا ہے۔“  
”عرشے پر مسافر تو خاصے تھے مگر یہاں ہم صرف تین ہیں... میں نے پوچھا۔

”ہم تین غریب ترین ہیں اس لئے...“ جارج آندہ ہو کر بولا۔ ”باقی مسافریا تو زسٹ کلاس میں ہیں اور یا کین کلاس میں۔“

جارج ان لوگوں میں سے تھا جنہیں پہلی ملاقات پر ہی آر پار دیکھا جاسکتا ہے وہ اندھے شیشے نہیں ہوتے۔ اُس کا وسیع تن دوش ایک نہایت معصوم بچے کو پناہ دیتے ہوئے تھا... اور سام ایسے لوگ جتنے زمین کے باہر دکھائی دیتے ہیں اُس سے زیادہ اس کے اندر ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سے موقع پر اُن کا تذکرہ ہو جائے گا۔

”آپ ڈنر کے لئے نہیں چل رہے، پورے آٹھ بجے سرور کر دیا جائے گا۔“ سام نے گھڑی بڑنگاہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔  
”ہاں کیوں نہیں۔“

جارج نے اپنی ہنسی دبائے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”اگر آپ ڈائننگ ہال میں ڈنر صرف تولیے میں ملبوس چلیں تو... سبیل تو بے حد خوش ہوگی۔“



”اودہ جارج“۔ سام نے پھر اس کی توند تھپکی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا: ”سیل ایک فرانسیسی رقاصہ ہے جو بیروت کے سستے ہوٹلوں میں بے حد پسند کی جاتی تھی جو پچھلے ہفتے میں اُسے تین مرتبہ اغوا کر لیا گیا، چنانچہ اب واپس فرانس جا رہی ہے۔“

”حالانکہ... حالانکہ...“ جارج اپنی سرخ آنکھوں کو مسخروں کی طرح کھاتے ہوئے ہنسنے لگا۔ ”اُسے اغوا کرنے پر جو خرچہ اٹھاتا ہے اُسی رقم سے باسانی...“

”اودہ جارج“۔ سام نے قدرے سختی سے اُسے ٹوکا...

”آپ تیار ہو کر آئیں، میں اسے عرشے پر لے جا کر تازہ ہوا سے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں...“ سام اُسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔

ڈاننگ ہال انجن روم کے عین اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی جستی دیواروں میں سے زنگ چھوٹ رہا تھا اور سفید پیٹ کی ناہمواریاں تھیں جس سے معزز بنانے میں ناکام رہی تھیں۔ تلاطم کے پیش نظر میزوں اور کرسیاں فرش سے جڑی ہوئی تھیں اور ان پر بیچ کر پہلو بدلنے کی عادت کو دبان پڑتا تھا۔ البتہ اس بکتر بند قدم کے ڈاننگ ہال کو مختلف رنگ دروپ کے چروں نے ایک چھوٹی سی مین الا تواری بستی کا روپ دے رکھا تھا... ہماری میز پر سیل بھی تھی جو جارج کی خصوصی دعوت پر وہاں آٹھ آنے والی تھی۔ درمیانی عمر کی ایک سپستہ قد عورت جس کا موٹا پاؤ صاف ہونے کے مراحل میں تھا مرنیک اور اُس کا خاوند پال جو ایک فرانسیسی جریدے کے لئے بیروت کے کنسٹنٹی کمیشنر کی تصاویر تیار کرنے گئے تھے۔ مرنیک ڈبلی اور لم ڈھینگ ہونے سے بال بال بچی ایک لڑکی تھی جس کی کمر داغی ایک جھڑکی طرح تھی۔ اُسے کھاتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ آخر اس کا معدہ کس جگہ ہو سکتا ہے۔ پال مرنیک سے قد میں چھوٹا، عینک لگاتے ہوئے ایسا شخص تھا جو عمر کے باوجود ہمیشہ ایک سکول بوائے لگتا ہے اور جو سجدہ فنگر اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش میں بہت وقت ضائع کرتا ہے۔ اور وہاں کچھ

بڑی بڑھپوں کی ایک میز پر قابو آیا ہوا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اُن سے معذرت کر کے پاس چلا آیا تھا... جارج ہمہ وقت اپنی خوراک سیل کی پلیٹ میں منتقل کرتا اور وہ شریف بی بی ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتی رہی۔ مرنیک اور پال روشنی میں رہے۔ سام ہال میں موجود لڑکیوں کا تیزی سے جائزہ لے رہا تھا، کیونکہ قبل اُس کے سفر صرف چار پانچ روز کا ہے اس لئے ابھی سے دو تین عورتیں کو اپنی بچا کا خصوصی مرکز بنایا جائے تب کہیں آخری دن تک متوقع نتائج برآمد ہونے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اُس نے اس کا رخیر کے لئے ایک اُونٹ نما آسٹریلین لڑکی کو چنا جس کے وارنک پانچ دانت ہمہ وقت نظر آتے تھے۔ میں نے اس کی پسند سے اختلاف کیا تو کہنے لگا: ”بال سب میں سے تو یہی بہتر ہے اور ویسے بھی لمبی لڑکیاں چھوٹے قد کے لڑکوں کے لئے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اُس گوشے کو مزید نرم کرنا ہمارا کام...“ ایک لبنانی لڑکی انگریز خاتون کو جو اس کہنے کو ہی خاتونیں تھیں اُس نے سپر زکے طور پر منتخب کیا۔ کھانا کوالٹی میں مبتلا گیا کرتا تھا اتنا ہی حجم میں زیادہ تھا۔ چنانچہ خوب پیٹ بھر کر علیا بل آیا تو وہ زیادہ تو نہ تھا مگر میری جیب سے بالکل باہر والا تھا۔ چنانچہ میں نے بدلہ لیا کہ یہ میرا لاسٹ سپر ہو گا اور آئندہ ڈبل روٹی اور بسکٹوں وغیرہ پر گزرا رہے۔ یا جانے گا۔ کافی کے آخری گھونٹ کے بعد میں نے سکرٹ سلگایا اور عرشے پر آ گیا۔

ایک تاریک خلا تھا جس میں سے انجن کی کچھ بچی آواز آرہی تھی، جیسے کوئی چوری چوکچہ کچھ خربوزے کھا رہا ہو۔ کچر، کچر، کچر اور... خاموشی... ہوا بند تھی۔ سفر... ایک سیاح اس سے فرادہ بھی ہوتا ہے اور اس کے تعاقب میں بھی رہتا ہے... پانی... اور پانیوں کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے، وہ باتیں کرتے ہیں۔ اُن کی سرسراہٹ ناگوار ان کی گفتگو کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ دریاؤں اور سمندر والے کنارے بسے

والے قبائل اس پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ پانی سے پوچھتے تھے، جواب پاتے تھے، میرے سامنے تاریکی میں مستور پانی بالکل خاموش تھے۔ نہ شور نہ سرسراہٹ، اور بجز گفتگو ہی نہیں کرتے تھے، ہم کلام ہی نہیں ہوتے تھے... یا پھر جو کچھ انہیں کنا تھا وہ نہیں چاہتے تھے، میرا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے... ہوا بند تھی۔ جہاز جیسے ایک بے جگہ پر خاموش کھڑا آہستہ آہستہ کندھے ہلا رہا تھا۔

میرے کان انتظار میں رہے... نہ کوئی دھماکہ، نہ سٹین گن کے کلکاتے چم کی آواز، نہ کوئی ہنستا ہوا گڈمڈ تھقہ... صرف شراب شراب پانی کی مسلسل آواز جیسے کوئی تھکا ہوا دھوبی کپڑے دھو رہا ہو... کبھی کبھار ایک لشکارا سا بڑا اور میرے بند پوٹوں کے پاس میں روشنی بھر جاتی اور پھر وہی شراب، شراب، شراب میں نے آنکھیں کھولیں، گول کھڑکی میں سمندر تھا۔ گول فش باؤل کے پانی میں نیل گلاب تھا۔ کبھی جہاز کی حرکت سے سمندر پوری کھڑکی پر بچھ جاتا اور کبھی سورج سمندر پر چمکتا اور گول کھڑکی کے راستے میرے چہرے پر لشکارے مارنا پھیل جاتا... اور وہاں روشنی تھی۔ اُن گنت صدیوں کے بعد ایک پُر اس صبح...

میں اپنے بستر سے اُتر آیا۔ میرے پاؤں تلے لوہے کا فرش تھا اور اس کے نیچے سیلوں گہرا سمندر۔ میدانوں میں رہنے والا جسم جزیرین کے سانس سے چلتا ہے۔ ایک بے یقینی کیفیت سے دوچار ہوا۔ زندہ گہرا سانس کے بغیر... شبیو کرتے ہوئے آئے ہیں میرا چہرہ گول کھڑکی میں سمندر تھا، ڈولتا ہوا۔ جہاز بھی ڈول رہا تھا اور میں ڈولتا قائم رکھنے کی خاطر ایک بوڑھے رقاص کی طرح کبھی اپنا وزن دائیں پاؤں پر ڈالتا کبھی بائیں پر... میرا چہرہ آئینے میں سمندر تھا۔ اوپر عرشے پر نمکین سمندری بولنبول تازہ شبیو کتے ہوئے چہرے کو کمرید، خاردار تار بن کر چبھنے لگی اور پھر آسروں کی چادر پھیلادیا۔ مسافر معصوم بچوں کی سی چلبلی مسرت کے ساتھ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ نئے مکان کے لیکن ہر دروازے اور ہر دیوار کو چھو گراہم اور محفوظ محسوس کرتے ہیں۔

وہ جہاز کمر رہے تھے۔ لائف بولٹس پر لکھی ہدایات نوٹ کر رہے تھے اور بھاری نروں پر ہاتھ پھیلا کر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ ڈیوٹی فری شاپ پر خریداری میں بے چینی کا عنصر تھا جیسے سستی شراب اور سکرٹوں کا ذخیرہ محدود ہو جاتا تھا۔

جہاز "الڈنیز" ایک ایسا بوڑھا انگریز تھا جو کبھی سلطنت ہند میں ایک بلند مرتبہ زنی انس تھا اور اب ولایت کے کسی زوال پذیر چھوٹے سے قصبے میں اپنے بچن گاؤں میں آواگاتا تھا۔ پرانی وردیوں کو بصد حسرت ہر صبح دیکھتا تھا۔ اُن پر لگے زنگ خوردہ نمونوں کو سانس کی بھاپ سے دھندلا کر چپکا آتا تھا اور اپنے عظیم ماضی کی یادیں آہیں بھرتا تھا، البتہ اُس نے اب بھی وہ تمام آداب اور قواعد اپنے اوپر لاگو کر رکھے تھے جو اس کے عظیم ماضی کا ورثہ تھے۔ "الڈنیز" میں بھی تین سیلوں تھے، ڈائمنگ روم تھا، عرشے پر سوئمنگ پول تھا، سنیما تھا مگر... ان سب کا زمانہ گزر چکا تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کی منزل سے اُنکل چلے گئے تھے مگر آداب اور قواعد جو اُن کے توں تھے۔ ڈنر کے لئے وٹیرانی سال خورہ وردیوں میں بڑے اہتمام سے کھڑے ہوتے۔ فرسٹ کلاس کے لئے سیلون الگ تھی جس میں ڈیک اور کمپن میں سفر کرنے والوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ سنیما کا ناکارہ پروجیکٹر ہر فلم کو جانچ جانچ کر فلم بنادیتا۔ لائف بولٹس بالکل مڑے تھیں۔ سوئمنگ پول کے کنارے ایک لائف گاؤڈ کھڑا رہتا تھا لانک وہ ایک ہاتھ شب سے شاید دو گنا ہی بڑا ہو اور گہرائی اتنی گہری میں پاؤں کے بل بیٹھ جانے سے بھی باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ خواتین ہاتھ پاؤں جاکر نہ شکل اپنے سوئمنگ کاسیٹوم کیلے کرتیں اور پھر ہا ہرا کر دھوپ میں لیٹ جاتیں۔ اُن کے کاسیٹوم دھوپ سے کم اور جارج اور سام ایسے نوجوانوں کی بھاپ چھوڑتی نگاہوں سے زیادہ شوکتے۔

ایسٹن گئے والا جرمین منہ میں پائپ دالے اپنے جانور کو صبح کی سیر کے لئے نڈرول میں لئے گھوم رہا تھا۔ مونیک اور اُس کا خاندان عرشے پر رکھی کرسیوں میں نشست آرام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مونیک نے ہاتھ ہلایا۔ پال نے صرف دیکھا اور

پھر آنکھیں بند کر لیں۔ انجن روم کے قریب سامنے سے چند خواتین آتی دکھائی دیں۔  
نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا۔ پہلی سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان  
لڑکی تھی۔ دوسری سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان لڑکی تھی مگر اس میں  
سے ذرا بڑی... اور تیسری بھی انہی خصوصیات کی حامل تھی مگر لڑکی سے عورت برتی  
ہوتی۔ ان سب کو کسی ایک ہی بھٹی میں سے نکالا گیا تھا۔

جہاز کی تفصیلی آوارہ گردی کے دوران متعدد بار میرے گھٹنے آہنی چرکوں سے  
ٹکراتے۔ ایک مرتبہ میٹھیوں سے پھسلا اور مہر وقت تنے ہوئے رستے پر چلنے والوں  
کی طرح دونوں ہاتھ اٹھائے اپنے آپ کو بلینس کرتا رہا حالانکہ روانی بے حد پرسکون تھی  
در اصل بحری جہاز کا پہلا باقاعدہ سفر ایک میڈانی شخص کے لئے ایسا ہی ہے جیسے  
ایک ڈولفن مچھلی کو سمندر میں سے نکال کر نہانے کے ٹب میں ڈال دیا جائے۔ لمبے  
لمبے ڈگ بھرنے والے کونا پ تول کر قدم رکھنے پڑتے ہیں اور یوں وہ اپنے آپ کو  
غیر محفوظ اور قدرے بے ہنگم سامحوس کرتا رہتا ہے۔

سیلون میں ایک صوفے پر نیم دراز گر تھکے آگے رکھی ٹیکس فری دسکی کی  
تول آدھی ہو چکی تھی۔

”آؤ، آؤ“ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اُس نے آٹھنے کی کوشش کی مگر ڈھیر بگاڑا۔  
”تم قدرے جلد باز نہیں ہو؟ وہسکی تو غروب آفتاب کے بعد شروع کرنی چاہیے؟“  
”زمین پر، ہاں! لیکن اس وقت ہم سمندر پر ہیں اور سمندر کے قوانین کے مطابق  
دھسکی پینے پر پابندی صرف نیند کے اوقات میں ہوتی ہے۔“ اس نے ہانا ہانا کرتے  
ہوئے ایک غرارے کرتا ہوا تمقہ لگایا۔

”سمندر کے دیگر قوانین کیا ہیں؟“ میں نے نطف لیتے ہوئے پوچھا۔  
”تاش، کتاب، شراب اور گرلز... تاش مجھے ناپسند ہے۔“ استاد ہونے کی  
حیثیت سے کتاب میرا پروفیشن ہے اس لئے فارغ اوقات میں اس کے قریب

یہ پٹلتا۔ گر لڑکیں قسم کی اس شپ پر پائی جاتی ہیں وہ تم نے بھی دیکھی ہیں... باقی  
شراب رہ جاتی ہے۔“

میں نے اسے تین نیچے اوپر کی ہوبہو سانولی لڑکیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ میڈیا  
پر بیٹھ گیا۔ ”ہاں میں نے بھی دیکھی ہیں، مصری ہیں۔“

باہر جہاز نے ایک زوردار جھونپو بجایا۔ سیلون کی بڑی کھڑکی سے جہاز کا ایک  
نظر آ رہا تھا، اُس سے پرے سمندر تھا اور سمندر پر بیروت کی سکاٹی لائن سے مشابہ  
ایک شہر کی نیم واضح علامتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”شاید ہم واپس بیروت پہنچ گئے ہیں۔“

”جہنم، نہیں۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں عرشے پر آگئے۔

جہاز ایک نیلگوں وسعت میں لنگر ڈالے خاموش کھڑا تھا۔ لنگر کی چرخہ پر متعین  
ایک ملاح نے بتایا کہ چند میل کے فاصلے پر دکھائی دینے والا جزیرہ قبرص ہے۔

سافروں کی نگاہیں پُر اشتیاق تھیں، جیسے پہلی مرتبہ زمین کو دیکھ رہے ہوں۔ جہاز

کا جہی سے ایک اور ”نوں“ آں“ کرتا ہوا جھونپو زور سے بجا، مسافر کیم چونکے اور پھر

ٹھیکانے ہو کر مسکرانے لگے۔ سمندر کی ہموار سطح پر ایک بڑی کشتی چھٹ چھٹ کرتی چلی

آ رہی تھی۔ جہاز سے ایک رستہ نیچے پھینکا گیا جسے کشتی میں سوار ملاحوں نے دبوچا اور

اُس کے ایک کٹڈے سے باندھ دیا۔ لنگر اٹھا دیئے گئے، رستہ تنے لگا اور پھر جہاز

آہستہ آہستہ انجن بند کئے ہوئے کشتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جیسے ایک ناراض عمر رسیدہ

وال نے ایک کڑیل جوان کو فرمانبردار بیٹے کا ہاتھ پکڑا ہوا اور اُسے گھسیٹتی چلی جا رہی ہو۔

پندرہ منٹ کے بعد ہم فاماگوستا کی ویران بندرگاہ میں پہنچ گئے جس پر ترکی کا سرخ جھنڈا

لڑا رہا تھا۔

لینڈنگ پاس جہاز میں ہی جاری کر دیئے گئے اور ہم گودی میں کھڑی ایک لیں

بازار ہو گئے۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ میں سے مانگ نکالا اور پبلک سٹم پر سافروں

سے مخاطب ہوا۔ "قبرص کے ترک حصے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ پچھلے برس انہی دنوں میں ترکیہ کی افواج اسی بندرگاہ کے راستے قبرص میں داخل ہوئیں اور آٹاٹانا جزیرے کے چالیس فی صد ترک حصے پر قبضہ کر کے ترک برادران کو یونانی قبرصیوں کے مظالم سے نجات دلا دی۔ وقت کی کمی کی بنا پر ہم آپ کو فاماگٹا شہر کے مرکز میں نہیں لے جاسکیں گے بلکہ جزیرے کی مختصر سیر کے بعد ایک ترک گاؤں میں ٹھوڑی دیر قیام کریں گے۔۔۔ شکریہ۔"

بندرگاہ سے نکل کر بس ایک وسیع قلعے کی حفاظتی کھائی میں چلنے لگی جسے پرانے زمانے میں بیرونی حملے کی صورت میں پانی سے بھر دیا جاتا تھا مگر اب اس میں تارکول کی سرنگ کھچی ہوئی تھی۔ شکستہ تفصیل ایک میل تک ہمارے ساتھ چلتی رہی اور پھر ہم ایک مہوار گریم ویران میدانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ کھیتوں کے درمیان ایستادہ ہاشی جھونپڑے اور فارم ہاؤس پچھلے برس کی جنگ کی گواہی دے رہے تھے گھاس بھی تنک بارود کی سیاسی میں تھی۔ دیواروں پر گولیوں کے نشانات موجود تھے۔ کوئی عمارت سالم نہ تھی۔ یہاں پر قبرصی یونانیوں نے ترکوں کو روکنے کی ایک نیم دلائے کوکشل کی تھی مگر پھر پسپا ہو گئے۔

۶۴۹ء میں امیر معاویہ کی بحریہ نے دھوڑ اور کریت کے جزیروں کے علاوہ قبرص پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاریخ کے مختلف اداریں یہ جزیرہ بے شمار قوموں کی آمد و رفت کا گڑھ رہا لیکن اس کا بنیادی تشخص ترکوں سے ہی وابستہ رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ۷۵ء کے لگ بھگ جب میں انگلستان میں تھا تو وہاں قبرص میں برطانوی تسلط کے خلاف جدوجہد کرنے والے یونانی جنرل گریواس کا بڑا شہرہ تھا۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ جزیرے کو آزادی دے کر اسے صرف یونانیوں کے حوالے کر دیا جائے مگر ترک آبادی اس تجویز کی سرٹو مخالفت کرتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ انگریزوں کے رخصت ہوتے ہی یونانی اپنی سینکڑوں برس کی نفرت کو ترک خاندانوں پر برسا دیں گے چنانچہ آئے دن ترک اور یونانی مکیویشن جاری رہی۔

بڑے رہتے۔ ان دنوں میرے ہوسٹل میں ایک ترک قبرصی لڑکا یوسل بھی قیام پزیر تھا۔ ایک روز کمروں کی صفائی پر مامور خادمہ نے ہکلاتے ہوئے وارڈن کو اطلاع کی کہ یوسل کے ٹیکے کے نیچے ایک سپتول دھرا ہے اور بھرا ہوا ہے۔ یوسل کی طلبی ہوئی تو یوسل نے اننگریزی میں کہا کہ یونانیوں ایسے کینے دشمن سے بچاؤ کی خاطر ایک ترک کے لئے زبردی ہے کہ وہ ہمہ وقت مسلح رہے۔ وارڈن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اول تو انگلستان ہے، یہاں اسے کوئی خطرہ نہیں اور پھر پورے ہوسٹل میں ایک بھی یونانی نہیں غالب علم نہیں ہے۔ یوسل پر اس منطق کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ سپتول پاس کئے پھر رہا۔ معاملہ پرنسپل تک گیا مگر یوسل نے وہاں بھی صاف انکار کر دیا کہ جب آپ بے شک مجھے کالج سے نکال دیں لیکن میں سپتول کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ بالآخر پرنسپل کی درخواست پر مسلمان طالب علموں کے ایک وفد نے یوسل سے سپتول لے لیا اس شرط پر کہ جب بھی کوئی جنگی صورت حال پیدا ہوگی اس کا اسلحہ فوراً اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ چھوٹا سا واقعہ ترک یونانی غاصبت کا آئینہ دار ہے۔ برعکس انگریزوں کی رخصتی پر ایک معاہدے کے تحت ایک ترک یونانی مخلوط حکومت آؤٹ بشپ مکاریوس کی صدارت میں وجود میں آئی۔ جولائی ۷۴ء میں یونان سے الحاق کے حامی چند فوجیوں نے مکاریوس کا تختہ الٹ دیا۔ اس سے پیشتر کہ نئے حکمران جزیرے کو یونان کا ایک حصہ قرار دیتے، ترک وزیر اعظم بلند ایچوت نے قبرص پر فوج کشی کا حکم دے دیا۔ چالیس فی صد علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد ترکوں نے خادراتار کی ایک نئی سرحد قائم کی جسے "گرین لائن" کے نام سے پکارا گیا۔

دوقیم جو کبھی اچھے ہمسایوں کی طرح رہتی تھیں اب ایک سو اکیس میل لمبی نیا لائن کے آدھار، خادراتار سے کاٹے ہوئے گھروں، محلوں اور کھیتوں سے ایک حصے کو صرف نفرت اور بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ یونانی دیوالیوں محبت و ہمدردی کی دیوی فرڈاٹس کی جائے پیدائش قبرص کا جزیرہ ہے۔ ان دنوں

افرد آتش کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

قبرص کے جس حصے میں سے ہم گزر رہے تھے وہ تقریباً سمندر سطح کا تھا۔  
کا سارا عکس آسمان تھا۔ گہرا نیلا اور لینڈ سکیپ، نیم خشک اور چمکیں جیسے روشنی  
سے جلی ہوئی ہو۔ کاج نما چھوٹے چھوٹے گھرجو وسیع اور دیران پس منظر میں جہاں  
بچے تھے، گمرین لائن کی قربت میں جا کر ڈرائیور نے بس موڑ لی اور ہمیں ٹانگہ لگا کر  
ایک نواحی قصبے کے چوک میں لے آیا۔ سامنے ایک یونانی گرجے کی عمارت تھی لیکن  
اب اس کے کنگورے مسمار کر کے وہاں ایک پنسل نما ترک طرز کا مینار تعمیر کر دیا گیا  
تھا۔ عمارت کو کلیسا سے مسجد میں بدل دیا جاتے تو بھی وہ تشدد پر نہیں اُترتی اس  
لئے وہ خاموش تھی۔

مقامی لوگ ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر جہاز کے مسافروں کو دیکھتے رہے اور  
کوشش کے باوجود میں ان میں سے کسی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکا۔ ہم ایک تھوہ خانے  
کے باہر کرسیوں پر بیٹھے دھوپ سینکتے رہے۔ روانگی سے پیشتر میں نے ایک دکان  
سے خشک گوشت اور لسی کے چند کارڈن خریدے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بلند اجوت کی  
تصویر تھی۔ ایک ہاتھ پر فاختہ، دوسرے میں بندوق۔ ڈبل روٹی کے بارے میں معلوم  
ہوا کہ وہ صرف فلاں گلی میں واقع بیکری سے ملے گی۔ میں اور گرتھ بیکری کی تلاش  
میں نکل کھڑے ہوئے۔ چند بچے ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بیکری کے اندر دو  
ترک بھڑت بنے کھڑے تھے۔ نصف دھڑندو میں ڈالے ایک صاحب گول اور  
گرم گرم روٹیاں نکال رہے تھے۔ ایک طرف آٹے کے ڈھیر لگے تھے جو اگڑا سٹ  
پنکھے چلنے کی بنا پر گھنی دھند کی صورت کرے میں اڑ رہا تھا۔ چند بچے کندھے پر تھے  
کی پٹلیاں گود میں رکھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ روٹیوں کی گرم خوشبو  
دیوانگی تھی جو بھوکے پیٹ کو بے اختیار کر دیتی ہے۔ ایسی ہی خوشبو کے آگے میں  
”لامر داب“ کے میرو نے ایک ڈبل روٹی چرائی اور پھر پوری زندگی اس کی مزاحمت کی۔

یوم بارہا... میں نے دو ڈبل روٹیاں خریدیں جو مالک نے اخباری کاغذ میں  
بٹ کر میرے حوالے کر دیں۔

باہر آتے تو ہم دونوں بھی سفید بھڑت بنے ہوئے تھے۔ چہرے اور بالوں سے  
نشان کرنے کی بجائے ہم اُسی بھڑت حالت میں واپس چوک میں آگئے۔ جارج  
نورخانے کے باہر کھڑا لسی پی رہا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلو  
پر۔ اُس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور منہ کھول دیا مگر بولا نہیں صرف ہلکاتا رہا۔ ”سنا ہے  
آرمینیا کے کنگ کا نگ ہو؟“ میں نے آٹے سے پوتے ہوئے چہرے میں سے دانت  
کالے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اُس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم کون ہو؟“

گرتھ جو ابھی تک خاصا مخمور تھا، غرارے کرتا ہوا، ہنسنے لگا۔ ”ہاغا، ہاغا...  
نانا... میں ہیملٹ ہوں اور یہ میرے باپ کی روح ہے۔“

اس سے پیشتر کہ جارج خوفزدہ ہو کر ہم پر حملہ آور ہو جاتا، میں نے اپنا چہرہ  
ادرا ل پونچھ ڈالے۔

”اوہ...“ وہ کھسیانا ہو گیا۔ ”یہ جزیرہ اتنا دیران اور خاموش ہے کہ یہاں کچھ  
نہ ہو سکتا ہے۔“

بندر گاہ واپس جاتے ہوئے ایک اور جنگ زدہ علاقے سے گزر رہا تو گرتھ کھنے  
شروع کیا جاتا ہوں وہاں یا تو جنگ، ہو رہی ہوتی ہے اور یا ہو چکی ہوتی ہے... یہ ہیں  
میں اچکا ہوں۔ وہ دن کب آئے گا جب میں ایک ایسی دیوار دیکھوں گا جس پر  
بازن کے نشان نہیں ہوں گے...“

میں بھی تباہی کے ان شواہد سے خاصا اکتا چکا تھا۔ پہلے قنطرہ اور گولان،  
جوزیت اور اب قبرص۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ میں ایک سیاح کی بجائے کوئی  
نوجوان جنگی نامزدگار ہوں جو ہر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو گولینز اور دھماکوں سے

گرم ہو رہا ہو۔

میں نے امینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ ”آخر تم آگئے۔“ اُس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں، میں آگیا۔“ میں نے فوراً ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“  
 ”خوراک۔“ وہ بھڑکی نظروں سے میرے اوپر جھک گئی۔  
 ”کون خوراک؟ کس قسم کی خوراک؟“ میں قدرے نروس ہو گیا۔

اُس نے بیگ میں سے ایک بڑا سا راپیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ ”تم کل کے بعد  
 ڈانگ روم میں نہیں آتے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں کھانا افرڈ نہیں کر سکتے۔ اسی  
 لیے میں آج تمہارے لئے کچھ خوراک چڑھا کر لے آئی ہوں۔۔۔“  
 ”اچھا، والی خوراک۔“ میری جان میں جان آئی۔ ”لیکن اس وقت تو میرے پاس  
 ایک ختمہ قہوی ڈبل روٹی ہے اور۔۔۔“

”اوہ فضول باتیں مت کرو۔۔۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ ”تم جیسے محنت مند پڑھ  
 لے کر گرم خوراک نہایت ضروری ہے۔۔۔ اور پھر مجھے اس میں کوئی دشواری بھی پیش  
 نہیں آتی جو ختمی ڈیٹر نے کوہس سر دیا میں نے اپنی پلیٹ بیگ میں اُنڈلی اور یہاں لے آئی۔“  
 ”اور تم کیا کھاؤ گی؟“

”میں ابھی جا کر ویٹر سے مزید خوراک منگوا لوں گی۔۔۔ تمہیں ان ترکوں کا پتہ ہے ناں  
 میں ذرا ہرنٹ بھیج کر، آنکھیں نشیلی بنا کر اس سے بات کروں گی تو وہ سارا کچن  
 میرے لئے اٹھا لائے گا۔۔۔ بہر حال تم کھانا شروع کرو میں سویٹ ڈش لے کر آتی ہوں۔“  
 بس کچھ کہنے سے قبل وہ کہیں سے باہر تھی۔

”اُنڈہ جاز میں جب بھی کھانے کے لئے گھنٹی بجے تم دس منٹ کے وقفے کے  
 جزیرہ کی کہیں میں پہنچ جایا کرو۔۔۔“ سویٹ ڈش کے خاتمے پر مونیک نے حکم دیا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ میں واقعی بے حد ممنون تھا۔ ”لیکن تمہارے خاندان کو تو  
 زہن نہ ہو گا؟“

”بالکل، جب تک میں تمہیں صرف کھانا مہیا کروں، اُسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

جہاز ایک دل گرفتہ چاہنے والے کی طرح نا مائست کی بندرگاہ سے پیچھے ہٹا  
 بڑی آزدگی سے جزیرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جیسے جہاز نہ ہونا چاہتا۔ پھر  
 دل کٹا کر کے اس نے قبرص سے منہ موڑا اور کھلے سمندر کا رخ کر لیا۔ تھکاؤں سے  
 بھگے مسافر اپنی اپنی کیبنوں میں چلے گئے۔۔۔ اپنے اپنے جزیروں میں۔ جہاز ایک  
 متحرک جزیرہ جس میں مختلف شخصیتوں کے جزیرے، ایک دوسرے سے کٹے ہوئے  
 اُن تک رسائی صرف کھانے کی میز پر، سوئمنگ پول میں یا بیئر کے گلاس پر اس دوران  
 گفتگو کے عارضی پُل جو میز سے اٹھتے ہی گلاس کے خاتمے پر جھاک ہو جاتے ہیں اور ہر شخص  
 اپنی اپنی کیبن میں چلا جاتا ہے، اپنے جزیرے میں۔

میں عرشے کی ایک آرام گرسی پر دراز سمندر کے چٹیل میدان پر نگاہ رکھے تھا  
 جس پر شام اُترنے کو تھی۔ اس سپاٹ میدان میں ایک کشتی منور ہوئی اور جہاز سے توپنا  
 ایک میل کے فاصلے پر ہمارا ساتھ دینے لگی۔ غروب کرنوں میں اس کے  
 زرد ہو رہے تھے۔ ایک زرد تلی جو اڑتے اڑتے تھک کر سمندر پر اتری اور اپنے  
 کھول کر تیرنے لگی۔ رفتار یکساں ہونے کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے جہاز اور یہ کشتی  
 کسی کشتی بالکل ساکت کھڑے ہیں لیکن کھلے سمندروں میں ایک بادبانی کشتی آگیاں سے لگتی  
 ایک آہٹ ہوئی، سیبل لائف بولش کے اوپر سے جہانک رہی تھی۔

”اوہ تم یہاں ہو۔“ وہ لائف بولش کے گرد چلتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ ”مونیک  
 کیبن میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”کیوں کیا بات ہے؟“  
 ”یہ تو تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو گا۔“ اُس نے اپنی بیٹھی ہوئی جنبی آواز میں  
 مونیک اپنی کیبن میں بے چینی سے ناخنوں کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔ مجھے کچھ

وہ ہنسی۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے تھے جیسے دودھ کے ہوں۔ ابیل دنگ روم میں واپس جا کر اس سویٹ ترک ویٹر سے کہوں گی کہ سویٹ ڈش بہت مزہ تھی اور کیا وہ کچن سے میرے لئے ایک اور ڈش سمگل کر سکتا ہے، اور وہ کرے گا کیونکہ میں بہت بُری طرح سے اُس کے ساتھ فلرٹ کر دوں گی۔“

مجھے معلوم تھا کہ یہ نظر عنایت مونیٹک کا مجھ پر فریفتہ ہو جانا وغیرہ نہ تھا بلکہ بنیادی طور پر ایک ہمدرد لڑکی ہے جو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی بھی شخص پیسوں کی کمی کے باعث پورے سفر میں صرف سوکھی ڈبل روٹی اور پنیر لگتا رہے۔ سیلون میں گر تھ حسب معمول اپنے مخصوص کونے میں بر اجمان دھسکی پی رہا تھا۔ ”آج کھانے میں سٹیک شتا تو براؤنڈ بالکل میری پسند کے مطابق تھی اور پلپل پانی تو کسی انگریز لینڈ لیڈی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی لگتی تھی...“ صوفے پر بیٹھ کر میں نے اپنی آسودہ آنکھیں بند کر لیں۔

”ہیں...“ وہ چڑکا۔ ”لیکن تم تو ڈاننگ روم میں تھے ہی نہیں۔“

میں نے مونیٹک کی کارروائی رپورٹ کر دی۔

”تمہیں احتیاط برتنی چاہیے لڑکے۔“ وہ ایک آئس کیوب کو منہ میں ڈال کر کڑکھانے لگا۔ ”انسانی ہمدردی کو جہانی ہمدردی میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔“

سیلون میں رکھے ٹیلی ویژن پر عمارتیں گر رہی تھیں، دھماکے ہو رہے تھے، مورچوں میں سے سٹین گنیں لو ہا اگل رہی تھیں اور لوگ مسراسیمہ ہو کر گلیوں میں بھاگ رہے تھے۔ بیروت میں کھلی جنگ چھڑ چکی تھی۔ لبنان ٹیلی ویژن کی نشریات اب تک ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔

”اوہ فار کرائسٹ سیک...“ گر تھ نے غصے سے دانت کچکچائے۔ ”جنگ جیتا... کیا ایک شریف آدمی کھلے سمندر میں پر بھی آرام سے اپنی دھسکی نہیں لے سکتا؟ اُس نے اٹھ کر چینل بدل دیا۔ قاہرہ ٹیلی ویژن پر سکرین کو بھرتی ہوئی ایک فوجی

ننگ کر جیسی... جیسی پکار رہی تھی۔ ”بات ہوئی ناں۔“ گر تھ نے تسلی سے ہاتھ دھو کر صبح ہم مصر میں ہوں گے۔“ اے ابوالہول میں آ رہا ہوں۔“ اور اگر ابوالہول نے تمہاری رفاقت کو پسند نہ کیا تو؟ مٹا ہے ٹی ٹو ٹر ہے، غراب وغیرہ نہیں پیتا...“

گر تھ نے ہانا، غانا، کمرتا ہوا ایک اور تمقہ لگایا۔ ”تو پھر اُسے میرے لئے جگہ نکال لی ہوگی... اگلے دو تین ہزار برس کے لئے اب میں وہاں بیٹھوں گا...“ سیلون کا دروازہ کھلا، اوپر تلے تین مصری لڑکیوں کے سر نمودار ہوئے۔ گر تھ نے ایک لمبا ہاتھ اُن کی طرف پھینکا اور وہ وہیں سے واپس چلی گئیں۔

”تینوں متناسب اور نمکین ہیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی۔ تم اگر ایک اور رضا کار کا انتظام کر لو تو ہم تینوں انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے قسمت آزمائی کر سکتے ہیں... آج سمندر میں تلاطم بہت ہے، میں ذرا ٹائلٹ تک ہواؤں...“ وہ اٹھا اور دائیں بائیں قدم رکھتا ٹائلٹ میں چلا گیا۔ سمندر بالکل پرسکون تھا تلاطم لٹ اُس کے جسم میں تھا... میں باہر آ گیا۔

عرشے پر شرب کی تاریکی اُس مرحلے میں معلق تھی جب کسی ایک لمحے میں وہ گرتی ہے اور عرشے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ لمحہ وارد ہوا اور ساتھ ہی گھر کی کسک طے ہوئی۔ وہاں گھر کیا۔ لاہور سے ہزاروں میل دور بحیرہ روم کے پانیوں میں خاموشی سے سرکے ایک جہاز پر یہ خواہش کہ میں گھر ہوتا۔ جہاز کا ایک ملازم شیشے کی کھڑکی سے باہر پکائے بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ یہ شخص اتنی تاریکی میں اتنی خنکی میں اکیلا کیوں بیٹھا ہے۔ اُسے کیا پتہ کہ میں گھر میں ہوں اپنے پیاروں کے پاس... بچن کی

محبوب بات ہے پورے آسمان پر صرف ایک ستارہ ہے، بے حد چمکیلا، لوٹنگ کے

لشکارے ایسا جہاز اتنی آہستگی سے چل رہا ہے جیسے یونانی دیو مالا کا ہیرہ زمین پر گرا  
جیسے سنہری کھال کی تلاش میں جا رہا ہے۔

## سکندر - سکندریہ

—

”شیری - شیری“ میرے قریب کھڑا گنجا شخص ہاتھ ہلاتا ہوا پکار رہا تھا۔ اُس کی  
بیگنی آنکھیں سکندریہ کی ڈاک پر جمع اُس ہجوم میں متلاشی گھوم رہی تھیں جو ہمارے جہاز  
کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اتنے فاصلے سے ہجوم صرف ایک بدن تھا جس  
کے مسام علیحدہ علیحدہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ گنجا شخص جانے کس جانِ جاناں کے لئے  
یوں بے حال ہو رہا تھا۔

”شیری - شیری“

بندر گاہ ایک وسیع آبی شہر تھی جس پر بال بردار کشتیاں جنگی جہاز، آبدوزیں اور  
ادبائی کشتیاں بچے کے کمرے میں کھلونے تھے، بے ترتیب، بکھرے کھڑے۔ ساحل پر شاہی  
محلات اور مسجد ابوالعباس کے ممبر ترے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارا جہاز آبی مسافروں  
سے ٹکرا ہوا مسافر تھا۔ آہستہ آہستہ اپنے عارضی پڑاؤ سکندریہ کی طرف رہینگ رہا تھا۔ ایک  
بڑے ہاؤس کے قریب سے گزر رہے جو تھا تو سکندریہ کا مگر وہ نہ تھا جس کا شمار عجائبات  
دن میں ہوتا تھا۔

”شیری - شیری“ گنجنے شخص کا گلا بیٹھنے کو تھا۔

اغمارہ برس پیشتر جب آتش ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا، ولایت جلتے  
تھے ایک پنکھوں والا جہاز رات کے پچھلے پہر قاہرہ کے ایئر پورٹ پر اتر رہا تھا مسافروں  
کو پورے کی طرح ہانک کر ایک بس میں سوار کیا گیا اور قاہرہ کے جانے کو نہ کوئے میں



میں واقع ایک قومہ خانے میں لے جا کر کافی پلوائی گئی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرٹھ میں سوٹ پر ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی اور دیوار پر کمال ناصر کی تصویر آویزاں تھی۔ اب میرٹھ میرے لئے ایک ترکی ٹوپی اور ناصر کی تصویر تھا۔ آج پھر سرزمین مصر میرے قریب ہو رہی تھی۔

”اے امیر المومنین! مصر کی سرزمین خاکستری رنگ کی ہے، اس کے درخت ہر بھرے ہیں۔ طول میں اس کی مسافت ایک ماہ کی ہے اور عرض میں دس دن کی۔ اے ایک خاکی رنگ کا پہاڑ اور خاک آلودہ ریت اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل نے اپنی جگہ بنا رکھی ہے اور اس میں کمی بیشی اس طرح جاری ہے جیسے سورج اور چاند میں جاری ہے۔“

”شیری۔ شیری!“

جہاز خلا میں تیرتے ایک مصنوعی ستارے کی طرح دھیرے دھیرے اپنے ڈاک پوائنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جس پر منتظر ہجوم میں کہیں وہ شیری شیری تھی۔ جے پکارتے پکارتے میرے پہلو میں کھڑے شخص نے اپنا گلابٹھا لیا تھا اور میرے کان ہرے کو دے تھے۔ سرزمین مصر قریب آ رہی تھی مگر صرف سات گھنٹوں کی مختصر ملاقات کے لئے کہیں جہاز ”الکدینیز“ کو پھر اسی طرح اسی ڈاک سے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ اتونی کا بجز اسکندریہ کی طرف آ رہا تھا جہاں قلوبطہ منتظر تھی۔

اسکندریہ۔ اسکندر اعظم کے بسائے ہوئے درجنوں شہروں میں سے واحد شہر زمانے کے سمندر پر اب بھی تیرتا ہے، شاید اس لئے کہ اس کے پتھروں تلے کس سکندریہ کا چوٹی تابوت ہے اور کھڑی تیرتی رہتی ہے۔ شاہ مصر طوطی دوم نے اسکندریہ کو بابل سے اسکندریہ منتقل کیا اور جب عرب یہاں آئے تو انہوں نے ایک شاہی شہر میں اسکندر کی لاش دکھی جو ایک طلائی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ روایت ہے کہ وہ دانیال کے معنی میں جہاں حکیم لقمان اور حضرت دانیال کے مزار ہیں ان کے نیچے ہے۔

ہی دنی ہے... اب حکیم لقمان اور شیردل والے حضرت دانیال کو اٹھا کر کون دیکھ کر بچے سکندر اعظم ہے یا نہیں۔

”شیری شیری!“ گنجے شخص نے بالآخر بندرگاہ پر منتظر ہجوم میں اپنی شیری کو سپاٹ کر لیا تھا اور اب وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اُسے آغوش میں لینے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں بھینکتا اُس کے گال بھیک جاتے... شیری ایک پونی ٹیلز والی گڑبادیسی بچی تھی جو جہاز کے پہاڑی کچم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کی انگلی سختی سے بھیجنے رکھی تھی اور قدرے بوریٹ سے آنکھیں میچے عرشے پر کھڑے مسافروں کو تنگ رہی تھی۔ ایک شدید دھچکے کے ساتھ جہاز بندرگاہ کے پہلو میں لسیا اور پھر پُرسکون ہو گیا۔ سیڑھی پر سے اترنے والا پہلا شخص شیری کی طرف بڑھا

جوابی تک عرشے کی طرف دیکھ رہی تھی اور گھٹنے ٹیک کر اُس سے لپٹ گیا ”شیری شیری“

وہ اسی طرح پکار رہا تھا جیسے اب بھی جہاز پر کھڑا ہو اور اُس کے گال بھیک رہے تھے۔

شیری کی ماں اُن پر نظریں جمائے مسکرا رہی تھی مگر چہرے پر حسد کی ایک لکیر کھینچ رہی تھی۔

لینڈنگ کارڈز اور بینک سے مصری پاؤنڈز کے حصول کے بعد میں اور کچھ بھاگ

جنگ اور سٹ بیورو کے دفتر میں پہنچے اور سوالیہ نظروں سے کاؤنٹر کے پیچھے دیکھا۔ وہاں

فرانسیسی مصری خاتون کو دیکھ کر ہم دونوں اپنے سوال بھول گئے... سائنولی صورت، لشکتے

دانت اور مکہ نفرتیتی کی سی آنکھیں جنہیں اگر ایک مردانہ می پر مگر ذکر دیا جائے تو وہ

کی گڑبادیسی بچی تھی جو جہاز کے پہاڑی کچم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے

اپنے... وہ سمندر کی نمکین ہوا تھی جو چہرے کے مساموں میں چپتی ہے اور جس کا

خبر کس کو بھیجنے سے حلق میں اترتا ہے۔ مگر تھنے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی

دانت اور مکہ نفرتیتی کی سی آنکھیں جنہیں اگر ایک مردانہ می پر مگر ذکر دیا جائے تو وہ

کی گڑبادیسی بچی تھی جو جہاز کے پہاڑی کچم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے

اپنے... وہ سمندر کی نمکین ہوا تھی جو چہرے کے مساموں میں چپتی ہے اور جس کا

خبر کس کو بھیجنے سے حلق میں اترتا ہے۔ مگر تھنے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی

دانت اور مکہ نفرتیتی کی سی آنکھیں جنہیں اگر ایک مردانہ می پر مگر ذکر دیا جائے تو وہ

کی گڑبادیسی بچی تھی جو جہاز کے پہاڑی کچم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے

اپنے... وہ سمندر کی نمکین ہوا تھی جو چہرے کے مساموں میں چپتی ہے اور جس کا

گر تھ بے حد مرعوب ہو چکا تھا۔ اُس نے خیف سی آواز میں ”اوہ بوائے“ لکڑیوں کی طرف دیکھا کہ تم ہی بہت کرو۔

”ہم سکندریہ میں صرف سات گھنٹوں کے لئے رُکے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس دوران قاہرہ جا کر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہی لوٹ آئیں...؟“

نمکین ہوائے چند سیاحتی کتابچے اکٹھ پلٹ کر کچھ حساب کتاب کیا ”اگر آپ فوراً روانہ ہو جائیں اور ٹرین پورے وقت پر قاہرہ پہنچ جائے اور پھر اُدھے گھنٹے کے بعد اگر آپ پھر ٹرین پر سوار ہو جائیں اور وہ بھی پورے وقت پر واپس سکندریہ پہنچ جائے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے ہم قاہرہ نہیں جاسکتے۔“

”ہاں“ وہ بے وجہ ہنستی ہوئی بولی۔

ہم نے نمکین ہوا کے چند گہرے سانس لئے اور منہ لٹکاتے بند گاہ سے باہر آئے۔

”تم نے کہا تھا ناں کہ ابو الہول ٹی ٹو ٹلر ہے، شراب نہیں پیتا۔“

”ہاں۔“

”تو پھر میں بھی اُس سے ملنا نہیں چاہتا اُسے مزید انتظار کرنے دو...“

بڑے پُل کے قریب ہم نے اپنے جہازی ساتھیوں کو جالبیا جو شہر کی جانب روانہ

تھے۔ پُل کے پار چند سیاح گھسیان گھسری تھیں اور اُن کے گھوڑے بے جینی سے کان ہلایے

تھے۔ ایک کبھی اُن میں سے علیحدہ ہوتی اور ہمارے گردہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”شہر جانے کے صرف دس ڈالر“ مصری کوچوان نے اپنے بلند سنگھاس سے جھک کر

ہم سے کہا۔

”دو ڈالر“ سام نے جواب دیا جو اس سے پہلے بھی سکندریہ آچکا تھا اور وہاں

طور طریقوں سے واقف تھا۔

”یہ کبھی شاہ فاروق کے ایک خاں سائے کی تھی“ کوچوان اتر کر بولتا ”شاہ بہ سونٹ

لے کر صرف آٹھ ڈالر۔“

”دو ڈالر“ سام نے لاپرواہی سے کہا۔

”تمہاری شکلیں جی نہیں ہیں شاہانہ لگتی ہیں میٹھے والی“ اُس نے نفرت سے منہ

پیرایا مگر کبھی بدستور ہمارے پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔

راستے میں مصری دستکاریوں کی چند دکانیں آئیں۔ اندر جانے سے پیشتر سام نے شبیہ

کی مصریوں کو اشیاء فروخت کرنے کا ایک غیر انسانی قسم کا ڈھنگ آتا ہے اور نہ چاہتے

ہوتے ہی انسان کوئی نہ کوئی بیہودہ سی شے خرید لیتا ہے اس پر گر تھ نے سینہ جھٹکا کر اعلان

کیا کہ اُس نے ساری زندگی کوئی ایسی شے نہیں خریدی جس کی اُسے واقعی ضرورت نہ ہو

اور مصریوں کی ایسی تیسی۔

ہم نے اندر جا کر مصری یادگار کے طور پر چند بڑے اور سہیڈ بیگ خریدے جن پر فرعونوں

اور لڑائیوں کی شبیہیں کندہ تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لوٹریاں نہیں اُن کی سیکیٹ تھیں۔ دکان

کی مالک کو واقعی اشیاء فروخت کرنے کا ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ سکندریہ کے بجٹ کا نصف حصہ

اُس کی نذر ہو گیا۔ گر تھ جو تکہ بیان دے چکا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز کسی قسم کی خریداری نہیں

کرے گا اس لئے وہ ایک کونے میں کھڑا ہم سادہ لوح سیاحوں کو لٹے دیکھتا رہا اور

بڑے غر سے سکراتا رہا۔ اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر مالک ایک انتہائی دیدہ زیب بیگ نکال

لائے۔ ”جناب خالص چمڑے کا اور ہاتھ کا بنا ہوا۔ اس پر فرعون رمیس کی تصویر ہے یہودیوں

کو مصر سے نکل جانے کے احکام دیتے ہوئے۔“

”مجھے فرعونوں سے سخت چڑ ہے، میں یہودی ہوں...“ گر تھ نے مجھے آنکھ مارتے

ہم سے بنا دئی غصے سے کہا۔

دکان کی مالک نے اس جواب پر آنکھ تک نہ جھپکی اور شلیف پر سے ایک ادب بیگ

نکال دیا۔ ”یہ لیجئے اس پر مقدس کوہ طور کی شبیہ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر خدائی احکام

نازل ہوئے تھے... آپ یہودی ہیں ناں؟“

گر تھہ کو وہ بیگ خریدنا پڑا۔

”اس لیڈر بیگ کا میں کروں گا کیا؟“ گر تھہ نے دکان سے باہر نکلتے ہوئے تجلار کہا  
”تم اسے کسی ایسی لڑکی کو تحفے کے طور پر دے سکتے ہو جس سے تمہیں بے حد محبت ہو۔“  
سیبل بولی۔

گر تھہ نے آگے بڑھ کر بیگ اُس کے کندھے پر لٹکا دیا۔ ”میں نے ابھی ابھی فیصلہ  
کیا ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں... میری طرف سے ایک حقیر تحفہ۔“  
بگھی والا جو دکانوں کے باہر سہارا انتظار کر رہا تھا اب پھر ہمارے ساتھ ہوا۔  
”چھو ڈال دو گے؟“

”دو ڈالر۔“ سام اُس کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑایا۔

بیروت کی نسبت سکندریہ ایک غریب شہر تھا۔ عمارتیں شاندار مگر صفائی سے گریز  
کرتی ہوتیں، ٹریفک انتہائی غیر جانبدار قسم کی، پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہاں دائیں جانب  
چلنے کا رواج ہے یا بائیں جانب۔ پولیس میں بھی ڈھیلے ڈھالے لیکن نسوانی آبادی کی  
رنگت اور دیکھنے کے انداز میں ایسا نمک کہ انسان چٹخارے لیتا لیتا زبان نکھالے۔  
آنکھوں کے گرد قلعہ سٹائل کا جل کے حلقے اور ہونٹوں پر خوش آمدید کہنے والی تیز  
لپ شک۔ کہا جاتا ہے کہ ہونٹوں کو رنگنے کا رواج فرعونوں کے زمانے سے شروع ہوا۔  
خواتین اپنے ہونٹوں پر لپ شک صرف اس لئے لگاتی تھیں کہ شیطانی قوتیں منہ کے  
راستے جسم میں نہ داخل ہو جائیں، باہری رنگ جائیں۔ اُن دنوں رنگ جاتی ہوں گی۔  
یا پھر لپ شک بدبودار ہوتی ہوگی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کوچوان نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”چلو دو ڈالر ہی دے۔“  
”کہاں کے لئے؟“ سام نے پوچھا۔

”شہر کے لئے۔“

”شہر تو ہم پہنچ چکے ہیں۔“ سام نے ہنس کر کہا۔ کوچوان نے گھوڑے کو جابک سے

بہرحال پٹا اور ہمیں عربی میں کوستا ہوا واپس بندرگاہ کی طرف چلا گیا۔

ایک ڈاک خانے کے باہر تصویریری پوسٹ کارڈوں کا سٹینڈ تھا۔ ہم سب نے وہاں  
اپنے اپنا ایک اور اہرام مصر کے تصویریری کارڈ خریدے اور اُن پر ”میں اس وقت  
بابل کے ساتے میں بیٹھا ہوں یہ کارڈ لکھ رہا ہوں، کاش تم بھی یہاں ہوتے...“  
اپنی عبارتیں لکھ کر پوسٹ کر دیئے۔ قریب ہی ایک سٹیشنری کی دکان تھی۔ میں ایک  
پوائنٹ اور چند کھلے کاغذ خریدنے کے لئے اندر چلا گیا۔ باقی گروہ بھی میرے پیچھے  
چلے آئے۔ اندر بھر دی حادثہ ہوا۔ گر تھہ نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف  
دیر ایک لمبی ”ہوں“ کا تبادلہ کیا... سیدز گریل مصری تھی مگر مصری کی ڈلی نہ تھی جیسے  
رنگ کی دس شکر تھی جسے چکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ تو نمکین ہے میں نے بال پوائنٹ  
باپوچا تو اُس کے نمکین شکر ہونٹ مسکراہٹ میں کھل گئے۔ ”پلیز“ سیدز گریل کی مسکراہٹ  
نہی ہے بس کر دینے والی تھی کہ جی چاہتا تھا اس کے ہونٹ کبھی بند نہ ہوں اور اس کا  
ایک ہی طریقہ تھا کہ اُس سے مزید بال پوائنٹ خریدے جائیں۔ چنانچہ جب میں نے تقریباً  
پانچ بال پوائنٹ خرید لئے تو گر تھہ آگے آگیا۔ ”بال پوائنٹ؟“

”پلیز“ مصری شکر ایک بال پوائنٹ اُس کے حوالے کر کے مسکرا دیتی۔ اس سے بیشتر  
اُس کے ہونٹ بند ہوں گر تھہ جلدی سے کہتا۔ ”بال پوائنٹ؟“ اور یوں جب ہم باہر  
نکلے تو گر تھہ، جارج اور سام کے ہاتھوں میں درجنوں بال پوائنٹ تھے۔

”اب میں ان بال پوائنٹس کا کیا کروں؟“ گر تھہ پاؤں پیچ کر بولا اور پھر کچھ سوچ کر  
کہنے کے پاس چلا گیا۔ چونکہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں اس لئے یہ حقیر تحفہ...”

”دوسرے کھانے کے لئے سام ہمیں ساحلی سڑک رو ۲۶ جولائی پر واقع ”سیستوران“  
پر لے گیا جس میں داخل ہوتے ہی سب کے چہرے اتر گئے۔ زیبائش سے اندازہ ہوتا  
تھا کہ یہ ایک سادہ گلاس پانی کی قیمت بھی ہماری کل نوپنجی سے زیادہ ہوگی مگر سام کا کہنا  
تو غزوات آپ فکر مند نہ ہوں۔ یہ مصر ہے لبنان نہیں۔ بل آتے کا تو بالکل مونگے پھلیوں

کے برابر ہوگا۔

”تم ”حمامہ“ پسند کرو گے؟“ سام نے عربی اور فرانسسیسی میں چھپے میز کا ڈیزائن ڈال کر پوچھا۔

”اگر ”حمامہ“ چکن کو کہتے ہیں تو ضرور پسند کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”حمامہ... حمامہ نہیں جانتے؟...“ سام نے دونوں ہاتھوں سے ایک ہارنای کی کوشش کی۔ ”پرنده ہوتا ہے“

”کبوتر؟“

”ہاں... اُس نے سر ہلایا۔“ مگر نہیں...“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”کبوتر ہیں... کبوتر کی بہن۔“

”فاختہ؟“

”بالکل۔“ وہ مینو کو میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ ”یہ ریسٹوران دوست فاختہ کے لئے بے حد شہرت رکھتا ہے۔“

جس طرح خرگوش جیسے بیبے جانور کو باقاعدہ کھانا میرے نزدیک ایک نیم وحشیانہ قسم کی حرکت ہے اسی طرح فاختہ ایسی پُر امن پردوں کی پوٹلی کو ہرپ کر لینا میرے بس کی بات نہ تھی اور پھر اس پرندے نے مجھے اپنی ایک کتاب کا عنوان ہی تو دیا تھا۔ چنانچہ میں نے سام کی پُر زور سفارش کو نظر انداز کرتے ہوئے دوست فاختہ کی بجائے دوست مرغ کا انتخاب کیا۔

”خواتین و حضرات آپ باہر ٹیرس پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کریں میں مشروبات دہیں بخورادیتا ہوں۔ کھانا نصف گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔“ سیاہ سوٹ اور ڈائینا ملبوس میجر نے چٹھی ہوتی جبینوں والے ہم سیاحوں سے مودب ہو کر درخواست کی۔

ٹیرس پر نرم گرم گاہٹ کی دھوپ تھی اور سامنے سمندر تھا۔ سیبل نے دھوپ سننے کے لئے اپنا سکرٹ کچھ اس طرح سے اُدپر تک سمیٹ لیا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے ہلکے

بنے لگے۔ ایک مداری آگیا جس کا بندر اُسی تربیت گاہ سے فارغ التحصیل ہوا تھا جس نے کستانی بندر تربیت حاصل کرتے ہیں یعنی اُس نے بھی دُلہا بن کر قص کیا، سخی باباؤں نے سام کیا اور چھری پکڑ کر خمیدہ بوڑھا بنا۔ اس کے بعد ایک پھیری والا مسکراتا ہوا آیا ہاتھ میں ریڈیو، بازوؤں پر گھڑیاں، گھڑیوں پر جرابیں لٹکتی ہوئیں، کندھوں پر پٹنی پڑے کے تھان، کانوں پر پین لٹکائے ہوئے... سام نے ہمیں ایک مرتبہ خبردار کیا کہ بڑی نہایت باتوں پر ہوتے ہیں امد اگر ان سے گفتگو شروع کر دی جائے تو انسان خواہ مخواہ بڑے کچھ خرید لیتا ہے اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ انہیں نزدیک ہی نہ آنے دیا جائے۔

”بالکل نزدیک نہ آنے دیا جائے۔“ گرتھ نے تاکید کی۔

چنانچہ سام نے ہم سب کی ترجمانی کرتے ہوئے پھیری والے کو عربی میں دفع دُور ہو جانے کا حکم دیا اور وہ اُسی طرح مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد تمام لوگ اطمینان سے اپنے شرب پیتے رہے اور سام باجرے کی راکھی بیٹھی مٹیاری طرح پھیری والوں کو شکار تارہا۔ ایک پھیری والا جسے شاید اُس کے ساتھیوں نے خبردار کر دیا تھا ہمارے قریب تو نہ آیا البتہ کچھ فاصلے پر ایک ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور انتہائی مسکین مسکراتے چہرے پر سجتے بیچارگی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چونکہ اُس نے ٹیرس کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اس لئے ہم بھی چپکے بیٹھے رہے مگر تھوڑی دیر بعد اُس کی مسکراتی موجودگی ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی اور ہماری گفتگو اکھڑنے لگی۔

چنانچہ سام نے آواز دے کر پوچھا کہ بھتی تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اُس نے وہیں فزہ کھڑے جواب دیا کہ بس ادھر سے گزر رہا، تم لوگوں کے ہنسنے کھیلنے خوبصورت ہے۔ دیکھ کر قدم رک گئے۔ ماشاء اللہ۔ بس تمہیں دیکھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں۔ پھر پوچھا جاتا ہوں۔ اب اس کا کیا جواب دیا جاتا۔ تمام لوگ مجرموں کی طرح سر ہلاتے ہوئے گئے۔ پانچ منٹ کی خاموشی کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس بھلے مانس کو بلا کر پوچھ ہی جائے کہ... جب وہ بھلا مانس ہم سے رخصت ہوا تو میرے پاس ایک ایسا رومال تھا

سام کرسی پر بیٹھا، پہلو بدل کر اس کی مضبوطی کے بارے میں اطمینان کیا۔  
 پچھت سے ٹیک لگانے کو ہی تھا کہ کرسی کی ایک ٹانگ جواب دے گئی اور وہ  
 فرش پر پڑا تھا۔  
 ”میرا خیال ہے اس رسیٹوران سے چلا جائے“ سام نے وہیں لیٹے لیٹے فیجرو کو  
 مڑتے ہوئے کہا۔

فیجرو نے اپنی رونی صورت سے ہم سب کی طرف دیکھا اور پھر یکدم سام کے پاس  
 پڑنٹس کرنے لگا۔ ”یقین کیجئے... خدا کے لئے... پلیز... میں آج ہی تمام کرسیاں  
 بدل دوں گا۔ فرنیچر بدل دوں گا۔ فرنیچر والے کو بدل دوں گا... پلیز، پلیز...“  
 ایک اور کرسی منگوائی گئی۔ سام جھجکتے ہوئے اُس پر بیٹھ گیا۔ ہم سب ایک ایسے  
 بے چارے کی طرح کان لگاتے منتظر رہے جس نے پٹاخے کو دیا سلائی دکھا رکھی تھی۔ فیجرو تو  
 باندھ جان کئی کے عالم میں تھا، اگر پلک جھپکتا تو تیزی سے جھپکتا کہ کہیں اس دوران  
 کوئی چہرہ نوٹ جائے۔ بہر حال سام سانس روکے بیٹھا رہا اور خاصی دیر تک بیٹھا رہا۔  
 ”کھانے کا مڑا تو نہیں آئے گا؟“ سام نے منہ بنایا۔ ”بہر حال آپ لوگ بھی بیٹھ جائیں  
 روزِ احتیاط سے“

ہم اتنی احتیاط سے بیٹھے کہ اس عمل میں پورے پانچ منٹ لگ گئے۔ اب صورت  
 یہ تھی کہ ہر شخص فرعونوں کی طرح ہاتھ آگے رکھے دم سادھے بیٹھا تھا۔ ویٹریں نے کھانا  
 بنایا تو ہم بقیہ سب کو بالکل منجمد کئے دھیرے دھیرے پوستیوں کی طرح ہاتھ بڑھا کر خوراک  
 فائے رہے۔ فیجرو کچھ فاصلے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں بدستور سام  
 پر ہی پڑیں۔

”سُکو“ سام نے گردن آگے نکال کر سرگوشی کی۔ آرام سے کھانا کھاؤ، کرسیاں  
 بدستور کی۔  
 ”یہ تم کہہ رہے ہو؟“ گر تھنے نے ہلے بغیر کہا۔

جس میں اگر چھوٹا ماری جاتے تو فوراً ایک گول سوراخ نمودار ہو جائے۔ پال اور نیک  
 نے رے بین کی عینک خرید رکھی تھی جس کے فریم کا رنگ ابھی سے اتر رہا تھا۔ سام نے  
 انگوٹھی پہن رکھی تھی جس کی چاندی مدھم ہوتی جاتی تھی۔ جارج نے اپنے دستانوں میں  
 ہاتھ ڈالا تو انگوٹھا باہر جھانکنے لگا۔ گر تھ کے پاس جرابوں کا ایک جوتا تھا جسے کھینچا گیا تو  
 وہ کھینچا ہی رہا۔

”اب میں ان جرابوں کا کیا کروں؟“ اُس نے سیبل کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔  
 ”بہت بہت شکریہ لیکن میں سکرٹ کے نیچے جرابیں نہیں پہنتی۔“  
 اس بے نیکی خریداری کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ہم سب کو اپنے ٹٹنے کا ذمہ برابر ملال  
 نہ تھا بلکہ ہم مصریوں کی چرب زبانی کے قائل ہو چکے تھے... جانے یہ لوگ اسراہیل سے نکلتے  
 کرنے کے لئے کسی پھیری والے کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔

ایک ویٹری نے اگر اطلاع دی کہ جناب کھانا لگا دیا گیا ہے، تشریف لائیے کھانے کی  
 میز کی سجاوٹ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر سب کے چہرے اتر گئے۔ ہم نے تو آج تک اخبار میں  
 صدارتی ضیافتوں کی تصاویر میں ہی اس قسم کی آرائش دیکھی تھی، بہر حال سام نے پچھتین  
 دلایا کہ بل مونگ پھلیاں ہی ہر گا۔ سب سے پہلے سام ہی آگے بڑھا اور کرسی کھینچ کر اُس  
 پر بیٹھا ہی تھا کہ دھڑام سے نیچے جا گرا۔ کرسی کی ایک ٹانگ پرواز کرتی ہوئی شیشے کی ٹکڑی  
 سے جا ٹکرائی۔ فیجرو بھاگتا ہوا آیا اور سام کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

”یہ کس قسم کا رسیٹوران ہے...“ سام غصے سے بولا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔  
 حالانکہ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔

”یقین کیجئے فرنیچر بالکل نیا ہے... میں بے حد شرمندہ ہوں... پلیز... میری  
 سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ واقعی اتنا شرمندہ ہو رہا تھا کہ ہمیں ترس آ رہا تھا۔ فیجرو  
 نے ویٹرو کو اشارہ کیا جو دوسری میز سے ایک اور کرسی اٹھا لایا۔  
 ”پلیز۔“ فیجرو نے سام سے گزارش کی۔

”انہیں بناؤ جارج“ سام نے کنگ کانگ کو اشارہ کیا۔

جارج نے چاروں طرف نظر دوڑا کر اطمینان کیا اور پھر بڑے غر سے بولا ”ہاں“  
 کا پرانا مشغلہ ہے۔ بیروت میں بھی جس رستوران میں جاتا تھا کمرسی پر بیٹھتے ہوئے کمرے  
 کا ایسا خاموش وار کرتا تھا کہ سب کچھ بینک بینک ہو جاتا تھا اور یوں کثافتات میں  
 خود اک مُفت مل جایا کرتی تھی... ہاں ایک مرتبہ ذرا ٹریڈی ہو گئی۔ ہوٹل کا مالک بھی  
 کرائے کا ماہر تھا وہ چپ چاپ یہ تماشا دیکھتا رہا اور جب بل آیا تو اس میں دو کمرے  
 کی قیمت بھی شامل تھی، ادا کرنی پڑی۔“

ہمارا بل آیا تو اس میں کمرے کی قیمت شامل نہیں تھی بلکہ انتظامیہ نے انہماں پانچ  
 کے طور پر پچاس فیصد کی خصوصی رعایت دی تھی۔ واقعی مزنگ پھیلیاں!

گر تھ غسل خانے سے ہاتھ دھو کر آیا تو مسکرا رہا تھا۔ جارج اور سام بھی ہنسنے  
 ہنستے ہوئے لوٹے۔ یہاں تک کہ پال ایسا خاموش طبع شخص بھی جب فارغ ہو کر پور  
 آیا تو منہ پر ہتھیلی جاکر میٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ میں نے نیکیں تہہ کر کے بیڈ  
 میں رکھا اور مسکراہٹ کے اس عقدے کو حل کرنے کے لئے غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ راستے  
 میں میچ کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی ایک مرتبہ پھر کمرسیوں کی لاغر صحت کے بارے میں  
 بھرپور معذرت کی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی خاطر  
 ابھی تپوں کی زپ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ عقب سے ہلکی ہلکی نفرتی ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے  
 ایک دم ہراساں ہو کر یوں پیچھے دیکھا جیسے سیف کھولتا ہوا چور کسی آہٹ پر ہلک جاتا ہے  
 ... چار نمکین سہوا میں سفید اور آل سپنے جاپانی گیشا گرلز کی طرح ہاتھوں میں تولیے  
 ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ تپ نہیں انہوں نے کیا دیکھ لیا تھا۔ اب میں آنے والا  
 بچے کی طرح تھا جسے خطرہ ہو کہ نیکر ڈھلک کر نیچے گر جائے گی اور وہ دونوں ہاتھ  
 اُسے تھامے کھڑا ہو۔ اُدھر نمکین ہوا میں منتظر تھیں کہ جس دباؤ کے تحت میں غسل خانے  
 ہوں اُسے کم کرنے کا عمل شروع کر دوں مگر ظاہر ہے اُن کی کھی کھی کرتی موجودگی

کننے لگے قاہرہ پہنچتے ہی بُرج کے علاقے میں چلے جانا... وہاں رہائشی فلیٹ  
 بڑا درمیاںوں پر ملتے ہیں، ایک تم بھی لے لینا۔

میں نے پوچھا۔ اچھا پھر؟  
 کننے لگے کہ تم اپنا سامان ابھی فلیٹ میں رکھ ہی رہے ہو گے کہ دروازے پر  
 شہزادی اور تین چار خواتین اندر آجائیں گی۔ وہ پوچھیں گی کہ جناب آپ کو یہاں قیام

کے دوران بادرچی خانے میں کام کرنے کے لئے خادمہ درکار ہے؟... تم حسبِ منزل اُن میں سے ایک کو رکھ لینا۔

میں نے عرض کیا۔ یا خواجہ مجھے بادرچی خانے کے لئے خادمہ کی کیا ضرورت ہے تو باہر رکھاؤں گا۔ فرمانے لگے، ویسے تو اُس فلیٹ میں بادرچی خانہ بھی نہیں ہوگا اگر رکھ لینا... بس قاہرہ سے روانگی کے وقت اُس بیچاری کی خدمات کے عوض کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دے دینا، خوش ہو جائے گی... دراصل مصر میں غربت بہت ہے۔

میں نے پوچھا۔ فرض کیجئے اس فلیٹ کے دروازے پر دستک نہیں ہوتی پھر؟ کہنے لگے، ہوگی۔

میں نے کہا پھر بھی فرض کر لیجئے کہ...

”ہوگی“۔ وہ غصے سے بولے۔ ”ایک تو تم بحث بہت کرتے ہو۔ بہر حال اگر نہ ہوئی تو پھر نیچے اتر آنا اور برج کے پُل پر کھڑے ہو کر عبداللہ کو آواز دے دینا وہ بندہ کر دے گا۔“

”کوئی عبداللہ کو؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بس تم پل پر کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگانا عبداللہ! اور تین چار عبداللہ جاتیں گے...“

”اور اگر نہ آئے تو؟“

”ضرور آئیں گے۔“ وہ گہرے یقین سے سر ملاتے ہوئے بولے۔ ”دراصل تیرے“

نہیں ہے ناں کہ مصر میں غربت بہت ہے۔“

... اگر میں کسی طور آج قاہرہ پہنچ جاتا تو صرف شغل کے طور پر برج کے پُل پر کھڑے ہو کر عبداللہ عبداللہ کے نعرے لگانا میرے پروگرام میں شامل تھا... صرف یہی ہے کہ لئے کہ کیا واقعی مصر میں غربت بہت ہے۔

تین بج رہے تھے اور تم تھکے ہوئے قدموں سے بندرگاہ کی جانب چل رہے تھے۔ ہارے پیچھے پیچھے چھٹی ہوئی نیکر اور گندی بنیان میں طبرس ایک چھ سات برس کا لڑکا سیٹاں بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی پیچھے دیکھتا تو وہ مڑے سے آنکھ نکال دیتا۔ ”اس مصری بچے سے عربی میں پوچھو کہ یہ سہارا تعاقب کیوں کر رہا ہے؟“ گرتھ نے تنگ آ کر سام سے درخواست کی۔ سام ابھی کچھ کہنے کو تھا کہ وہ مصری بچہ اڑتا ہوا ہمارے قریب آگیا۔

”تم عربی بول سکتے ہو؟“ اُس نے گرتھ سے انگریزی میں پوچھا۔

”نہیں“ گرتھ نے ڈانٹا۔

”انگریزی بول سکتے ہو؟“

”میں انگریزی بھی نہیں بول سکتا۔“ گرتھ نے دانت پیسے۔

”بول تو رہے ہو۔“ اُس نے گرتھ کو آنکھ ماری۔

ایک غصیلی سنجیدگی کے ساتھ گرتھ نے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور بولا۔ ”بچے اگر تم مصری ہو تو میں دنیا کی کوئی بھی زبان نہیں بولتا... اس لئے کہ میں صبح سے ایک بیگ، دو درجن بال پوائنٹ اور جرابوں کا ایک جوڑا خرید چکا ہوں۔“

”لیکن میں کچھ بیچنا تو نہیں چاہتا۔“ بچے نے اپنے خراٹ چہرے پر اب معصومیت بھالی۔ ”تو پھر کیا چاہتے ہو شکوک مصری بچے؟“ گرتھ دھاڑا۔

”میں تو آپ کو ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں اور آپ ہنس ہنس کر بے حال ہو جائیں گے۔“ ”دفع ہو جاؤ۔“

بچے نے نہایت ناراض اور دونی سی شکل بنالی۔ اس پر مونیک اور سیبل نے گرتھ کو زبردستی طعن کی کہیں بیچارے بچے پر گرم ہو رہے ہو، صرف لطیفہ ہی تو سنانا چاہتا ہے۔

”بھئی آئے گی۔“ بچہ ہوشیار ہو گیا۔

”اور اگر... مجھے ہنسی نہ آتی... تو؟“ گر تھ نے بچے کو کچا چبا جانے والی نعروں سے دیکھا۔

”تو آپ مجھے جوڑتے ماریں“ وہ ابرو چڑھا کر بولا۔

”اور یقین رکھو کہ میں واقعی ماروں گا... یہ جو کر مجھے ہنسائے گا؟“ گر تھ نے بچے کو بنا کر اپنا سینہ ٹھونکا اور ہم سب بچے کی ہمراہی میں چلنے لگے۔ لطیفہ شروع ہو گیا۔

”ایک عورت کا امیر خاندان فوت ہو گیا۔ عہدت نے ساری جائیداد پر قبضہ کر کے لئے ایک وکیل سے قانونی مشورہ طلب کیا۔ وکیل نے ایک لاکھ ڈالر فیس کے طور پر وصول کئے اور اسے ایک نہایت قیمتی مشورہ دیا...“ بچے خاموش ہو گیا۔

”کیا مشورہ دیا بچے؟“ گر تھ بے دھیانی میں پوچھ بیٹھا۔

”جو مشورہ وکیل نے ایک لاکھ ڈالر وصول کر کے دیا وہ یونہی تو نہیں بتایا جاسکتا۔ آپ ایک ڈالر دے دیجئے، بتا دوں گا...“

گر تھ نے ایک آنکھ بند کر کے بچے کو گھورا اور زیر لب کوئی گالی دیتے ہوئے ایک ڈالر اس کے حوالے کر دیا۔

”وکیل نے عورت کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے شادی کر لے اور اس طرح وہ ساری عمر اس کے لئے مفت مقدمے لڑتا رہے گا۔“

”یہ تو بکواس قسم کا مشورہ ہے۔“ گر تھ کو اب احساس ہوا کہ اس نے اپنا ایک ڈالر ضائع کر دیا ہے۔

”تم وکیل ہو؟“ بچے نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“

”تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وکیل اسی قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ شادی ہوگئی اور وکیل نے عدالت میں جا کر عورت کی حمایت میں ایسے دلائل دیئے کہ

”ہوش ہو گیا...“

”اچھا“ گر تھ چوکا کر پھر سنہیل گیا۔ ”میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔“

”تو جناب جج بے ہوش ہو گیا لیکن وکیل نے اس کے کان میں ایک ایسی بات کہی

”جج چلا گیا مار کر میز پر چڑھ گیا...“

”کیا بات کہی بچے؟“ گر تھ نے بے اختیار پوچھا۔

”اگر آپ ایک ڈالر عنایت کر دیں تو...“

بندر گاہ کے داخلے پر پہنچے تو لطیفہ جاری تھا اور گر تھ کی امارت میں سات ڈالر کی واقع ہو چکی تھی۔

”مصری بچے“ گر تھ نے بالآخر دانت نکال دیئے۔ ”خدا کا شکر ہے کہ اب میں جہاز میں سوار ہو جاؤں گا ورنہ آج میں دیوالیہ ہو جاتا... یہ لو ایک اور ڈالر اور دفع ہو جاؤ۔“

”ٹھیک یوسر“ بچے نے مودب ہو کر سلام کیا، سب کو باری باری آنکھ لگائی اور بھاگتا ہوا شہر کی جانب چلا گیا۔

”اب سمجھ آتی ہے کہ مصر میں آنے والے ستیاح مصریوں کی بجائے میسوں کی نفادت میں زیادہ وقت کیوں گزارتے ہیں، وہ بولتی نہیں!“

کشم ہال میں اونٹ بک رہے تھے۔ چڑے کے بنے ہوئے مزید اشکوں والے اونٹوں کی آنکھوں میں کاجل بھرا تھا اور وہ ایک قطار میں درجہ بدرجہ کھڑے تھے پہلا اونٹ سائز کا تھا یعنی باقاعدہ اونٹ۔ اس کے بعد اس سے قدرے چھوٹا اور آخری اونٹ دو اونچا تھا مگر مکمل۔ میں نے آخری سائز کا ایک مٹی اونٹ خریدا اور اس پر بیٹھ کر ”سکندر سکندر“ لکھ کر حبیب میں ڈال لیا، سود میسر!

جہاز پر کابریں اور ترلووز لوڈ ہو رہے تھے۔ یہ بے شمار ترلووز ان مصریوں کا اثاثہ تھا جو ہندوستان سے سوار ہو رہے تھے۔ میں سسٹانے کی غرض سے اپنے پرسکون ہال



## اوڈیس کشتی روک دو

”دیائے آدشن کے بہتے پانیوں میں سے میرا جہاز گزرا اور سمندر کی وسعت  
داخل ہوا اور ہم جزیرہ طلوع آفتاب کے قریب پہنچے جہاں صبح کا گھر ہے“  
رات کے بعد صبح آئی۔

جہاں گرد کے سفر کی ایک اور صبح۔

جہاز نیم تار ایک سمندر کے فریب میں گھرا ہوا تھا۔ یونانی دیوی دیوتاؤں کے  
مذہب کیون میں جہاں ٹرائے سے واپسی پر اوڈیسس نے عرشے پر کھڑے ہو کر صبح  
ہائے کے لاتعداد مناظر دیکھے تھے۔

رات بے چینی میں گزری۔ ڈیک میں خوابیدہ جسموں کی باس اور گھٹن، میں نیند  
کو ساتھ لئے عرشے پر آگیا۔

جہاز نیم تار ایک سمندر کے فریب میں گھرا ہوا تھا اور صبح آنے کو تھی۔  
سمندر کے سلوٹوں سے پاک سرمئی فرش نے آسمان کی گرتی محراب کو روک رکھا  
نور نیند غالب آگئی۔

جب پیوٹے دوبارہ اُٹھے تو، دیکھو اب وہاں روشنی تھی۔

سورج کا روشن دائرہ سمندری فرش کے کنارے پر سے جھانک رہا تھا۔ سنہری  
نور کی دُاریں سنسناتے تیروں کی طرح میرے سر پر سے پرواز کرتی گزر رہی تھیں اور

میں داخل ہوا تو وہاں مصریوں کا ایک ہجوم موجیں کر رہا تھا، چرس پی جا رہی تھی اور  
تربوز کھاتے جا رہے تھے۔ فضا میں دھواں گاڑھا تھا۔ میرے بستر پر بھی ایک تربوز  
دھرا تھا۔ نچلے بستر سے ایک منحنی سامصری اُٹھا اور لمبا ہوتا گیا۔ ”میرا نام صلاح ہے“  
اس کی تھوٹھی اُس اونٹ سے بہت ملتی تھی جو اُس وقت میری جیب میں تھا۔ ”تربوز  
آپ کے لئے...“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور جھکتا چلا گیا۔ ”برادر برادر“  
میں نے تھوٹھی دیر صلاح الدین سے کپ لگائی جو نیپلز میں پھیری لگانے جا رہا تھا  
اور پھر چرس کی بو سے تنگ آ کر عرشے پر آگیا۔

پورے چار بجے جہاز کو دھچکا سا لگا جیسے سات گھنٹے کی ہم آغوشی کے بعد  
سمندر نے اُسے دھتکار دیا ہوا اور دھیرے دھیرے بندرگاہ سے پیچھے ہٹنے لگا  
سمندر میں آتے آتے ہمیں شام ہو گئی۔ میں نے اپنا منی اونٹ پھیلی پر رکھا، اُس کی  
کاہل بھری آنکھیں مجھے تنکے لگیں، سکندر۔ سکندر یہ!  
انتونی نے خنجر سے خودکشی کر لی، سکندر۔ سکندر یہ!  
قلو پٹوہ کو ناگن نے ڈس لیا، سکندر۔ سکندر یہ!

❖ ————— ❖

سمندر اُن کا عکس ہو رہا تھا۔ بقول ہومر انگوروں کی شراب ایسا سیاہی مائل کر دیتا ہے کہ اُس اندھے شاعر نے اسی دیوالائی سمندر پر پیس کہیں دارد ہوئی اسی قسم کا بھرا ہوا ہزاروں برس پہلے ”دیکھا“ اور بیان کیا۔

تازہ، خوشگوار صبح آئی اور اپنے نارنجی جھنڈے سے آسمان روشن کر دیا۔ صبح نارنجی بادلے میں ملبوس آئی۔

صبح نے گلابی رنگت والے ہاتھوں سے مشرق کو روشن کیا۔ صبح اپنے بستر پر بیدار ہوئی جہاں وہ تھوئیں دلیزنا کے ساتھ سوتی ہے تاکہ وہ انسانوں کو روشنی مہیا کرے۔

صبح جب چمکتے سورج نے ستاروں کو فراہم ہونے پر مجبور کر دیا۔ بابرکت صبح آئی اور مشرق کو سرخ روشنی میں لپیٹ دیا۔

اور پھر صبح اپنے بابرکت تخت پر بیٹھ گئی۔

ادریس ایک بادبانی کشتی میں سوار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جادوگر بنوں، ایک چشم جتوں، اسیری کے ہاتھ بڑھانے والی دیویوں اور سمندر کے تھریں سے گزرتا اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا اور میں اُسی راستے پر لیکن مخالف سمت میں اپنے گھر سے دور ہو رہا تھا۔ اس پرانے جہاز میں، اکیلا کہ سیاح ہمیشہ تنہا ہوتا ہے اور میں بھی عازلہ اور جنگلوں کے غفرتیوں سے بچ نکلا تھا، مگر ابھی سفر باقی تھا... مجھے ابھی بڑے پتیا تھا اور گھر کو واپسی کا خیال اس لمحے غم آنکھ کے آگے دھندلائے منظر کی طرح تھا۔ صبح اپنے بابرکت تخت پر بیٹھ چکی تھی اور مسافر ناشتے سے فارغ ہو کر عرش پر پھیل رہے تھے۔

”بریکناسٹ سر“ موزیک کی آواز آئی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کا طرز و حال بالکل بدن تھا۔ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اُس نے اپنی جلد کی رنگت کی کمی ہیں۔

پارکر کپڑا جو دو گرہ باندھ لیا جاتا ہے اور دو گرہ اٹکا لیا جاتا ہے مگر موزیک نے نہ بالائی حصے کی وجہ سے وہ دو گرہ بھی باندھ رکھا تھا کہ اسے اٹکانے کے لئے مناسب نہ ہو نہ تھی یعنی اُس کا ٹکڑا کچھ اس قسم کا تھا کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ آرہی ہے یا نہیں ہے۔ وہ بالکل سموار تو نہ تھی، بس شائبہ سا ہوتا تھا کہ یہاں کچھ ہے۔

”کانی؟“ اُس نے فلاسک میری گود میں رکھ دی۔ ”اور بسکٹ؟“ اور ایک بسکٹ فرادیا۔

”شکریہ“

”آج چونکہ ہمیں کہیں بھی لنگر انداز نہیں ہونا اس لئے میں نے سوچا کہ عرش پر اُپر سیک کر دن گزارا جائے۔“ وہ ڈیک چیر پر دراز ہوتی ہوئی بولی اور آنکھیں بند کر لیں۔

”پال کہاں ہے؟“

”اُسے اُپکائیاں آرہی ہیں، صبح سے داش بمیں کو آغوش میں لئے کھڑا ہے۔“ تھوڑی دیر بعد جارج اور سام کا چوڑا بھی نمودار ہو گیا۔ سیبل بھی ان کے ہمراہ تھی اور کمپنی میں تھی۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے کی نسبت جب اُس نے نہانے کا یہ لباس پہنا تھا وہ مزید موٹی ہو چکی ہے کیونکہ وہ باقاعدہ سانس سمیٹ کر گفتگو کر رہی تھی بادل کپڑا دعاگوں میں نہ بدل جاتے۔ جارج حسبِ عادت ایک پرمسٹر ریچھ کی طرح کھانچا اور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تینوں مصری لڑکیاں بھی یکشت گھوم رہی تھیں۔

گرتھ آیا، کوٹوں پر ہاتھ رکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ”صبح کے وقت تازہ ہوا میں نہ لینا صحت کے لئے مفید ہے، صرف ایک سانس... اب میں سیلون میں جا کر بیرون گا۔“

”فالی بیٹ شراب پینا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔“ سیبل نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

گم تھکے میری گود میں رکھے پکیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھایا اور نگل لیا۔  
ٹھیک ہے؟“ اور ٹٹکٹا ہوا چلا گیا۔

سمندر کے بے انت پھیلاؤ میں جہاز کا تنہا وجود دل چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

پچھلے پہر ہم سے خاصے خاصے پر سفید زمین کا ایک تودہ اُبھرا ہوا دکھائی دینے لگا۔  
رہوڈز جس کی بندرگاہ کے دہانے پر دُنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک یعنی  
کلاسس آف رہوڈز ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ مجسمہ ساز چارس کا تراشا ہوا عظیم  
ایستادگی کے پانچ برس بعد ایک زلزلے سے اوندھا ہو کر گرا اور سمندر کی تہ میں  
جالیا۔ پھر روایت کے مطابق ایک شامی نے اسے خرید لیا اور اس کے ٹکڑے پانی میں  
سے نکال کر اُونٹوں پر لادے اور شام لے گیا۔ روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ رہوڈز آزاد  
شام کے درمیان پڑتے سمندر پر اُونٹ کس طرح چلتے گئے، یا تو بڑے پیچھے ہوتے اُونٹ  
ہوں گے اور یا پھر اُن دنوں تیرتے بھی ہوں گے۔ اُونٹ کو صحرائی جہاز "کلا" اور دو تین  
کہا گیا... رہوڈز کے وجود میں آنے کی روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہا جاتا ہے  
کہ دیوس دیوتا ایک روز بڑے خوشگوار مود میں تھا چنانچہ اُس نے دریادلی بلکہ سمندر  
کا مظاہرہ کرتے ہوئے سمندر میں واقع بارہ جزیرے مختلف جو نیزہ و تلواروں کو لاٹ  
کر دیئے۔ آخر دیوتا تھا اس لئے بے چارے اپا لو کو بھول گیا جو ان دنوں کس تھیلان  
منانے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اپا لو بڑا سیخ پا ہوا اور دھمکی دی کہ آج کے بعد اس سمندر  
میں سے جو بھی جزیرہ ظہور میں آئے گا، میرا ہوگا۔

ایک چمکیلی مٹی پر اس سمندر زلزلے سے لرزا اور ایک آتش فشاں چٹان سمندر کی  
تہ میں سے اُبھرتی ہوئی سطح پر نمودار ہو گئی۔ یہ رہوڈز تھا اور اپا لو کا تھا۔

سمندر کے بے انت پھیلاؤ میں جہاز کا تنہا وجود دل چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

سیل گنگنا رہی تھی۔

سمندر پر دھوپ کی چادر چمکتی تھی۔ کورے لٹھے میں چلتی قینچی کی طرح جہاز اس

دور کا کٹا چلا جا رہا تھا۔

سفید چٹانوں کا ایک اور جزیرہ نظر آیا جیسے سمندر میں کسی سفید براق دیل کی

پت اُبھری ہوئی ہو۔ ہم اس کے قریب ہوئے اور پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دھوپ

پتوں میں گھمکتی ہوئی سفیدی کے علاوہ وہاں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سفید چٹانوں کا

سُس پانی پر تھا جس کے سکوت میں جہاز غل ہوتا چل رہا تھا۔

”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی ان چٹانوں کے عقب میں سے ایک آنکھ

دلا سا ٹیکو پ دیو نمودار ہو گا اور جہاز پر ایک بھاری چٹان گرا دے گا۔“ جارج

ناوشی سے گزرتے سفید جزیرے کی ہیبت سے سہم گیا۔

”اور اگر سا ٹیکو پ نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر سمندر

پر دُوب مرے گا۔“ سیسل لا پردائی سے بولی۔

ایک ناماوض جارج نے سچکی لی۔ ”تم محبت کے اظہار کے لئے کتنی خوبصورت

زبان استعمال کرتی ہو۔“

جہاز جزیرے کے بالکل قریب ہو کر چل رہا تھا۔ چٹانیں ہم پر چمکی ہوئی تھیں

اور ہم اپنی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوف لئے اُن کی سفید بے جان آنکھوں کو

نہا رہا تھا۔ دھوپ کی چمک تیز اور ڈراؤنی تھی۔ عرشے پر مکمل خاموشی چھا چکی تھی ہوائے

سُسل کے جواب بھی آنکھیں بند کئے گنگنا رہی تھی۔

اودیسس کی کشتی یقیناً اسی جزیرے کے قریب سے گزری ہو گی۔

ایک روز ایک چٹانوں کے جزیرے میں اُس نے سا تیرز کو دیکھا... ”ہمارے

بھائی، اُسے شاندار اودیسس کشتی روک دو اور آجاؤ...“

لیکن اودیسس کو مہر کے دیوی نے خبردار کر دیا تھا کہ سب سے پہلے تم اُس

”لنچ سر“ اُس کی چوہوں ایسی دندیاں لبوں میں سے جھانکنے لگیں۔  
”شکریہ“

وہ ڈانٹنگ روم میں واپس جانے کے بجائے ڈیک چئیر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟“ میں نے بالکل ایک ایسے فقیر کی طرح محسوس کیا جو بزم میں سے پہلا نوالہ اٹھانے کے بعد اپنے آن داتا کی جانب کھسیانی بلی کی طرح بھاٹا ہے۔

”نہیں تم کھاؤ... میں اپنے جسمانی تناسب کا دھیان رکھ رہی ہوں۔“  
”مجھ سے پوچھو تو تمہیں خوراک کی سخت ضرورت ہے۔“ میں نے اُس کے لم ڈھینگ پر ایک نظر ڈالی۔

”عجیب بات ہے“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”یورپ میں تو...“ اُس نے اپنی ہتھیلی بائسٹری کی طرح پورے جسم پر پھیری۔ اس قسم کے ماڈل گزرا ایسے فکر کو پسند کیا جاتا ہے۔  
”گرم شرابی لوگوں کو جانے کیوں بڑے گوشت سے ہی رغبت ہوتی ہے... یہ سیبل ٹائٹروں میں بہت پالورہ تھی، کیا خیال ہے ایسا کیوں ہے؟ آخر عورت اور گائے ایک کچھ تو فرق ہوتا ہے...“

”میں چپکے سے سُنتا رہا اور اُس کا مہیا کردہ کھانا کھا تا رہا...“  
”کچھ ہم اٹالیہ پہنچ جائیں گے...“ لنچ کے خاتمے پر میں نے کہا۔  
”بالکل نیلین اور پرسوں مار سیلنہ اور اُس سے اگلے روز میں پیرس میں ہوں گی“  
”اور خود مختار“

”بال بہت وسیع القلب خاوند ہے کیا؟“  
”نومیر خاوند نہیں ہے۔“ مونیک آنکھیں بند کر کے پھر لیٹ گئی۔ ”تمہارے مشرقی نام نہاد اخلاقیات کے خوف سے ہم یہاں بیوی کے طور پر سفر کرتے رہے ہیں ورنہ

جزیرے میں پہنچو گے جہاں سائرنز نام کی ڈانٹیں رہتی ہیں جو مردوں کے ساتھ ہمہ تن کرتی ہیں۔ مگر جو کوئی اُن کے قریب جاتے وہ کبھی اُس جزیرے سے واپس نہیں آتا۔ کیونکہ وہ پھولوں کے کھیتوں میں لیٹی ہوتی خوبصورت گیت گاکر مسافر دل کو مسحور کر دیتی ہیں اور ان کے گرد اُن کے شکار مردوں کی لاشیں پڑی ہوتی ہیں۔  
سیبل گنگنا رہی تھی اور سفید جزیرے کی چٹانیں ہمارے سروں پر سایہ کرتی رہی تھیں۔

”ہمارے پاس آؤ اے شاندار اڈیسیس، کشتی روک دو اور آجاؤ... اڈیم تمہیں اُن کارناموں کے گیت سنائیں جو تم نے ٹرائے کی دیواروں تلے سرانجام دیے... کشتی روک دو۔“

یہ سائرنز کا بلاوا تھا۔ سمندری ڈانٹیں جن کے چہرے خوبصورت ترین عورتوں کے تھے اور دھڑکنے والے دل کے... لیکن اڈیسیس کو میرے خبردار کر چکی تھی۔ اُس نے سفید جزیرے کے قریب آنے سے پہلے اپنے ساتھیوں کے کانوں میں کچھلی ہوئی موم ڈال دی تھی تاکہ وہ سائرنز کے مسحور کن گیت سن کر کشتی سے کوڈ کر جزیرے میں نہ پہنچ جائیں اور خود کو بادیان کے مستول سے باندھ لیا تھا... ”ہمارے پاس آؤ اے شاندار اڈیسیس... سائرنز کا گیت اتنا سحر انگیز اور وسیلا تھا کہ اڈیسیس بے اختیار ہو گیا اور اپنے آپ کو مستول سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر اُس کے بہرے ساتھیوں نے اسے اور مضبوطی سے باندھ دیا... یوں جب اُس کی کشتی سائرنز کے چٹانوں والے جزیرے کے قریب سے گزر گئی تو سب نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اڈیسیس کو کھول دیا۔ ہمارے جہاز نے جب خاموشی کے اس سفید جزیرے کی آخری چٹان چھچھوئی تو سب نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ میں نے ریلنگ پر جکڑے ہاتھوں کو کھول دیا۔ سیبل بدستور گنگنا رہی تھی مگر اُس کی آوازیں وہ سحر باقی نہ تھا۔  
دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا تو سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ مونیک حب معلوم جاتے ہی لوٹ آتی۔

لیکن سمندر دھیانہ ہوا، اُس کی شہوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک نامعلوم سی رخت سنناٹ پر سو پھیلنے لگی۔ دس منٹ تک یہی کیفیت رہی اور پھر سورج کے نئے بھی غبار آگیا۔ جہاز اس بُری طرح لڑکھڑانے لگا جیسے یونانی دیوالا لاکوئی عفریت مندر کی تہ میں سے ہاتھ بڑھا کر یونہی تقریباً اسے جھلار ہا ہو۔

ایک جہاز کا ایک پُرسکون سمندر کی شہرت رکھتا ہے یکدم اپنا مزاج بدلنے لگا۔ اسے بنانی دیوتاؤں کا سونگ پُل بھی کہا جاتا ہے اور لگتا تھا جیسے تمام دیوتا ابھی ابھی لڑاؤ پس سے اتر کر اس میں کود پڑے ہوں... جہاز سے ٹکراتی لہروں کی پھوار سے ہلکے چرے ہیلنے لگے اور تیز ہوا ہمیں سرد کرنے لگی۔

”ہے تم لوگ“ عرشے پر آنے والی سیڑھی پر گر کر کھڑا تھا بلکہ کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ”کیا واقعی باہر طوفان ہے؟“

”ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے“ اُٹار تو ایسے ہی ہیں۔“

”ابا! وہ ہنستا ہوا سیڑھی پر چھک گیا۔“ سیلون میں دھسلی پڑے ہوئے مجھے لگے ہاتھا لباہر طوفان ہے مگر جہاز کا کپتان اصرار کر رہا تھا کہ نہیں سمندر بالکل پُرسکون ہے۔“

”جہاز کا کپتان... وہ سیلون میں کیا کر رہا ہے؟“

”دھمکی پی رہا ہے۔“

”تو پھر...“ مونیک نے ایک خوفزدہ چپکلی کی۔ ”جہاز کون چلا رہا ہے؟“

”میری پالتو لڑکی فکر مت کرو، اُس کا کہنا ہے کہ اتنے قدیم جہاز سے زیادہ چھپر چھپاڑا بائے تو اس کے بچنے اُدھرنے لگیں۔ راستے میں آس برگ یا چٹانیں تو ہیں نہیں اس نے منت متعین کر کے اسے کھلا چھوڑ دینا ہم سب کی صحت کے لئے مفید ہے۔“

”راستے میں جزیرے تو ہیں...“

”مگر ڈبکی لگا کر ان کے نیچے سے گزر جائیں گے...“

”مگر تو پلیر مجھے خوفزدہ مت کرو...“ مونیک نے منت کی۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہاں سچ کہہ رہا ہے؟“

”ہم صرف دوست ہیں... اگر ہم اس سفر کے دوران ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں تو شاید شادی بھی کر لیتے مگر پال نے مجھے مایوس کیا ہے... اُس نے فلسطینیوں کی جو تصویریں اتاری ہیں وہ سب کی سب ان کے خلاف استعمال کی جائیں گی۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے سگریٹ سٹگا کر دانتوں میں دبایا۔

”پال نے فلسطینی مہاجرین کی ایسی تصاویر اتاری ہیں جن سے ظاہر ہو کر یاروگ اپنے وطن سے نکل کر عیش کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی مفت خوراک کھاتے ہیں۔ عربوں کے خیرات کردہ کپڑے پہنتے ہیں اور خیموں میں پڑے سوئے رہتے ہیں... اور ان لوگوں نے مجھے اور پال کو سرسراٹھوں پر بٹھایا، پورے قیام کے دوران محبت سے دہرے ہرے رہے اور ہمیں ایک پیسہ بھی خرچ کرنے نہیں دیا... اتنے مہربان لوگوں سے اس قسم کا سلوک؟... اسی لئے بیروت میں ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا... اُس کا موقف یہ ہے کہ اُن تصویروں کے بدلے اتنی رقم ملے گی کہ ہم ایک شاندار گھر خرید سکتے ہیں اور کئی بچوں کو ایسے انسانوں کے ساتھ دھوکہ کرنا مکروہ ترین فعل ہے... میں کبھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی... اور پھر وہ مکمل مرد بھی تو نہیں...“

”ہیں...“ میرا سگریٹ لبوں میں سے گر گیا۔ ”یعنی وہ... یعنی اُس کے کچھ راتھ چھپ چکے ہوتے ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ چڑھیا کے دانتوں سے ہنسی۔ ”ساڑھے چھ تو نہیں... چھ بج کر پینٹین منٹ کہہ لو... لیکن اگر وہ ایک ایماندار شخص ہوتا تو شاید میں اس کی کو بھی محسوس کرتی... جہاز کچھ زیادہ نہیں ڈول رہا؟“ اُس نے ڈیک چیر کے بازو کو گرفت میں لے ہوئے چونک کر کہا۔

”سمندر کی چادر پر حرکت کرتی ہوئی سلوٹیں نمودار ہو رہی تھیں۔“

”یہ سب تمہاری جنسی گفتگو کا اثر ہے... سمندر میں بھی اُبال آ رہا ہے۔“

”ابھی فوراً ہی دھیانہ ہو جائے گا... پال کی طرح۔“ اُس نے پورے یقین سے کہا۔

”بالکل... وہ صبح سے مجھے شراب پلا رہا ہے، ایسا شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔“  
 ”میں تو اپنی کمین میں جا رہی ہوں...“ وہ لائف بوٹس میں سے گزرتی ایک کشتی پر لپکی  
 ”لائف بوٹ نمبر پانچ... کیا خیال ہے ابھی سے اس میں سوار نہ ہو جائیں۔“  
 ”عمدہ مشورہ ہے... میں بھی آتا ہوں۔“ گرتھ چیخا مگر سمندر کے بے پناہ شور نے  
 اس کی آواز کو جذب کر لیا۔

سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر مونیک نے پوچھا۔ ”تم نے کچھ کہا تھا؟“  
 گرتھ نے اپنا فقرہ دہرایا۔

”لائف بوٹ خطرے سے بھاگنے کے لئے ہوتی ہے نہ کہ خطرے کو ساتھ لے کر بھاگنے  
 کے لئے...“ اُس نے خوش دلی سے گرتھ کے دُستار پر ایک دوستانہ بوسہ بڑا اور نیچے چلی گئی۔  
 میں اپنے ہال کمرے میں آگیا۔ سام تو اپنے بستر پر دراز ایک بالٹ سا نرڈیو کمان  
 سے چپکائے سر پلا رہا تھا اور جارج خراٹے لے رہا تھا۔ اُس کے خراٹوں کی آواز کبھی کبھی  
 سمندر کے شور پر بھی حاوی ہو جاتی۔ بقول سام اس مقابلے میں سمندر کے جیتنے کا امکان  
 بہت کم تھا۔

مصریوں کا ایک گروہ دائرے کی صورت فرش پر براجمان تھا اور چرس کا ایک  
 سگرٹ گردش میں تھا۔ کش لگانے کے بعد سگرٹ دوسرے امیدوار کو تھانے کا حوالہ  
 خاصا دشوار نظر آ رہا تھا۔ سگرٹ کو چپکنی میں ختم کر دائرے کے درمیان میں لایا جاتا،  
 پانچ چھ ہاتھ اُس کی طرف بڑھتے مگر نشے اور جہاز کے ڈولنے کے باعث وہ غلامیوں  
 ٹٹولتے رہتے۔ ہاتھوں کا یہ سرکس کافی دیر تک جاری رہتا اور بالآخر اتفاقاً کسی خوش  
 نصیب کا ہاتھ سگرٹ پر جا پڑتا اور وہ اُسے دبوچ کر منہ کو لگا لیتا... کچھ سا دیر سوہنے  
 تھے اور باقی تیرہ روز کھارہے تھے۔

میں نے اپنے بستر پر ہاتھ دکھا تو وہ پچڑ رہا تھا۔ پاٹ ہول کھلا تھا اور جیسے اندہ  
 آ رہے تھے۔ میں سام کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”آج رات فرسٹ کلاس کے سیلون میں الوداعی پارٹی کا ہنگامہ ہو رہا ہے سیبل  
 چلی گی۔“  
 ”اتنے شدید طوفان میں؟“

”یہ تو جعلی قسم کا طوفان ہے، شام تک ختم ہو جائے گا... چلو گے؟“  
 ”اگر پارٹی فرسٹ کلاس کے سیلون میں ہے تو وہاں صرف فرسٹ کلاس کے  
 سازوں کو ہی داخل ہونے دیا جاتا ہوگا۔“

”تم ہامی بھرو طریقہ میں بتا دیتا ہوں۔“  
 ”میں کھلے کانوں سے سن رہا ہوں۔“

”لباس معقول قسم کا پہنو، دربان سے آنکھ ملاتے بغیر بے دھڑک اندر چلے جاؤ  
 اور جاتے ہی باہر سب سے منگے مشروب کا آرڈر دے کر بار میں کو بھاری ٹپ کر دو۔  
 ... یوریکا... کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں پچھلی تین راتوں سے یہی کچھ کر رہا ہوں۔“  
 ”اور اگر کسی نے ٹکٹ چیک کر کے باہر نکال دیا تو... بے عزتی ہوگی۔“  
 ”وہ تو ہوگی... مگر وہاں سیبل بھی تو ہوگی۔“

چرس کی ٹونے مجھے بیزار اور پیاسا کر دیا۔ جارج بدستورہ خراٹے لے رہا تھا۔  
 اندر بڑا بستر پچڑ رہا تھا۔ میں پھر باہر آگیا۔

سمندر دھیمیا نہیں ہوا تھا۔ میں راہداری کی ریلنگ کو تھام کر چلنے کی کوشش  
 کرنے لگا۔ کبھی اپنے آپ کو دھکیل کر قدم بڑھاتا اور کبھی جسم بے اختیار ہو کر آگے  
 گر جاتا۔ تامل سے ڈولتے جہاز میں چلنے کی کوشش بیک وقت چاروں سمتوں میں قدم  
 بٹھانے کے مترادف ہے اور وہ بھی بے اختیار ہو کر۔ جہاز رقصندہ ہاتھ میں پکڑے  
 پنکھ کی طرح لرز رہا تھا۔ انجن دوم میں سے مشینوں کی مشقت کی آوازیں آرہی تھیں۔  
 ”ایک کھلی راہداری تھی۔ دائیں ہاتھ پر سمندر اور بائیں پر ترچھی ہوتی جہاز کی دیوار۔  
 اندر کے اس کھلے فاصلے پر سمندر کی بوجھاڑ اتنی شدید تھی کہ میں کافی دیر اسی

## شیطان اور سمندر کے درمیان

سیلون میں گر تھ اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور ہاتھ میں کپڑے گلاس کو آنکھوں کی سطح تک اٹھائے اُسے جھلکنے سے بچا رہا تھا۔ تمام کمرسیاں رستوں سے بندھی ہوئی تھیں اور بالکاؤنٹر کے شیلٹوں میں رکھی تو بلیں جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

”چمیز“ اُس نے گلاس اُونچا کیا جو اُونچا ہی ہوتا چلا گیا۔ گر تھ نے بمشکل ایک چمکی لی اور بقیہ شراب اُس کے کپڑوں پر چھلک گئی۔ اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں محفوظ بوتل کھینچ کر نکالی اور گلاس پھر بھر لیا۔

”پورے جہاز میں اس وقت صرف یہی جگہ ہے جہاں نسبتاً سکون ہے۔“ میں نے ردال سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پوچھا۔

”یہ کسی بھی وقت جہاز میں سب سے پرسکون جگہ ہے۔“ گر تھ بولا۔ ”بس اپنے اپنے کونے بات ہے۔“ اُس کا چہرہ لال بھیجھکا ہو رہا تھا، سُرخ آمار۔

”کیا اتنی بلا نوشی سے تمہیں متلی نہیں ہو رہی؟“

”نہیں...“ وہ بمشکل بات کر رہا تھا۔ ”اندر اور باہر کا موسم ایک ہے میں مزے

تذبذب میں رہا کہ اس پل صراط کو پار کرنے کا خطرہ مول لیا جائے یا پسپائی کا بگڑا بجار واپس اپنے کمرے میں چلا جائے۔ بہر حال ایک مرتبہ جب لہریں پیچھے ہٹ رہی تھیں تو میں کچی برف پر چلنے والوں کی طرح دھیمے دھیمے قدم رکھتا دوسری طرف پیچ گیا۔ لیکن میرے پیچھے آتی لہروں کا ایک دیلا پوری قوت سے راہداری کی دیوار سے آگرایا۔ سمندر کی مچھینکا راُس جھینسے سے مشابہت تھی جو پہلی مرتبہ بل رنگ میں دھل رہا ہے اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ کھولتا ہوا اہل رہا تھا اور اُس کی شوک کی گونج کبھی گھٹ رہی ہے اور کبھی بڑھ رہی ہے۔ وہ جہاز کے اس منحنی کھلونے کو اپنے آبی وجود سے بھر دینا چاہتا ہے۔ اسے اپنی آبی کائنات میں شامل کر کے پانی کر دینا چاہتا ہے... اور وہ تمہارا تعاقب کرتا رہتا ہے، پیچھے پیچھے چلا آتا ہے، کیبن میں، راہداری میں، ڈائننگ روم میں، ہر جگہ وہ تمہاری نشت پر ہے ایک مسلسل موجودگی۔ کبھی وہ سانس روک لیتا ہے مگر اُس کے آنے والے لمحے کی گونج کا شائبہ باقی رہتا ہے اور پھر وہ ہنستا ہے اور ڈرا دیتا ہے۔ وہ مسلسل موجودگی تو ہے مگر مسلسل شور نہیں جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اُس کی آواز میں بادلوں کی گڑگڑاہٹ ملتی چلی آتی ہے اور جب پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے تو اُس کی سستی شوک میں بے بسی ہوتی ہے جیسے اُس کی شرک کٹ گئی ہو اور مردہ سانس اُبلتے ہوئے باہر آرہے ہوں... طوفان میں پانیوں کا تو کوئی حصہ نہ تھا، وہ تو وہی تھے پرسکون اور سموار۔ وہ صرف سوار کا باغ دے رہے تھے اُس کے لئے۔ وہ اُن لہروں پر سوار تھا جہاز کے چھوٹے سے کھلونے پر حملہ آور ہونے کے لئے۔ اسے اپنے آبی وجود سے بھر دینے کے لئے۔ جیسے ایک جرم گلیوں، بازاروں، درس گاہوں میں پرسکون ہوتا ہے، پھر وہی هجوم پھرتا ہے اور حملہ آور ہو جاتا ہے۔ وہ صرف سواری ہوتا ہے۔

نہ بند کیا اور مجھے باہر لے گیا۔

عجیب سرزمین تھی۔ دائیں طرف اطالیہ کے پرمیٹ پہاڑ تھے دھند میں ظاہر ہوتے اور ڈوبتے اور بائیں جانب جزیرہ سیسیلی کی پُر آسیب چٹانیں گُڑ رہی تھیں اور روشنی ابھی اور جتنی اُسے چٹانوں کی سیاہی اور دھندلے جذب کر رکھا تھا اور جہاز ان جتنی بند یوں کے درمیان میں سے ایک سے ہوتے نیچے کی طرح دم سادھے گُڑ رہا تھا۔

”ہم سیسیلی میں سے گُڑ رہے ہیں۔“ گرتھ ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر منہ اٹھاتے بانوں کی دہشت کے بوجھ تلے گویا ہوا ”جہاز رانی کی تمام قدیم کتابوں اور یونانی دستاویزوں کا ذکر ملتا ہے مگر میں انہیں آج تک ایک دیو مالائی قصہ ہی سمجھتا رہا۔“

جہاز پر دونوں طرف سے اُڑتی ہوئی سیاہ اور بلند چٹانوں اور اُن میں نیکی دھند کی مافوق الفطرت آمیزش کسی بھی نادان شخص کو وہی سوچنے پر مجبور کر سکتی تھی

قدیم یونانی سوچتے تھے۔ یہ ایک دیو مالائی سرزمین تھی، دیوتاؤں کا بلند مسکن اور نوتوں کی آماجگاہ۔ اوڈیسیس کی کشتی بھی اسی تنگ آبی درے میں سے گُڑی تھی۔

”اس طرح ہم سیسیلی میں داخل ہوئے، خوف سے کہہ رہے ہوئے“

کیونکہ ہمارے ایک جانب سکاٹلینڈ آئن تھی اور دوسری جانب چیریڈس جو خوفناک انداز میں سمندر کا نمکین پانی اپنے اندر کھینچ رہی تھی... میرے ساتھی خوف سے زرد پڑ گئے۔“

”ہومر“ (اوڈیسی)

ہم اُسی آبی درے میں سے گُڑ رہے تھے اور شاہد تھے کہ ہزاروں برس پیشتر سے ہومر نے ”اوڈیسی“ نام کا جو کلاسیک تخلیق کیا وہ جغرافیائی حقائق پر مبنی تھا،

نہ کہ ابھی دایں طرف گُڑتی اطالوی چٹان ”سکاٹلینڈ“ کے نام سے جانی جاتی ہے اور یہ جانب صرف چار میل کے فاصلے پر سیسیلی کی کیپ پی لورڈ کا خوفناک مجبور موجود

سمندر کے نمکین پانی کو اپنے اندر کھینچتا ہے۔ انگریزی کا مشہور محاورہ

”BETWEEN THE DEVIL & THE DEEP BLUE SEA“ اسی مقام کی

میں ہوں... اور میں بلا نوش ہرگز نہیں ہوں، بس مجھے سمندر اچھا نہیں لگتا۔ میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں۔ بے انت میدانوں اور ویران خوبصورتیوں کا دھڑلے اٹھا ٹیکساس۔ میں جس زمین پر قدم رکھتا ہوں اُس کے ہلنے رہنے کا عادی نہیں ہوں جہاز پر اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میں اس کی لہریں اور سمندر کی موجودگی سے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہوں اور یہ مجھے پسند نہیں... اسی لئے ”چیریڈس“ اُس نے گلاس کو بگاڑ دیا۔“

”سمندر میں انسان سفر کرتے ہیں، دریا بہتے ہیں، زلزلے آتے ہیں، آبی جانوروں کی صورت میں خوراک آگتی ہے... یہ بھی تو ایک طرح کا میدان ہے۔“

”ہاں، لیکن کیا تم اس کی سطح پر ایک پچھلے ہوئے سالین گھوڑے کو دوڑا سکتے ہو؟... ایک بھاری تھنوں والی گائے کو کھونٹے سے باندھ کر رکھ سکتے ہو... جب بارش ہوتا ہے تو اس میں سے اُٹھتی دھول میں خوشبو ہوتی ہے... بہت بہت شکریہ مگر مجھے اپنے میدان چاہیے۔“

انسان مشترک قدروں، رنگ و نسل یا مذہب کے حوالوں سے قریب آتے ہیں مگر ہمیں میدانوں نے قریب کیا اور میرا میدان اُس کے ٹیکساس کی طرح ویران اور غاردار جھاڑیوں سے اٹا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ تو ہر مادل تھا۔ کیوں کے پھولوں والا جو ہر تھا۔ کی کے دانے، کھن کی سفیدی، گندم کی سنہری چمک، بسنت رت، گرم دھوپ اور سرچاندی گھر کی باتیں شروع ہوتیں تو گرتھ اپنا گلاس بھولی گیا اور ہم دونوں باہر بچنے سمندر کو۔ یہاں تک کہ اُسے خاموش ہونا پڑا۔ شیلفوں میں رکھی توپیں ساکت ہوئیں

بار میں اپنے سٹول سے اُٹھا اور کاؤنٹر پر گلاس سجانے لگا۔ عرشے کا جو حصہ کھڑکیں سے دکھائی دے رہا تھا اُس پر جہاز کے ملازمین صفائی میں مشغول تھے... سمندر دھیمہ ہوجکا تھا۔

”میں تازہ ہوا کا ایک اور سانس لے آؤں، صبح والا شاید ختم ہو رہا ہے،“ گرتھ اُٹھ کر باہر چلا گیا مگر فوراً ہی بھاگتا ہوا واپس آگیا۔ ”لینڈ او ہائے“ اُس نے منہ پکڑا



نسبت سے مشہور ہوا... ایک طرف ڈیول یعنی سکائٹ چٹان اور دوسری طرف غریب جو ڈیپ بلویسی ہے اور ان کے درمیان "گڈیز" جہاز اور اس کے عرشے پر میں اور کو منہ اٹھائے دھند کے کفن میں سے نظر آتی کالی چٹانوں کے جسموں میں وہ غار لائے کرتے جس میں سکائٹ ڈائن رہتی تھی۔

اُس نے اپنی کشتی چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلائی اور سکائٹ نے اپنی پناہ گاہ میں سے ٹانگیں لٹکا کر اُس کے چہرے کا اٹھا لئے۔ "اوڈیسیس ہمیں بچالو" انہوں نے اوڈیسیس کا نام آخری مرتبہ پکارا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ میں تمہارے خیالات کے لئے ایک پینی دیتا ہوں؟" میں نے گرتے سے کہا۔

میں اپنے معقول ترین پیرا من یعنی جین جیکٹ میں ملبوس تھا جس کی تشکبیں اس پر نمایاں تھیں جس طرح کھیت میں مینڈھیں اُبھرتی ہیں اور فرسٹ کلاس سیلون پر دروازے کو کھٹک رہا تھا جس کے اندر دھما دھما چوڑی مچی ہوتی تھی مگر باہر ایک زبردست گرمی ہر آنے والے کا سفری ٹکٹ چیک کر رہا تھا کہ فرسٹ کلاس کا مسافر ہے یا نہیں... میں ہمت کر کے آگے بڑھا۔ مہتلیوں میں پسینہ تھا۔ سام نے کہا تھا کہ اللہ ان سے آنکھ ملاتے بغیر... مگر میں اُس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا اور اُس نے بھی کہا تھا کہ بے دھڑک اندر داخل ہو جانا اور میرا دل بے دھڑک ہونے کے خیال سے بے تاب نہ ہو گا۔ دیکھ کر مسکرایا اور ٹکٹ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا اور خوب زور سے مصافحہ کیا۔ "مسلمان؟" اُس نے پوچھا۔ "اللہ" میں نے جلدی سے کہا اور اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے میں نے اس کے چہرے پر ایک غائب ہوتے دیکھی۔

"اوڈیسیس کی کشتی بھی اسی درے میں سے گزری تھی۔"

"صرف وہ مخالف سمت میں سفر کر رہا تھا۔"

"ہائیں" گرتے چوٹک اٹھا۔ "تم نے ہر مڑ پھر رکھا ہے؟"

"HE WAS ALL GREEK TO ME" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم امریکی ہوتے ہوئے بھی اتنے پڑھے لکھے کیسے ہو؟"

"میں سکول میں بچوں کو ہر مڑ پڑھاتا ہوں ایسے... اور اگر تمہارا خیال ہے کہ امریکی پڑھے لکھے نہیں ہوتے تو تم آج تک غلط امریکیوں سے ملے رہے ہو... اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے بیان دیا اور پھر بڑے عالمانہ انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا کہ شاید معلوم نہ ہو کہ مشہور انگریزی محاورہ..."

"مجھے معلوم ہے... ریڈیو دی ڈیول..."

"اوہ فنی من... اُس نے شور مچا دیا۔" سن لیتے تو کیا حرج تھا، آخر اچھا اخلاق بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہو گا... لیکن یہ بتاؤ کہ کیا آج فرسٹ کلاس کی سیلون میں واقعی سیل ناں

اب پھر جا کر میں نے دونوں کُنیاں کا دُنر پڑکانے کی کوشش کی مگر وہ پھسل گئیں۔ نامت ان تک پہنچ چکا تھا۔ بہر حال میں نے سب مہنگا مشروب خریدا اور بار میں اس ڈالر کا نوٹ بڑھا دیا۔ اُس نے پانچ ڈالر واپس کئے تو میں نے تین نوٹ

اب پھر جا کر میں نے دونوں کُنیاں کا دُنر پڑکانے کی کوشش کی مگر وہ پھسل گئیں۔ نامت ان تک پہنچ چکا تھا۔ بہر حال میں نے سب مہنگا مشروب خریدا اور بار میں اس ڈالر کا نوٹ بڑھا دیا۔ اُس نے پانچ ڈالر واپس کئے تو میں نے تین نوٹ

اُسے تھما دیئے۔

”تھینک یو“ وہ ابھی جھک ہی رہا تھا کہ دربان میرا بچھا کر تا ہوا دربان پہنچ گیا۔  
”مسلمان؟“ میں نے پوچھا اور بقیہ دونوں اُس کی جیب میں اُس دے دیئے۔ اُس نے  
جیب میں سے نوٹ نکال کر اُن کا معائنہ کیا۔ ”الحمد للہ“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا  
اور واپس چلا گیا۔

میں نے اطمینان اور اعتماد کا ایک سانس اپنے اندر کھینچا اور ایک دیران میرے  
جانب بٹھا۔ مشروب کا ایک گھونٹ بھر کر میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔... چہرے ابھی  
دیکھے جھالے تھے مگر اُن پر کچھ کر گزرنے کی تحریر صرف آج ہی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ سام کے  
سمراہ وہی اُنچے دانٹوں والی لمبی آسٹریلوی لڑکی تھی اور جارج سیبل پراڈا بیٹھا تھا۔  
مونیک اور پال بیزا چہرے کھینچے ایک دوسرے کی بجائے دوسروں کو دیکھ رہے تھے۔  
اسیشن والا جرمین اپنے جانور کو گود میں لئے اُس کے بالوں میں گنگھی کرنے میں مصروف  
تھا۔ آرکسٹر کوئی اُداس سی ترک دھن بجا رہا تھا اور فرش پر چند جوڑے اُس پر قس کرنے  
کی کوشش میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اتنی دیر میں گرتھ اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر سے دہک  
کی پوری بوتل خریدی، مجھے دیکھا اور تیزی نکالتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ جارج اور سام  
نے گرتھ کی بوتل دیکھی اور حسبِ مقدور مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ہوا ہلکے  
پاس آ گئے۔ میز آباد ہو گئی۔

”تم کب ناچو گی سیبل ڈیر؟“ گرتھ نے دہکی کی آبی سرسوں کا پہلا گھونٹ لیا۔  
”جب حاضرین اتنے مخمور ہو جائیں کہ میرا موٹا پاپا انہیں دلکش نظر آنے لگے۔“  
لہک کر بولی۔

”تو پھر میں اس وقت یقیناً مخمور ہوں۔“  
سام نے آرکسٹر بجانے والوں کے ساتھ کچھ مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں انہوں  
نے ڈسکو کی دھمک آمیز دھمال شروع کر دی۔ میزیں خالی ہو گئیں اور فرش دھنسنے لگا۔

”تم کیوں نہیں ناچتے؟“

”اگر میں کھڑا ہو سکتا تو ضرور ناچتا۔“ گرتھ نے نیم وا آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔  
”سال اب میں تم سے کرتا ہوں۔“  
”کس کے ساتھ ناچوں؟“  
”وہ جوسین سی لڑکی ہے کاؤنٹر کے قریب۔...“

”وہ جوسین لڑکی موٹا دربان ہے۔“

”اچھا۔“ گرتھ پریشان ہو گیا۔ یہاں سے تو لڑکی ہی نظر آتی ہے، بلکہ دو نظر آتی  
ہیں بلکہ شاید تین۔...“  
گرتھ پر خمار مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔

جارج اپنے موٹا پے کے باوجود بڑی بردہم سے ناچ رہا تھا اور سیبل تو تھی ہی  
رہا۔ سام بھی رقص تو کر رہا تھا مگر اُس کی ٹانگیں اور ہاتھ کراٹے کے انداز میں چل  
رہے تھے۔

”ہائے۔“ گرتھ ایک دم منہ کھول کر پکارا۔  
”کیا ہے گرتھ؟“

”تمہیں نہیں کہہ رہا، اُس لڑکی کو کہہ رہا ہوں۔...“

اس مرتبہ اس کا اندازہ درست تھا۔ سیبلوں میں وہ تینوں ہو ہو مہری بیبیاں  
نکل ہو رہی تھیں۔ گرتھ نے ایک اور زوردار ”ہائے“ کی اور اُن کا رخ ہماری طرف  
برگایا۔

”کیا یہ کمریاں خالی ہیں؟“

گرتھ نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی اور فوراً اپنی کمرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ کمرسی  
خالی ہے۔“

وہ ٹانگیں مسکراہٹوں سمیت دھیرے سے بیٹھ گئیں۔

گر تھ نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میرے کان میں سرگوشی کی "اس کو رقص کے لئے کہو"  
"ان میں سے کس کو؟"

"ان میں سے کا کیا مطلب؟ وہ چمک کر بولا "ایک ہی تو ہے"

"اس مرتبہ ایک نہیں ہے گر تھ۔ سچ جانتی ہیں... وہی مصری نمک کے مجھے۔"  
"اچھا۔" گر تھ نے منہ کھول دیا۔ "میں سمجھا مجھے تین نظر آرہی ہیں۔" اُس نے تیزوں کو  
باری باری نہایت اہتمام سے گھورا۔ ویسے اگر میں ذی ہوش ہوتا تب بھی انہیں ایک ہی  
سمجھتا... ہیں ہی ایک جیسی۔"

اور گر تھ تھا بھی درست۔ ایک سے لباس، ناک نقشے کسی مشترکہ سانچے میں ڈھلے  
ہوتے، ایک دوسرے کی نوٹوسٹیٹ کا پیاں۔

"اچھا اب چلو ان میں سے کسی ایک کو رقص کے لئے کہو..." اُس نے پھر سرگوشی کی۔

"اتنا عرصہ ہو گیا ہے اس فعل قیغ کو چھوڑے ہوئے کہ ڈر لگتا ہے کہیں بھول نہ گیا ہو۔"

"تیرا ک تیرا نہیں بھولتے... جلدی کرو تم ایک کو لے جاؤ تو میں دوسری سے باتیں کروں۔"

"تیسری بھی ہے۔"

"بے شک ہے مگر مجھے دوسری پسند ہے۔"

"ان میں سے دوسری کونسی ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

میں نے اُن میں سے کسی ایک کو رقص کی دعوت دی اور ہم فرش پر آگئے۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" میں نے ایک

گھسے پٹے جملے سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کا خیال درست ہے کیونکہ پچھلے چند روز سے ہم اس جہاز میں اکٹھے سفر کر

رہے ہیں۔"

"بے شک..." میں جھینپ گیا۔

یہ میری جارح تھی، اُس کی بہنیں اپنی جارح اور شیریں جارح تھیں اور یہ  
نہیں جارح بہنیں مارسیلز جارح ہی تھیں جہاں یہ مصری بچوں کو فرانسیسی پڑھاتی تھیں۔  
بسی ختم ہوئی تو ہم واپس میز پر آگئے جہاں گر تھ بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ اُس نے  
چکر گزیاں شروع کر دیں۔ "ان میں سے کوئی ایک اپنی ہے اور دوسری شیریں ہے۔"  
مجھے یاد کہ شیریں کونسی ہے کیونکہ وہ مجھے پسند ہے۔"

میں نے میری سے پوچھا کہ ان میں سے شیریں کونسی ہے تو اُس نے کہا کہ میں تو

اپنی ہوں، میری وہ ہے، ظاہر ہے کہ تیسری شیریں تھی۔ میں بھی کنفیوز ہو رہا تھا یا

کی ساتھی لڑکی ٹائلٹ میں گئی تو گر تھ نے ایک سازشی سرگوشی میں اُس کو قائل کر لیا کہ وہ

اپنی کو رقص کے لئے لے جاتے۔ سام بھی اُس آسٹریلوی بلندی سے بیزا رہ چکا تھا اس

لئے فوراً رضی ہو گیا۔ اُن کے جانے کے بعد گر تھ نے میری منت کی۔ "اب اگر تم ان میں

سے میری کو رقص کے لئے کہو تو باقی شیریں رہ جائے گی۔"

میں نے میری سے درخواست کی تو اُس نے معذرت کر دی۔ وہ بہت تھکی

ہوئی تھی۔

"تو پھر اسے میری کہیں میں لے جا کر لٹا دو، آرام کر لے گی۔" گر تھ نے خفیہ آواز

میں پیشکش کی۔

"انہوں جیسی باتیں کرتے ہو... اتنی مختصر ملاقات کے بعد ایسی پیشکش کیسے

کر سکتا ہوں؟"

"تو پھر عرشے پر لے جاؤ، وہاں لائف بوٹس ہیں۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"یہاں تو دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے میری سے مخاطب ہو کر کہا "دھواں بہت

ہے، چند لمحوں کے لئے عرشے پر نہ چلیں۔"

میری توقعات کے عین برعکس مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور گر تھ نے ایک

کان سے دوسرے کان تک پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے میرا شکریہ ادا کیا۔

عرشے پر خاموشی تھی اور خاموشی سے زیادہ سیاہ تاریکی۔ انجن کی ملکی سی گرج تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کھلے سمندر میں نہیں بلکہ چٹانوں سے گھرے ایک آبی دسے میں سے گزر رہے ہیں۔

”آپ میری جارج ہی ہیں ناں؟“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”میرا درست قدرے اونچا اڑ رہا ہے اس لئے...“

”ہم تینوں واقعی ہم شکل ہیں...“ اُس کا گندی چہرہ اندھیرے میں بھی کودے رہا تھا۔ ”بلکہ کئی مرتبہ ہم ایک دوسرے کے سکول میں جا کر پڑھا آتی ہیں اور بقیہ مشافہ کو علم تک نہیں ہوتا۔“

”آپ ذرا ریلنگ سے ہٹ کر کھڑی ہوں، ادھر میری طرف... ادھر سمندر ہے۔“ شیطان اور سمندر کے درمیان... ”میری جارج کے دانت شعلوں کی طرح روشن ہوئے اور پھر بجھ گئے۔

فیصلہ حسب معمول شیطان کے حق میں ہوا۔

”میری جارج! عرشے پر آنے والی سیڑھیوں سے آواز آئی۔

”میری جارج! اُس آواز کے پیچھے سے ایک اور آواز آئی۔

تینوں جارج ہمیں پھر اکٹھی ہو گئیں۔ سام اور گرگتھ بھی اندھیرے میں گرتے پڑتے آئے۔

”حضرات ہم ہمیں آپ کی بے حد شکور ہیں کہ آپ نے ہمیں آج شام اتنی خوشگوار رفاقت دی۔“ جارج یعنی ہماری والدہ نے مصر سے روانگی کے موقع پر تاکید کی تھی کہ ہم تینوں ہر رات دس بجے سو جایا کریں۔ دس بجنے والے ہیں، خدا حافظ! اور وہ ہنستی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئیں۔

گرگتھ نے اُن کی والدہ محترمہ کے بارے میں کچھ نازیبا سے الفاظ بڑھاتے جن کا

مذہب یہ بتاتا تھا کہ صرف دس بجے سونے کو کہا تھا، تینوں بہنوں کو اکٹھے سونے کو تو نہیں کہا تھا۔

میں نے نا آسودگی کے غصے سے مچھکا دیتے ہوئے چند سگریٹ پھونکے اور سیلون میں بائیں آگئے۔ اب وہاں سیبل برائے نام کا غذی سے لباس میں بیٹے ڈانس کر رہی تھی۔ ریشتر حاضرین میزوں پر کھڑے ہو کر داد دے رہے تھے۔ اُس کا گھنا جسم اور چھوٹا قد بکریے لینے کی بجائے دھچکے کھا رہا تھا مگر حاضرین واقعی اتنے مخمور ہو چکے تھے کہ وہ انہیں اس وقت دنیا کی خوبصورت ترین رقاصہ نظر آرہی تھی۔ ہم لمبے چہرے کھینچے منہ ہائے سیٹھے رہے۔ رقص ختم ہوا تو عرب مذاحوں نے اُسے گھیر لیا۔ آرکسٹرانے عربی موسیقی سے دامن چھڑا کر دوبارہ ڈسکو میوزک کو پلپے باندھ لیا۔

”تم نے جہاز کا نوٹس بورڈ دیکھا تھا؟“ سام نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔ ”ہم گیارہ بجے کے قریب سسلی کے ایک آتش فشاں پہاڑ کے قریب سے گزر رہے۔“ آتش فشاں تو دس بجے ہی سو جاتے ہیں۔“ گرگتھ بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد سام اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہاں کچھ بھی نہیں رکھا، اڈا ہر چلتے ہیں۔“

عرشہ جہاز کے اندرونی مہیاں سے لا تعلق اندھیرے میں آرام کر رہا تھا۔ میں اور سام ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں پھیل کر تاریکی میں مرکوز کر دیں۔ کچھ لمبی نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ عرشے پر مسافروں کے ہیولے حرکت کرنے لگے جو بالآخر طرح آتش فشاں کو دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اور اگر تاریکی فضا تھی کچھ غور آقا لیکن کسی شے کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہاں پرے کچھ ہے مگر اس کا ہڈا تاریکی سے الگ نہیں ہو رہا تھا، اُسی کا حصہ تھا۔ کچھ ہے تو سہی، مگر کیا! ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔

”میرا خیال ہے کہ آتش فشاں میں آگ ہوتی ہے اور آگ کو اندھیرے میں ڈھونڈنے کے لئے اتنا تردد نہیں کرنا پڑتا جتنا ہم کر رہے ہیں۔“  
”درست کہتے ہو۔“ سام بدستور اندھیرے میں گھومتا رہا۔

بڑھتے ناصلوں سے سسلی کا یہ نامعلوم آتش فشاں اُپلوں کے ڈھیر میں بدلنے لگا۔  
پرمردہ جلگوں کے بدن کی بجھتی کو اور پھر آہستہ آہستہ شائبہ گرگڑا ہٹ اتنی مدھم  
اور ن گان ہوتا تھا۔۔۔ ”اوڈیسیں... بکشتی روک دو۔“ جہاز چلتا رہا۔



تھوڑی دیر بعد اُس نے تاریکی کے ایک ایسے حصے کی طرف اشارہ کیا جو  
تاریک تر ہونے کی بنا پر کچھ الگ سا نظر آ رہا تھا۔ پہاڑ... ایک شائبہ سا تھا  
مگر آتش نہ تھی، مسافروں کے درمیان کھسکھسرتی ہوئی۔ ہم خاموشی سے حرکت کرتے  
رہے۔ پھر ایک سا یہ نظر آیا، جہاز کے رخ میں تبدیلی ہو رہی تھی اور سیاہ شائبے کے  
اوپر انتہائی گہری توجہ سے دیکھنے پر ایک نامعلوم سی روشنی دکھائی دی جیسے اندھیری  
رات میں مڑہ جلگوں کے بدن کی بجھتی کو ہو۔ تمام نظریں اُس پر مرکوز تھیں۔ روشنی کچھ  
گلابی ہوتی اور دیکھتے دیکھتے دھکتے ہوئے اُپلوں کے ایک ڈھیر میں بدلنے لگی۔ پھر  
اُس میں سے ایک پھلپھڑی چھوٹی اور ہلکی سی گرگڑا ہٹ ہوتی۔  
انجن بند کر دیئے گئے اور جہاز ساکت ہو گیا۔

اب وہاں پھر وہی نامعلوم سی روشنی تھی۔ چند لمحوں بعد ایک اوپل پھڑکی چھوٹی  
اور پھر ایک دھکتا ہوا گلابی انگارہ تاریک فضا میں بلند ہوا۔

”النا۔ النار۔“ مصری مسافروں نے شور مچا دیا۔

گرگڑا ہٹ اب باقاعدگی سے سنائی دے رہی تھی مگر اس میں طنطنہ اور دہشت  
نہ تھی، جیسے چڑیا گھر کا بوڑھا شیر لنگر مارنے والے بچوں سے تنگ آ کر بے چارگی سے  
دھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب وقفوں وقفوں سے آتشی انار چھوٹنے لگے اور  
آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی پر دھکتا الاد روشن تر ہوتا چلا گیا۔

جب کبھی لاوے کے اُبلتے پھینٹے تاریکی کے سیاہ کاغذ میں جلنے لگتے، مصری  
مسافروں کی آواز ”النا۔ النار۔“ سنائی دیتی۔

دس منٹ بعد انجن دوبارہ شارت ہوئے اور جہاز پھر سے تاریکی میں رہنے لگا۔

## روم سویٹ روم

خیمے کا پردہ اٹھایا اور ایک تھکے ہوئے چوپائے کی مانند رینگتا ہوا اپنے خود ایستادہ ماضی گھر میں جا بیٹھا۔

ماؤنٹ ایٹنا کیمپنگ سائٹ پر پھیلے چڑکے درختوں تلے میں نے اپنے ہلکے بزم خیمے کا پردہ زمین پر بچھایا اور چاروں کونوں میں میخیں ٹھونک دیں، پھر اس کے اندر راڈ کھڑے کئے اور طنائیں کس دیں۔ خیمہ تیار ہو گیا... خیمے کو ایستادہ کرتے ہوئے میں ہمیشہ ایک خوشگوار سنسنی سے دوچار ہوتا۔ کیا کپڑے کا ٹیکڑا اور چند میخیں واقعی ایک گھر میں تبدیلی ہو جائیں گی؟... اور میں ہمیشہ قدرے حیرت زدہ رہ جاتا کیونکہ ایسا ہمیشہ ہو جاتا۔ ہسپانیہ کے بعد، چھ برس تک لاہور میں ایک پرانے ٹرنک میں پلٹے رہنے کے بعد، آج اس خیمے نے روم میں، اطالیہ کی سرزمین پر سر اٹھایا تھا۔

سیلینگ بیگ پر لیٹا تو خیمے کے کپڑے میں سے گزشتہ سفروں کی مہک نے مجھے بلایا، سفروں کی، بدلوں کی مہک اور گئے وقتوں کی زنگ آلود خوشبو، یہ خیمہ ایک قدیم توہلی تھا جہاں لوگ میرے لئے آئے اور چلے گئے۔ ان کی خوشبو کو بھی زنگ لگ چکا تھا۔ دو بچی اپنی زبان بولتے تھے اور بچہ خاموشی ہوتی تھی، جب مجھ سے ہم زبان ہوتے تھے ان کی آوازیں بھی مجھے یاد نہیں۔ ہاں ان کے بدلوں، ان کی زبانوں کی مہک موجود تھی لیکن الگ الگ نہیں، اجتماعی طور پر... کھلے پردے میں سے چڑکے تنے دکھائی دے رہے تھے، ان کے عقب میں، پہاڑی سے نیچے روم تھا... اندر خیمے میں ”ہوم سویٹ ہوم“

اور باہر ”روم سویٹ روم“۔

آج صبح عرصے پر آیا تو دایں ہاتھ پر اطالیہ کے پہاڑ گز رہے تھے سلسلہ کوہ میں سے گزرتی ایک ٹرین ایک کینچرے جتنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک شاہراہ کی لکیروں دکھائی دے رہی تھی مگر اُس پر موجود کاریں فاصلے کی بنا پر معدوم تھیں البتہ کبھی کبھار جب بلج کی شعاعیں کسی ونڈ شیلڈ پر پڑتیں تو ہلکی سی چمک نظر آتی۔ پھر کپیری نظر آیا، زمین سے رُوٹھا ہوا ایک ٹکڑا جو نیلگوں سمندر میں جالسا تھا۔ دس بجے ہم آبنائے نیپلز میں داخل ہوئے اور جہاز نہ ہاتھی عمارتوں اور ٹریفک سے بھری پُری شاہراہوں کے عین سامنے جاکھڑا ہوا... اول بیروت، آخر نیپلز۔ گرتھ گذشتہ شب کی شراب نوشی کی بنا پر کین سے باہر آنے کے قابل ہی نہ تھا۔ جارج اور سام نے بڑے برادرانہ انداز میں میرے گالوں پر الوداعی بوسے دیتے اور ان کے بعد میری جارج، اپنی جارج اور شیری جان نے بھی یہی عمل دہرایا۔ چند روز کی غیر جذباتی رفاقت بھی الوداعی لمحوں میں جذباتی ہو جاتی ہے۔... بندرگاہ سے باہر اگر ارادہ کیا کہ جزیرہ کپیری کی خوشناتی کی جانب بڑھا جائے پھر خیال آیا کہ وہاں پہنچنے کے لئے پھر سے سمندر کا سفر کرنا پڑے گا اور اگر نیپلز میں قیام کرتا ہوں تب بھی سمندر سامنے ہوگا۔ بہت بہت شکریہ، مجھے میرے میدان دے دواد میں رُوٹ جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اب میں شہر سے باہر ماؤنٹ اٹینا کی بلندی پر خیمہ زن تھا اور سیلینگ بیگ پر لیٹا ہوا تھا اور خیمے کے پردے میں سے چوڑے درخت نظر آ رہے تھے اور اُن کے پیچھے روم تھا، روم سویٹ روم... لیکن ابھی نہیں، ابھی آرام سویٹ آرام! آہستہ پر ڈولتے ہوئے کسی لوسے کے صندوق پر نہیں بلکہ زمین کے آشنا سکوت سے ہم آغوش ہو کر... مٹی کے قریب اور مٹی، مٹی میں بدل جاتی ہے۔

و یا ردما، نمبر ۱۰۲، دوسری منزل، میں نے آہستہ سے دستک دی۔  
دوسری دستک سے پہلے ہی چٹنی اترنے کی آواز آئی اور دروازہ کھلا... گنجائش

ن مٹول، بنیان اور ڈھیلی تپوں میں ایک اطالوی بوڑھا۔ وہ شاید میرا ہی منتظر تھا، زائمرے کندھے تمام کر گالوں پر بوسے دیتے اور ”پراگو۔ پراگو“ کہتا مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ بید کی کرسی میں بیٹھی ایک غم زدہ شبابہت کی پُرا من عورت سیاہ شال اوڑھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ آہٹ سن کر اُس کا چہرہ ہماری جانب ہوا اور وہ چہرہ اُن تمام بہنوں کا عکس ہو گیا جو مائیں اپنے بیٹوں سے کرتی ہیں۔ وہ ایک جوان لڑکی کی سی پھرتی سے اٹھی اور میری پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”پراگو۔ پراگو“ میں پندرہ سال بعد اس گھر میں داخل ہوا تھا اور اُن کی پہچان میں ایک لمحے کی جھجک بھی نہ تھی۔

”پیر توجی کہاں ہے سنیدو لودی؟“ میری نظریں متلاشی تھیں۔

”ا... تم اپنے دوست سے ملنے آئے ہو، ہمیں نہیں۔“ سنیدو لودی کے خوش نظر ہرے پر خوشگوار ناراضگی تھی۔

”وہ اکثر تمہیں یاد کرتا ہے۔“ سنیدو لودی کی زرد ہتھیلیاں میرے گالوں پر پکپکا رہی تھیں۔ ”تم پندرہ برس بعد آئے ہو... آؤ میں تمہیں وہ کمرہ دکھاؤں جہاں تم ٹھہرے تھے۔“

کمرے کا فرنیچر بلکہ دیوار پر ٹنگی رافیل کی تصویر بھی جوں کی توں تھی جیسے پندرہ برس بعد اُسے آج ہی کھولا گیا ہو۔ کھڑکی سے باہر دیا روماکے درخت البتہ بلند ہو چکے تھے۔

سنیدو لودی بار بار میرے کندھے کو تھپک کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے اور اُن کی بیوی مجھے دیکھنے چلی جا رہی تھی۔

”تمہیں یاد ہے جب تم ولایت سے پاکستان واپس پر روم اترے تو تم نے ایرپورٹ سے پیر توجی کو فون کیا، میں تین روز کے لئے یہاں آیا ہوں، پلیز میرے لئے کسی بٹل میں کمرے کا انتظام کر دو مگر منگنا نہ ہو۔“

”ہاں۔“ میں اُن کی شفقت کی تاب نہ لاتے ہوئے مسکراتا جا رہا تھا۔ ”اور اُس نے کہا تھا کہ پہلے میرے گھر آؤ، میرے ماں باپ سے ملو پھر ہوٹل کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اور یہاں آکر جب میں نے اُس سے پوچھا کہ کمرے کا انتظام ہو گیا ہے تو

اُس نے کہا تھا، ہو تو گیا ہے مگر قدرے ہنگامہ ہے۔ روم کے مشہور وکیل سینیور لودی کے گھر کا کمرہ ظاہر ہے سستے کرائے پر تو نہیں مل سکتا۔  
وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”اور مجھے یاد ہے کہ تم آڑوڈن پر چینی کی بجائے نمک لگا کر کھاتے تھے۔“ سینیور لودی نے دانائی سے سر ہلایا۔  
”پیٹر لودی کہاں ہے؟“

سینیور لودی نے اپنی بیوی کے ساتھ کچھ خیالات آمیز نظروں کا تبادلہ کیا اور پھر اپنے گنجے سر کو جو فلسفی سنیکا سے بے حد مشابہت رکھتا تھا، آہستہ آہستہ ہلایا۔ وہ یہیں ہے روم میں، لیکن... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اُسے بلو گے کیسے؟“ سینیور لودی نے دانت بھیج کر غصے سے سر جھٹکا۔ ”ہمارا بیٹا بالکل فخر ہے۔“  
”لیکن ایک قابل فخر خچر۔“ سینیور لودی نے متانت سے سر ہلایا۔ ”وہ اب ایک بڑا آدمی ہے، ایک نج۔ شادی شدہ ہے اور اپنے ذاتی فلیٹ میں رہتا ہے... تین روز بعد وہ عدالتِ عالمیہ کی نشست کے لئے ایک امتحان میں میڈرہا ہے چنانچہ اُس نے بیوی کو رشاک ہوم بھیج دیا ہے۔ پورے تین روز کی خوراک فرج میں جمع کر لی ہے اور اپنے آپ کو فلیٹ میں مقفل کر کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے... ہمیں بھی بٹنے کی اجازت نہیں۔“

”تو پھر فون پر تو بات ہو سکتی ہے ناں؟“

”نہیں ہو سکتی۔“ سینیور لودی چلائے۔ ”اُس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ فون دوسروں میں اُسے مغل کیا جا سکتا ہے، اگر اُس کی ماں وفات پا جائے یا میری ماں جنگ چھڑ جائے... ان سانحوں کے علاوہ اگر اُس سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے قطع تعلق کر لے گا... خچر ہے ناں، یعنی اگر میں فوت ہو جاؤں تب بھی اُسے مغل نہیں کیا جا سکتا۔“

میں نے ایک زبردستی کی مسکراہٹ سے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔ وہ روزوں مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں ایک انتہائی بے بس کم شدہ بچہ ہوں جس کی بے چارگی کی تاب نہ لا کر وہ ابھی رو دیں گے۔ چند لمحوں کے اُداس توقف کے بعد سینیور لودی نے ہونٹ بھیج کر نعرہ لگایا۔ ”میرا خیال ہے کہ تیسری عالمی جنگ پھر چلی ہے۔“ اور فون اٹھا کر پیٹر لودی کا نمبر ڈائل کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ بیور کو کھاتے رہے لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔

”وہ جان بوجھ کر فون نہیں اٹھا رہا۔“ سینیور لودی نے غصے سے کہا۔ ”لیکن وہ اٹھائے گا۔ اگر وہ خچر ہے تو میں بھی خچر ہوں... لیکن اس دوران میں ہم کافی پیسے گئے۔“ سینیور لودی فوراً لکچن سے چھوٹے چھوٹے اطلاوی کیک اور کافی پاٹ اٹھالائیں۔ سینیور لودی نے اپنے اور میرے گم میں کافی کے چند قطرے ٹپکائے اور پھر کیمینٹ میں سے کوئی آگ کی بوتل نکال کر بقیہ حصے کو براڈی سے لبریز کر دیا۔  
”دودھ نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بچے پیتے ہیں۔ یہ مردانہ کافی ہے۔“

میں نے ایک چسکی لی تو جتنے بھی موجود طبق ہوتے ہیں اُن سے سوا ایک دوسرا نشان ہو گئے۔ سینیور لودی نے پھر نمبر ڈائل کیا، انتظار کیا، ادھر سے خاموشی۔

جبرنی میری کافی کی سطح قدرے نیچی ہوتی سینیور لودی بوتل اٹھا کر اُسے مزید مردانہ کر دیتے۔ ادھر سینیور لودی کا کہنا تھا کہ اگر میں نے وہ درجن بھر کیک سارے کے سارے نہ کھائے تو وہ سمجھیں گی کہ مجھے اُن کی گُلنگ پر اعتماد نہیں۔ میں مردانہ کافی بنا رہا اور کیک کھا تا رہا۔

چوتھی مرتبہ جب سینیور لودی نے نمبر کھایا تو دوسری جانب سے کلک ہوتی اور ایک مناسب قسم کی دھماکا مٹاتی دی۔ سینیور لودی اسی طرح رسیور کان سے لگاتے لگاتے اٹھئے اور اٹینشن ہو گئے اور انگریزی میں بولے۔ ”بیٹا تیسری عالمی جنگ



شروع ہو چکی ہے۔“ اُدھر سے تیز لمبے کا ایک سیلاب آتا چلا گیا اور سنیر رُودی جراب میں صرف ہکلاتے رہے۔ بالآخر پدرانہ حاکمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اندر سے ٹائون میں گرجے اور اس گرج میں مستنصر“ اور پاکستان“ کے نغظ نمایاں تھے۔۔۔ فون بند ہو گیا۔“ کہتا ہے، میں مستنصر سے بات نہیں کرنا چاہتا۔“ سنیر رُودی نے سنجیدگی سے اطلاع دی۔“ ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ دیا ماتیہ نمبر ۹۰۰۔۔۔ بس نمبر ۱۹۰۰۔۔۔ مار تو کے سٹاپ پڑ جانا۔۔۔ اور ہاں یہ لوہیں میرے کاسکے، لفٹ میں ڈالنے کے لئے، فلیٹ تیسری منزل پر ہے۔“ ”روم آؤ اور دیا روماسے گزرو تو اپنے گھر آنا نہ بھولنا۔۔۔ تم پیٹر لوجی کے بے پرنے دوست ہو۔“ سنیر رُودی کی زرد ہتھیلیاں میرے گالوں پر سرد ہونے لگیں۔ میں اپنا ماتھا اُن کے کپکپاتے ہونٹوں تک لے گیا۔

میں نے لفٹ میں بیس میرے کاسکے ڈالا تو اس کا دروازہ تھپتھر کے پردے کی طرح بغلی دیواروں میں سما گیا۔ تیسری منزل کے بٹن پر ہاتھ رکھتے ہی میں قید میں آیا اور لفٹ میں سفر کی بے چین خلائی کیفیت بدن میں بیٹھنے لگی۔ آج روم تھا، پندرہ برس پیشتر ایک موسم گرما میں آوارگی کا پڑاؤ نبی شفق کے شہر شاک ہوم میں تھا۔ میں ”کیفے غزال“ میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور پچھتا رہا تھا۔ لڑکیاں اتنی اقلیت میں تھیں کہ بڑے بڑے پلے بوائے قسم کے نوجوان ایسی خواتین کی منتیں کر رہے تھے جن کی صورت اور بناوٹ میں نسوانیت کا بس واجب ساشا سبھی ہوتا تھا۔ فلور پر صرف چند خوش نصیب ناچ رہے تھے اور بقیہ پبلک میری طرح کوفوں کھدروں میں مٹھ کھوئے کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ میرے پیلوں میں کھڑے ایک انتہائی وجیمہ اور انتہائی بور ہوتے ہوئے نوجوان نے ایک انتہائی طویل جالی لی اور میری جانب دیکھے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ زبان اطالوی تھی۔ وہ کبھی کندھے سیرتا، کبھی ہاتھ سے ڈوٹی سی بنا کر فلور کی طرف اشارہ کرتا اور باتیں کرتا چلا جاتا۔ بالآخر

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں پوچھا۔ ”کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟“ اُس کے مردانہ خدو خال پر حیرت بر اجمان ہو گئی۔ ”ماما میا۔۔۔ کیا تم اطالوی نہیں ہو؟“ ”میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر نہیں ہوں۔“ ”ہا۔۔۔ اُس نے پورا منہ کھول کر کہا اور چپ ہو گیا۔ ہم غزال سے نکلے تو سوچ میں تھے۔ کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو نہکتے رہتے جیسی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ اور قدرے گریزاں۔ یہ شخص دوست ہو سکتا ہے؟

دوسرے روز میں کام سے فارغ ہو کر اپنے فلیٹ میں آیا تو میرے بستر میں ایک سنہری بالوں والی لڑکی تھی۔۔۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہ تھی مگر اُس وقت تھی کینز میں اُس لڑکی کا تانا بک نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”سوری لیکن تمہارے کمرے میں بستر کے علاوہ اور کوئی شے ایسی نہیں تھی جس پر بیٹھا جاسکے۔۔۔“ اُسی لمحے کچن کا دروازہ کھلا، پیٹر لوجی ہاتھوں میں ایک ٹرے تھا۔ ”دُریا ہے اے میری بے مثال خوبصورتی۔۔۔“ مگر اپنے سامنے اپنی بے مثال خوبصورتی کو بکائے مجھے دیکھ کر قدرے بھونچکا رہ گیا۔ ”اوہ۔۔۔ تم یہاں تھے ہی نہیں، دروازہ کھلا تھا ہم اندر آ گئے اور ہم قدرے بھوکے تھے۔۔۔“ میں نے ڈوبتے دل سے ٹرے کی طرف دیکھا۔ وہ اتنے بھوکے تھے کہ میرے فرج میں ذخیرہ شدہ خورد و نوش کی تمام اشیاء اُس میں سبجی تھیں۔

”یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔“ میں نے نظام رلا پر وائی سے کہا۔ ”مُنعیت ہونے سے پہلے وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔“ ”خوراک کے لئے شکریہ درست۔“ ”میں نے چند نوٹ میری جیب میں ڈال دیئے۔“

”گتا ہے کہ میں اس شہر میں ہمیشہ گنہگار رہی رہوں گا...“ وہ ہونٹ لٹکا کر بولا۔  
 ذرا خیال کرو کہ موسم گرما ہے، سالانہ چھٹیاں ہیں تو یورپ اور امریکہ کی بیشتر خوبصورت  
 دکانیں اس وقت کھلی ہوئی ہیں۔ روم میں، ہسپانوی زمینوں کے آس پاس... اور  
 یہ ایک رومن کہاں ہوں، روم میں نہیں، سویڈن میں... لعنت ہے مجھ پر۔“

اور یہ کچھ میرے لئے بھی ناقابل فہم سی بات تھی کہ پیٹر لتوجی جو یقیناً مجھ سے  
 تین زیادہ خوش شکل اور خوش مزاج تھا، خواتین کے معاملے میں جانے کیوں انتہائی  
 بدست واقع ہوا تھا...۔

وہ راہ چلتے جوڑوں کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا۔ ”مستفہ میرے دوست تم  
 ذرا بات تو سہی کہ کیا میں اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے گاؤں سے کئی  
 لاکھ گنا بہتر نہیں ہوں... میری رومی ناک، سیاہ گھنٹھریالے بال، یہ سانڈھوں لپی  
 چلتی انگلیں... اور میرا یہ روم کے بہترین درزی کے ہاتھوں کا سیلا ہوا برتن ٹوٹ  
 بہت ہے پر مجھ پر۔“ اُسے یقین تھا کہ اُس کے دوستوں نے جان بوجھ کر اسے روم  
 سے جلا تیا ہے تاکہ وہ اُس کی غیر موجودگی میں ہسپانوی زمینوں کے آس پاس پائی جانے  
 والی لڑکیوں کو بلا مقابلہ جیت سکیں۔

تم خوش قسمت ہو، وہ ہمیشہ کہتا۔ سٹاک ہوم آ رہے تھے تو ایک ایسے سویڈش جوڑے  
 سے ملاقات ہو گئی جنہوں نے اپنی ہسپانوی بالیڈے پر جاتے ہوئے اپنا پورا فلیٹ تمہارے  
 پر ڈکڑ دیا۔ جدھر جاتے ہو لوگ تمہاری طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ وہ کپڑے بھاڑنے  
 والی بات کا تو میں بھی گواہ ہوں کہ یہاں ہوتی ہے مگر میرے ساتھ نہیں، تمہارے ساتھ۔

اب فیصلہ کی بات ہے ورنہ یہ تو تم بھی مانو گے کہ میں تم سے زیادہ ہینڈ سٹم ہوں۔  
 ایک روز پوچھنے لگا۔ ”یہ تم اُس سکاچ ٹیپ کی فرم میں کلر کی کرتے کرتے آگتا  
 میں جاتے، سکاٹس ریسٹوران آجاء، ٹیٹف رہے گا۔“

میں نے پوچھا کس قسم کا کام ملے گا؟ کہنے لگا ”وہی جو میں کرتا ہوں، برتن دھونے کا۔“

”یہ ریسٹوران نہیں ہے پیٹر لتوجی۔“ میں نے نوٹ واپس کر دیئے۔

اگلے دن کام سے واپسی پر میں نے اپنا فرج کھولا تو اُس میں کم از کم ایک ماہ  
 کے لئے کافی خوراک اور مشروبات ٹھنڈے پڑے تھے۔ ایک روسٹ چکن کی ٹانگ سے  
 ایک چٹ لٹک رہی تھی۔ ”اب یہ ایک ریسٹوران ہے... پیٹر لتوجی۔“  
 ہاں یہ شخص دوست ہو سکتا ہے۔

ایک روز اُس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ نہایت اعلیٰ قسم کی ڈیکور والا فرنیچر  
 طرز کا کمرہ، صفائی اور منگائی کی مہک لئے ہوئے۔ دس منٹ کے عرصے میں اُس کی  
 لینڈ لیڈی نے کم از کم میں مرتبہ کسی نہ کسی بہانے اندر جھانکا۔

”دیکھا دوست میں اذیت میں ہوں۔“ پیٹر لتوجی نے بے چارگی سے کہا ”تم لڑکے  
 ہو تو اُس نے اتنی مرتبہ اندر جھانکا کہ دیکھا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی...  
 بھلا میں یہاں کسی لڑکی کو کیسے لاسکتا ہوں...“  
 ”میرے ساتھ آؤ۔“

”تمہارے بستر میں جگہ بچے تب ناں۔“  
 پیٹر لتوجی واقعی اذیت میں تھا۔ ایک سیاہ جس مزاج کا مالک، منہ سورتا ہوا

اور سٹاک ہوم سے بیزار۔ ”میرا تو سارا ’نیزن‘ تباہ ہو گیا ہے۔ میں روم واپس جا کر  
 اُن تمام دوستوں کی پٹائی کروں گا جنہوں نے سویڈن کی سنہری خوبصورتیوں کے  
 بارے میں مجھے بھڑکایا تھا کہ پیٹر لتوجی وہ تو تمہیں دیکھتے ہی اپنے کپڑے بھاڑ لیں گا  
 دو ماہ ہو گئے ہیں اور میں کسی فرشتے کی طرح معصوم پھر رہا ہوں۔“

”اور اُس روز میرے فلیٹ میں؟“  
 ”تم آگئے تھے... میں بے حد مایوس ہوں دوست۔“ اُس نے ایک رقت آمیز  
 آہ بھری۔

میں نے اُسے دلاسا دیا کہ مایوسی گناہ ہے۔

چلے آئے ہیں مبادا ان میں سے کوئی کسی مشروب یا کھانے کی فرمائش کر بیٹھے بلکہ اکثر روایات وہ ہمیں سگان خرید کر دیتیں اور اپنے پتے سے کھاپا لیتیں۔ قسمت یاوری کرتی تو دی پلا بعد میں کھل بھی جاتا۔

پیڑ لٹو جی اور میں جڑواں بچوں کی طرح تھے البتہ کبھی کبھار مجھے علیحدہ ہونا پڑتا اور ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہتا: ”تم ہو ہی خوش قسمت، لعنت ہے مجھ پر“

گرمیوں کی چھٹیاں اختتام کو پہنچیں۔ وہ شاک ہوم میں میری آخری شام تھی۔ اس روز میں نے ایک آرٹ شاپ میں پابلو پکا سو کے بناتے ہوئے چار کول کے چند سیج دیکھے جن میں بل فائٹنگ کے مختلف انداز تھے۔ سیج برائے فروخت تھے میں نے فلیٹ میں آکر اپنی کل ٹوپی کا حساب کیا، اگر میں شاک ہوم سے لندن تک صرف ڈبل روٹی کھا کر گزارہ کرتا اور مجھے سارا راستہ لفٹیں ملتی چلی جاتیں تو میرے پاس تقریباً چار سو سیٹس کروڑ بچتے تھے۔ ایک سیج کی قیمت بھی چار سو کروڑ تھی... پکا سو کے ہاتھ کا بنایا سیج۔ میں فلیٹ سے باہر نکل رہا تھا کہ پیڑ لٹو جی آگیا۔

”ہا... میرے دوست آج شاک ہوم میں ہماری آخری شام ہے، میں بہت اداس ہوں، آؤ اس آؤ اسی کو دُور کریں“

”اس آؤ اسی کو دُور کرنے کے لئے تمہاری جیب میں کچھ ہے؟ میرے پاس تو کچھ نہیں“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”وہ سوچ میں پڑ گیا“ میں نے تو واپسی کے لئے روم تک کا ٹرین ٹکٹ خرید لیا ہے اور بقیر رقم سے چمڑے کی یہ خوبصورت جیکٹ... اس نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔ ”شاید وہ دکان ابھی کھلی ہو آؤ اس بد صورت جیکٹ کو واپس کر آئیں“

”نہیں میں دیکھتا ہوں شاید کچھ نکل آئے“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چار سو کروڑ کے نوٹوں کو محسوس کیا۔ تمہیں پکا سو کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک سیج زیادہ عزیز ہے یا آج کی شب پیڑ لٹو جی کے ہمراہ؟... پکا سو یونسی قسم کا مصور ہے، اتنا مشہور بھی نہیں

میں نے اُسے بتایا کہ جاٹ حضرات تو کھیتی باڑی کے علاوہ عام تجارت کریں معیوب گردانتے ہیں چچا جی کہ کسی ہوٹل میں برتن مانگنے شروع کر دیں۔ دو روز بعد میں بھی پیڑ لٹو جی کے پہلو میں کھڑا برتن مانگ رہا تھا۔

شاک ہوم کے منگے ترین ریسٹوران ”سکائنس“ کے باورچی خانے کا ماحول ایک ہالڈے کیپ ایسا تھا۔ تقریباً تین درجن طالب علم لڑکے لڑکیاں ایک ایسی مشین کے گرد ایسٹرن باندھے کھڑے رہتے جس میں سے دھلے دھلائے برتن برآمد ہوتے اور ہال کام صرف یہ تھا کہ ہم انہیں سفید تولیوں کی مدد سے خشک کر کے رکھ دیتے۔ وہ مشین اتنی آہستگی سے چلتی کہ پورے دن میں فی کس چار پانچ پلیٹیں یا گلاس ہی آتے نزدیک نہایت اعلیٰ پائے کی معنی اور مفت تھی۔ ڈیوٹی چار بجے سہ پہر سے رات گیارہ بجے تک۔

میں اور پیڑ لٹو جی سارا دن جی بھر کے سوتے، چار بجے سکائنس پہنچتے، وہاں ایسٹرن باندھ کر گپ بازی ہوتی، درمیان میں ایک آدھ پلیٹ خشک کر دی اور بس کبھی گلاس ٹوٹے کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سینکڑوں کروڑ کے بیش قیمت گلدان ساثر شراب کے گلاس بڑی معصومیت سے فرش پر گرا دیتے جاتے۔ ”اوہ آج تو انگلیاں صابن ہو رہی ہیں۔“ ”میری بھی“ ”اُدھر سے دھپ کی آواز آتی۔“ ”اور میری بھی۔“ پیڑ لٹو جی افسوس سے کہتا اور ساتھ ہی ایک ہلکا سا چوڑ ہوتا دھماکہ۔

گیارہ بجے ہم ایسٹرن آنا کر ریسٹوران کی کلب کی طرف چلے جاتے جہاں داخلے کی قیمت ہماری ایک ماہ کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی مگر ہم چونکہ بے چارے ریسٹوران کے شاف میں سے تھے اس لئے گیبٹ پر کارڈ دکھا کر مفت اندر داخل ہو جاتے شاک ہوم کے امیر گھرانوں کی خواتین جب ہر شب دو نو جوانوں کو ایک مخصوص میز پر لا پڑا لے سگار چھونکتے ہوتے دیکھتیں تو یقیناً انہیں کسی یونانی جباروں کے مالک کے بیٹے یا راک فیلر کے جیتے بھانجے وغیرہ ہی سمجھتیں۔ ہم بھی انہیں یہی بتاتے کہ دراصل ہم بھی ابھی کسی ڈویک وغیرہ کے ڈنر سے کھاپی کر آ رہے ہیں اور یہاں تو صرف سگار دہنی کے لئے

اور پھر سچ بھی کوئلے کا بنا ہوا ہے، چند برس میں مدھم ہو جائے گا۔“ اور اپنی ادا سی دُور کرتے ہیں۔“

فلور نمبر تین کا خانہ روشن ہوا۔ لفٹ رُکی اور دروازہ کھل گیا۔

راہداری میں متعدد سفید دروازے تھے۔ ایک پر پیٹر لٹو جی لودی کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ میں گھنٹی بجانے کی نیت سے بٹن پر انگلی رکھنے کو ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ سامنے پیٹر لٹو جی کھڑا تھا۔

”ہیلو سٹنفر...“ اُس نے بے حد رُکھے اور بنیرا لمبے میں کہا۔ میرے بڑے ہونے ہاتھ اور مسکراہٹ سادگت ہو گئے۔ اُس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور سر کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ میں اتنی سرو مہری پر پیچ ڈاب کھاتا ہرچکائے اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں سے گزر کر ہم ٹیرس پر آ گئے۔ وہ پیچھے ٹراؤ پھر ایک وحشی گوریلے کی طرح اپنی چھاتی پر سٹکے چلاتے ہوئے انتہائی خوفناک آوازیں ”ہاؤ ہاؤ، ہو ہو“ کرنے لگا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”میں تمہاری آمد پر خوشی کا وحشیانہ اظہار کر رہا ہوں... ہاؤ ہاؤ، ہو ہو...“ اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ جب قدرے نارمل ہوا تو میں نے کہا ”مجھے دیکھ کر تو تم سخت بیزار ہو رہے تھے، اُس وقت خوشی کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا؟“

”نہیں ہو سکتا تھا۔“ اُس نے مزید دنگے اپنی چھاتی پر رسید کئے۔ ”میں اذیت میں ہوں دوست... میرے ہمسائے میں ایک جنطی بڑھیا رہتی ہے اور اگر میں اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی ذرا سا بھی شور کرتا تو وہ سیدھی پولیس سٹیشن چلی جاتی کہ یہ لڑکا میرے آرام میں مغل ہوتا ہے۔ چنانچہ میری مجبوری تھی کہ میں وہاں پر اپنی وحشیانہ خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لئے یہاں آ کر کر لیا... ہاؤ ہاؤ، ہو ہو“

اور میں اُدھر سے دیکھ رہا تھا جب تم عمارت میں داخل ہوئے تھے... ہاؤ ہاؤ، ہو ہو“

میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ پندرہ برسوں نے پیٹر لٹو جی کا چہرہ بھر دیا تھا، اس کے سیاہ گھٹنہ مالے بالوں میں کہیں کہیں سفید لکیریں تھیں مگر آنکھوں کی چمک بھر سا ڈھوں ایسی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مجھ تک پہنچنے میں دُشواری پیش آئی... تین روزہ امتحان ہے اور اگر میں کامیاب ہو گیا تو ایک اعلیٰ عدالت میں جج کی کرسی میری ہوگی... پچھلے سات روز سے میں اپنے بیڈ روم میں مقید ہوں، پورے دن میں رن باج منٹ کے لئے ٹیرس پر آ کر سورج کی روشنی دیکھتا ہوں اور پھر واپس نماؤں میں۔“

”میں تمہاری پڑھائی میں حارج ہو رہا ہوں...“ میں نے بے آرام سا محسوس کیا۔ میں اطالیہ صرف میری وجہ سے ایک اعلیٰ پائے کے جج سے محروم نہ ہو جاتے۔ ”اگر ایسا ہوتا تو یہ اطالیہ کی بد قسمتی ہوگی...“ اُس کی مسرت چمکتی تھی اور بڑے کی جلد تلے برسوں کی دوستی کی حدت روشن ہو رہی تھی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں نے وہ لون اٹھالیا اور تم آ گئے... اطالیہ ایک جج سے محروم ہو جائے مگر میں تم سے محروم نہیں ہونا چاہتا... جہاں ٹھہرے ہو فوراً میرے پاس آ جاؤ... کتنے روز کے لئے آتے ہو... ہا... ایک حیرت ناک خبر... میں اب ایک شادی شدہ شخص ہوں... اور جانتے ہو میری بیوی کون ہے؟... برگیتا۔“

”اچھا۔“

”اچھا کیا... برگیتا کو نہیں جانتے؟“

”نہیں۔“

”یہ تو تم بڑھے ہو گئے ہو اور یا مجھے احمق بنا رہے ہو، بوڑھے تم لگتے نہیں“

اس لئے... بھئی برگیتا۔“

”اچھا، برگیتا۔“ میں نے پھر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ہا۔“ اُس نے جھٹکا کہ ہاتھ فضا میں بلند کئے اور انہیں اُسی طرح اٹھائے ہوئے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔ واپسی پر انہی ہاتھوں میں ایک سنہری فریم والی تصویر تھی... اُس کی شادی کی تصویر۔ ”یہ والی برگیتا۔“ اُس نے سنہری بالوں والی سیب نما دھن کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا یہ والی برگیتا...“ میرا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ نپاٹ تھا۔

”تم بوڑھے ہو گئے ہو...“ وہ پچھلا ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بھئی ہمارے ساتھ سکاٹس ریسٹوران میں برتن صاف کیا کرتی تھی اور تم تو اکثر اسے پارک کیفے میں لے کر بیٹھے رہتے تھے... بلکہ ایک روز یہ تمہارے فلیٹ میں سے براہ راست ہوتی ہوئی بھی دیکھی گئی تھی۔“

میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تصویر کی شکل اجنبی ہی رہی۔ ”نہیں پیڑتوجی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس خاتون کو بالکل نہیں جانتا۔“

پیڑتوجی کھڑا ہو گیا اور ایک ہاتھ سینے پر جاکر دوسرا ہوا میں لہراتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”مائی ڈیر فرینڈ کیا ایک شریف النسل خود دار اطالوی کبھی یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ اُس کی موجودہ بیوی اس کے ایک عزیز دوست کے فلیٹ میں سے باہر آتی دیکھی گئی تھی اگر وہ نہ دیکھی گئی ہوتی...“

”یار تم پلین بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اُس کا ہوا میں لہراتا ہوا بازو کپڑا ”مجھے اپنی یاد نہیں... لیکن ہم دونوں تو شاگ ہوم سے ایک ہی روز واپس لوٹے تھے پھر۔“ ”پھر میں اگلے برس دوبارہ شاگ ہوم گیا اور خوش قسمتی سے تم وہاں موجود نہیں تھے... اور پھر اس سے اگلے برس بھی... اور یوں چودہ برس کے مختصر عرصے میں میں نے پلگیتا کو اپنی طرف مائل کر ہی لیا...“

”بارک ہو پیڑتوجی... تم انتہائی خوش قسمت ہو۔“

”چودہ برس میں ایک لڑکی... اسے تم خوش قسمتی کہتے ہو۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر ذہن پر زور ڈالا، صورت پہچان کے دھند لکوں میں کوئی دہی مگر یکدم سب کچھ ظاہر ہو گیا... برگیتا، ایک نہایت پڑھا کو قسم کی شے صرف ایک مرتبہ میرے فلیٹ میں کوئی کتاب وغیرہ مانگنے کے سلسلے میں آئی تھی۔ بن نے پیڑتوجی کو بتایا تو وہ بے حد راضی ہوا۔ ”اب میرا شادی شدہ مستقبل بے حد روشن ہو گیا ہے در نہ یہ بات ہمیشہ مجھے کھٹکتی رہتی۔“

ٹیرس مختصر تھا۔ پُرانے محبتے سفید گلوں میں چوڑے پتوں والے نمائشی پودے اور بارک پتوں کی پھپھوندی نما بیلین، ایک دیوار پر کسی رومی دیوتا کا سرمہ کھولے ہادی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ کسی عجائب گھر سے اُٹھالائے ہو؟“

”گولڈن ہینڈ۔“ وہ اپنے ہاتھ نچا کر بولا۔ ”میں نے خود بنایا ہے، ان ہاتھوں سے۔“ وہ مجھے فلیٹ کے اندر لے گیا جو آئیڈیل ہوم میکنزین کی ایک تصویر لگ رہا تھا۔ وہ مختلف آرٹشی اشیاء کی طرف اشارہ کرتا اور ہاتھ نچا کر کہتا۔ ”گولڈن ہینڈ... میں نے خود بنائی ہے، ان ہاتھوں سے۔“

ٹیرس پر واپس آئے تو تیسری چڑھا کر کہنے لگا۔ ”تم نے مجھے ابھی تک بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں ٹھہرے ہو۔“

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی تک اُس نے مجھے اطمینان سے بات کرنے کا موقع نہیں دیا اور پھر بتایا۔

”کیمپنگ کر رہے ہو؟“ وہ ہنسا۔ ”کیا وہی والا خیمہ ہے؟“

”نہیں۔“ میں بھی ہنسا۔ ”اب اُس کا پوتا ہے۔“

شاگ ہوم میں پیڑتوجی نے ایک مرل سی لڑکی کو بڑی شقت سے رہتی کیا

”بچی مرتبہ تریوی کے فوارے میں جو سکے ڈالے تھے انہوں نے بلا لیا ہے۔“  
”تو پھر پہلے وہیں چلتے ہیں تریوی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے۔“

”مجموعہ مکینوں میں پوشیدہ تریوی کے آبشار نما فوارے میں بیچپون دلو تاکا جٹمہ  
اور نرہ زور گھوڑوں کی بالکیں کھینچ رہا تھا۔۔۔ اور نیچے تالاب میں سکے تھے کچھ زنگ آلود  
یاں ریکانے برسوں پہلے پھینکے تھے اور بیشتر چمکتے ہوئے جو ہمارے گرد کھڑے  
یاں کے ہاتھوں میں سے ابھی ابھی نکلے تھے۔“

”عجب پاکھنڈ ہے اس فوارے کا بھی۔“ پیٹر لوجی کہہ رہا تھا۔ ”جو لوگ دوبارہ روم  
ہاتے ہیں وہ اسے کچھلی مرتبہ تریوی میں پھینکے ہوئے سکوں کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور جو  
نیا آتے۔۔۔ انتظار کرتے رہتے ہیں۔“

ایک فلک اعال بوڑھا پتلون کے پانسے چڑھا کر تالاب میں اتر گیا اور اس سے پیٹر  
سباہی اُسے روکتا وہ چند سکے سمیٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔ اُس کے بھوکے پیٹ کے  
نئی نئیوں کی آدھی پلیٹ کی قیمت۔۔۔ سکے جو اُس کی ہتھیلی میں گرنے کی بجائے  
نہیں گرتے تھے اور زنگ آلود ہوتے رہتے تھے۔ چند بچے دھاگے کے سرے پر تھناٹیں  
دکھاتے تھے وہ میں پڑے سکوں پر پھینک رہے تھے کبھی کبھار کوئی سکہ چپک جاتا تو وہ  
میاٹ سے ڈر سمیٹ لیتے اور اُسے اُتار کر جیب میں ڈال لیتے۔۔۔ ایک سکہ،  
بہانی۔

”جلیں؟ میں نے پوچھا۔“

”اُس مرتبہ سکے نہیں پھینکے گئے؟“

”نہیں۔ اس مرتبہ ہنگامی بہت ہے، خواہ مخواہ سکے ضائع کرنے سے فائدہ؟“  
”ہنگامی نہیں، تم بوڑھے ہو چکے ہو۔“

”مردن فورم میں گئے اور ایک دوستوں کا معائنہ کر کے باہر نکل گئے۔۔۔  
نیکل کی سالگرہ کیگ نما سفید یادگار کے قریب سے گزرے۔ کلاسیک کے اندر

کہ وہ اس کے ہمراہ نزدیکی جھیل پر دیک اینڈ منانے کے لئے چلے۔ چونکہ اُس نے جان  
بوچھ کر ایک دیران جھیل کو منتخب کیا تھا اور ایسی جگہوں پر سٹول نہیں ہوا کرتے اس  
لئے میرا خیمہ اُدھار لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُنہوں نے قریبی جنگل میں خیمہ نصب کیا اور  
جھیل میں تیرنے کے لئے چلے گئے۔ واپس آتے تو خیمہ موجود تھا مگر کسی آواز نہ کرنے  
اُن کے رُک سیک اور بدن کے کپڑے غائب کر دیتے تھے۔ چنانچہ اُسی دوپہر جب وہ  
دونوں سٹاک ہوم واپس لوٹے تو خاتون مختصر کیلنی میں تھی اور پیٹر لوجی سر پر نیم لٹا  
نہانے کے جا لکھے ہیں۔۔۔

”نہیں، وہ والا خیمہ تو نہیں۔“ میں بھی ہنسا۔ ”اب اُس کا پوتا ہے۔“

”اُس کے پوتے کو سمیٹو اور میرے فلیٹ میں آجاؤ۔ برگیتا بھی موجود نہیں چنانچہ  
ہم ایک مرتبہ پھر کنوارے پنے کے وقت زندہ کریں گے۔“

میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس پورٹ پر اطالیہ کے قیام کے لئے صرف سات اوز  
کا ویزا ہے، دو روز روم کے لئے، چار دن فلا رنس اور شاید ایک دو روز وین۔  
۔۔۔ پھر سٹوٹز لینڈ، فرانس، بہر حال واپسی پر شاید۔۔۔

وہ بہت آزدہ ہوا۔ ”کیس تم میرے امتحانوں کی وجہ سے تو گریز نہیں کرتے؟“  
”نہیں۔۔۔ میرے پاس وقت کم ہے۔“

”ہاں وقت کم ہے۔ اب شام ہو جاتی ہے، دوپہر گزر جاتی ہے۔“ اُس نے باؤں

پر ہاتھ پھیرا۔ ”کبھی دوپہریں اور شامیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔“ وہ مجھ سے ملحد  
ہو کر کہیں اور چلا گیا، پھر واپس آیا آہستہ آہستہ اور کہنے لگا۔ ”اس کا مطلب ہے  
کہ ہمیں صرف ایک دوپہر اور ایک شام مل رہی ہے۔۔۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔“

”تو پھر تم روم میں ہو۔“ پیٹر لوجی نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک پر مڑتے

بے یقینی سے کہا۔ ”مگر تم آ کیسے گئے؟“

”ہا“ پیٹر لٹو جی نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے ”میں بھول گیا تھا کہ تم پہلے یہاں آچکے ہو۔“

ہم سپانوی زینوں کے سامنے ایک قہر خانے کے باہر بیٹھ گئے۔ سنگ مرمر کے زینوں پر بیٹھنے والے عیسائی شہداء کے لئے دعاؤں کے خیر مانگ کر باہر آ گئے۔ یا زادی! ان زینوں میں کھڑے ہو کر چند کبوتروں کی پیٹھ ٹھپکی۔ کلیسا کے سینٹ پیٹر کے گنبد پر سوار ہو کر ان کے گنبد نے بنایا تھا اور اسی کلیسا کے اندر جا کر اسی مائیکل انجلو کا شاہکار ”پیٹیا“ دیکھا کہ گنبد کی مریم بیٹے کی لاش پر سو گواٹھکی ہے اور رستیں چیلپ کی چھت دیکھی صرف ایک نظر کر اس پر بارش اللہ میاں مصورت تھے، دوسری نظر کی تاب کہاں۔ ایک اور کلیسا میں مائیکل انجلو کے حضرت موسے براہمان تھے۔ ہم نے متعدد تاریخی نوادوں کا مختصر جائزہ لیا پھر دریائے ٹامبر کے کنارے پر جا کر چند گنبد مٹ گشت کی... ہر تاریخی مقام پر پیٹر لٹو جی ہی کتا کچھلی تہہ پورا ایک ہفتہ ان کھنڈروں اور گرجوں اور نوادوں کا طواف کرتے رہے تھے۔ اس مرتبہ

سرسری زیارت پر اکتفا کر لو... وقت بہت کم ہے۔

دوپہر گزرتی۔ روم کی ایک دوپہر اس کی قدیم تہذیبوں کی طرح فنا ہوئی مگر شاہکار کی مانند ہی پھر سے زندہ ہونے لگی۔ کلیساؤں کی گھنٹیاں مترنم اذانوں کی طرح ہر گونہ رہی تھیں... اور ہم بے حد تھک چکے تھے اور گھر جانا چاہتے تھے۔ ویاکندوٹی میں سے نکلے تو ہم سپانوی زینے کسی سفید پہاڑ کی ڈھلوان میں سے تراشے ہوئے کھیتوں کی طرح سامنے آ گئے۔ میں نے بہت ہاروی۔ ”ان سینکڑوں سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے مجھے پہلے آرام درکار ہے اور اس کے ساتھ کافی کی ایک پیالی۔“

”اور پہنچو گے تو بڑا دلفریب منظر دیکھنے کو ملے گا۔“ پیٹر لٹو جی دکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ”زندگی کی تھکا دہیں اسی طرح جنم لیتی ہیں کہ لوگ کہتے رہتے ہیں، اور پہنچو گے تو بڑا دلفریب منظر دیکھنے کو ملے گا... اور وہاں پہنچنے پر ایک اور سپانوی زین سامنے آ جاتا ہے... مجھے معلوم ہے کہ اوپر کچھ بھی نہیں سوائے ایک اور ٹیڑھ شاہراہ کے جہاں سے تمہارے فلیٹ کو جاتی ہوئی ٹرامیں ملتی ہیں۔“

”لیکن تم تو بچ رہے ہو۔“

”ہمارے نہیں ہوتے؟“

”ہمارے ہاں تو ہوتے ہیں۔“

”تم بائیں کرتے رہے۔“

”نہ پاتھ پر لگی تمام کی تمام کرسیاں پر مہر چکی تھیں۔ زیادہ تعداد امر کی سیاحوں

کی تھی جو شام ہو جانے کے باوجود تنکوں کے بڑے بڑے مہیٹ پہنے ہوئے تھے...  
سیاح لڑکیاں پاؤں گھسیٹتی ہوئی آئیں اور کرسیوں پر ڈھیر ہو گئیں۔ ان کی سرزنش  
شکلوں سے لگتا تھا کہ وہ سارا دن کڑی دھوپ میں روم کے کھنڈروں میں دھنکے  
پھری ہیں۔ ان کے صحت مند جسموں، سنہری بالوں اور بے خوف نظروں سے سویش  
ہونے کا پتہ ملتا تھا۔

”اوہ نو۔“ پیٹر لوجی جس کی نظریں ان کے ساتھ ساتھ چلتی آئی تھیں اور انہیں  
باقاعدہ کرسیوں پر بٹھایا تھا، ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا  
”میں ایک دفا دار خاندان ہوں، پرائی لڑکیوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا لیکن...“ اس نے  
بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”میں بھوکا ہوں... ہاؤ ہاؤ۔“ پھر اُس نے میرا ہاتھ  
پکڑ کر اپنے سینے پر چڑھایا۔ ”کیا تمہیں ناخن چھب رہے ہیں؟“  
”کس کے؟“

”میرے جیسی بٹوے میں میری بیوی کی تصویر ہے۔ مجھے ہمہ وقت احساس رہتا  
ہے کہ اُس کے ناخن میرے سینے پر رکھے ہیں کہ خبردار...“ وہ میرے دوست شاد  
انسان بھی کتنا ڈرپوک ہوتا ہے...“ اس کے بعد پیٹر لوجی کی گفتگو خاصی بے ربط  
اور وہ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا حالانکہ ہم زنانہ کافی ہی نوش کر رہے تھے... کچھ  
بعد اُن لڑکیوں نے بل ادا کیا اور باہر جانے لگیں۔

”میں ایک دفا دار خاندان ہوں...“ پیٹر لوجی بھی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن  
بھوکا ہوں... آؤ دوست ان کا پیچھا کریں۔“

میں نے ہچکچاہٹ ظاہر کی تو ہنس کر کہنے لگا۔ ”یہ شام بھی ختم ہو جائے گی۔ آؤ...  
ہم باہر نکلے تو وہ دونوں دیا کندوتی کی ایک دکان کے شوکیں میں جھانک رہی  
جس میں مسک کی ٹائیاں سجی تھیں۔ پیٹر لوجی اُن کے پاس گیا اور تودب ہو کر بولا۔ ”خیرین  
اگر آپ میرے لئے کسی نئے کتے کا انتخاب کر رہی ہیں تو مجھے وہ گہری مرنی مانی پسند ہے۔“

تین نے پیٹر لوجی کو حقارت آمیز نظروں سے دھکیلا اور آگے چل دیں۔ پیٹر لوجی نے  
مجھے گھسیٹ لیا۔ ”وہ یقیناً ہمیں پسند کرتی ہیں اور صرف بھرم رکھنے کے لئے کچھ  
بقا ب کر دانا چاہتی ہیں... ہا ہا میں ابھی یہ کھیل نہیں بھولا۔“

دیا کندوتی سے نکل کر وہ ہسپانوی زینوں کی طرف بڑھیں۔ پیٹر لوجی لپکتا ہوا  
بے مثال پر گیا اور چند پھول خرید کر انہیں پھر چڑھایا۔ میں نے دُور سے دیکھا کہ وہ جھکے  
نہیں کچھ کہہ رہا ہے، وہ بھی کچھ کہہ رہی ہیں اور پھر وہ تینوں میری جانب آنے لگے۔  
پیٹر لوجی بدستور قدرے جھکا ہوا تیزی سے باتیں کرتا ہوا اور لڑکیاں پھولوں کو گھسیٹتی  
فرے عطا کر کھچا دے آزاد۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میری طرف آیا اور تعارف کروایا۔ ”یہ ہے  
برادرست اور کزن سنیر تو رو... سسلی سے آیا ہے۔ ڈیوک آف وینڈٹیا کا ساتواں  
بڑا... بے حد خوشخوار۔“

”ہیلو...“ اُن میں سے ایک نے قدرے بے یقینی سے میری طرف دیکھا کیونکہ میری سیلی  
بلیک مین اور جیکٹ اتنی شاندار تھیں۔ اس سے پیشتر کہ میں اُسے کچھ کہتا پیٹر لوجی نے میرا  
بال مبارک سے تھکا اور کہنے لگا۔ ”بے چارہ انگریزی بالکل نہیں جانتا... صرف تھینک یو  
کر سکتا ہے... کو تھینک یو۔“

میں نے ہنرٹ بھیج لئے اور پیٹر لوجی کو کھانا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ”ہاں خوشخوار  
اے...“ وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ”تھینک یو بھی نہیں کہتا اتنی سویت لڑکیوں کے لئے...  
بڑا کر دو۔“

”تھینک یو۔“ میں نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ جھک کر کہا۔ دونوں خواتین  
بہر غور ہوئیں۔

اس کے بعد پیٹر لوجی اُن کے ساتھ نان سٹاپ گفتگو کرتا رہا اور چلتا رہا۔ ہر پانچ دس  
دھنکے دھنکے کے بعد مجھ سے ”تھینک یو“ کہنے کی فرمائش ہوتی جو میں دانت کچکچاتے ہوئے  
ناکار دیکھا۔ پیٹر لوجی نے جس طور مجھے سسلی کے ایک ڈپوک کا پوتا بنا دیا تھا اُسی طرح



”آپ میں کھسپھر کر رہی تھیں۔“ میری سہیلی کہتی ہے کہ تمہارے دوست کا رنگ سہلی کے رہنے والوں ایسا نہیں ہے، کچھ ڈارک ہے۔“ اُن میں سے ایک بولی۔  
”یہ ڈھوپ میں بہت پھرتا ہے۔“ پیٹر ٹوجی نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں تو رو...  
کہو تھینک یو۔“

”تھینک یو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ہاؤ سو ریٹ۔“ وہ خوش ہو گئیں۔

”آپ کیا پیسے گی؟ اطالوی داتن، شپٹین یا جن؟“

”ہم سارا دن تاریخی عمارتوں اور کھنڈروں میں گھومتی رہی ہیں اور کہیں بھی...  
اُن میں سے ایک نے جھجکتے ہوئے کہا ”اور کہیں بھی... میں پہلے فدا ہوا تھا روم میں جانا چاہتی ہوں۔“

”ڈرائنگ روم کے سامنے بیڈ روم کا دروازہ ہے، اندر جاتے ہی داتن ہاتھ پر...  
پیٹر ٹوجی نے خوش دلی سے کہا۔

وہ اندر چلی گئی تو پیٹر ٹوجی نے دوسری سے پوچھا۔ ”آپ روم میں کتنی راتیں  
سوئیں گی؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔ اُس کے لب اگرچہ پُرکشش تھے مگر ہمیشہ کھلے رہتے تھے،  
توڑے احمقانہ انداز میں۔ ”ہم چھ روز کے لئے روم آئی ہیں، انگے اور میں۔“  
”ادہ آپ کی دوست کا نام انگے ہے، اور آپ کا؟“  
”برگلیتا۔“

پیٹر ٹوجی تو جیسے بجلی کی ننگی تار سے چھو گیا ہو۔ ”ہا۔“ اُس نے خوفزدہ ہو کر کہا  
”برگلیتا... شاک ہو م؟“

”ہم شاک ہو م سے ہی آئی ہیں۔“

”برگلیتا۔“ وہ دوسری لڑکی دھاڑتی ہوئی فلیٹ میں سے نکلی۔ ”یہ تو شادی شدہ ہے۔“

روم کے بیشتر سرکاری دفاتر اور پوسٹ آفس کی عمارات وغیرہ کو فلاں سیزر اور نیرد  
کے محلات کے طور پر پیش کرتا رہا۔ پھر تپہ نہیں کیسے اُس نے انہیں اپنے فلیٹ پر  
شام کے کھانے کے لئے مدعو کر لیا۔

اُس نے بڑی آمیتگی سے فلیٹ کا دروازہ کھولا، منہ پر انگلی رکھ کر سب کو  
خاموشی سے اندر آنے کو کہا اور پھر بتلیوں کی طرح دبے پاؤں چلتا ٹیرس پر آگیا۔  
”آپ تشریف رکھتے...“ وہ تسلی سے ہاتھ ملتا ہوا کہنے لگا۔ ”اور کھانے سے بڑے  
کچھ پینے کے لئے...“ اُس پر بے ٹیف۔ ”اور کچھ میں چلا گیا۔ میں تیر کی طرح اُس کے پیچھے گیا  
”یہ کیا یہودگی ہے پیٹر ٹوجی۔“

”دیکھو دوست...“ وہ ابرو چڑھا کر بزرگانہ انداز میں بولا۔ ”یہ تیر کی لڑکیاں  
رومانس کی بھوک ہوتی ہیں۔ کسی اطالوی یا زیادہ سے زیادہ کسی سہلی کے رہنے والے  
کے ساتھ روم کی ابدی شاموں کو راتوں میں بدلنے کا ارمان... اب اگر میں یہ کہتا کہ  
میرا دوست پاکستانی ہے تو وہ کبھی ہمارے قریب نہ آتیں...“  
”اور میں انگریزی کیوں نہیں جانتا؟“ میں نے بھڑک کر پوچھا۔

”یہ بھی ایک طرح کا رومانس ہے... سہلی کا خوشنوا رنوب، مانیا کا خفیہ کنج  
صرف تھینک یو کہہ سکتا ہے... اور سوچو تو سہی دوست کہ اگر تم انگریزی نہیں جانتے  
اور جہد و جد کے بعد ایک خاص مقام پر پہنچ کر وہ کہہ دیتی ہے کہ ”نہیں، نہیں“ تو تم  
سمجھ ہی نہیں سکتے... فائدہ... اور بعد میں تم اُسے ”تھینک یو“ کہہ سکتے ہو۔“  
میں اُس کے ترنگ آمیز مودے سے متاثر ہو کر مسکرا کر انے لگا۔ ”اور مجھے سو تو رو  
کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ تو رو تو ہسپانوی میں ساڈھ کو کہتے ہیں۔“

”تو پھر؟“

اُس نے فرج میں سے چند بوتلیں اور گلاس نکالے اور باہر چلا گیا... لڑکیاں

پیشہ کی اٹھا رکھی ہو۔ اتنے میں وہ پھر واپس آگئیں۔ ”ہمارے پاس لفٹ میں ڈالنے کے لئے ریزنگاری نہیں ہے، ایک سکہ دو۔“

”لفٹ کے عین پہلو میں سیڑھیاں اُترتی ہیں، اپنی صحت مندی کا فائدہ اٹھائیے اور اتر جائیے، رات تک نیچے پہنچ جائیں گی، خدا حافظ۔“ پیشہ ریزی نے دونوں ہاتھ ہلاتے۔ وہ پاؤں پچھتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

”بُری بات پیشہ ریزی“

”اور یہ اچھی بات ہے کہ اُنہوں نے ہماری شام ضائع کر دی۔ شادی شدہ زندگی میں پہلی بے وفائی کی شام... خیر دفع کر دو ان چٹریوں کو، آؤ کپڑی کی اس بوتل کو کھولتے ہیں...“ اُس نے بوتل کے کار میں تار گھمائی اور مجھے تھمادی۔ ”تم کھولو مگر احتیاط سے...“

”پھٹنے کا خطرہ ہے؟“ میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

”نہیں... اس کا کارک بہت بلندی تک جاتا ہے اور اکثر اوقات ذرا ترچھا ہو کر ساتھ والے ٹیرس پر جا گرتا ہے... وہی خطی بڑھیا... اور وہ شور مچاتی ہے کہ کوئی مجھے چھیر رہا ہے...“

میں نے دھیرے دھیرے تار گھمائی، کارک بھٹک سے علیحدہ ہوا، ہماری نظریں اُس کے ساتھ اٹھیں اور وہ ٹیرس سے بلند ہو کر روم کے آسمان میں تیرا ادا نیچے آگیا۔ پیشہ ریزی نے ہاتھ بڑھا کر اُسے دبوا اور میز پر رکھ دیا۔

میں نے کپڑی چکھی اور منہ بنا لیا۔ ”یہ تو کڑوی یعنی ہڑ ہے۔“

پیشہ ریزی نے بوتل اٹھا کر اُس کا لیبل آگے کر دیا جس پر کپڑی بٹر لکھا تھا۔ جہاں روم کے دن تمازت میں چمکتے ہیں وہاں راتیں اکثر سرد ہو جاتی ہیں ہم نے اُس ٹیرس پر بیٹھے ہوئے سردرات کی تبدیلی آند کو اپنے بدنوں میں محسوس کیا۔ پیشہ ریزی اگرچہ پوری طرح بحال ہو چکا تھا مگر شوخی اور مسترت کی جھاگ بیٹھ چکی تھی۔

اُس کے ہاتھ میں پیشہ ریزی کی شادی والی تصویر کا فریم تھا... پیشہ ریزی کا رنگ اڑنا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ ”یہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی کی تصویر ہے، ہماری شکل ملتی ہے۔“ تم تو راستے میں کہہ رہے تھے کہ تم اکلوتے بیٹے ہو اور اس خوبصورت دنیا میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہو۔“ انکے باقاعدہ دہک رہی تھی۔

”یہ میرا سوفیصد بھائی ہے... یقین کیجئے خواتین... مجھے مقدس مریم کی قسم ہم ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔“ وہ سینے پر صلیبیں بنانا کرنا ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے انکے کے شانے پکڑ کر سمجھانے کی کوشش کی اور اس دوران اپنی اطالوی عادت سے مجبور ہو کر اُس کے رُخسار کو بھی پھینچا دیا۔ وہ مزید جوش میں آگئی۔ ”یہ تم نے میرے گال کو کیوں ہاتھ لگایا ہے؟“

”آپ کو ایک اچھے عیسائی کی طرح اپنا دوسرا گال آگے کر دینا چاہیے...“ میں نے صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”میں اُن عیسائیوں میں سے نہیں ہوں جو تم جیسے جھوٹے شیروں کے آگے تھکڑا ڈال دیتے ہیں...“ وہ لال بھبھو کا ہو کر بولی اور پھر فوراً ہی خاموش ہو گئی۔ مجھے نظر پڑا دیکھا ”تو تم انگریزی بھی بولتے ہو۔“ اُس نے اپنی سہیلی کا بازو تھام لیا۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ دالاسسلی کا نہیں... آؤ انکے ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ دونوں دھوکے باز ہیں۔“ انکے نے قدرے مائل سے کام لیا تو برگیتا اُسے جھنجھوڑ کر بولی ”تم انھی کیوں نہیں؟“ ”ادھر برگیتا، اگر یہ شادی شدہ ہے تو پھر کیا ہو اور اگر یہ دالاسسلی کا نہیں اور انگریزی بولتا ہے تو کیا حرج ہے؟“

”حرج؟“ وہ چنچی۔ ”یہ معصوم لڑکیوں کو درغلالتے ہیں، دھوکے باز ہیں... چلو۔“ انکے نے خوش نظر ٹیرس اور ہم حسین مجرموں کو حسرت سے دیکھا اور مجبوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دونوں باہر نکل گئیں۔

پیشہ ریزی منہ کھولے کھڑا تھا اور اُس کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند تھے جیسے کوئی

”مجھے تم سے موبابیت ہے... اُردو میں آئی تو یو کو یہی کہتے ہیں ناں؟“  
 ”ہاں پیٹر لتوجی... اور مجھے بھی تم سے موبابیت ہے۔“  
 رات کے بارہ بجے تو روم کی سہاؤں میں موسیقی سے لبریز، کلیساؤں کی گھنٹیوں  
 کی آوازیں بھیلیں اور ہم تک پہنچیں۔

”مجھے چلنا چاہیے۔“  
 ”ہاں۔ رات بھی ختم ہو گئی۔“  
 فلیٹ میں سے گزرتے ہوئے وہ ایک آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”اس فلیٹ میں  
 برتنے تھے سوائے اس آئینے کے جو میں اپنے ماں باپ کے گھر سے اتار لایا تھا۔ اس  
 کے سامنے کھڑے ہو کر میں اپنی ناکا میوں پر ردیا اور خوشیوں پر مسکرایا۔ اسی آئینے  
 کے دُور جوان ہوا اور اب سفید بال نوجوا ہوں... تم بھی اتنے برسوں بعد ایک  
 پرانے آئینے کی طرح میرے سامنے آگئے ہو۔“  
 دیا تارنٹو کے سٹاپ پر ماؤنٹ اٹلینا کیمپنگ کے لئے آخری بس آئی اور میں سوار  
 ہو گیا۔

”ارے دی ڈاچی... پیٹر لتوجی“  
 بس سٹارٹ ہوئی تو وہ پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ ”ہاں۔ اُس نے دونوں  
 ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔“ میں آج ہی تمہاری جانب سے تریوی نوآرے میں چند سکتے  
 ایک دوں گا... پانیوں کو کیا پتہ کس نے چھینکے ہیں... روم واپس آنا۔“  
 روم سویٹ روم۔



وہ اپنے دنوں اور سالوں کا حساب کر رہا تھا۔ ”میں چھتیس برس کا ہو گیا ہوں اور اب  
 تک پڑھ رہا ہوں... تمہیں پتہ ہے ناں کہ میں تمہارے علاوہ آج کسی اور کو نہ ملتا۔  
 ... دیکھو۔“ اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔“  
 ”بوڑھا نہیں، مگر بس نفل۔“

”ایک ہی بات ہے... تم نے یہی کہا تھا ناں کہ زندگی کی تھکا دہی اسی طرح ختم  
 لیتی ہیں کہ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ اُوپر پہنچو بڑا دلفریب منظر ہے اور اُوپر پہنچنے پر ایک  
 اور ہسپانوی زبیر سامنے آجاتا ہے... میں اب بھی ایک چھوٹی عدالت کا جج ہوں مگر  
 لوگ کہتے ہیں کہ اُوپر پہنچو، بڑا دلفریب منظر ہے... بڑی عدالت میں جلا جاؤں گا تو  
 پھر بھی یہی کہیں گے کہ اُوپر پہنچو...“

”تم عدالت میں سفید وگ لگا کر سنجیدہ کیسے بیٹھے رہتے ہو پیٹر لتوجی؟“  
 ”تم آج کی بات مت کرو۔ آج میں تمہارے ساتھ تھا اور ہم دونوں سٹاک ہوم میں  
 تھے پندرہ سال پہلے... روم تو اب آتے ہیں۔ میں بہت سنجیدہ اور سخت جج ہوں  
 ... بس دو پہر گزر رہی ہیں اور شامیں ختم ہو رہی ہیں...“

اُس نے کمپاری کے بعد کیانتی کی ایک بوتل کا کارک ڈھیلایا تو وہ آسمان پر  
 تیرتا ہوا ساتھ والے ٹیرس پر جا گرا۔ پیٹر لتوجی نے کان پر مہلتی رکھ کر انتظار کیا مگر  
 خیال ہے سو گئی ہے۔“

پھر ہم ایک طویل عرصے کے لئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔  
 ”ہاں۔ وہ یکدم کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا دیئے۔“ مجھے یاد آگیا۔ اُس نے فرش پر  
 ایک گھٹنا ٹیک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا تم اُردو بولتے ہو؟“ پیٹر لتوجی نے نہایت مزیدار  
 اطالوی لہجے میں اُردو کا یہ فقرہ ادا کیا جو میں نے اُسے پندرہ برس پیشتر سٹاک ہوم  
 میں سکھایا تھا۔

”ہاں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

## پتھر کا شہر

آج اتوار تھا، صبح کے دس بجے تھے۔ ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔  
دس بجے تھے مگر دُھوپ میں ایک نامعلوم سی سیاہی گھٹی ہوئی تھی۔  
ابدی شہر سے نکلنے والی سڑک کے دور درویر سرو کے درخت پتھر کے بنے تھے۔  
کربا کل ساکت کھڑے تھے جیسے روم سے بغاوت کے جرم میں مصلوب غلاموں کے  
لاشے اکڑ رہے ہوں۔

ایک کھنڈر ہوتا ہوا اردمی اکھاڑہ نظر آیا۔ شکستہ اینٹوں میں گھاس اور مرکنڈے  
اور درمیان میں ایک نوجوان جس کی نگاہیں اپنے گرد و سمار ہوئی ہوئی عمارت میں کچھ  
فلاش کر رہی تھیں۔

آج اتوار تھا، صبح کے دس بجے تھے۔ ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔  
بلیری کی جبین میں منڈھی ہوئی باتیں ٹانگ موسیقی کی تال پر ٹانپ رائٹر کے ایک  
بنی لفظ پر بار بار پڑنے والی انگلی کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ کرخت شبابہت، مرد  
بزنس سے بال بال بچتی ہوئی بلیری جس کی واحد جاذبیت تال پر دھمکتی متحرک ٹانگ  
موسیقی، سٹیزنگ وہیل پر تھی۔ اُس کے پہلو میں لینڈ انیم دراز تھی۔ پچھلی نشست پر  
فانہ بدوشوں ایسے گھیر دار لباس میں شیلہ تھی جو اپنے بے ترتیب سٹو کے ہوتے بالوں  
کو بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھجلا رہی تھی۔ اور میں تھا اور باہر دیکھ رہا تھا۔  
فوکس واگن کا ڈیہ فلائرس جانے والی شاہراہ پر مڑ گیا اور باہر ٹریفک سے دور

بیلوں سے سیاہ انگور لنگوروں کی طرح لٹک رہے تھے۔

آسٹریلیا کی ہلیری اینڈ کمپنی سے پچھلی شب کمپینگ کے ادین ایر کا کافی باغیں سرسبز ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے روم سے فلارنس کی جانب روانگی کا ذکر کیا تو میں نے لفٹ کا دست سوال دراز کر دیا... اور اب میں ان کی یہ خیرات وصول کر رہا تھا۔ ان دیکھے شہروں کی جانب سفر کرتے ہوئے جو بے دھڑلے کشش بدن کو گرفت میں لیتی ہے، وہ کہاں ہے؟ آوارگی کا وہ عالم وارفتگی کیا ہوا؟ کیا دیوانگی سفر کے کلبلا تے ہوئے جرثومے مرتے جاتے ہیں... مرتے جاتے ہیں۔

دو بجے ہم فلارنس پہنچ گئے۔ پلازا دیکیمو میں دانٹے کے مجسمے کے نیچے ہلیری نے اپنی میوزیکل ٹانگ بریک پر رکھی اور فوکس داگن پارک کر دی۔ مجسمے کے سر پر ایک گدھ بیٹھا ہوا تھا۔

ہلیری اور لنڈا نے پلازا دیکیمو میں اتری ہوئی دھوپ کی چمک میں نہایت بے وقوفی سے ایک ایک سگرٹ پیا اور چلی گئیں... شیلارک سیک کے بوجھ سے جھکی جھکی باؤں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ ”جرمنی میں ان کے دوست لڑکے ان کا انتظار کر رہے ہیں کسی جھیل کے کنارے... اس لئے انہوں نے فلارنس ایسے شہر میں ایک شب رونا بھی گوارا نہیں کیا مگر میں...“ وہ میبلے دانتوں سے ہنسی۔ ”میرا کوئی انتظار نہیں کر رہا۔“

”کہاں ٹھہرو گی؟“

”یوتھ ہوسٹل میں، اگر وہاں جگہ نہ ملی تو... ان دنوں فلارنس میں سیاحوں کی بھڑکی کی وجہ سے چھت کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔“ وہ بڑی مایوس اور بے چاری دکھائی دی۔

”اگر کہیں جگہ نہ ملی تو میرا خیر اتنا چھوٹا نہیں ہے، آجانا۔“ میں نے لفٹ کا بدلہ چکانے کی خاطر پیشکش کی۔

”میں شاید آج بھی جاؤں لیکن پہلے یوتھ ہوسٹل۔“ وہ سر کھجاتی ہوئی چل دی۔

دانٹے کے سر پر گدھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجسمہ چوتھرے پر ساکت تھا اور میں چوتھرے ساتھ ٹیک لگاتے سگرٹ پی رہا تھا... پلازا دیکیمو میں ٹہلتے سیاح بھی دست رہے تھے۔ وہ اطمینان سے تصویریں کھینچ رہے تھے، لاپرواہی سے دھوپ ایک رہے تھے اور سٹالوں پر سے فلارنس کی فنکارانہ مصنوعات خرید رہے تھے۔

اب نہیں رہے تھے اور ان کے پاس دنیا کا تمام تر وقت پڑا تھا اس لئے کہ روم نہیں تھا... روم جس کی وسعت اور تابیخ اور ہجوم سیاح کو حقیر دیتے ہیں، اسے بھگا بھگا کر نڈھال کر دیتے ہیں۔ فلارنس تو اتنا حقیر تھا کہ اس

بیزیز ہلنے والا انسان یا تو تسکینی کی پہاڑیوں میں پہنچ جاتا تھا اور یا سیدھا سیدھا اپنے آرنے کے پار نکل جاتا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت کے لئے گاڑ کا منہ نہیں دیکھنا تھا بلکہ یہ ایک ایسا ورق تھا جسے جدید انسان کسی مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ دانٹے، بکا،

لال، کلاشیو، گلیلیو اور مونا لیزا کو جاننے کے لئے کیا کسی گاڑ کے لیکچر کی ضرورت ہے؟ روم شہنشاہوں اور سیزروں کا شہر ہے اور فلارنس مصوروں، مت تراشوں اور دانشوروں کا، روم جلال اور فلارنس جمال... اور میں کبھی بھی جلال سے محروم ہی ہر سکا البتہ جمال کے لئے میں ایک ایرانی قالین ہوں، وہ مجھ پر بے شک تنگے پڑ چکے... اور فلارنس میرے وجود پر چلا اور اس کے نقش پا آج تک میرے

ہن پر موجود ہیں۔

گول ہیٹ اور اس کے نیچے ایک گھیرے دار میکسی اور ایک کمرہ۔ ایک پادری نے مجسمے کی تصویر اتارنا میرے قریب آگیا۔

”سنیئر۔“ اس نے مسکراہٹ سے درخواست کی۔ ”اگر آپ ایک لمحے چوتھرے سے ہٹ جائیں تو میں دانٹے کی ایک مکمل تصویر اتار لوں۔“

”اگر اس گدھ کی بھی جو سنیئر دانٹے پر براجمان ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کاشی۔“ پادری نے ہاتھ لہرا کر گدھ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ ”نہیں اڑنا۔“

اُس نے خجالت میں سر کی بجائے ہیٹ کو کھٹکھٹایا اور پھر تصویر اُتاری۔

”فلارنس میں تم پہلے شخص ہو جس کے ساتھ میں نے بات کی۔“ وہ اب میری نگہ پر ٹیک لگا کر براجمان ہو گیا۔ ”مجھ سے تو کوئی بات ہی نہیں کرتا، تیرے نہیں لوگ پلوئیں سے کیوں خوفزدہ رہتے ہیں حالانکہ کل صبح تک میں بھی انہی کی طرح ایک عام شہری تھا۔“

”یہ دستار اور مجتہ آپ نے کراتے پر حاصل کئے ہیں؟ میں سُکرایا۔“

”نہیں۔“ وہ بھی سُکرایا۔ ”صرف پانچ برس کی مشقت اور یہ مفت میں مل جاتے ہیں... میں روم کی ایک خانقاہ میں اتنے برس مذہبی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ کل دوپہر دہان میں ہم پاس آؤٹ ہوتے اور عزت آف پوپ نے ہمیں باقاعدہ پادری ہونے کی سند عطا فرمائی اور مجھے پوپ کی دست بوسی کا شرف حاصل ہوا...“

”فلارنس میں آپ کیا کر رہے ہیں، یہاں کوئی گرجا وغیرہ سنبھالنے کا ارادہ ہے؟“

”میری یہ قیمت کہاں...“ وہ آزدہ ہو کر بولا۔ ”یہاں تو صرف سینئر پادری آتے ہیں یا جن کی سفارش ہو... میں تو ابھی نووارد ہوں۔ کسی غربت زدہ گاؤں میں بھیجا جاؤں گا۔ اور فلارنس میں کیا کر رہا ہوں، میں نے سوچا روحانیت کی زندگی کا آغاز اس شہر کے عالیشان کلیساؤں کو دیکھ کر کروں... آج صبح سے اُٹھ تو دیکھ چکا ہوں تم بھی ضرور دیکھنا اور ہاں پٹی پلیس کے قریب ایک ایرکنڈیشنڈ قبرستان بھی دیکھا۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”آپ یقین کہیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں دوں۔“

”کامیڈی“ کو ڈیو این کہا گیا۔ ”میکل انجلو“ انسان کے ہاتھ مصوری نہیں کرتے،  
 میں کا ذہن برش چلاتا ہے۔“ پتھر میں پوشیدہ مجسمے کو دیکھ لینے والا بت تراش ...  
 علم سیاست کا ولی مکا دلی جس کی ”دی پرسن“ نئی سیاست کی بائبل ٹھہری ...  
 بامارڈ ڈی وینچی کی مونا لیزا جو مسکراتے مسکراتے دنیا کی سب تصویروں پر حاوی  
 ہوئی۔ بکاشیو اور پترارچ نے ادب کے نئے رجحانات کو تقویت دی۔

ہینی بال جو افریقہ سے چل کر کوہ الپس کو عبور کر کے اپنے پیارے ہاتھیوں سمیت  
 دھرتی نکلا تھا، دریائے آرنو کے کنارے بسنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ جنگ  
 کی بجائے فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ فلائس کے رہنے والے اب بھی بنیادی طور پر  
 آرٹ ہیں۔ زندگی کرنے کا فن جانتے ہیں اور خوبصورت زندگی اور دانش الگ الگ  
 فائن میں نہیں بانٹتے۔ رسیوران کا ویر بھی اپنے ہم شہر دانٹے کے حوالے سے بات کرتا  
 ہے جبکہ سپیر کے گاؤں سٹریٹفورڈ میں شراب خانے تو اُس کے ڈراموں کے نام پر  
 ملتے ہیں مگر ان میں مخمور ہوتی ہوتی مخلوق کو اُس کی تحریروں سے آگہی نہیں ہوتی فلائس  
 کا باشندہ بجا طور پر کہتا ہے کہ میں کبھی بھی ڈومو کے نظارے سے جدا نہیں ہو سکتا اور  
 اگر ایسا ہوتا تو سمجھو کہ میں زندہ نہ رہا۔

ستانے کے بعد میں خیمے سے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ ڈومو کے پہلو میں کھڑے  
 بڑھیا پر چند کمرے زرد ہو رہی تھیں اور آرنو کے پُل پانیوں پر کسی پُریچ لیس کی  
 لڑکا ٹھہرے ہوئے تھے۔ گھاس میں شام کی تر اور سبز مہک تھی۔ فلائس کا نازک جال  
 بڑے سامنے تھا۔ بادیا، وکیو اور گیوٹو کے چوکور مینار، خزاں رسیدہ رنگوں کی گلیاں  
 فیری گیلری کی محرابیں، لپو تو وکیو کا ڈھکا ہوا پُل اور آرنو... اور میرا خیمہ... اور  
 بڑھیا اور ہوا... اور میں... اور میں آزاد تھا... سانس لے رہا تھا... مجھے  
 زانوس ہوا جیسے میں اب بھی افغانستان کی اُسی پُرشور بلندی پر اکیلا بیٹھا ہوا ہوں

فلائس کا باشندہ کہتا ہے۔ ”میں کبھی بھی ڈومو کے نظارے سے جدا نہیں ہوں  
 اور اگر ایسا ہوتا تو سمجھو کہ میں زندہ نہ رہا۔“

اور ڈومو ہے کیا؟ ڈوم... دینے ساں کلیسا کا عظیم گنبد جو شہر کے دیان  
 میں ایک موٹے اور کامل پادری کی طرح توند نکالے لیٹا ہے۔

فلائس پتھر کا بنا کہ اس کے باسی سینکڑوں برسوں سے نواحی تسکن پہاڑوں  
 سے پتھر کاٹ کاٹ کر لاتے رہے اور ان سے حفاظتی دیواریں، قلعے، کلیسا بنائے اور  
 بناتے رہے۔ پتیرا سر نیل یعنی گدا پتھر جسے تسکن اس طرح ہاتھ لگاتا ہے جیسے عاشق  
 محبوب کے گداز بدن کو چھوتا ہے اور اُسی طور موم کر لیتا ہے۔ فلائس والے کہتے ہیں  
 کہ اگر تم پتھر کو اس طرح مارو جس طرح جاہل کسان بیل کو مارتا ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ ان  
 اُس سے پیار کر دو تو وہ تمہیں غذا بنا دے گا، تم تخلیق پر قادر ہو جاؤ گے۔

فلائس کو پہلی صدی قبل مسیح میں رومنوں نے آباد کیا مگر بقیہ یورپ کی طرح  
 دریائے آرنو اور تسکن پہاڑوں کے درمیان واقع یہ قصبہ بھی ایک ہزار برس تک  
 جہالت کی تاریک رات میں سوتا رہا۔ اس دوران معدودے چند انسان ذہن کے تغافل  
 میں نیند کے عالم میں چلتے رہے مگر عام طور پر روم اور یونان کے علوم تو اہم پرستی اور مذہبی  
 تنگ نظری میں گم ہو گئے۔ راہبوں نے ہمیشہ اگلے جہان کی باتیں کیں اور اس جہان کو  
 بھول گئے اور پھر ہمیں سے، فلائس کے پتھر دل سے آواز آئی۔ ”زندگی کو اس جہان  
 میں بھی خوبصورت طریقے سے بسر کرو۔“

تب تسکن کی ان پہاڑیوں میں سے ایسے ایسے جینتیں اُٹھیں جنہوں نے آج کے  
 جدید انسان کے ذہنی سانچوں کو ڈھالا اور یورپ میں تہذیب کا اولین سنگ بنادیا۔  
 ... گلیلیو میں نے زمینوں کی اشیاء چھو کر اپنی آنکھیں آسمان پر لگا دیں۔ اُس نے  
 کاٹخ آسمانوں کی طرف موڑا اور مذہبی جہالت کے پاگل پن کا شکار ہونے کے باوجود  
 انسان کو کائنات کے قریب لے گیا۔ دانتے انہار کی ان بلندیوں تک پہنچا جہاں

نی میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی تو بارش نے آنکھوں کو بند کر دیا میں سر جھکاتے  
پانی کی خشک لکیریں بدن پر ریگتے ہوئے محسوس کرتا آرنو کے پار آیا۔  
ہستہ آہستہ پہاڑی سڑک پر چلنے لگا۔ کیمپنگ ٹک پہنچتے پہنچتے میں اس طور شرابور  
ہو گیا تھا جیسے آرنو کا نصف پانی اٹھا لیا ہوں۔ خیمہ نیم تاریکی میں بھیگ رہا تھا گلوں  
میں کی عافیت کے خیال نے میرے ٹھٹھرتے بدن کو ایک گھنی گرماہٹ کا احساس  
دیا۔ اگر میں اسی طرح پھرتا ہوا کپڑے کے اس گھر میں داخل ہوتا تو باہر اور اندر کا  
رہنم ایک ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے چپکے ہوئے کپڑوں کو اپنے آپ سے علیحدہ  
بادر پھر خیمے میں داخل ہو کر تولیے سے بدن پونچھنے لگا۔

”کیا یہ تم ہو؟“

”ہاں...“ میں ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ یہ ایک نسوانی آواز تھی اور میرے خیمے میں تھی۔  
”میں شیلہ ہوں، یاد ہے؟“

”کونسی شیلہ؟“ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ”دیکھنے“ لگا۔

”ہیری اور لنڈا کی دوست... تم ہی نے تو کہا تھا کہ اگر یو تھ ہوٹل میں جگہ نہ ملے  
تو...“

ادہ خدایا، اس لڑکی نے ایک نیم مزاحیہ فقرے کو سنجیدگی سے لے لیا تھا اور اب  
بزرگ مقرر خیمے میں تھی... جہاں صرف ایک فرد بخوبی لیٹ دغیرہ سکتا تھا۔

”ہاں کہا تو تھا لیکن وہ تو میں نے... شیلہ بی بی یہاں تو...“

”مجھے انوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا ہے مگر پورے فلائرس میں سولتے  
ٹکے ہوٹلوں کے کوئی بھی کرہ خالی نہیں ہے... میں شام کو ہی یہاں آگئی تھی خیمے  
میں بیٹھی تھا نا انتظار کرتی رہی مگر پھر بارش شروع ہو گئی...“

اس گفتگو کے دوران میں نے کمال عجالت سے اپنے آپ کو قدرے ملبوس کر لیا۔  
”اتنی وسیع کیمپنگ سائٹ میں میرا خیمہ تم نے کیسے تلاش کر لیا؟“

اور میرے سامنے فلائرس نہیں پُرسیت صحرا اور دیرانے اور خاردار جھاڑیاں ہیں۔  
کلیسا کا گنبد ایک عظیم بگولا ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ آرنو کے پانی سراب ہیں میرے اس  
پاس سیاہوں کے خیمے نہیں، بے چین بگولے ہیں جو پل بھر کے لئے رُکے ہیں اہم  
پھر رواں ہو جائیں گے... میں آزاد ہوں۔

میں کپڑے بدل کر کیمپنگ سے باہر آنے لگا تو منیر کہنے لگا: ”آپ مایوس ہوں گے  
سنیو، رات کو فلائرس ایک مردہ شہر ہے۔“

شہر کی گلیاں واقعی سنسان تھیں مگر پلازا سانوریا میں چند قہوہ خانے کھلے تھے۔  
پلازا اوکیو میں بھی صرف کبوتروں کے پردوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی جو میڈیوئل  
کی منڈیروں میں روپوش تھے۔ البتہ دانستے کا مجسمہ گدھ کی رفاقت سے محروم ہو چکا تھا۔  
بڑے چوکوں سے ہٹ کر فلائرس کی پرانی پتھریلی گلیاں تھیں اور ان میں سے ایک میں  
میں نے دانستے کا گھر دیکھا... پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے تعمیر کردہ، سُرخ جھکی ہوئی تختوں  
والا ایک قلعہ نما گھر... دروازے پر کھلنے اور بند ہونے کے اوقات درج تھے اور  
بہت دیر سے آیا تھا۔

واپسی پر ملکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بجلی کی چمک گلیوں کے پتھروں پر پڑتی تو  
جیسے چھتاق کا ایک شہزادہ، چمکا اور بچھ گیا۔ آرنو کے کنارے پر واقع بس سٹاپ پہنچتے  
پہنچتے تیز بارش آسمان سے جھکنے لگی۔ دریا کے کنارے حفاظتی دیوار پر چند نہایت  
خوش لباس فلائرسی بیٹھے تھے اور بارش کے باوجود پانی میں ڈوبیاں ڈالے پھیلوں  
کے انتظار میں تھے۔ چونکہ بس سٹاپ پر کسی قسم کا شیڈ ناپید تھا اس لئے میں کھلی جگہ پر  
بھیگنے کی بجائے سڑک کے پار ایک دکان کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ یہاں سے کیمپنگ  
مائیکل انجلو نظر آرہی تھی مگر میرا خیمہ پہاڑی کی اوٹ میں چھپا بیٹھا تھا، بلند ڈھلوان پر  
کچھ دیر بعد سٹاپ پر ایک بس رُکی۔ میں اپنی پناہ گاہ سے نکل کر سڑک پار کرنے لگا تو  
ٹریفک شروع ہو گئی۔ جتنی دیر میں کاروں کا سلسلہ ختم ہوا بس جا چکی تھی اور یہ آخری



وہ ہنسی ”مشکل نہ تھا، تم یہاں واحد پاکستانی ہو... بلکہ تمہارے قریب ہی انگریز لوگوں کا ایک گروپ ٹھہرا ہوا ہے۔ اُن سے تمہارا پوچھا تو کہنے لگے کہ اگر رات ہی بسر کرنی ہے تو ہمارا خیمہ اُس پاکستانی سے زیادہ بڑا ہے... بھنگے کہیں کے۔“

میں نے سگریٹ منگوانے کے لئے ماچس جلوائی تو خیمے میں روشنی کا ایک گولہ سامنے بڑھ گیا۔ شیلابی بی میرے سیلینگ بیگ میں مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بھڑورے بال خیمے کے کم از کم چوتھائی حصے میں بکھرے نظر آتے۔

”میرا خیال ہے کہ میں باہر سو جاتا ہوں“

”باہر تو بارش ہو رہی ہے“

ہاں باہر تو بارش ہو رہی تھی۔

کچھ اٹالوی اور بہت کچھ فلارنسی ہو جاتا ہوں۔ بہر حال اس بے جواز میر سپاٹے فلارنس نے مجھ سے بہت کچھ کہا، مثلاً...

ایک ادھیڑ عمر امریکی خاتون پلازا سینورا میں نصب ایک برہمن دیوتا کے مجسمے کو سامنے کیے چل جا رہی تھی۔ اُس کے چونگم چباتے، جمائیاں لیتے بڑھے کھوسٹ خاندانے ننگے پوچھا۔ ”آخر تم اتنی دیر سے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”بٹھیا بولی“ ڈارلنگ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میں کون کون سی کمی تھی اور کہاں...

ایک فلارنسی کلنک سے نکلتے ہوئے اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”قدرت شفا دیتی ہے اور ڈاکٹر اُس کے پیسے وصول کر لیتے ہیں۔“

ویاکیوری کے ایک تھوہ خانے میں کھانے کے ہمراہ مجھے دو گلاس دودھ پلاتے ہوئے ایک ویٹرس دیکھتی ہے اور کہتی ہے ”کیا تم آج اپنی پانچویں سالگرہ منا رہے ہو؟“

ویاڈی نیری میں سے گزر رہا تھا تو ایک فلارنسی سڑک کے پتھروں کے بیچ میں بڑبڑاتی ہوئی ایک ننھی مٹی کو پل کو بڑے اہتمام سے پانی دے رہا تھا۔ میں کھڑا ہو کر لگے لگے ”میں جانا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا چیز جنم لے رہی ہے... زندگی۔“

اُن کے کنارے ایک نوجوان ہنسی ڈور پانی میں ڈالے اُدنگھ رہا تھا۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے اُس پر کنگرہ پھینکا اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

”کیوں ہنستی ہو؟“ نوجوان نے جھلا کر پوچھا۔

”اگر تم یہاں دھیل مچلی کے انتظار میں بیٹھے ہو تو وہ آرنو میں نہیں ہوتیں۔“ لڑکی روتے لگائی۔

”اچھا۔“ اُس نے کمال سنجیدگی سے سر ہلایا اور ہنسی ڈور اٹھا کر چپکے سے چلا گیا۔

فلارنس مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ چنانچہ تیسرے روز میں نے بڑے اہتمام سے کھانا، سیاحوں کی وردی یعنی جین جیکٹ زیب تن کی اور بغل میں کتابچے اور

اگلے دو روز میں نے جان بوجھ کر ایک سیاح کا لبادہ اتارا اور ایک بے فکرے طالان نکلتے کی طرح شہر فلارنس میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ نہ ہاتھوں میں کتابچے اور نقشے لے کر فلاں علقہ کدھر ہے، فلاں میوزیم کتنے بجے بند ہو جاتا ہے اور اس برہمن خاتون کا ختم کس نے بنایا تھا اور کس طرح بنایا تھا اور ان دنوں یہ خاتون کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ بلکہ ایسی مصروفیات میں مگن دوسرے سیاحوں کو ایک احساس برتری کے ساتھ دیکھتا ہوا ہاتھ لٹکانا گھومتا رہا۔ اگر پلازا گیروانی میں کوئی قہوہ خانہ پسند آیا تو پوری دوپہر میں اُدنگھے گزاردی۔ کبھی پلازا دیکھو کے سٹالوں پر پنک چڑھی اٹالوی لڑکیوں سے خواہ مخواہ عبادتاً ذکر کرتے رہے اور کبھی آرنو کے کنارے مچھلیاں پکڑتے کسی صاحب کے ساتھ گپ لگاتی... اس ننھی زندگی نے مجھے بے حد تروتازہ اور مسخرہ سا بنا دیا۔ میں ایک حجاج نا ہیٹ پہنے راہ چلتے لوگوں کی طرف دیکھ کر بلاوجہ مسکراتا رہتا۔ ہانپتے ہوئے سیاحوں، پھبتیاں کستا اور نیم تار ایک کونوں میں کھسکے ہوئے جوتوں کو ”آپ کو گرتا کیا جاتا ہے کہہ کر خواہ مخواہ خوفزدہ کر دیتا... تیسرے روز مجھے احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہوئی جا رہی ہے

اور نقشے دبا کر ایک شریف النسل ٹورسٹ کی طرح اطالیہ کے تاریخی شہر فلورنس میں گھومنے لگا۔

”تین سو لیرے...“ نیشنل میوزیم کے باوردی دربان نے ٹکٹ کاٹنے سے پیشتر فیس داخلہ سنائی۔

میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی مجھے درجن بھر آرٹ گیلریوں اور دیگر قابل دید مقامات کی خاک چھانا تھی اور اگر ہر مقام پر خانہ بدوش خزانے پر یونہی بوجھ پڑتا رہا تو فلٹ زر کا شدید خدشہ تھا... میں پھر آگے بڑھا، سودے بازی کی جانے۔

”تین سو لیرے کچھ بہت سارے نہیں ہیں؟“  
”اندر تصویریں اور مجسمے بھی تو بہت سارے ہیں۔“ دربان یوں بے رنج سے بولا جیسے در محبوب پر کھڑا ہو۔

دو ٹورسٹ لڑکیاں جو میرے سامنے ٹکٹ خرید کر اندر گئی تھیں، جلد ہی باہر آ گئیں۔

”کیا اندر جو کچھ ہے وہ تین سو لیرے کا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”تین لیرے کا بھی نہیں۔“ وہ متوجہ ہوتے بغیر چلی گئیں۔

میں نے بال پوائنٹ سے سیاحتی کتابچے میں درج نیشنل میوزیم کے آگے کلاس لگا دیا... دیکھ لیا۔ اب ”اکیڈمی“ کی باری تھی جہاں مائیکل انجلو کے تراشیدہ اور نیم تراشیدہ مجسمے محفوظ تھے... اور ہاں ڈیوڈ بھی تو تھا۔

”اکیڈمی“ کی عمارت کا آغاز پلازا بیلے آر تی سے ہوا، پلازا مارکوٹک چلی گئی اور وہاں سے دائیں ہاتھ مڑ کر پلازا انونزی آمانک پہنچ گئی مگر داخلہ کارڈ واہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں پھر اپنے نقش پا کو گہرا کرتا واپس پلازا بیلے آتی میں... مگر داخلے کی کوئی صورت نظر نہ آئی البتہ نیشنل میوزیم کے باہر نظر آنے والی دونوں

مرد تین پھر نظر آ گئیں۔

”ان میں سے ایک جو تدرے زیادہ بیزار تھی میرے پاس آگئی۔“ ہو سکتا ہے باتے ہوں کہ اکیڈمی کے اندر جانے کا راستہ کہاں پر واقع ہے...“  
”میرا خیال ہے اندر صرف دیوار پھیلانگ کر ہی جایا جاسکتا ہے...“ میں نے بھی بے بیزاری سے جواب دیا۔

”ادہ... دوسری جو صرف نیم بیزار تھی بولی۔“ آپ کو بھی نہیں مل رہا؟  
”نہیں...“  
”تو پھر مل کر تلاش کریں۔“

ہم پانی پیتے بنگلوں کی طرح منہ نیچے کر کے نقشے پر گلی یا چوک کا نام دیکھتے تو پھر اٹھا کر اسے تلاش کرتے، اور یہ کرتے کرتے گردنیں ہلاتے پلازا مارکوٹک میں پہنچ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ”اکیڈمی“ کو بھول کر کسی فضول سے شروع کر گئیں تو دوبارہ تلاش شروع کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا...“  
”بیزار تھی تھکی سی بولی۔

”مثلاً کونسے فضول ہو جنوع پر؟“  
”مثلاً یہ کہ تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟“  
میں نے مختصر اپنی عمر، نام اور قومیت کے کوائف پیش کئے۔

”میں دینٹھی ہوں۔“ نیم بیزار بولی ”اور یہ میری دوست جینیفر ہے اور ہم دونوں بیزار گریزی پڑھاتی ہیں... اور کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہم امریکی ہیں...“  
”ہاں ہے، کیونکہ میں نے آج تک اتنی بیزار امریکی لڑکیاں نہیں دیکھیں...“

اس فقرے پر مکمل بیزار نیم بیزار میں بدل گئی اور نیم بیزار تدرے خوشگوار ہو گئی۔  
”اُسے صبح سے کتنے عجائب گھر اور آرٹ گیلریاں دیکھی ہیں؟“

”نیشنل میوزیم ہنگا بہت تھا اور اکیڈمی کا دروازہ نہیں مل رہا اس لئے نکل لیا  
ایک بھی نہیں۔“

”ہم اب تک چھ میوزیم اور چار کلیسا دیکھ چکی ہیں... کیا تمہیں اب بھی حیرت  
ہے کہ ہم اتنی بیزار کیوں نظر آتی ہیں؟“

”آپ کو کس حکیم نے کہا تھا کہ اتنے میوزیم اور کلیسا ضرور دیکھیں؟“  
”اس کتابچے نے کہا تھا۔“ وینڈی نے مزید خوشگواہی سے کہا۔ ”اس گائیڈ بک

میں لکھا ہے کہ ان قابل دید مقامات کی دید کے بغیر فلائرس کی سیر نامکمل ہوگی... اور  
اگر ہم مائیکل انجلو کا ڈیوڈ اور دوسرے مجسمے نہ دیکھ سکے تو واقعی یہ سیر نامکمل ہوگی...  
آؤ پھر دروازہ ڈھونڈتے ہیں...“

”ہم پھر پانی میں چوہیں ڈبوئے لنگوں کی طرح اپنے اپنے نقشوں میں ناکیں ڈبو  
ڈبو کر چلنے لگے۔“

سب بلوغت میں قدم رکھنے والی اکثر لڑکیاں قدرے بے ڈھنگی اور بے زادی سی  
ہو جاتی ہیں۔ جینیفر نے مجھے یقین ہے کہ اس سمت میں کئی قدم رکھے ہوں گے مگر کچھ بھی

وہ شکل سے قدرے کچی سی لگتی تھی اور اُس کی سرخ ناک دیکھ کر اُسے رُومال پیش  
کرنے کی خواہش سر اٹھاتی تھی۔ وہ پھیکی پڑتی ہوئی جین اور مختصر بلاؤز میں تھی اور

ہر وقت ایک ہتھیلی پشت پر رکھ کر چلتی تھی... وینڈی عام امریکی لڑکیوں کی نسبت  
چھوٹے قد کی تھی۔ چمڑے کی جیکٹ، سیاہ جین اور سیاہ بالوں میں وہ ایک گول چہرے

والی لڑکی تھی جو حسین تو نہ تھی مگر جسے صنف مخالف کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہرگز  
تردد نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ جیکٹ میں جتنی تھی، اُس سے زیادہ باہر تھی اور بہت تھی۔

جینیفر نے اپنی ہپ پاٹ سے ایک گائیڈ بک نکالی اور صفحے اٹھنے لگی۔ ”نوجوان  
مائیکل انجلو کے استاد نے کہا کہ اگر تم ایک پتھر کاٹنے والے کی بجائے ایک بُت تراش

بننا چاہتے ہو تو سب سے پہلے انسانی بدن کو جانو۔ اُن دنوں علم بدن پر لکھی ہوئی کتابیں

پہننے کے برابر تھیں۔ چنانچہ وہ ایک شب باورچی خانے کی چھری لبادے میں اڑس کر  
بیا سانسو سپرنو کی دیوار بچانڈ کر اُس تہہ خانے میں چلا گیا جہاں گدا گروں کی لاشیں  
بچی ہوئی تھیں...“

”لاشیں؟ وینڈی نے تھوک نکلے۔  
”ہاں، اور اُس نے تازہ ترین لاش کو چھری سے چاک کیا اور ایک موم بتی کی

ریشی سے خون آلود اندرونی اعضاء کا مطالعہ کرنے لگا...“  
”پلے جینیفر میرا دل اُلٹ رہا ہے۔“ وینڈی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُبھائی کو روکا۔

مگر جینیفر کہاں ماننے والی تھی، اُستانی تھی، لیکچر جاری رکھا۔ ”مائیکل انجلو ہر رات  
ساتھ سپرنو میں چوری چھپے داخل ہوتا اور علم بدن کا ایک اور باب ذہن نشین کر کے

بوت کی بڑا اپنے پیرا میں لئے گھر واپس آجاتا اور کاغذ پر انسانی رگوں، ہنسون اور تیرناؤں  
کی تصویریں بنا کر اُسے محفوظ کر لیتا۔ ایک شب اُس کے والد نے اُسے خون آلود کپڑوں

اور چھری سمیت گھر لوٹتے دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ نوجوان مائیکل کسی کو قتل کر کے  
آیا ہے... اُدھر شہر میں دھوم مچ گئی کہ کوئی شخص گدا گروں کی لاشیں بچا کر پتہ

نہیں کیا کرتا ہے...“  
”کیا مائیکل انجلو کے بارے میں کوئی خوشگوار قسم کی معلومات نہیں ہیں اس گائیڈ بک

میں؟“ وینڈی نے تنگ آ کر پوچھا۔  
”میں تو صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ بے چارے مائیکل نے علم بدن کس مصیبت سے

دھکیل لیا...“  
حالانکہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک اور آسان طریقہ بھی تھا... میں نے قہر دیا۔

”وہ بُت تراش تھا، کا سا نووا نہیں۔“ جینیفر نے سرخ ناک چڑھائی اور کیا حیرت ناک  
نہیں کہ اُس نے اپنے مشہور مجسمے ”پائسا“ یعنی سوگواہی میں حضرت عیسیٰ کے چہرے

کٹائے ایک نوجوان یہودی کو ماڈل بنایا تھا؟“

”میں نے پاتا دیکھا تھا۔ روم میں سینٹ پیٹرک کے آسمانی گنبد تلے چھاتی تم آریک میں ایک ماں... بی بی مریم، اپنے بیٹے... عیسے کی لاش کھٹنوں پر بچھائے سر جھکانے سوگوار۔ بے جان بازو لٹکے ہوئے اور عالم فنا کی تمام آخرت رگوں اور جسم میں ٹھہری ہوئی۔ بی بی مریم کے سینے پر اٹھالوی زبان میں ایک عبارت کندہ تھی۔

پیٹرک توحی نے بتایا کہ مائیکل انجلو نے ایک گناہ تخلیق کار کی حیثیت میں ”پاتا“ کو دو برس کے عرصے میں تراشا اور پھر ایک رات چپکے سے سینٹ پیٹرک کے ہال میں رکھ دیا۔ اگلی صبح اس شاہکار کی سوگوار نے زائرین کو اپنی طرف بلایا۔ وہ کہتے ہیں یہ تو روم کے فلاں مجتہد ساز کی تخلیق لگتا ہے، یہ تو دینس کے فلاں بت تراش کا ہاتھ ہے۔ ایک ستون کے پیچھے پوشیدہ مائیکل انجلو پیچ و تاب کھاتا رہا اور سارا دن لوگ اُس کے مجتہد کو معروف بت تراشوں کی تخلیق قرار دیتے رہے۔ اُس رات اُس نے ہتھوڑا اور چھینی اٹھائے اور اس مکمل مجتہد کے سینے پر یہ الفاظ کھود دیے ”مائیکل انجلو باری تعالیٰ نے تخلیق کیا جو فلاں کا باشندہ ہے“... اور وہ اس قسم کی حرکتیں بعد میں بھی کرتا رہا۔ اُس نے پوپ جو لیتس کے مقبرے میں رکھے گئے حضرت موسے کے مجتہد کو بھی ہتھوڑی مار کر کہا تھا ”تم ہی تو مکمل موسے ہو، بولتے کیوں نہیں“ حضرت موسے کے گھسنے پر آج بھی اس ضرب کا نشان موجود ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کی امریکی عورت، کھلے پھولدار فراک میں مٹکتی ہوئی، کیمرو گے میں ہاتھ میں گاڈ ٹیک اور آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک، ہمیں جھٹکتے ہوئے دیکھ کر سیدھی ہماری طرف آئی۔ ”کیا تم ڈیوڈ کو ڈھونڈ رہے ہو؟“

”کو نسا ڈیوڈ؟“ ہم نے سمجھا مائی کسی گم شدہ بچے کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ ”وہی مائیکل انجلو والا“ اُس نے بے پناہ مسرت سے اپنی پوری نقلی سیسی ہمیں دکھائی۔ ”ہاں“ ہم نے فوراً سر ہلاتے۔

”تو اس برآمدے میں چلے جاؤ، دائیں طرف مڑو گے تو وہاں داغے کا دروازہ ہے۔“

”ہم تو اس برآمدے کے قریب سے دیوڑیوں مرتبہ گزر چکے ہیں...“

”اندر جاؤ ناں... ڈیوڈ ابھی وہیں کھڑا ہے۔“

”ہم ”ایڈمی“ کے اندر داخل ہوئے تو ڈیوڈ واقعی وہیں کھڑا تھا بلکہ پھیلے کئی سو یوں سے وہیں کھڑا تھا۔

ڈیوڈ کو دیکھنے کے لئے دستار تھا منی پڑتی ہے۔ وہ مجتہدوں کا اہرام تھا۔ اُس کا سر ہر طرف پوش کوہ آوارات کی پہلی جھلک تھا۔ سر بلند، سفید اور آپ پر چھاتا ہوا، پٹ میں لیتا ہوا، لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ نہ تو اُس کی تخلیق میں لاکھوں غلاموں نے پسینے تھے اور نہ ہی وہ قدرت کا ایک منظر تھا... اُسے صرف ایک انسان مائیکل انجلو نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا... میں نے ڈیوڈ کو اُن مناظر میں شامل کر لیا جو صرف مجھ ایسے خانہ بدوشوں کے لئے ہی تخلیق کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر خدا کی جانب سے اور ایک بار مائیکل انجلو کی طرف سے۔

اُن دنوں مصوڈ لیونا رڈو ڈی ونچی فلاںس کے ایک تاجر گیا کاندو کی چوبیس سالہ بیٹی کی تصویر بنا رہا تھا جو لنگر میں اُس کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی، مونا لیزا۔ ایک دہائی کے دوران اُس نے مائیکل انجلو کو حقارت سے کہا ”بت تراش تو پتھر کاٹنے والے ہوتے ہیں۔ یہ ایک مشقتی سا کام ہے، تخلیقی نہیں“ مائیکل انجلو نے سوچا ایک روز میں ڈی ونچی کو یہی الفاظ واپس لینے پر مجبور کر دوں گا... اُس نے دو ہزار ہزاروں سنگ مرمر کا ایک تودہ منتخب کیا اور اُس میں سے ڈیوڈ کو نکالنے کے لئے لکھ لکھتے روزانہ کام کرنے لگا۔ وہ ستائیس برس کا تھا، ڈیوڈ مکمل ہوا تو وہ تیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس عظیم الشان مجتہد کو ایک پلیٹ فارم پر رستوں سے باندھ کر مائیکل انجلو کے گھر سے پلازا سینورا تک لانے میں چار دن لگے۔ اہل فلاںس نے اسے ہڈوں کے مجتہد سے بھی عظیم قرار دیا اور لیونا رڈو ڈی ونچی نے بھی گردن جھکا لی۔ ایک خانہ جنگی کے دوران ڈیوڈ کا بایاں بازو ٹوٹ گیا اور پھر اسے اس ”ایڈمی“

میں محفوظ کر لیا گیا۔

ہم سب سنگ مرمر کے اس دیو زاد مجسمے کے گرد گھومتے ہوئے گردنیں اٹھائے اس کی کشش کو محسوس کرتے رہے۔ اتنا زندہ اور دھڑکتی ہوئی رگوں والا تاجہم  
”اس کے بازو عام انسانوں سے زیادہ لمبے نہیں ہیں؟ جینفر منہ اٹھائے کولوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”تمہیں کسی اور حصے کی لمبائی پر بھی اعتراض ہو تو وہ بھی بتا دو“ وینڈی پڑکھائی۔  
”مائیکل انجلو نے جان بوجھ کر بازو لمبے بنائے تھے کیونکہ ڈیوڈ کی تمام تر طاقت اُس کے بازوؤں میں تھی۔ گو لاتھ کو یونی تو زیر نہیں کر لیا تھا اُس نے۔“

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ”ڈیوڈ“ تو دراصل اپنے حضرت داؤد ہیں۔

”اکیڈمی“ میں اکلوتا ڈیوڈ ہی نہیں تھا اور مجسمے بھی تھے مگر وہ سب ڈیوڈ سے بڑے

میں پینتالیس برس بڑے تھے... مائیکل انجلو بڑھا ہوا تھا تو اندھا بھی ہو گیا مگر پتھروں

سے جُدا نہ ہوا۔ اُس کا کہنا تھا کہ جب میں سنگ مرمر پر داد کرتا ہوں اور اُس میں سے

اُٹھنے والی سفید دھول میرے منھوں میں جاتی ہے تب میں سانس لیتا ہوں۔ آخری

عمر میں وہ ایک اور ”پانتا“ بنانا چاہتا تھا... ایک مجسمہ میری میکلڈالن کا ہے جس نے

حضرت عیسیٰ کے ہاتھ پر گناہوں سے توبہ کر کے معصومیت اختیار کی۔ وہ اپنے پیغمبر

کو سولی سے اتار رہی ہے۔ یوسف پاس کھڑا ہے اور مائیکل انجلو نے یوسف کے آپ

میں اپنی شباب ترائشی ہے۔ عمر رسیدہ اور اندھا۔ اُس کا آخری مجسمہ ”قیدی“ بھی

یہیں رکھا ہوا ہے۔ ایک زور آور جسم پتھر میں سے نکلنے کی کوشش میں۔ کوشش

اس لئے کہ اس سے پیشتر کہ مجسمہ پتھر کی گرفت سے آزاد ہوتا، مائیکل انجلو توبے برس

کی عمر میں خود زندگی سے آزاد ہو گیا... ”قیدی“ اُسی طرح ادھور پڑا ہے۔ کہتے ہیں

کہ حضرت عیسیٰ کو سولی سے اتارنے والے مجسمے کو ایک روز مائیکل انجلو نے ٹوٹا تو

اُس کی کھردری تراش پر آبدیدہ ہو کر ہتھوڑا ہاتھ میں پکڑ لیا کہ میں اسے توڑ ڈالوں گا

اپی فلائس نے اُس کے بازو تھام لئے... یہ مجسمے اُس کی اندھی بے بسی کا آخری

نقش ہیں۔

ہم اکیڈمی سے باہر آئے تو سر جھکا کر چل رہے تھے، ڈیوڈ کو دیکھ دیکھ کر ہماری

گردنیں تھک چکی تھیں اس لئے۔

”مائیکل انجلو کے مجسموں کے بعد اُس کے گھر جانا چاہیے“ وینڈی نے گاڈ بگ کی

ہدایت پڑھی۔

”کیا اُس نے تمہیں بلایا ہے؟“ جینفر نیم بیزاری نے پہلی مرتبہ مسکرا کر پوچھا۔

”ہن بلائے کسی مرد کے گھر چلے جانا خلاف آداب ہے۔“

وینڈی گاڈ بگ کے مطالعے میں مگن تھی چونکہ کمر بولی۔ ”مجھے پیدا ہونے میں ساڑھے

چار سو برس کی تاخیر ہو گئی ہے ورنہ وہ مجھے بلایا لیتا۔“

مجھے فوراً احساس ہوا کہ ہماری رفاقت صرف ”اکیڈمی“ ڈھونڈنے کی خاطر قائم

ہوئی تھی اور اب میں بھی بن بلائے اُن کے ساتھ تھی ہوا چلا جا رہا تھا۔ خواتین کی سیانے

نے کہا تھا کہ دشمن رفاقت بہتے ہیں اور تمیسر آجائے تو پھر جو ہم بن جاتا ہے...“

جینفر نے پشت پر جھے ہاتھ کو بے دھیانی میں مٹایا اور کہنے لگی۔ ”تو میں چلی جاتی

ہوں... صاف ظاہر تھا کہ ایک مرد کی موجودگی میں خاموشی کے باوجود لڑکیوں کے

درمیان جو ایک مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے کہ یہ حضرت کیسے ہیں، اگر پسند میں تو بے شک

لے جاؤ یا پھر میں آگے ہو جاتی ہوں میں جینفر نے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور

مجھے خوشی وینڈی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

”اوہ جینفر...“ وینڈی کی نظریں اُس کی پشت پر تھیں۔

”اوہ سوری...“ جینفر کا ہاتھ پھر سے پشت پر جم گیا۔

”ویسے اگر تمہیں کوئی اور مصروفیت نہیں ہے تو بے شک ہمارے ساتھ ساتھ چلے

اؤ...“ وینڈی نے سنجیدگی سے مجھے دعوت دی۔ ”ہم اکیلی ہوتی ہیں تو کوئی نہ کوئی

فلارنسی لفنگا ہمارے گرد منڈلاتا رہتا ہے، تم کم از کم اُن سے تو بہتر ہو۔“

”بہت بہت شکریہ میڈم۔“ میں نے جھجک کر کہا۔ ”آپ بے حد توصیفی موڈ میں ہیں۔“

”اکیڈمی“ کی طرح مائیکل انجلو کا گھر تلاش کرنے میں بھی خاصی دقت پیش آئی۔  
وہ بونورا رتی میں جس کسی سے پوچھتے کہ جناب یہاں مائیکل انجلو کا گھر کدھر ہے تو وہ  
کندھے سکیر کر پوچھتا۔ ”آہ... بونیٹو؟“ ہم کہتے کہ بھئی بونیٹو نہیں چاہیے، مائیکل انجلو  
چاہیے۔ یہ مشکل بھی ایک اور امر کی ٹورسٹ نے حل کی۔ معلوم ہوا کہ اہل فلارنس نکال پھرو  
کو صرف بونیٹو کے نام سے پکارتے ہیں اور اُس کا گھر ”کاسا ڈی بونیٹو“ کہلاتا ہے۔  
دروازے کے عین اوپر مائیکل انجلو کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا گھر قدیم وضع  
کا تھا مگر پانچ سو سال پرانا ہرگز نہ لگتا تھا، باہر ایک سکوٹر کھڑا تھا۔

”وہ اندر ہی ہے۔“ وینڈی مہنسی۔ ”باہر سکوٹر جو کھڑا ہے۔“

گھر کا دروازہ مقفل تھا، داخلے کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔

”اب کس کے گھر جانا ہے؟“

”دانستے کے۔“ جینیفر بولی۔

”اور وہ کہاں رہتا ہے؟“

”وہاں دانستے ال میں۔“

میں پچھلی شب یہاں آچکا تھا مگر تب صرف ویرانی تھی اور اب صرف ٹورسٹ  
تھے۔ فلارنس کی دیگر رہائش گاہوں کی طرح پتھروں سے بنا ہوا ایک قدیم گھر جس میں  
متعدد گیلیریاں تھیں اور بے شمار ٹورسٹ تھے۔ اطالوی ادب کے باوا آدم دانستے  
کے مسودے شوکیسوں میں محفوظ تھے جن میں ”ڈیوائن کامیڈی“ کے اوراق بھی تھے۔  
باہر جانے لگے تو دروازے کے ساتھ میز پر سیج اور کتا ہیں سجائے ایک شریف  
قسم کا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا، ہمیں دیکھ کر چپکنا ہو گیا۔ ”کیا آپ دانستے کے گھر کا سیج خریدنا  
پسند کریں گے؟“

”کتنے کا ہے؟“ جینیفر کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی۔

”سات سو لیرے کا...“ بوڑھا بولا۔ جینیفر ٹھنڈی ہو گئی۔

”دانستے کے گھر کا ہے...“ اُس نے ہم تینوں میں سے صرف جینیفر کو مخاطب کرنا

مناسب جانا۔

”قیمت بہت زیادہ ہے۔“

”کم بھی ہو سکتی ہے۔“ بوڑھا جینیفر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ ”بلکہ مفت بھی مل سکتا

ہے، سات بجے آ جانا۔“

”لیکن سات بجے تو یہ گھر بند ہو جاتا ہے۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں...“ بوڑھے کی کمر سیٹی ہو گئی۔ ”میں یہیں ہوں گا،

فلوٹ رہے گی۔“

جینیفر نے زیر لب ”ڈرٹی اولڈ مین“ کے الفاظ کہے۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

بوڑھا کتا گھر دل جو ان رکھتا تھا۔

”کیا کہا؟“ اُس نے اپنے نیم بہرے کان کے آگے ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”جو کچھ بھی کہا ہے اطالوی میں نہیں تھا...“ جینیفر ایک بوڑھے کے مائل ہونے

پر بے مزاج تو ہو رہی تھی مگر لطف بھی لے رہی تھی۔

”اگر اطالوی میں کہتیں تو میں متا رہ جاتا۔“ بوڑھا بلا جھجک فلوٹ کر رہا تھا۔

”اطالوی تو دنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے۔ ایک ہالبرگ بادشاہ نے کہا تھا کہ

وہ خدا سے ہسپانوی زبان میں بات کرتا ہے، مردوں سے فرانسیسی میں، گھوڑوں سے

جرمن میں اور عورتوں سے... اطالوی میں۔“

جینیفر نے پھر زیر لب کچھ کہا۔

”کیا کہا؟“ بوڑھے نے پھر پوچھا۔

”میں نے تم سے جرمن میں بات کی تھی۔“ جینیفر ناک چڑھا کر بولی۔

سونے اور چاندی کی مصنوعات شوکیسوں میں سنہری تیندوے، مچھلیاں اور دریائی  
مڑے سبجے تھے۔ دانتے کی جنت کے ننھے ننھے طلائی فرشتے اور جہنم کے سُرخ زبانوں  
والے شیطان۔ میں نے ایک شیطان کی قیمت دریافت کی تو وہ میرے تمام تر سفری  
بذایات سے بھی تجاوز کرتی تھی۔ شیطان ہمیشہ منگے بکتے ہیں۔

دریا کے پار ایک طویل چڑھائی تھی جس کے آخر میں پٹی پلس کھڑا تھا۔ ہم ہانپتے  
ہوئے وہاں تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرتیں ہو رہی ہیں، بند ہے۔

شام قریب تھی، پونے ویکیو کی دکانوں کا عکس پانی میں منتقل ہونے کو تھا۔  
پٹی پلس کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر وینڈی نے اپنی گاڑی لگا لی۔ اب  
مرن باپستری، ڈومو کا کلیسا اور ادیفیزی آرٹ گیلری باقی رہ گئے ہیں جو ہم کل  
دیکھیں گے۔

”ہم؟“  
”ہاں، کیوں نہیں۔ تم یقیناً ایک اطالوی لفنگے سے بہت بہتر ہو۔“ اُس کی آنکھیں  
رانات کو طول دینے کی خواہش میں تھیں۔

”جینفر بھی آئے گی؟“

”تیسرا شخص ہجوم ہوتا ہے۔“

”چلو میں تمہیں واپس شہر چھوڑ آتا ہوں۔“

”میں شہر میں نہیں، اُدھر کمپنگ میں رہتی ہوں۔“

”کمپنگ مائیکل انجلو میں؟“

”ہاں۔“

”میں بھی تو وہیں ہوں۔“ میں نے ایک حیرتی مسکراہٹ سے کہا۔

”اچھا؟“ اُس کی مسکراہٹ ایدم سمٹ گئی۔ ”لیکن میں ابھی واپس نہیں جانا چاہتی  
مجھے شہر سے ٹوٹھ پیسٹ اور خوراک کے چند ڈبے خریدنا ہیں... کل پلازا اساتوریہ۔“

”آہا... تم میں جس مزاح موجود ہے... بوڑھا ہنسنے لگا۔“ مگر سوچو تو سہی کردانے  
کا گھر اور خلوت... اور میں تم سے اطالوی میں باتیں کروں گا اور بائرن نے کماتے  
کہ اطالوی منہ سے یوں ہستی ہے جیسے کسی حسینہ کے منہ سے بوسے...“

ہم باہر نکلے تو جینفر بے حد اپ سیٹ تھی اور اسی پریشانی میں اُس نے پشت  
پر رکھی، پتیلی مٹالی۔

”جینفر...“ وینڈی نے اُسے فوراً ڈانٹا، مہتملی واپس چلی گئی۔

”ایک لڑکی کو ایک دن میں اور کیا چاہیے...“ جینفر کی مکمل بیزاری لوٹ آئی  
”درجن بھر سیزیم اور ایک بوڑھا عاشق... میں واپس جا رہی ہوں، تم اچھا نا...“  
اس سے پیشتر کہ وینڈی لب کھولتی وہ پاؤں بچختی ہوئی چل دی۔ اُس کا ہاتھ بے  
دھیانی میں پھر نیچے ہو گیا۔

”جینفر...“ وینڈی نے زور سے پکارا مگر وہ اُس کی آواز کی حدود سے نکل چکی تھی۔  
اب وینڈی جھینپتی ہوئی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”بے چاری جینفر، آج صبح اُس  
نے اپنی جین کو ذرا بوسیدہ بنانے کی خاطر پشت پر سے ایک چوکور ٹکڑا کاٹا اور اُس پر  
ایک سُرخ پیچ لگا دیا۔ پلازا اساتوریہ میں پہنچ کر احساس ہوا کہ اطالویوں کا ایک  
ہجوم ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے اور وہ سب مسکرا بھی رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ جینفر  
کا چسپاں کردہ پیچ کہیں گر چکا ہے اور جین کے چوکور سُورخ میں سے تھوڑی سی جینفر  
نظر آ رہی تھی چنانچہ بے چاری صبح سے اُس پر ہاتھ رکھے گھوم رہی تھی۔“

ہم چلتے ہوئے آرنو کے ڈھکے ہوئے پل ”پونٹے ویکیو“ پر آ گئے۔

مائیکل انجلو کے زمانے میں اس پل پر قصابوں کی دکانیں ہو کر تھیں پھر مچھلیوں  
نے پیاز اساتوریہ کا محل چھوڑ کر دریا پار ایک وسیع رہائش گاہ تعمیر کی تو انہیں اس پل  
پر سے گزرتے ہوئے گوشت کی بونا گوار گزرتی چنانچہ ان کے حکم سے قصاب نکالے گئے  
اور یہاں ایسی دکانیں ظہور میں آئیں جن کی مصنوعات صرف امیر لوگوں کو خوشبودی ہیں۔

اطلاوی شہروں کے مرکزی چوکوں کی مانند پلازا سانوریا میں بھی بے شمار کبوتر پر پرچار ہے تھے اور وینڈی ان کے نیم سیاہ غول میں کھڑی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔  
”ہیلو“

”ہیلو...“ اُس نے کبوتروں کو متوجہ کرنے کے لئے ہتھیلی پھیلا رکھی تھی اور سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ ”دیکھو یہ میرے قریب ہی نہیں آتے، میں نے ان کے لئے پچاس پیرے کا دانہ خریدا ہے اور یہ کھاتے ہی نہیں...“

”اگر یہ ہر ٹورسٹ کی ہتھیلی پر بیٹھ کر دانہ چُکنے لگیں تو ایک گھنٹے کے اندر اندر باخورا کی باعث انتقال کر جائیں...“

”ہاں... تم بھی اتنے موٹے اور بھڑے ہو رہے ہیں...“ اُس نے ہتھیلی سمیٹ لی اور اُسی لمحے ایک کبوتر اُس کے کندھے پر آ بیٹھا۔ وینڈی نے وحشت سے کندھا جھٹکا اور کبوتر اڑ گیا۔ ”میں بچوں کو اپنے جسم پر برداشت نہیں کر سکتی...“

”کیا تمہیں اس کی عادت نہیں ہے؟“ میرے لمحے میں بچھپی شب کا شک بولا۔  
”کیا مطلب؟“ اُس نے میرا بازو تھام لیا۔ ”مجھے اس قسم کے فقرے اچھے نہیں لگتے... اور تم بہت دیر سے آئے ہو...“

”اور میرا خیال تھا کہ تم آؤ گی ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ میرا بازو چھوڑ کر سامنے آ گئی۔

”میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کل رات دیکھا تھا۔“

”میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا کافی پتے ہوئے۔“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔  
”اب میرے ساتھ تھا۔“

”اور یہ باب کون ہے؟“

”اؤکھیں بیٹھتے ہیں۔“

کل دانستے کے گھر کے قریب ایک قہوہ خانہ نظر آیا تھا، اُسے تلاش کیا اور اندر چلے

... دس بجے۔“ اور وہ پٹی پولیس سے اُترتی سڑک پر سے اُتری اور پانچویں گم ہو گئی۔

ٹوٹھ پیسٹ وغیرہ تو کمپننگ کے سٹور میں سے بھی دستیاب ہو سکتی تھی میں نے سوچا۔ بہر حال... اور پھر بس نمبر ۱۱ پر سوار ہو کر واپس کمپننگ پہنچ گیا۔ خیمے کے باہر فلائرس اور اُس کے اندر صرف ڈومو کا روشن گنبد۔

رات کا کھانا میں نے کمپننگ کے رستوران میں کھایا اور پھر چند انگریز ٹورسٹوں کے ہمراہ پہاڑی کی چوٹی پر پھیلے پلازا مائیکل انجلو میں چلا گیا جس کے وسط میں ”ڈیوڈ“ کی ایک نقل ایسا دہ تھی۔ یہاں سے فلائرس کا شہر تسکانی کی پہاڑیوں میں گھرا دکھائی دیتا تھا۔ پرے بلندی پر سان منیا تو کلیسا اور نیچے پٹی پولیس کی حفاظتی فصیل کا آئندہ آرنو کے کناروں پر لیٹا ہوا۔ فٹ پاتھ پر پتھریوں نے میکسیکن کھیس بچا کر ان پر اپنی دستکابل سجا رکھی تھیں۔ لوہے کے کنگن، برسلٹ، موتی منکے، ایک جوڑے نے اپنے نورانیہ بچے کو فٹ پاتھ پر لٹا رکھا تھا... چوک میں روشنی کم تھی۔ میں نے ایک مثال سے کافی خریدی اور گتے کے کپ میں سے محسوس ہوتی حدت کو انگلیوں میں سموتا چسکیاں لینے لگا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک طویل قامت باریش نوجوان اور ایک چھوٹے قد کی بھری لڑکی پتھر ملی دیوار پر کُنئیاں لٹائے کھڑے تھے، وہ کبھی سرگوشیاں کرنے لگتے اور پھر کبھی فلائرس کی طرف دیکھتے ہوئے چپ ہو جاتے... کافی ختم کر کے میں واپس کمپننگ کی طرف اُترنے لگا... مجھے یونہی دامہر سا ہوا کہ لڑکی کی پشت وینڈی کی طرح تھی، شاید بال بھی۔ مگر اس دامہر میں مادہ حسد کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ ایک روز کی رفات جس میں آنکھیں ایک دوسرے پر ہونے کی بجائے جھٹمیں اور تصویریں پر تھیں کسی جذبے کو جنم نہیں دے سکتی... میں نے خیمے کا پردہ گرایا، ڈومو اچھل ہو گیا اور میں تھکا دوڑوں کے بوجھ تلے اسودہ ہو کر سو گیا۔



گئے۔ ویٹر سے کافی لانے کو کہا تو وہ قد سے ناراض ہو گیا۔ ”سنیور آپ ٹورسٹ میں اور سرنیزیں شراب میں ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اطالیہ کے سات فیصد حقے پر صرف انگور کی کاشت ہوتی ہے۔“

”بہر حال میں صبح کے ساڑھے دس بجے صرف کافی ہی پیتا ہوں۔“  
 ”تو پھر سنیور تیا کے لئے“ وہ بانس کی ٹوکری میں پھنسی کی انتی کی ایک بوتل لے آیا۔ ”یہ پرفٹا بیرا ہے یعنی ایسی شراب جو جوانی میں پی جاتی ہے۔“  
 ”تو یہ شراب تو اخلاقاً بھی مجھ پر حرام ٹھہرتی ہے۔ میں ایک عرصے سے تیس برس کا ہو چکا ہوں۔“

”نہیں سنیور“ ویٹر نے سر ہلایا۔ ”جوانی سے مراد شراب کی جوانی ہے، یعنی اسے تیار کر کے سٹور نہیں کیا جاتا بلکہ فوراً پی لیا جاتا ہے۔“

وینڈی نے ایک گھونٹ بھرا۔ ”بڑی شدید جوان ہے، جسم کو فوراً گرفت میں لے لیتی ہے۔“ وہ ہنسی اور پھر لب پونچھتے ہوئے بولی۔ ”باب اور میں سپین میں ایک ہی سکول میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ وہ بہت شفیق انسان ہے۔ میں اُس کے ساتھ محبت تو نہیں کرتی مگر اُس کے ہمراہ زندگی بسر کرنا میرے لئے ایک سکون اور تجربہ ہے۔ ہم کھٹے سفر کر رہے ہیں اور جینیفر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ باب کو گھومنا پھرنا زیادہ پسند نہیں وہ صرف میرا ساتھ دینے کی خاطر سفر پر نکلا ہے۔ سارا دن دین میں ٹیڈہ مکتوری کی کتابیں پڑھتا ہے، شطرنج کھیلتا ہے اور اُس نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم کہاں تھیں، کس کے ساتھ تھیں اور عام طور پر میں جینیفر کی رفاقت میں ہی گھومتی رہتی ہوں۔ میں نے اُس کے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کی لیکن ہم شادی شدہ تو نہیں، آزاد فرد ہیں۔... اگر میں کسی کی رفاقت پسند کروں تو وہ مجھے روک تو نہیں سکتا۔“

”کیا تم نے اُسے بتایا ہے کہ آج تم مجھے ملنے کے لئے شرا آئی ہو؟“  
 وینڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ بہت شفیق انسان ہے، ظاہر نہیں کرے گا کہ

”دکھ ہو گا۔ میں خواہ مخواہ اُسے کیوں دکھ دوں۔...“  
 ”لیکن اس صورت حال میں میں اپنے آپ کو کچھ کچھ مجرم سمجھ سکتا ہوں کہ اُس نے لگوں گا۔...“  
 ”لیکن کیوں؟“ وینڈی نے میز پر تہہ شدہ میرے بازوؤں پر پھیلی رکھ دی۔

”میرے اندر کی مشرقیت مجھے بے چین کرتی ہے۔...“  
 ”دیکھو بھائی پاکستانی... ہم کل ملے ہیں اور آئندہ کل تک ہمارے درمیان کے فاصلے سینکڑوں کلومیٹروں کے ہوں گے۔... تو پھر کیا فرق پڑتا ہے۔... اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت وغیرہ بھی تو نہیں کرتے۔... صرف رفاقت ہے ایک اور انسان کی۔...“  
 ”بالکل درست۔“ میں بھی نارمل ہو گیا۔ بلکہ کل اس وقت میں وینس کے کسی گنڈ دلے میں بیٹھا تمہاری یاد میں آہیں بھر رہا ہوں گا اور ڈائری نکال کر چیک کروں گا کہ خاتون کا نام وینڈی ہی تھا یا کچھ اور۔...“

”ہیں؟“ وہ چونک اُٹھی۔ ”کل صبح تو ہم بھی وینس جا رہے ہیں۔ اُس نے جلدی سے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور پھر ماتھے پر پھیلی رکھ کر بولی۔ ”تم ہمارے ساتھ ہی کیوں نہیں چلتے؟“

”نہیں میں ہیج ہانگنگ کے ذریعے سفر کرنا چاہتا ہوں۔...“  
 ”دین میں بہت جگہ ہے اور ہم ویسے بھی راستے میں ہیج ہانگنگ کرنا کرنا چاہتے ہیں، ہمیں تمہاری کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔...“  
 ”اور باب کو؟“

”اُسے کہہ دوں گی کہ ایک خانہ بدوش قسم کا غریب پاکستانی ملنا تھا اور اُسے ملنے وینس تک لفٹ دینے کی پیشکش کی ہے، اُسے شک بھی نہ ہو گا۔“  
 ”بہت شفیق انسان ہے ناں بے چارہ اس لئے۔...“

”ادہ خدا کے لئے اس مشرقی ٹوڈ سے نکل آؤ۔...“ وہ بیزار ہو کر بولی۔ ”اگر اتنی بڑی سی بات کے لئے تمہارا احساس مجرم اتنا شدید ہے تو خدا حافظ۔...“



کس دُور گنبد ایک موم گولائی تھی جو شاید تھی یا نہ تھی۔  
ستون تھے۔  
مجھے تھے۔

فرش تھا اور اُس پر گھسٹتے قدموں کی خراش۔  
دُور آنر پر بے شمار موم بتیاں روشن تھیں۔

دینڈی مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ پہلے تاریکی میں سایہ پھر موم بتیوں کے  
اُبالے میں داخل ہوتے ہی وہ بھی جھلکانے لگی۔ میں ایک قریبی چبوترے پر بیٹھ گیا۔  
چبوترے کے ساتھ کچھ مجھے ایسا دہ تھے۔ فلائرس کی دھوپ داخلے کے دروازے  
پر سے آتے ہی فرش پر بچھ رہی تھی۔ صرف چند میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بھی  
کیسا تاریکی میں تاریک ہو رہی تھی۔ ایک جانب روشن دھوپ دروازہ، دوسری  
دُن فاصلے پر جگمگاتا ہوا الٹرا اور موم بتیاں روشن اور میں تاریکی میں گھرا قدموں کی  
پاپ ٹنٹا اور اُس پاس چلتے بیولوں کو دیکھتا... ایک گول مٹول گڈا پادری ہاتھ  
میں چبوترے کی صندوقچی تھا مے بہت دیر تک کھڑا اسکے چھنکا تار ہا کہ شاید اُن میں اضافہ  
لے لے لیں اپنی عاقبت سنوار لوں اور پھر ڈولتا ہوا کسی اور زائر کی طرف چلا گیا۔

دینڈی واپس آ رہی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچی اور اُس کی آنکھیں تاریکی میں  
ہلکی ہلکی ہو گئیں۔ "مشرم کو دم مائیکل انجلو کی قبر پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

"تم یقیناً مذاق کر رہی ہو، وہ تو روم میں فوت ہوا تھا۔"

"ہاں مگر اُس نے وصیت کی تھی کہ اُسے بالآخر فلائرس میں دفن کیا جائے۔ وہ  
بیکار ہے، پتھر کی اس سِل کے نیچے جس پر تم بیٹھے ہو۔"

میرا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ سِل کی سردی موت بن کر شریاؤں میں اُترنے لگی۔ میں  
اُچھک رہا ہوں مگر زندہ ہوں اور وہ عظمت کے باوجود مُردہ ہے اور اس زندگی کے  
بلانے میں اُسے پتھر کا چبوترہ سمجھ کر اُس پر بیٹھا رہا۔ فنا اور بقا... فنا کی عظمت

چوکیدار سے دریافت کیا کہ جناب یہ مانوئیل میٹر کیس کہاں پر داق ہے؟ اُس نے  
ہماری پشت پر نگاہ کی اور اطمینان سے بولا۔ جناب آپ ابھی ابھی اُسے طے کر کے بیار  
پہنچے ہیں اور اسی لئے ہانپ رہے ہیں۔"

ادفیزی کم از کم مجھے تو میڈرڈ کے پراڈو، پیرس کے لوڈ اور ایمسٹرڈیم کے  
رائنک میوزیم کے ہم پلہ دکھائی نہ دی البتہ اس کی چھتیں انتہائی شاندار اور سنہری تھیں  
بیل بوٹے اور نقش پوشیدہ روشنیوں سے چمک رہے تھے۔

"یہ چھتیں لڑکیوں کے لئے مہنی مومن منانے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔" میں  
نے مصنوعی دے دھیانی سے بات کر دی۔

"صرف لڑکیوں کے لئے ہی کیوں؟ دینڈی اُدھر دیکھنے لگی۔

"اس لئے کہ وہ اس دوران صرف چھت کی طرف ہی دیکھ سکتی ہیں۔"

دینڈی قدرے تاخیر سے اس فقرے کے رموز سے آشنا ہوئی اور اُس کا چہرہ  
چسپ کی کسی زرد شہزادی کی طرح پیلا ہو گیا۔ پھر سیلا ہٹ ہلکی سُرخ میں بدلی "شرم" اُس  
نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

ادفیزی سے نکل کر ہم فلائرس کی قدیم مارکٹ میں گئے جو ایک نوآرے کی درجہ  
سے مشہور ہے جس میں ایک آہنی سَوڑ تھو تھنی اُٹھائے کھڑا ہے۔ میں نے ایک دکان  
سے گنڈولا ہیٹ اُٹھا کر پہن لیا۔

"احتمل لگ رہے ہو۔" اُس نے فوراً کہا۔ میں نے فوراً اُتار دیا۔

یہاں پر ہم نے اطالوی پتیزا کالیس دار پیر اور قیہ کا پراٹھا کھایا۔ کافی پی  
اور پھر اپنی گانڈنگوں پر نگاہ ڈالی۔ چھوٹے موٹے دو تین چرچ چھوڑ کر صرف بڑا  
کلیسا رہ گیا تھا۔ کلیسا جس پر "دومو" تھا۔

کلیسا کے اندر ایک خلائی تاریکی تھی۔

دقتی بھا کے پاؤں تلے تھی۔ شرمندگی کتنا چھوٹا لفظ ہے۔

”یہ دیکھو“ وہ فرش پر بیٹھ کر اُس پر کندہ عبارت پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے کوئی نابینا بریل پڑھ رہا ہو۔ ”مائیکل انجلو بونا رورٹی اور اوپر اُس کی یاد میں تین عیسے۔ فنی تعمیر، مصوری اور بت تراشی کی دیوایاں، اُس کی قبر پر چھکی ہوئی، نور کٹاں...“ میں ساکن کھڑا رہا۔

”آؤ“ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

مائیکل انجلو کی قبر کے ساتھ دانٹے کی یادگار تھی۔ اس پر اطالیہ اور شاعری کی دیوایاں سوگوار کھڑی تھیں۔ تیسری قبر پر ”س“ کے مصنف میکاولی کی تھی۔

مگر میں ابھی تک مائیکل انجلو کی قبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب کے نیچے، کلیسا کے فرش تلے کہیں گہرائی میں اُس کا تابوت تھا، نیچے۔ ”اد“ اکیڈمی میں اُس کا ڈیوڈ کھڑا تھا اور پر آسمانوں کو چھوتا ہوا۔

ایک ٹھکنی بڑھیا قدم گھسیٹتی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں موم بیوں کا ایک بندل تھا، کلیسا میں جلانے کے لئے۔

وینڈی نے ایک موم بتی اٹھالی۔ ”کتنے کی؟“

”سو لیرے“ بڑھیا بولی۔ وینڈی نے چپکے سے رقم ادا کی اور موم بتی بیگ میں رکھ لی۔

”اسے جلاؤ گی نہیں آ لٹر پز؟ میں نے پوچھا۔

”اتنی منگی موم بتی تو ہرگز نہیں جلاؤ گی، ساتھ لے جاؤ گی۔“

کلیسا کے باہر آ کر ہم بڑی دیر تک آنکھیں میچے کھڑے رہے اور تب کہیں جا کر دھوپ میں دیکھنے کے قابل ہوئے۔

فلارنس میرے لئے صرف آج تھا، کل مجھے وینس جانا تھا۔ پلازا دیکھیں

بنانے جب وطن لے جانے کے لئے چمڑے کی دستکاریاں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وینڈی کہنے لگی۔ تم اکیلے جاؤ، مجھے ساتھ دیکھ کر اطالوی زیادہ قیمت بتائیں گے۔ کڑاٹوں پر اطالویاں کھڑی تھیں یعنی بھری بھری میدے میں سندھور والی قد سے زہر پوٹیاں۔ تیز طرا اور زبردست سیلر گہرے۔ میں نے چمڑے کے دو سکرٹ کیس اور بیگ پسند کیا۔ کتنے پیسے؟

”سولہ ہزار لیرے“

”کچھ کم کرو...“ میں نے سیلر گہرے کے ساتھ ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

”یہاں ہے تو لو ورنہ راستہ نالو“ وہ چمک کر بولی۔

”کم کرو میں کوئی امیر امریکی تو نہیں ہوں۔“

”اور میں کوئی امیر اطالوی نہیں ہوں جو مفت میں دے دوں۔“ اُس نے فوراً گادوٹر پر سے اشیاء اٹھا لیں۔

مجھے معلوم تھا کہ تمام سٹالوں پر قیمتیں یکساں ہیں۔ ”خواہ مخواہ مارا ہوا ہوتا ہو“ میں نے چپکے سے سولہ ہزار لیرے نکال کر رکھ دیتے۔ ”اتنے خوبصورت چہرے پر بغفہ اچانک لگتا۔“ اُس نے اشیاء پیک کر کے میرے حوالے کیں اور ساتھ میں پانچ سو لیرے کا ایک نوٹ بھی تھما دیا۔ ”یہ تمہارے فقرے کے لئے۔“ اور ہنس دی۔

پارسل اٹھانے میں واپس پلازا دیکھو میں آیا تو وینڈی کبوتروں کے درمیان ٹھری کھڑی تھی اور ایک موٹا کبوتر اُس کے کندھے پر آسودگی سے براجمان تھا۔

”قریب نہ آنا ورنہ اڑ جائے گا۔“ اُس نے وہیں سے اشارہ کیا۔

”اس کے پیچھے تمہارے جسم کو ناگوار نہیں گزرتے؟“ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔

”نہیں“ وہ ماتھے پر سے بال سمیٹتی ہوئی بولی۔ ”یہ کبوتری ہے۔“

دو پر ڈھل رہی تھی۔ پلازا دیکھو میں ایسا وہ انسانی شکلوں کے پتھروں کے ساتھ بول ہو رہے تھے۔ دھوپ چوک کو بتدیج خالی کر رہی تھی۔ وینڈی کبوتروں کے درمیان

گھڑی کھڑی تھی، اپنے کندھے پر براجان کبوتر یا کبوتری کے لئے ساکت، اُس کے بال بار بار سر نہ اٹھاتے تو وہ بھی پلازا دیکھو کے محبتوں میں شامل ہو جاتی بلکہ بہت سائل بہ جب میں نے اُس کا نقش تلاش کیا تو وہ ایک محبت کی صورت میں ہی ملا۔ کندھے پر کبوتر، ہوا میں منجمد بال، ڈھلتی دھوپ اور پلازا دیکھو۔ میں نے کندھے سے کیمرا اتار کر اُسے فوکس میں لیا اور بٹن دبا دیا... زندہ شکل کا غریب منتقل ہو گئی، ساکت اور اسی لمحے قدیم ہوتی ہوتی۔  
”وینڈی“

”کیا ہے؟“ وہ اُسی طور ساکت رہی، صرف اُس کی آنکھیں کبوتر پر لگی تھیں۔  
بات نہیں کر سکتی، اڑ جاتے گا۔“

میں نے اس منظر سے منہ موڑا اور دیا کورنو کی جانب چل دیا۔ میرے پیچھے پلازا دیکھو میں دوپہر ڈھل رہی تھی اور دھوپ چوک کو بتدریج خالی کر رہی تھی اور دینڈی ایک محبت تھی۔

مشہور چوکوں اور کلیساؤں کے عقب میں فلائرس کی تنگ گلیوں میں بیچا موشی تھی۔ مقامی باشندے کھڑکیوں کے کواڑ بند کتے دوپہر کی نیند میں تھے۔ مجھ پر ڈھلتی دھوپ کی آداسی اثر انداز ہو رہی تھی اور یہ وینڈی سے جدا ہونے کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ میرے لئے ایک مختصر، پرکشش مگر غیر جذباتی دوستی کے دودن تھی۔ یہ لوگر سے دُریوں اور اُن افغان صحراؤں، ترک پہاڑوں اور آئینہ منہ سمندر کی آداسی تھی جو مجھے دھکیلے ہوئے یہاں اطالیہ تک لے آئے تھے اور آنے والی سروس جھیلوں جرمن جنگلوں اور سویڈش دستوں کا خوف تھا جنہوں نے مجھے گھر سے مزید دور کر دیا تھا... تو پھر کیوں؟ واپسی کا تقارہ بجانے کے لئے ہاتھ کیوں نہیں اٹھ جاتا... ڈیلنی کا اور لیکل میرے نصیب کی خبر ابھی کیوں نہیں دے دیتا... نہیں، میں نے اپنے آپ کو تسلی

دی۔ اُس امریکی بوڑھے کے نفرت انگیز لفظ ہیں جنہوں نے تمہیں اپنی زمین کی اپنائیت کے لئے آداس کر دیا۔ پلازا دیکھو میں کھڑی دینڈی ہے جس سے تم نے منہ موڑا... یہ نہیں کیا تھا... مگر کچھ تھا... اور میں بے حد تھک چکا تھا... دیا زانی کی کھٹیا پر پلازا میڈونا آیا جس کے سامنے ایک کلیسا تھا۔ میں اُس کی تاریک دستوں میں پناہ لینے کی خاطر اندر داخل ہو گیا۔ ایک عبادت گزار پادری نے میری موجودگی محسوس کی اور سر اٹھا کر بولا۔ ”میڈیچی خاندان کے نابوت زیر زمین تہہ خانے میں رکھے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھ کر صندوچ میں چند لیرے ڈالے اور ایک موم بتی روشن کر کے الٹر پر نہاتی موم بتیوں کی قطار میں رکھ دی۔ ”میں بہت تھک چکا ہوں۔“ پادری نے پھر براٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ابدی سکون تھا۔ ”کلیسا کے پیلو میں راہب خانے کا ایک گوشہ ہے، وہاں چلے جاؤ۔“

کلیسا کی تاریکی کم ہوئی اور پتھریلی راہداری مجھے راہب خانے کے باغیچے میں لے گئی۔ ایک چوکور سادہ سی خاموش عمارت جس کے درمیان سرو کے چند درخت چپ تھے اور ایک پتوں کی باڑیں خوابیدہ تھیں۔ میں ایک پتھریلی نشست پر بیٹھ گیا... سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا، فلائرس، مائیکل انجلو کے مجسمے، میرا خیمہ، وینڈی اور لوگ اور سارا شور...  
”خاموشی تھی۔ یہ جگہ کہیں اور تھی، دقت اور زمین سے علیحدہ، کمی ہوئی، تہہ نہیں کہاں... دھوپ صرف چھتوں پر تھی اور ایک مودب خاموشی تھی جیسے گھرے کتوں میں جھانکنے سناٹی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہوگی... باہر کی دُنیا سے ایک آواز آ رہی اور باغیچے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے پروں کی پھر پھر اٹھ بھی مجھے ناگوار گزری۔  
”خیر، دیکھو گردن پھلا پھلا کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر شاید راہب خانے کے سناٹے تنگ آ کر اڑا، پھر پھر آتا ہوا جیسے ابھی گر جائے گا... اور خاموشی تھی، جیسے گھرے میں جھانکنے سے سناٹی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہوگی...  
انگلی میز میں نے خیمہ سمیٹا تو دروازے میں سے نظر آنے والا ”دو“ پھر سے فلائرس

## دنس کی موت

یہ ایک وسیع اور سبزے کی بوباس والا میدان تھا۔ دو تیسکانی کی پیاری ڈھلوانوں پر انگوروں کے باغ تھے اور ان کے پار ایک پتھریلے پیالے کے بیچ میں کہیں فلائرس تھا جسے ہم تین گھنٹے قبل چھوڑ چکے تھے۔ بلند گھاس تیز ہوا سے جھکی جا رہی تھی اور اس میں سے کبھی یہاں کبھی وہاں ایک سفید دھتیر دکھائی دے جاتا، باب کا روسی گتا جو کھلی فضا میں بھاگتا بھاگتا پاگل ہو رہا تھا۔ ٹورسٹ دین سڑک سے ہٹ کر ایک کھیت کے کنارے کھڑی تھی اور وینڈی اور جینیفر گھٹنے بازوؤں میں سیٹے اُن پر ٹھوڑیاں لگاتے بیٹھ چکی تھیں اور ہوا میں اُن کے بال موٹے کبوتروں کی طرح سستی سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ باب بھیلیاں مر کے نیچے رکھے لیٹا تھا اور اس کی طویل داڑھی کسی کلاسیکی رقاصہ کی ہتھیلی کی طرح دہیں بائیں ہل رہی تھی۔

ہم دوپہر کے کھانے کے لئے رُکے تھے۔

آج صبح وہ تینوں پانٹو ویکو پر میرے منتظر تھے۔ باب واقعی ایک شفقتی شخص تھا۔ دیمیا اور اس کے گتے کی طرح فرمانبردار جو ڈرائیونگ کرتے ہوئے چپ چاپ اس کی گود میں بیٹھا رہتا۔ وہ وینڈی کے اشارے کا منتظر رہتا۔ یہاں تک کہ دائیں بائیں مڑنے سے پیشتر بھی اس کی طرف دیکھ ضرور لیتا۔

باب سستی سے اٹھا اور وینڈی کے اٹھے ہوئے منہ پر جھکا۔ پھر اُس نے دین کے پاس سے ایک پرانا رُک سیک نکال کر کا ندھے پر ڈال لیا اور سیٹی بجا کر گھاس میں اچھلتے

کتنے کو متوجہ کیا۔ ”وینڈی جینفر تم اب جاؤ... میں پرسوں شام جینو کی کیمپنگ میں تمہارا انتظار کروں گا...“ وہ سر جھکا کر پیدل آگیا جاتی شاہراہ کی طرف چلنے لگا۔ ایک کارڈنگ اسے فوراً ہی بھٹ بل گئی۔

”تم ڈرائیو کرو۔“ وینڈی نے دین کا دروازہ کھول دیا۔

میں اندر داخل ہوا اور سٹیئرنگ کے نیچے کھسکتا دوسرے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ”میں ڈرائیو نہیں کر سکتا۔“ باب ہمارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟

”اُسے دے کی شکایت ہے اور وینس کی ٹھنڈی ہوا اُسے سوٹ نہیں کرتی۔“ وینڈی نے میری طرف دیکھا۔ ”اور میں وینس دیکھنا چاہتی تھی۔“

جینفر جو ہمارے درمیان میں پھنسی بیٹھی تھی، ڈیش بورڈ پر ہاتھ مار کر بولی لیکن وینڈی ہمیں ہر صورت میں پرسوں تک جینو پہنچ جانا چاہیے۔

”یہ ہم دیکھیں گے۔“ وینڈی نے آمہنگی سے کہا۔

ساڑھے چھ بجے ایک جدید مگر بے ترتیب سا شہر شروع ہو گیا۔ کہیں ایک بورڈ دکھائی دیا۔ ”وی نیزیا۔“

”یہ وینس ہے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں؟“

”لیکن سمندر کہاں ہے؟“

”سمندری وینس میں پہنچنے کے لئے ہمیں اس دین کو سٹیئر پر لے جانا ہوگا جو بہت ہنگامہ سوار ہے... ہم اسی جانب کسی کیمپنگ میں ٹھہر جاتے ہیں۔“

ہم رہائشی فلیٹوں اور کاروباری مراکز میں پھنسی ہوئی ”کیمپنگ بارک“ میں داخل ہوئے تو مجھے اونچے اونچے درختوں میں گھری ایڈریالنگ سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی

”ہینک لیڈ“ یاد آگئی جہاں آج سے چھ برس پیشتر میں نے اور میرے خیمے نے پہلی مرتبہ وینس دیکھا تھا۔ یہاں زمین سخت تھی اور میرے خیمے کے پردے میں سے ٹوچہ میٹ کا ایک جہازی اشتہار اور ایک غسل خانہ نظر آ رہا تھا!

”کافی سونگے؟“ وینڈی نے اپنی دین میرے خیمے کے پہلو میں پارک کر رکھی تھی۔ ”پہلے ایک خنک شاور... پھر کافی۔“ میں نے تولیہ کندھے پر ڈالا اور غسل خانے کی جانب چل دیا۔

جولائی کے مہینے میں بھی شاور کا پانی ادلوں کے ہمراہ برسنے والی بارش کی طرح برنٹا تھا۔ منہ کے صندوق میں دانتوں کا جیل ترنگ بچنے لگا۔ وینڈی کی دین میں پہنچے ہی میں نے کافی کا نصف مگ اس میں انڈیلا تب جا کر کہیں یہ کٹ کٹاٹ بند ہوئی۔ ”معزز خواتین! اس عمدہ کافی کے بدلے میں آپ نے وینس دکھانے کے لئے ایک گائیڈ کی بلامعاوضہ خدمات حاصل کر لی ہیں۔ پتھر کے شہر فلائرس کے بعد پانی کا شہر وینس، تیار ہو جائیے...!“

جینفر نے ناک پر رد مال جھا کر ایک شرلی سی چھوڑی... ”مجھے زکام ہے۔“ ”ذرا خیال کیجئے کہ چاندنی رات میں نہروں میں رواں سبک گندولے، اُن کے کنارے سنگ مرمر کے محلات، کبرے پل۔ اور سان مارکو چوک...“

وینڈی نے دروازہ دھکیل کر باہر جھانکا۔ ”چاندنی رات؟ باہر تو گھپ اندھیرا ہے۔“ ”خیر رات تو ہے نان... کہتے ہیں کہ نصف شب سان مارکو میں ایسا دھگڑاؤں کے بستے ہنہناتے ہیں اور...“

”ہنہناتے ہوتے گھوڑے...؟“ وینڈی نے لمبا منہ کھینچ کر ایک اور شوش لایا۔ ”تم وینس کے گائیڈ ہو یا کسی اصطبل کے...“

”خواتین پلیز خیال کیجئے کہ ہم وینس میں ہیں اور زندہ ہیں... وینس میں تو لوت بھی خوبصورت ہے... ہے ہے ہے...“ میری چرب زبانی کاریکارڈ

اس فقرے کے آخر میں اٹک گیا... ربیکا۔ ربیکا۔ ربیکا...

”سمندر کے اس حصے میں لہریں تیز تھیں جن کی وجہ سے ہانجھی کو گنڈولا جہازانے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہمارے پاس سے سیاہ نخل میں لپٹے ہوئے چھ گنڈولے بڑی آہستگی سے گزر گئے۔ درمیان والے گنڈولے میں ایک سیاہ تالوت رکھا تھا جس پر پھولوں کی ایک چادر لگی تھی۔ پانی کی سطح پر تیرتا یہ خاموش قافلہ ”سان مثل“ کے قبرستان کی جانب رواں تھا۔“ ونیس میں موت بھی خوبصورت ہے۔“ ربیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔“

وینڈی نے لگ کے کنارے سے آنکھیں اٹھائیں۔ ”تم خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ میں انگوٹھے کو ناخنوں پر پھیرتا رہا... شہر پہلی محبت کی طرح ہوتے ہیں طویل جدائیوں کے بعد ان کی طرف کوٹنا بے حد اذیت ناک ہوتا ہے۔ تمہارے اندر ماضی کی آوازیں اور ہمک محفوظ ہوتی ہے مگر وہ چہرہ کی طرح وقت کے ساتھ بدل چکے ہوتے ہیں...“ ہاں باہر شاید گھپ اندھیرا ہی ہے چاندنی رات نہیں... ونیس میں رات کے وقت نرم سمندری ہوا چلتی ہے جو صحت کے لئے انتہائی مضر ہے۔“

”اور مجھے بے حد زکام ہے۔“ جینفر نے ایک اور شٹل کی۔

”اور سفر کی تھکاوٹ بھی تو ہے... میں نے بہت طویل ڈرائیونگ کی ہے، کل صبح چلیں گے...“ وینڈی بھی جانیال لے رہی تھی۔

میں اپنے خیامی میں آکر لیٹ گیا۔ میرے پاس پورٹ پر چسپاں اطالوی دیزے کے ختم ہونے میں صرف ایک روز باقی تھا اور مجھے ہر حالت میں کل شام تک اطالوی سرحد عبور کر کے سوئٹزرلینڈ پہنچنا تھا۔ اطالیہ میں میری آخری رات اور ونیس میں بھی...!

”اور میں...“ اُس نے میرے ہونٹوں پر اپنے خنک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”دوم کے تریوی نوآرے میں سکے ڈال کر دو عاکروں کی کہ ہم دونوں پھر ونیس میں ملیں...“

اور میں ونیس میں تھا... شاید آخری مرتبہ... میں نے کپڑے تبدیل کئے اور کیننگ

ہے باہر آگیا۔

پلازا رومانا تک بس جاتی تھی، وہاں سے گھاٹ قریب ہی تھا۔ میں نے ریا لٹو کے بکٹ خریدا اور پانی میں ڈولتی لکڑی کی انتظار گاہ میں جا بیٹھا۔ سٹیمر کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ چاروں طرف شیشے تھے جن میں سے سمندر کا سیاہ وجود اور اس میں ابھرتی اکادکا روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

”یکب چلے گا؟“ میرے قریب بیٹھی ایک ادھیڑ عمر امریکی عورت نے دریافت کیا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں کتنی دیر سے ٹکٹ خریدا کر بیٹھی ہوئی ہوں اور یہ چلتا ہی نہیں۔“ وہ مصومت سے بولی۔

میں اپنی ذہنی افسردگی کے باوجود مسکرا دیا۔ ”میڈم یہ تو صرف انتظار گاہ ہے سٹیمر

زابھی آئے گا۔“

”میں بھی کتنی احمق ہوں۔“ وہ اپنی حماقت پر لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگی۔

سٹیمر پر بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ نرم ہوا سے بچنے کی خاطر اندرونی حصے میں اٹک رہے تھے۔ میں رینگ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہم کھلے سمندر میں رہے اور پھر دنیا کا خوبصورت ترین شہر تاریکی کی اوٹ میں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ

ہمارے قریب آیا اور سٹیمر کو اپنے بدن میں داخل ہوتی ہوئی ایک نہر میں راستہ دے دیا۔

گرینڈ کینال کے کناروں پر دریائی گھوڑوں ایسی گردنیں نکالے، لہروں کے ساتھ اٹھتے

بٹھے گنڈولے خالی پڑے تھے۔ گلیوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں جو اس آبی شاہراہ

بل سے نکل کر جزیروں کے شہر میں داخل ہو رہی تھیں اور ان پر اٹھتے ہوئے محرابی پل

بانیوں سے دھڑاٹھائے کسی مردہ عفریت کی طرح ساکن دکھائی دے رہے تھے سٹیمر

سنگرز نے سبل کھاتا ہوا پانی کنارے پر ایستادہ دم بخود کر دینے والی خوبصورت عمارتوں

اور ہائس گاہوں کی سنگ مرمر کی دیواروں سے جا ٹکراتا۔ سنگ مرمر غلط بھر کے لئے پانی

ناڈوتا اور پھر ننگا ہو جاتا، جیسے سمندریں ایک دودھیا بدن، مدوجزر کے دوران کبھی



میرے خیمے میں روشنی تھی۔

چور!

لیکن وہاں ہے کیا؟ پاسپورٹ، کیمرا اور کرنسی تو میں ہمہ وقت اٹھائے پھرتا

تھا... تو پھر؟

میں یقیناً اس امر کی بڑھیا کی طرح سٹھپا چکا تھا، بھلا کوئی چور ایک ننھے منے خیمے میں داخل ہو کر روشنی کر سکتا ہے، پھر بھی میرا ہاتھ پر دے تک گیا تو جھجک تھی۔

کافی کامک اٹار کھا تھا اور اس پر موم بتی جل رہی تھی۔ سیلینگ بیگ پر جو ڈرکے کھلاڑیوں ایسے گاؤں اور پاجا بنے میں دینڈی ایک یوگی کی طرح آنتی پالتی مائے ٹھی تھی۔

”ہیلو“ میں نے وہیں جھکے جھکے کہا۔

”ہیلو“ اُس نے گاؤں کی بلیٹ کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے گھریلو انداز میں کہا۔ کیا ایک شریف آدمی اتنی رات گئے اپنے خیمے میں واپس آتا ہے؟

”تم یہاں کیا کر رہی ہو...“

”اندر آ جاؤ تمہارا اپنا ہی خیمہ ہے۔“

میں اندر جا کر ایک کونے میں لگ گیا۔

”میں یہ موم بتی جلانے کے لئے یہاں آئی تھی۔ اب سویلرے کی یہ موم بتی فلائرس کے گیس میں جلنا کر ضائع تو نہیں کی جاسکتی تھی ناں۔؟“

میں نے شعلے کے عین اوپر خیمے کے کپڑے پر ہاتھ پھیرا، خاصا گرم ہو رہا تھا ویسے اگر یہ موم بتی کچھ دیر اور ہمیں جلتی رہتی تو خیمے میں روشندان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔“

”اوہ“ وہ اٹھنے لگی تو اُس کا سر خیمے سے جا ٹکرایا... ”مجھے خیموں میں رہنے کی لادت نہیں ہے۔“ اور پھر لگ پرچی موم بتی کی جگہ بدل دی۔

”وینس کیسا تھا؟“

کنڈھوں تک پانی صرف چہرہ دکھائی دے اور کبھی وہ یوں پیچھے ہٹتا چلا جائے کہ پانی تک کی بڑھکی نظروں کے سامنے آجائے... وینس ابدی تھا۔ وینس ڈی میلو کے مجسمے کی طرح... وینس دراصل وینس تھا، پانی سے نکلتا ہوا سنگ مرمر کا بدن چند اونچی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان میں روشنی تھی۔

سیٹمر پر ایک سائے نے حرکت کی، ریالٹو کا پل گزر گیا۔ دوسری طرف سٹاپ تھا۔ شہر کے اندر گلیاں پتھر کی تھیں اور قدیم مکانات کے باہر آرائشی لائینوں کی روشنی کو سیاہ رات چوس رہی تھی۔ مرسیر یا سٹریٹ بند ہو چکی تھی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا سان مارکو کے چوک میں آ نکلا۔

”موسیقی کا شور مدہم ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا سان مارکو چوک خالی ہو چکا تھا اور اُس کے بیچ صرف ریبیکا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ سنہری بالوں سے ملتا ہوا پھولدار لباس اور اُس کے اوپر ہلکا زرد کوٹ پہنے وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔“

سان مارکو چوک واقعی خالی ہو چکا تھا۔ کس قسم کی مسکراہٹ یا سنہری بالوں سے خالی۔ اس میں اُڑنے والے ہزاروں کبوتر ڈوجے پلپس اور کلیسا سان مارکو کی دیواروں اور

چھجوں میں مجر استراحت تھے۔ گھوڑوں کے آہنی مجسمے جیسے ایک وسیع اور تاریک میدان میں جنگ کے منتظر کھڑے ہوں۔ میں نے ایک سگرٹ سٹیکایا اور چوتھرے پر بیٹھ کر بھونکنے لگا۔

ڈوجے پلپس میں پوشیدہ کبوتروں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کبوتر جو وینس کے لئے موت کا گدھ بن گیا ہے۔ پچاس ہزار سے زائد کبوتروں کی تیزابیت سے بھرپور سیٹ

وینس کے سنگ مرمر کو پاؤں میں بدل رہی ہے۔ مجسمے بے شکل ہو رہے ہیں اور عمل نما عواموں کو گھٹن لگ چکا ہے... وینس میں موت حسین ہو تو ہو، وینس کی موت حسین نہ ہوگی۔

وینس کے بدن میں نکلتی نہرنے ہمیں واپس کھٹے سمندر میں چھوڑ دیا۔ گھاٹ پر اتر کر جب میں بلا زار و امیں پہنچا تو آخری بس کب کی جا چکی تھی، میں آہستہ آہستہ کیپیٹنگ کی

طرف چلنے لگا۔

”چھ برس پہلے تو بہت خوبصورت تھا۔“

”اور اب؟“

”سنگ مرمر یا ڈوڈر ہوتا تھا اور عمارتوں کو گھٹن لگ رہا ہے، مگر پھر بھی خوبصورت ہے۔“

”اور تم کل پلازا سائبریا میں خدا حافظ کسے بغیر اچانک کیوں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں خود لاعلم ہوں کہ میں بعض اوقات جو کچھ کرتا ہوں وہ کیوں کرتا ہوں۔“

”میرا خیال تھا کہ تم اس کریم وغیرہ خریدنے کے لئے دیا پائیز میں گئے ہو،

جادو گے، میں بہت دیر وہیں کھڑی رہی۔“

”میں تمہیں متوجہ کر کے تمہارے کندھے پر براجمان کبوتر کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”کبوتری۔“ وہ ہنسی۔ ”وہ تو اسی وقت اڑ گئی تھی... کافی؟“ اس نے قریب رکھی

فلاسک اٹھائی۔

”ہم دونوں کافی پینے لگے... خاموشی کا ایک طویل وقفہ... بگھیلی موم گولائی کے ساتھ

پیشتی ایک رواں بیل کی طرح نیچے اتر کر مگ کی پشت پر پھیل رہی تھی۔“

”تم ایسی حسین لڑکیوں کو تو جو ڈوکا لباس پہننے کی ضرورت نہیں...“ بالآخر میں نے

اس وقفے کو توڑا۔ ”تمہیں تو دیکھ کر ہی ہتھیار ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔“

”اُس کے گول چہرے پر موم، تکی لٹکی۔“ تم اٹالویوں کی طرح جھوٹی مگر خوب صورت

باتیں کرتے ہو۔“

میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی ربیکا نہیں تھی، مگر تھی کہ لفظ وہی رہتے ہیں۔ اس کے

سامنے میں تھا اور میرے لفظ بھی وہی تھے مگر اب ان میں جھوٹ تھا... میں نے اسے ربیکا

کے بارے میں بتایا۔

”کیا تمہیں اس سے محبت تھی؟“ اُس نے لا تعلقی سے پوچھا۔

”نہیں... لیکن چہرے کا پس منظر بھی تو انسان کے جذبات کو گہرا کرتا ہے۔ ربیکا میڈرڈ

یا برسلز ایسے شہر میں ملتی تو شاید میں صرف ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا مگر نہیں... جس

طرح تم کل فلائس کے پلازا سائبریا میں کبوتروں میں گھری کھڑی تھیں... پس منظر

اثر انداز ہوتا ہے۔“

شاید ملال کا ایک سایہ آیا اس کے گول چہرے پر۔ ”اگر میں فلائس کی بجائے کسی

اور شہر میں ملتی تو تم مجھے ایک نظر بھی نہ دیکھتے؟ ہوں؟“

”وہ چہرہ صرف ایک ہوتا ہے وینڈی، اگر انسان خوش قسمت ہو تو وہ اس مختصر

زندگی میں سامنے آ جاتا ہے۔ ایسا چہرہ جس کے لئے کسی پس منظر کی ضرورت نہیں ہوتی،

وہ خود پس منظر تخلیق کرتا ہے۔ اور میں اور تم ایک دوسرے کے لئے وہ چہرہ نہیں ہیں۔“

خاموشی کا ایک اور وقفہ ہمارے درمیان حائل ہوا۔

”کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ چہرہ سامنے نہ آئے انسان نقاب پہن کر

دنیا کے تمام چہروں سے پردہ کر لے... مجھے معلوم ہے کہ تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں

اس شہر میں تمہاری رفاقت میں چلوں، باتیں کروں، ہنسوں لیکن تمہارے اندر ایک بے چین

بے جہتی ہے۔ تم کوشش کر کے خوش رہتے ہو اور شفقت سے خوبصورت فقرے کہتے ہو،

اور اداسی کی ایک ہلکی سی حدت ہمہ وقت تمہاری آنکھوں میں چلتی رہتی ہے... تمہاری

اس خواہش کا مجھے یقین نہ ہوتا تو میں باب کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ چلی جاتی کیونکہ میں کبھی

بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ باہر جانا پسند نہ کروں جو میرے لئے بھی پسندیدگی کے جذبات

نہ رکھتا ہو۔“

”جہتی میں تو تم سے محبت کرتا ہوں، شدید اور نہایت جذباتی قسم کی، اور اگر میرا

اطالوی دینا کل ختم نہ ہو رہا ہوتا تو میں تمام وقت تمہاری دین کے پیچھے لٹک کر آہیں

بھرتا رہتا... میں قسم کھاتا ہوں...“ میں نے ہنستے ہوئے اپنے سینے پر صلیب کا

نشان بنالیا۔

”اوہ تم بہت ہی ناقابل یقین قسم کے آدمی ہو مستنصر۔“ وینڈی مسکرا دی جس طرح

تم مجھے بتائے بغیر پلازا سائبریا میں چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے تو مجھے اُسی وقت شک

ہوا تھا کہ تمہارے ذہن میں کچھ فتور ہے۔ اور میں ایک نیم دیوانے شخص کے ساتھ  
دینس میں ہرگز گھومنا نہیں چاہتی۔“  
”بالکل۔“ میں نے سر ہلادیا۔

”لیکن ہم ایک دوسرے کو اچھے لگے، تھوڑی سی مدت کے لئے، فلارنس میں!“  
”ہاں۔“ میں نے پھر سر ہلادیا۔ ”بہت اچھے لگے۔“

”تم دراصل مجھے پلازا سانوریا میں ہی چھوڑ آتے ہو۔۔۔“ اُس نے سر جھٹک کر  
میری طرف دیکھا۔ مسکراہٹ سمٹنے لگی، چہرہ آگے آیا، ہونٹ جدا ہوتے، نیم دائرے  
میں بدلے اور ایک گہرا سانس موم بتی کے شعلے پر بجھ گیا۔ یکدم اس کا چہرہ اندھیرے  
میں یوں چمکا جیسے کسی نے ماچس جلادی ہو۔ یہ روشنی لمحہ بھر کے لئے میرے گالوں پر  
نم آلود حدت کے ساتھ پھیلی۔ پھر وہ اٹھی اور پردہ اٹھا کر خیمے سے باہر نکل گئی۔



## اپس

”سنیور یہ کار آپ کی ہے؟“ اطالوی پولیس مین نے گرجے کے فٹ پاتھر پر پڑھی  
ہوئی کار کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ پچھلی نشست پر ایک بہت ہی دہشتناک تہہ دار میک اپ  
میں دفن خاتون پھیلی ہوئی تھی۔

”یہ کار میری نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں؟“ اُس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”اس خاتون کو دیکھ رہے ہو؟“

وہ مسکراتا ہوا غلط پارک شدہ کار کے مالک کی تلاش میں نکل گیا۔

میرے سامنے ڈومو تھا۔ فلارنس کا نہیں بلکہ میلان کا کلیسا اعظم جو ڈومو ہی

کہلاتا ہے۔ میں میلان میں تھا۔

آج صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ گیارہ بجے خیمے سے باہر آیا تو دینڈی کی ٹورسٹ  
ڈین کی بجائے کچی زمین پر صرف ٹاتروں کے نشان تھے۔

میں نے خیمہ سمیٹا اور دینس کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر اطالوی سرحد سے  
نزدیک ترین سوئٹزرلینڈ کے شہر لوگانو تک کا ٹکٹ خرید لیا۔ پڑو آ اور وینٹا کے  
بعد ساڑھے پانچ بجے میلان آگیا۔ لوگانو کے لئے گاڑی ساڑھے چھ بجے روانہ ہوئی  
تھی۔ گو تھک محل نما ریلوے سٹیشن پر پورے ساٹھ منٹ خواہ مخواہ انتظار کرنے کی  
جائے میں نے سامان لیگج روم میں جمع کر دیا اور ٹرام بکڑ کر یہاں چلا آیا۔۔۔ اور

یہاں حسب معمول ایک بڑا چوک تھا، شاندار گرجا تھا اور بے شمار کبوتر تھے جن میں پلاسٹک کی وہ چڑیاں بھی اڑتی پھرتی تھیں جو اطالوی بچے مجھ ایسے سیاحوں کو تفریح کرنے کے لئے چابی بھر کر فضا میں چھوڑ رہے تھے۔ میرے پاس صرف اتنا وقت تھا کہ میں میلان کی تھنڈی کو باہر سے ہی ایک نظر دیکھوں، دو تصویریں اُتاروں اور فوراً سٹیشن واپس پہنچنے کے لئے ٹرام میں سوار ہو جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا یعنی وہی امر کی سیاحوں کا رویہ کہ... دیکھ لیا۔

کہہ کر ہو کہ اتنے میں گھاٹی پر سے ایک پچاس سی سی کا ہونڈا پھٹ پھٹ کرتا اُترا۔ سوار نے ہیٹ اُتار کر اپنے سنہری بال جھٹکے اور بولی ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یوں انتظار کرنا پڑا۔ آپ کو یقیناً کیمپنگ کی تلاش ہوگی کیونکہ آپ کے رُک سیک پر خیمہ بندھا ہوا ہے تو کیمپنگ ”آنیو“ میں چلے جائیے۔ بس نمبر ۱۳، یہاں سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر“ اُس نے بڑی پھرتی سے بیگ میں سے لوگالو کا ایک نقشہ نکال کر اُس پر کیمپنگ کے مقام پر نشان لگایا اور میرے حوالے کر دیا۔ ”میں ابھی ابھی ٹورسٹ بورڈ بنڈر کے گئی ہوں کیونکہ آخری گاڑی میں سے کوئی ٹورسٹ نہیں اُترا تھا۔ آپ شاید بائی روڈ آتے ہیں۔ بہر حال میں نے حسب عادت اُس درے کے قریب جا کر بیچھے نگاہ ڈالی تو آپ سٹیشن کے باہر کھڑے نظر آ گئے... مجھے افسوس ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی، خدا حافظ“ اس سے پیشتر کہ میں جھک کر گورنش بجا لاتا اُس نیک دل بی بی نے ہونڈا کو ایک لگ رسید کی اور پھٹ پھٹ کرتی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔

ایک بازار کا مختصر قصبہ ”آنیو“ اور ایک جنگل نما پارک میں سے جاتا رستہ اور جھیل لوگالو کے کنارے ”کیمپنگ آنیو“... کافی بار، سٹور، چمکتے ہوئے شادوز اور چمکتے ہوئے چارجرز۔ صرف خیمہ لگانے کا کرایہ تیس روپے فی شب۔ ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے پسندیدہ سوس چاکلیٹ ٹا ملر، تازہ مہک والے الپائن دودھ کے ساتھ نوش کئے اور پھر سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیٹ گیا، سردی تھی۔

دوسری صبح خیمے سے باہر آیا تو جھیل لوگالو کو نظر بھر کے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ سبز پانیوں پر اُترتی ہوئی روشنی وہ دھوپ تھی جو سوئٹزرلینڈ کے اس اطالوی حصے کا خاصا ہے۔ الپس کے اُس پار جہاں حصے میں سے آنے والی کادیں اکثر بادش میں جھلکتی آتی ہیں اور ان میں جھٹھرتے ہوئے سوس جھیل لوگالو کے کنارے پہنچتے ہی جاگیلے بنتے ہیں اور آنے والی تاریک سردیوں کے لئے دھوپ سمیٹنے لگتے ہیں... میں نے بھی

میلان سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد سوئٹزرلینڈ کے آثار شروع ہو گئے۔... سبزہ گہرا ہونے لگا۔ پہاڑوں کا حجم اور بلندی بڑھنے لگی، ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا بدن کو یوں چھو رہی تھی جیسے کورے کھڑے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہلکی کمر نیلی چٹانوں کے گرد سفید ہالے بناتے ہوئے تھی۔ ٹرین کسی وادی میں سے گزرتی تو معدوم ہوتی ہوئی کوئنج ساتھ ساتھ جلی آتی۔ ایک جھیل کا پانی نزدیک ہوتا گیا اور پھر ہم اُس سے پرے ہٹتے چلے گئے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی رُک گئی۔ یقیناً کوئی اطالوی سٹیشن تھا ورنہ سرحد نزدیک آتے ہی اطالوی اور سویس کسٹم والے پاسپورٹوں پر پھٹے لگانے کے لئے نمودار ہو جاتے۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ بعد ایک نیلی دردی والے گاڑی آتے کہنے لگے، اگر آپ لوگالو میں اُتر جائیں تو ہم آپ کی اجازت سے ٹرین کو واپس میلان بھیج دیں۔

باہر آیا تو لوگالو نہی تھا۔ چھوٹے سے پہاڑی سٹیشن پر کوہ الپس کی شاگرمی ہو رہی تھی۔ دور سر سبز پہاڑیوں اور مکانون کی سرخ چھتوں کے درمیان غریب آفتاب کے بعد کی ہلکی روشنی میں جھیل لوگالو کا پانی ظاہر ہو رہا تھا۔ ٹورسٹ بورڈ بند ہو چکا تھا۔ سٹیشن کے باہر ٹرک پر بھی سرد ویرانی تھی۔ میں حیران کھڑا تھا کہ اب رُخ

جھیل میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی نہیں گلشیر ہے، پاؤں گھسیٹ کر آگے بڑھاتے گھٹنے تالیاں بجانے لگے۔ چپکے سے باہر آگیا۔

”آج تو پانی اُبل رہا ہے۔“ کیمپنگ کا مالک کُردہ جھیل میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے بڑا پچھلے پہر میں نے اپنے آپ کو جھیل کنارے بلند ہوتے ہوئے پہاڑوں میں ایک پکڑنڈی پر پایا۔ خواہش تھی کہ میں الپس میں ڈوپوش چھوٹے چھوٹے غیر معروف دیہات کو دیکھوں۔ چڑھائی بے حد دشوار تھی مگر میں اپنے تھکتے ہوئے جسم کو انجانے مناظر و گناہم بستیوں کی نوید دیتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ایک ویران مقام پر ایک بد مزاج کسان میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں اُس کے ذاتی کھیت میں سے بلا اجازت کیوں گزر رہا ہوں... ایک بوسیدہ قصبے میں چند خوش مزاج بُل ڈوگزن نے میری ٹانگوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے شدید دانتنگی کا اظہار کیا... چوٹی پر واقع ایک تاریک چوٹی مکان میں سے ایک لڑکی باہر نکلی اور مجھے وہاں سے فوراً غائب ہو جانے کا حکم دیا... ان دلفریب انجانے مناظر کے بعد میں نے واپسی مناسب خیال کی اور جوگی اُتر پہاڑوں آیا۔

کیمپنگ واپسی کے لئے میں شاہراہ کے کنارے پر چلنے لگا۔ یکدم سامنے سے آتی ہوئی ٹریفک کے نظام میں کچھ گڑبڑ سی ہو گئی، کاروں کے ہارن بجنے لگے۔ ڈرائیو اپنے آدھے دھڑ باہر نکال کر ہاتھ ہلانے لگے۔ لڑکیاں بے قابو ہو کر میری طرف ہوائی بوسے پھینکنے لگیں۔ میں نے سوچا ہونہ ہو کسی مواصلاتی سیارے کی بدولت سوئٹزرلینڈ کے اس حصے میں پاکستان ٹیلی وژن کے پروگرام اُترنے لگے ہیں اور یہ سب حضرات میری ”بے مثل“ اداکاری وغیرہ سے دیوانے ہو کر خراج تحسین پیش کر رہے ہیں پھر ایک سکوتر سوار دوشیزہ نے مجھے دیکھا، فوراً بریک لگائی اور گھسٹتی ہوئی میرے قریب آئی۔ ”یہ سیلینگ سوٹ بہت ہی کیوٹ ہے۔“ اُس نے میرے پیراہن کی طرف اشارہ کیا اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔

”وہ سیلینگ سوٹ“ میرا کڑھا ہوا بوسکی کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار تھی جو اُس صبح

میں نے ہالیدے موڈ میں آکر پہن لیا تھا۔

کیمپنگ پہنچنے تک موٹروں کے ہارن اور نعرے میرا پیچھا کرتے رہے... ایک بات طے تھی کہ اگر کل صبح یہی کُرتہ شلوار پہن کر میں برن جانے والی سڑک پر کھڑا ہو جاؤں تو یہ ڈرائیور حضرات کے لئے سُم قاتل ثابت ہو گا اور وہ مجھے لفٹ دینے کی خاطر باقاعدہ قطاریں بنالیں گے...

دوسری صبح وہ کُرتہ شلوار واقعی سُم قاتل ثابت ہوا مگر میرے لئے... اُسی طرح ہارن بجتے، ہاتھ ہٹنے لگتے مگر بریکیں بالکل نہ لگتیں۔ کاریں اور ٹرک شرلاٹے ہوتے ہوئے قریب سے گزرتے رہتے۔ میں پوری صبح اور دھلتی دوپہر تک ایک ہی مقام پر انگوٹھا بلند کئے اُکرتا رہا... تین بجے کے قریب ایک ٹریکٹر والے نے مجھ پر کرم کیا اور وہاں سے اٹھا کر چند کلومیٹر کے فاصلے پر لاکھڑا کیا... برن پہنچنا تو دور کی بات تھی، اب میری صرف یہ آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے اگلے بڑے قصبے میلن زدنا تک پہنچ جاؤں... شام ہونے لگی تو ایک بوڑھے پادری کی کار چند سوئیٹر کے فاصلے پر جاؤں گی۔ میں بھاگتا ہوا اُس تک پہنچا تو وہ بولا۔ ”میں نے تمہارے لئے کار کھڑی نہیں کی، خود ہی کھڑی ہو گئی ہے پیچھے ہونے کی بنا پر۔“

”میں ڈکٹی میں سے ٹائر نکال لاتا ہوں“ میں نے فوراً پیشکش کی۔

ٹائر بدلنے کی کوشش میں شریک ہونے کی بنا پر پادری صاحب نے مجھے ساتھ بٹھالیا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“

”برن جاؤں گا۔“ میں نے انتہائی شائستگی سے عرض کیا۔

”برن؟... ہوں... تمہارا خیال ہے کہ میں درہ سینٹ گوٹھارڈ عبور کر کے سوئٹزرلینڈ کے دوسرے سرے پر واقع دارا غلغلے برن چلا جاؤں، صرف تمہیں بھڑکنے کی خاطر... میں یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر لوکارنو جا رہا ہوں۔“

”لوکارنو جاؤں گا۔“ میں نے سر تسلیم فروداً ختم کیا۔

سوسٹر لینڈ کے سیاحی کتا بچوں میں حسین ترین تصاویر لوکار نو کی ہوتی تھیں جہاں لوکار نو کے کنارے اطالوی مزاج کی دھوپ سے دکھتا شہر، پام کے درخت اور کبڑی پہاڑیوں والے جزیرے... جب کبھی سوسٹر لینڈ آتا تو لوکار نو کسی نہ کسی طرح بس ہوتا۔ اب میں ایک پادری کی برکت سے وہاں جا رہا تھا۔

زمین جیسے کار کے نیچے سے پھیننے لگی ہو۔ ہم ایک لینڈنگ کرتے ہوئے جہاز کی طرح نشیب میں اترنے لگے۔ دائیں ہاتھ پر ہانسرہ دادی سے مماثلت رکھتا ہوا ایک پیالہ نما میدان تھا جس میں بہین زدنا کا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ پادری بابا نے کار دائیں طرف موڑ لی۔

”کہاں اتر دگے؟“ لوکار نو کے نواح میں پہنچنے پر اُس نے بے رخی سے پوچھا۔  
 ”کیمپنگ“ میں نے بھی قدرے بے رخی سے جواب دیا کہ طوطا چمی کا یہی تقاضا تھا۔  
 لوکار نو میں سوسٹر لینڈ کی سب سے بڑی کیمپنگ سائٹ ہے مگر اس کے گیٹ پر ”کپلیٹ“ کا بورڈ آویزاں تھا یعنی جگہ نہیں ہے۔

”کیا بالکل جگہ نہیں ہے؟“ میں نے کاؤنٹر پر دریافت کیا۔

”بالکل نہیں ہے،“ نوجوان کلرک خاصا سرد مزاج تھا۔

”میرا خیمہ تو بالکل چھوٹا سا ہے... آنا سا“ میں نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔

”چھوٹے سے خیمے کے لئے بھی جگہ درکار ہے... جو نہیں ہے۔“

باہر سڑک پر صرف ایسے لوگ تھے جو جھیل کے پانیوں پر جھکے لوکار نو کی حسین شام سے ملنے آئے تھے۔ سپورٹس شرٹس اور شارٹس پہنے ہوئے سیاح لڑکے اور لڑکیاں، وحشی خوشی کی بے جہت بلند گفتگو... ان سب کے پاس پناہ گاہیں تھیں جہاں رات ڈھلے دہ کافی، واٹن اور بدن کی خوشبودن میں رچے واپس لوٹ سکتے تھے اور میں دن بھر کی تھکاوٹوں اور درک سیک کے بوجھ سے جھکا ہوا، مھوک سے نڈھال انہیں رنگ اور نفرت کی اُن نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے ایک جھوکا شخص رستوران کے اندر خوراک

چُکے لوگوں کو دیکھتا ہے... میں نے داہنی طرف نگاہ کی۔ ان خوش باش لوگوں سے پرے ایک پہاڑی تھی جس کی اوٹ میں سے لوکار نو شہر کے چند مکان اور اُن کی برج چھتیں دکھائی دے رہی تھیں اور اُن کے نیچے شاید وہ جھیل تھی، پام کے درخت تھے اور وہ جزیرے تھے جن کے گرد وحدت کی دجہ سے دھند سی چھائی رہتی ہے... لوکار نو پر بس ہو گیا تھا۔

میں ان خوش نصیبوں کی مخالف سمت میں شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چلنے لگا۔ میرے ایک کوڑھی بستی سے گریز کرتا ہوا نکلتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ دو تین کلومیٹر چلنے کے بعد میں کھلی فضا میں آنکلوں گا اور کہیں بھی خیمہ نصب کروں گا مگر آبادی ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ مکان، فلیٹ، دفتر برابر ساتھ دے رہے تھے۔ البتہ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ لوگ لوکار نو میں تھے... میرے دائیں جانب ایک بلند پہاڑی تھی۔ ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا۔ چوٹی کے گرد سیاہ بادل کا ایک گڑھا تھا۔ لحوں میں وہ وبا کی طرح پھیلنے لگا، بجلی چمکنے لگی، بادل نیچے تک آگیا اور بارش شروع ہو گئی... ریلوے لائن کے پار ایک راستہ جا رہا تھا۔ میں بھیکتا ہوا کسی بے آباد جگہ کی تلاش میں اُس پر اتر گیا۔ سردی تھی... کہیں کہیں رہائشی مکان کھڑکیاں بند، روشنی باہر آتی ہوئی مجھے اُن کے مکینوں کی عافیت سے چڑھتی ہوئی۔ ایک دو منزلہ مکان پر گارڈ نے دینڈا درج تھا اور برآمدے میں سومنگ کا سیٹوم پہنے ایک جوڑا بھیکتے آسمان لطف افسردہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ انگریزی جانتے ہیں؟“ میں نے سڑک پر سے پوچھا۔

”ہاں... ہم انگریز ہیں... اگر تم رہائش کی تلاش میں ہو تو یہ ہوٹل بھی فیل ہے۔“ لکھنے میرے شہر ابور حلیے پر ایک رحم آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں تو یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں باغیہ نصب کر سکوں؟“

رکھے ہوتے تھے۔ فرش پر ایک چھوٹا سا غالیچہ تھا اور دھلی ہوئی کپاس کی حدت تھی۔ ایک روشندان بھی تھا جس کے چوکھٹے میں سے سڑک پر سے گزرنے والوں کے پاؤں نظر آتے تھے... میں نے کپڑے اتار کر تولیے سے اپنے آپ کو خشک کیا اور پھر سلپنگ بیگ بچھا کر اُس پر لوگانو سے خرید شدہ دوست چکن کا ایک حصہ اور ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے سجا کر بڑے اہتمام سے ڈنر کرنے لگا... کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلگایا اور بیگ پر لیٹ گیا... چند لمحے پیشتر میں ایک بے سہارا بھگیتا ہوا بھوکا بدن تھا اور اب ایک آسودہ حال اور محفوظ سیاح... میں مزے میں تھا۔

”ہیلو“ دوش دان پر ایک بھوری داڑھی جھکی ہوئی تھی۔ ”کیسے ہو؟“  
”میں جھول رہا ہوں مزے سے“ پتہ نہیں کون تھا۔  
”اگر تم فارغ ہو تو آؤ سیر کریں“

بارش ختم ہو چکی تھی۔ آسمان نہلاتے ہوئے بچے کی طرح صاف تھا۔ روشندان کے قریب ایک طویل قامت بھوری داڑھی والا سخت بے ڈھنگا شخص کھڑا تھا۔  
”میں فلپ ہوں“ اُس نے ہاتھ آگے کر دیا۔ ”اسی ہوٹل میں رہتا ہوں، اُدپر والے کمرے سے تمہیں دیکھ رہا تھا... شام کی سیر کے لئے نکلا تو سوچا تمہیں بھی پوچھ لوں اور تو کوئی میرے ساتھ چلنے پر رضامند نہیں ہوتا“

تھوڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کے ساتھ چلنے پر اور کوئی رضامند کیوں نہیں ہوتا۔ فلپ ایک آپرا سنگر تھا اور لوکارنو کے کسی کلب میں بقول اُس کے ”پر فارم“ کرتا تھا۔ تمام قن کاروں کی طرح اُسے بھی کلمہ تھا کہ اُس کی قدر نہیں کی جاتی۔  
”اگر وہ میرے ٹیلنٹ کو نہیں پہچانتے تو خسارہ اُن کا ہے...“ وہ اپنی بھوری داڑھی سنوارتے ہوئے بولتا چلا جا رہا تھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگر میں میلان یا دی آنا کے آپرہاؤس میں پر فارم کروں تو شائقین کی تالیریں سے اُن کی چھتیں اُڑ جائیں۔“  
اُسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ماریا کالا س سے بھی اُدنچے نمروں میں گاسکتا ہے چنانچہ

”ہاں“ لڑکی بارش میں بھیگتی ہوئی جنگلے کے اُس طرف اکھڑی ہوئی۔ ”لوکارنو میں ایک بہت بڑی کیمپنگ سائٹ ہے، وہاں چلے جاؤ۔“  
”وہ نل ہے۔“ میں نے بالوں میں تیرتے پانی کے لئے سر جھٹکا۔ ”ویسے کیا یہ ممکن ہے کہ میں ہوٹل کے اس مختصر لان میں خیمہ لگا لوں؟“  
”پتہ نہیں...“ وہ تذبذب میں تھی۔ ”پتہ نہیں... تم ٹھہرو میں ہوٹل کے مالک رولینڈ کو بلاتی ہوں۔“

رولینڈ منہ میں سگار دہاتے برآمد ہوا۔ پستہ قد اور بے حد فریب... میں بارش میں کھڑا زبردستی مسکراتا رہا اور وہ برآمدے کی پناہ میں اطمینان سے سگار پیتا رہا۔  
”اتنی تیز ہوا میں اور اس بارش میں... لان میں خیمہ؟... اُڑ جائے گا۔“  
”میں اس میں بیٹھا رہوں گا... نہیں اُڑے گا۔“  
”بارش اتنی شدید ہے کہ تم خیمے میں بھی بھیگ جاؤ گے...“  
”اس سے زیادہ نہیں جتنا میں اب بھیگ رہا ہوں۔“  
رولینڈ سوچ میں پڑ گیا۔ انگریز جوڑے نے بھی شاید میرے لئے سفارشی کلمات کہے۔  
”پاسپورٹ ہے؟“

میں نے جیب ہتھکی۔  
”سلپنگ بیگ؟“

میں نے رگ سیک کی طرف اشارہ کیا۔  
”لانڈری روم میں سو جاؤ گے؟“  
”اگر اُس کی چھت ہے۔“  
”آجاؤ۔“

لانڈری روم ایک مختصر سا تہ خانہ تھا جس میں استری کرنے کی میز اور دھلی ہوئی تہ شدہ چادروں کا ایک انبار لگا تھا۔ شیلفوں میں جام، پیپر اور جینی کے سینکڑوں پیٹ

اُس نے ہاتھ لہرا کر اپنا کھلا اور شروع ہو گیا۔ پورے دس منٹ تک میرے کان بہرے کرنے کے بعد بولا "کیسا ہے؟"

اگر میں کچھ دیر پہلے بھوکے پیٹ پر یہ گانا سن لیتا تو یقیناً بیہوش ہو جاتا...

"در اصل آکر کھڑا کا ساتھ نہیں ہے اس لئے تاثر میں شدت پیدا نہیں ہو رہی۔" اُس نے میری رائے کا قطعی برائہ مانا اور مناسبت سے گفتگو کرتا رہا۔ "آج رات گیارہ بجے میں لوکار نو میں پر فارم کروں گا، تم بھی چلو، میرے دوست کی حیثیت سے تمہارا داخلہ مفت ہو گا۔"

عام حالات میں شاید میں اس نیم جہلی آپریشن کے ساتھ دوستی کا ٹھک لیتا کہ ایسوں کی رفاقت ہمیشہ پر لطف رہتی ہے مگر میں واقعی تھک چکا تھا میں نے مندرت کرتے ہوئے اُسے اپنا کارڈ دیا۔ "زندگی میں جب تم میلان کے آپریشن کی سٹیج پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے خط لکھنا، میں خاص طور پر تمہیں سُننے کے لئے پاکستان سے آ جاؤں گا۔"

"واقعی؟" فلپ کا چہرہ یوں دمک اٹھا جیسے اُسے میرے وعدے پر مکمل یقین آ گیا ہو۔ مجھے پاکستان میں رہتے ہوئے ہمیشہ خدشہ رہا کہ کسی روز واقعی فلپ کا دعوت نامہ آ جائے گا۔

دوسری صبح رولینڈ مجھے کچن میں لے گیا۔ "میں نے آج تک جس کسی کو بھی لائڈی روم میں سونے کی اجازت دی ہے، اگلی صبح پیر اور جام کے ایک ددو بے ہمیشہ کم ہو جاتے تھے۔ تم میرے پہلے غریب مگر ایماندار ٹورسٹ ہو اس لئے تم سے کرایہ بھی نہیں لوں گا اور ناشتہ بھی میری طرف سے..."

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے رولینڈ کی غیر متوقع مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور سامان اٹھا کر ایک تروتازہ چلبلا تے ہوئے جذبے کے ساتھ، "اوہ کیا خوبصورت

صبح ہے،" گنگنا تا ہوا باہر آ گیا... اور یہ ایک خوبصورت صبح تھی نیلیگوں آسمان اور ستھری دھلی ہوئی دھوپ... میں بیلن زونا جانے والی سڑک پر اکھڑا ہوا رک سیک زمین پر رکھ کر میں ابھی گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک سفید جیپ مجھے روکنے کی آرزو میں بال بال ناکام ہوتی ہوئی سڑک پر قدرے بے قابو ہو کر رک گئی۔ مجھے صرف ایس بلائڈ بالوں کا ایک سر دکھائی دیا۔ اتنے میں وہ ایک جھٹکے سے دوبارہ سٹارٹ ہوئی اور بیک گتیر پر پوری رفتار سے میری طرف آنے لگی میں اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔

ایس بلائڈ بال جو کسی عمدہ ڈائی سے بیچ کئے گئے تھے۔ گول بڑا سارا شیر نما چہرہ جس پر ڈکار کئے گئے تشکاروں کی طمانیت۔ ایک وہابی سی ناک اور اتنا ہی غیر وہابی کھلے دہانے کا منہ اور اُس میں پیلے پڑتے ہستے ہوئے دانت۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے فرک میں تھی۔ فرک کے اندر بھی مگر باہر زیادہ اور بہت سفید سفید۔ خواتین پہلوؤں کے مقابلوں میں اس قسم کے وجود دیکھنے میں آتے تھے۔ اُس نے اپنی وسیع ران پر ہاتھ مار کر اطالوی میں پتہ نہیں کیا کہا اور لوٹ پوٹ ہو گئی۔ میں اُسے ایک ایسے بچے کی طرح گم سم کھڑا دیکھتا رہا جو اپنے والدین کی کوئی ایسی حرکت دیکھ لیتا ہے جو اُسے بالکل نہیں دیکھنی چاہیے تھی۔ اُس نے پھر اطالوی میں کچھ کہا اور ران پر پھٹیلی مارا کر اشاروں سے سمجھایا کہ بیٹھو بیٹھو۔

میں بیٹھ گیا۔ اُسی لمحے جیسے کسی نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر دھکا دے دیا ہو، میں پیچھے کی طرف گرا اور جیپ ایک گیلی شمر کی طرح سڑک پر پٹا ختی تیرنے لگی۔ یہ زمانہ خاتون چیخ چیخ کر کوئی اطالوی گیت بھی گا رہی تھی جس کے دوران وہ خوش ہو کر کبھی "اے ہاتھ سے اپنی ران پر تالی سی بجاتی اور کبھی بائیں ہاتھ سے میری ران پر... ہم زیادہ بلندی پر تو نہ تھے مگر بل کھاتی ہوئی سڑک پر یہ جھومتی ہوئی سفید جیپ اگر کسی بھی موڑ پر سیدھی چلی جاتی تو ہم بھی یقیناً... چلے جاتے۔ سپیڈ میٹر کی سونٹی



درجن بھر کاروں کو نہلایا ڈھلایا گیا اور پالش کی گئی اور میں لفٹ کی امید میں دوپہر تک وہیں کھڑا سوکھتا رہا۔ بالآخر سامنے کے فلیٹوں سے ایک کار نکلی اور سیدھی میرے پاس آگئی۔

”تم نے میزری چھٹی کا دن برباد کر دیا ہے، اخبار بھی نہیں پڑھنے دیتے، سیلینگ سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان خن کی ہڈیوں پر مڑھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کم سے کم گوشت استعمال کیا تھا، مجھے کھوڑتے ہوئے بولا۔ اب میں اس فقرے کا کیا جواب دیتا، خاموش کھڑا رہا۔

”اب بیٹھ بھی جاؤ۔“ اُس نے دروازہ کھول دیا۔  
میں بیٹھ گیا۔

”میں سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہوں۔“ اُس نے ناگواری سے ناک چڑھائی اور کار سٹارٹ کر دی۔ ”آج صبح کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اخبار کھولا تو تم نظر آ گئے۔ اور پھر نظر آتے رہے، تم میرے اعصاب پر سوار ہو گئے۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ یہ شخص میاں سے چلا کیوں نہیں جاتا، مجھے اخبار کیوں نہیں پڑھنے دیتا... اب واحد علاج یہی تھا کہ میں خود ہی تمہیں اپنی کار پر چند کلومیٹر آگے چھوڑ آؤں...“  
ایک کراسنگ پر اُس نے کار روک دی۔ کوہ الپس پار کرنے کے لئے یہاں سے دو راستے نکلتے ہیں۔ دائیں طرف درہ سان برناڈینو اور بائیں جانب سینٹ گوٹھارڈ... کس طرف ڈراپ کروں؟

”کیں بھی آتا رہیں، مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

”عجیب سیاح ہو۔“ اُس نے جھلا کر کہا۔ ”پتہ ہی نہیں ہے کہ کس طرف جانا ہے... جلدی فیصلہ کر دیں واپس جا کر اپنا اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔“  
میں نے جیب میں سے ایک سکہ نکال کر ٹاس کیا۔ سینٹ گوٹھارڈ کی قیمت نیرنگلی۔ کراسنگ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر اُس نے مجھے آتا دیا اور میں ایک مرتبہ پھر

سو کلومیٹر کے ہندسے کے آس پاس منڈلا رہی تھی اور وہ گا رہی تھی اور ہارن بج رہی تھی اور اس کا ہلکا لباس ایک پیراشوٹ کی مانند بار بار اوپر اُٹھ رہا تھا اور جب بھی اُس کا لباس اوپر اُٹھتا میں بھی اوپر دیکھنے لگتا کہ نیچے کیسے دیکھتا... بخاتون لقیلا ”کاروباری“ تھی اور لوکار نو میں کسی سیاح کی جیب ہلکی کر کے صبح صبح واپس آ رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ جب اُس نے نہایت دل ہلا دینے والے انداز میں موٹر کاٹے تو میں نے اُسے روکنے کے لئے کہا مگر وہ اُسی طرح ہنستی رہی اور گاتی رہی۔ اگر ہم ٹرک پر اب تک موجود تھے تو کمال قسمت کا بھی نہ تھا، دوسرے ڈرائیوروں کا تھا... ایک دم جیب رکی اور میں تقریباً پھلانگ مار کر باہر آ گیا... یہ بیلن روزنا کا مرکز تھا اور وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہنسنے چلی جا رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ٹرک سیک باہر نکالا کہ کہیں جیب خود بخود پھر نہ چل پڑے اور ابھی اپنے اعصاب درست کر رہا تھا کہ اُس کی دو سہیلیاں نمودار ہو گئیں۔ اُن کی صبح بھی اُن کی رات کا فسانہ کہہ رہی تھی۔ اُنہوں نے پہلے تو میرا بغور معائنہ کیا۔ میرے کندھے محسوس کئے، گالوں کو ہچکچھایا جیسے کھوڑا خرید رہی ہوں اور پھر اپنی سہیلی کو مبارکباد دینے لگیں۔ گفتگو میں بار بار ”لا آمور“ یعنی محبت کا ذکر آ رہا تھا۔ پھر سفید جیب دالی نے اُسی طرح ہنسنے ہنسنے شاید انہیں بتایا کہ یہ تشکار نہیں ہے، ایک غریب سیاح ہے۔ اس پر اُنہوں نے کمال آفت سے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی... میں نے اُن تینوں کے درزشی جُستوں کی طرف دیکھا اور اپنی ناتوانی کا اظہار کرتے ہوئے اجازت چاہی جو بے حد مشکل سے ملی کیونکہ وہ خدا حافظ کہنے کے تمام یورپی رداجوں پر صدق دل سے عمل کرنے لگیں اور بہت زیادہ کرنے لگیں، یہاں تک کہ عوام نے اس فعل کو نا پسندیدگی سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنے گیلے گیلے گال سہلاتا شہر سے باہر آیا اور ایک مرد سٹیش کے سامنے کھڑا ہو کر لفٹ کے لئے قسمت آزمائی کرنے لگا... میرے سامنے اُس مرد سٹیشن پر

”اور سگرٹ؟“

”پتیا ہوں۔“

”تو پھر تم میری کار میں نہیں بیٹھ سکتے۔“

”کیا وہ موٹر کاٹتے ہوئے تمہارے دل میں یکھت یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ میں سگرٹ کے کنارے کھڑے اس مسافر کو فوراً اپنی کار میں بٹھالوں...“

اُس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں... میں نے...“

”تو پھر تم مجھے کار میں کیوں نہیں بٹھاتے، یہ تو خدائی احکام ہیں جو تم پر نازل ہوئے...“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُسے اپنی تازہ ترین دعا کی تفصیل بتائی۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ”لیکن سگرٹ تم پھر بھی نہیں پی سکتے، یہ ہمارے خدائی احکام ہیں۔“

میں کبڑا ہو کر چھوٹی سی بستران میں گھس گیا۔

حجام کی دکان سے برآمد ہونے والے کسی شخص کی طرح ڈینیل بے حد صاف اور نفیس ہنک والا ایک لڑکا تھا جو آئینہ کیمپنگ میں ہی چند روز گزارنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ اُس کی گفتگو میں ایک مہذب اور متین آہستگی تھی جو اُس کی عمر کے نوجوانوں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔

”کیا تمہیں یقین تھا کہ لفٹ کے لئے تمہاری دعا قبول ہو جائے گی؟“ اُس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں... آں... بس۔“

”میں خود لاڈ پر شدید اعتقاد رکھتا ہوں، میں مارمونائٹ ہوں۔“

”اچھا... تو آپ عیسائی نہیں ہیں۔“

”عیسائی تو ہوں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”مگر مارمونائٹ عیسائی ہوں۔“

”اچھا... بہت خوب۔“ کوئی دہائی اور دیوبندی قسم کا جھگڑا تھا۔

سڑک کے کنارے ایستادہ ہو گیا۔ اب میرے اور برن کے راستے میں صرف الپس کا سلسلہ کوہ حائل تھا جسے مجھے پار کرنا تھا اور یہ اتنا مشکل کام بھی نہ تھا کہ سہنی بال نے درجنوں ہاتھیوں سمیت اسے عبور کر لیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد احساس ہوا کہ شاید الپس کو عبور کرنے کے لئے ہاتھیوں کی کمپنی بہت ضروری ہوتی ہے، اسے اکیلا شخص پار نہیں کر سکتا... ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ بیلن زدنا کی طرف سے کبھی کبھار کوئی کار آتی اور مجھے کنارے پر آگاہ ہوا کوئی ایپائن درخت سمجھ کر بغیر رُک چلی جاتی... مزید ایک گھنٹہ گزر گیا اور اس دوران مجھے سگرٹ کی طلب ہوئی جو ختم ہو چکے تھے۔ میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ یا اللہ اگر کسی ڈرائیور کے دل میں رحم کی گنجائش پیدا نہیں کر سکتا تو کم از کم ایک سگرٹ کا تو انتظام کر دے... اگلی کار جو سڑک پر نمودار ہوئی، فوراً رُک گئی۔

ڈرائیور نے سر باہر نکال کر کہا۔ ”یہ راستہ سینٹ گو تھارڈ کو جاتا ہے یا سینٹ برنارڈینو کو۔ ہم پھیلی کراسنگ پر سائن نہیں پڑھ سکے۔“

”سینٹ گو تھارڈ کو۔“

”شکریہ۔“ ڈرائیور نے سگرٹوں کا ایک پکیٹ کھڑکی سے باہر مٹتی کر دیا۔ ”سگرٹ؟“

میں نے مشکور ہوتے ہوئے سگرٹ نکالا اور ساتھ ہی کارڈسٹارٹ ہو کر میری

نظروں سے غائب ہو گئی۔ بہر حال ماچس میرے پاس تھی۔

”اب سگرٹ پلایا ہے تو لفٹ کا انتظام بھی کر دے... میں نے ایک طویل کش لے کر آسمان کی طرف دیکھا... آخری کش سے پہلے ہی یہ دعا بھی پوری ہو گئی۔“

ایک کھلونا نما چھوٹی سی بستران میرے قریب اس طرح آکھڑی ہوئی جیسے میرا ذاتی شو فر اُسے میرے لئے وہاں لے آیا ہو۔ ڈرائیور نے بٹھانے کے لئے دروازہ نہیں

کھولا۔ کھڑکی میں سے ہی پوچھا۔ ”چرس پیٹے ہو؟“

”نہیں۔“

”تم امریکی پیغمبر جوزف سمتھ کے بارے میں آگاہ ہو؟“  
 ”امریکی پیغمبر؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔“ میرا خیال تھا امریکہ میں صرف صدر ہوتے ہیں یا گینگسٹر ہوتے ہیں یا دونوں ہوتے ہیں۔“  
 ”اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ بتاؤں۔“  
 میں بھلا نا پسند کیسے کرتا، اُس کی کار میں سوار تھا۔

”جوزف سمتھ ایک مقدس روح تھا۔ ایک روز عبادت کے دوران پیغمبر مودنی نے اُسے بشارت دی کہ مانچسٹر نیویارک کے قریب ایک پہاڑی کوراہ میں ایک صندوق دفن ہے جس میں دھات کی چند قدیم پلیٹیں موجود ہیں، انہیں تلاش کرو اور اُن پر کندہ قدیم عبارت کو انگریزی میں ترجمہ کر کے خلق خدا کے سامنے لاؤ۔ جوزف نے ایسا ہی کیا اور یوں ہماری ”بک آف مارمون“ وجود میں آئی جو بیت المقدس میں مقیم ایک ایسے خاندان کی تاریخ ہے جو قبل از مسیح ہجرت کر کے جنوبی امریکہ میں آباد ہو گیا۔۔۔ ہمارے عقیدے کے مطابق مصلوب ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ کا نزول جنوبی امریکہ میں ہوا۔۔۔“

”کمال ہے حضرت عیسیٰ امریکہ میں۔۔۔“ میں حیرت زدہ ہو گیا۔ ”وہ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”اُن کا نزول ہوا تھا۔ وہ سختی سے بولا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بائبل کے ساتھ بک آف مارمون پر ایمان لانے سے ہی انسان ایک مکمل عیسائی ہو سکتا ہے ورنہ وہ کافر ہے۔۔۔ پوری دنیا میں ہمارے لاکھوں ہم مذہب ہیں اور ہم اپنی عبادت گاہوں کو ”ٹمپل“ کا نام دیتے ہیں جن میں بڑے بڑے تالاب ہوتے ہیں اور ہم ان میں اپنے آپ کو ڈبو تے ہیں۔۔۔“

”اچھا۔“ میرا منہ کھل گیا۔ ”یعنی آپ زندگی کے آخری ایام میں اپنے آپ کو ڈبو لیتے ہیں اور سیدھے جنت میں چلے جاتے ہیں۔“

”نہیں، ایسا نہیں۔“ ڈینیئل ایک پہنچے ہوئے پیر کی مانند میری کم علمی پر مسکرایا۔  
 ”سمجھتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص ہتھم نہیں ہوتا اُس کی بخشش ناممکن ہے۔۔۔“  
 ”ہتھم سمجھتے ہو؟ جان دی بیپٹسٹ مسیح کی ولادت سے پیشتر عوام کو دریائے اردن میں غسل دے کر آنے والے پیغمبر کے لئے پاک کرتے تھے۔۔۔ چنانچہ ہتھم کے بغیر کوئی شخص بخشا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اب سوال یہ ہے کہ دنیا کی موجودہ آبادی تو ہتھم ہو کر بخشی جائے گی لیکن ہمارے آباء اجداد کا کیا بنے گا جو عیسائیت کی آمد سے پیشتر اس دنیا میں رہتے تھے، اُن بے چاروں کا کیا ہو گا۔۔۔“  
 ”ہاں۔۔۔ واقعی اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”چنانچہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اُن رشتہ داروں کے لئے مقدس پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے۔۔۔ ایک رشتہ دار کے لئے ایک ڈبکی۔۔۔ میں فی الحال آج سے تین ہزار سال پیشتر پیدا ہونے والے رشتہ داروں کو تو بخشو اچکا ہوں، باقی تقریباً سات ہزار سال والے وہ گئے ہیں۔۔۔ برن کے نواح میں ہمارے ٹمپل کی عمارت ہے اور میرا باپ اُس کی دیکھ بھال پر مامور ہے۔“

”انشاء اللہ کبھی آپ کے تالاب میں نہانے کے لئے آئیں گے۔“ میں نے خوشدلی سے کہا۔

”نہیں۔“ وہ درشتگی سے بولا۔ ”غیر مذہب کے لوگ ہمارے ٹمپل میں داخل نہیں ہو سکتے۔“  
 میں نے اپنی مایوسی ظاہر کرنے کے لئے ایک لمبی ”اوه“ کی۔ شدید مذہبی ہونے کے وجود ڈینیئل بہت ہی عمدہ رفاقت تھا۔

مجھے خشکی کا احساس ہوا۔ باہر نگاہ کی تو سڑک کے دونوں طرف برف کی دبیز ڈھاریں تھیں اور اُن کا پانی پچھل پچھل کرتا رکول پر پھیل رہا تھا۔ کار آہستہ آہستہ اوپر بڑھتی رہی۔ پھر ایک کشیدہ شروع ہو گیا اور بالآخر ہم برف سے ڈھکے ہوئے وہ برف کو تھارڈ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ڈینیئل نے کار پارک کر دی۔ باہر برف بستہ ہوا تھی۔

مگر اُس میں آکسیجن اتنی کم تھی کہ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ میں نے لپکپاتے ہاتھوں سے اپنی جیکٹ کے تمام بٹن بند کئے مگر ہوا تھی کہ مجھے ننگا کئے دیتی تھی۔ گھنیر میں سے گھپلتے پانی کا ٹپکتا شور تھا اور میں اس بلند درے پر تھا اور دوسری طرف نیچے کہیں بُرن کا شر تھا... میں نے درہ سینٹ گوٹھارڈ کی چوٹی پر واقع رستوران سے جیسی کو فون کیا۔

## جیسی

یہ بھی اُنہی دنوں کا قصہ ہے جب نوخیز جسم سرحدیں عبور کرتا ہے۔ اولین تجربوں اور محبتوں کی کسک سے خائف بھی رہتا ہے اور اُس کا لوں لوں اُن کی خواہش بھی کرتا ہے۔ وہ ان گرم اور رستے احساسات کی بخار آلود دھند میں ہر منظر ہر بدن کے اندر جانا چاہتا ہے۔ یہ وہی دن تھے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر سطح راج ہنس کی صورت دکھائی دیتی ہے اور جیسی تو تھی ہی راج ہنس وہ مجھے پتہ نہیں کیا دکھائی دی۔

پہاڑوں کی تاریک رات میں میں نے اپنا خیمہ ٹٹول ٹٹول کر نصب کیا۔ کیمپنگ سائٹ میں خاموشی تھی اور پانی کے چلنے کی سرگوشی اور ایک ہوا جس میں برف کی خشکی تھی... یہ سوئٹزرلینڈ سے میری پہلی ملاقات تھی اور ایک کارڈرائیور نے رات کی سیاہی میں مجھے جانے کہاں آتا دیا تھا... صبح نے روشنائی دی تو میں نے دیکھا کہ یہ انٹر لاکن تھا اور میرا خیمہ جھیل برینزا اور جھیل تھن کو ملانے والی نہر کے کنارے ایک سرسبز ڈھلوان پر ایک سست پرندے کی طرح پر سمیٹے بیٹھا تھا۔ سامنے نہر کے پار شہر اور اس سے پرے ینگ فرائی یعنی سفید دھن، ایک برف پوش پہاڑ۔

دوپہر کے کھانے کے لئے میں کیمپنگ کے کافی ہاؤس میں چلا گیا۔ مینو پر درج نام بد مزہ یورپی خوراکوں کے تھے۔ ”کیا آپ کے پاس چاول وغیرہ نہیں ہیں؟“ وٹرس نے نفی میں سر ملایا اور مجھے کچی مچلی کا ایک سینڈوچ دے گئی۔

پچھلے پہر میں نے شہر دیکھا، جھیل دیکھی۔

میں نے شدید اکتاہٹ سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ایک کُنڈ زمین طالب علم کی طرح کھڑی تھی۔

”میں آتشبازی میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔“

”لیکن یہ جھیل حقن کے کنارے ہوگی، پانی کے عین اوپر۔“

”اب رات کے بارہ بجے کون دھکے کھاتا پھرے...“ میرا لہجہ کسی سوئس گلشیئر سے بھی سرد تھا۔ ”اور تپ نہیں اتنی طویل جھیل کے کون سے مقام پر یہ تماشا ہوگا میں ذرا سہم بھی نہیں جانتا...“

”میں جانتی ہوں... میں لے چلوں گی۔ رات بارہ بجے ادھر کافی ہاؤس کے باہر آجانیے گا؟“ وہ جیسے ایک شاہی فرمان پڑھ کر فوراً کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور گاہکوں سے بل وصول کرنے لگی۔

دوبارہ خیمہ لگاتے ہوئے میں شدید غصے اور بے چارگی میں مبتلا رہا کہ آخر یہ سوئس لڑکی تقریباً تشدد کے ذریعے ہی کیوں مجھے یہ آتشبازی وغیرہ دکھانا چاہتی ہے۔ میں نہیں دیکھنا چاہتا تو کیوں دکھانا چاہتی ہے... انکار میں اس لئے نہ کر سکا کہ اُس نے زنجیر مہلت ہی نہ دی۔ بس فرمان پڑھ دیا۔

اُس رات بارہ بجے میں ایک طویل میدان میں تقریباً دوڑتا ہوا چل رہا تھا میرے لئے یہ میدان اس لئے تھا کہ ارد گرد تاریکی اتنی کھنی اور گاڑھی تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بڑے ٹخنے اور گھٹنے پتھروں سے چھل چکے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ایک نندی اُبھر گیا پھر کوئی کوہستانی راستہ آگیا۔ میرا سانس پھول رہا تھا... البتہ وہ سیاہ ایل والی خاتون بڑی لا پرواہی سے میرے آگے آگے چلی جا رہی تھی کبھی کبھار رُک کر بچہ دیکھ لیتی کہ میں فراد تو نہیں ہو گیا اور پھر ایک قدرے صحت مند بہن کی مانند دلائیں برتی پتھروں اور چشموں کو پھلانگی چل دیتی۔ اُسے شاید تاریکی میں بھی نظر آتا تھا... بالآخر ہم اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں آتشبازی کا مظاہرہ ہونا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی

دوسرے روز میں نے سامان باندھا اور کافی ہاؤس میں آگیا۔ روانگی سے پیشتر میں کچھ کھالینا چاہتا تھا۔ ویٹرس نے اس مرتبہ کمال مربانی سے مینو میرے سامنے رکھا اور مسکراتے ہوئے آخری سطر پڑھنے کو کہا۔ اُبے ہوئے چاول اور ہیکرین گولاش... صرف پاکستانی مسافر کے لئے۔ یہ یقیناً ایک انتہائی خصوصی توجہ تھی اور میں نے کھانے سے فارغ ہو کر ویٹرس کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکراتی رہی اور کاؤنٹر کی طرف دیکھتی رہی۔ میں ادائیگی کے لئے کاؤنٹر پر آگیا۔

”کیا آپ نے اپنی ملکی خوراک کو پسند کیا؟“

”جی ہاں، شکریہ۔“

”آپ کل بھی اسے مینو پر پاتیں گے؟“ کیشئر ملکی نے کاروباری انداز میں کہا۔

”شکریہ لیکن کل تو میں یہاں نہیں ہوں گا، میں جا رہا ہوں۔“

”لیکن آپ نہیں جاسکتے...“ اُس کے لہجے کی کرسنگی اُبھری اور یکدم وہ نرم پڑ گئی۔ ”وہ... میرا مطلب ہے آپ نے یہ شہر مکمل طور پر تو دیکھا ہی نہیں۔ ہم سوئس بھی برنیز اور برلینڈ کو ملک کا خوبصورت ترین حصہ قرار دیتے ہیں۔“

میں نے اسے بتایا کہ میں انٹر لاکن مکمل طور پر دیکھ چکا ہوں اور رُک بیٹھا تھا کہ باہر آنے کو تھا کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر کاؤنٹر سے باہر نکل آئی... سیاہ بال ادا نکھیں ایک تاریک گہرائی جو کبھی نہیں چمکتی، ہمیشہ جھج رہتی ہے۔ اس کے خدخال سوئس کی بجائے اطالوی تھے اور رنگت بھی برف سفید کی بجائے کاٹھے الپائن دودھ ایسی۔ وہ اتنی صحت مند تھی کہ انسان دیکھتے ہوئے شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ اس معاملے میں وہ قدرے بے قابو سی لگتی تھی۔ مجھ سے عمر میں بھی دو تین سال بڑی ہوگی۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل حقن کے کنارے آتشبازی چھوڑی جائے گی، اُسے دیکھنے بغیر تو آپ یہاں سے جا ہی نہیں سکتے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

بشکل اپنا پاؤں باہر نکالا اور نشست پر بیٹھ کر کچھ سے بھرے ہوئے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

”میں کھولتی ہوں۔“ اُس نے میرا ہاتھ بوٹ سے ہٹا دیا۔

اُس نے بوٹ اور جراب کو میرے گیلے پاؤں سے اتنی نرمی سے علیحدہ کیا جیسے نبات کر رہی ہو، پھر نہر سے پانی لا کر اُنہیں دھونے لگی۔ میں اپنا ننگا پاؤں نشست کے سرد پتھر پر رکھے اُسے حیرت سے نگار رہا۔ جراب پہنانے سے پیشتر اُس نے میرا پاؤں اپنی گود میں رکھا اور اُس پر جھجک گئی۔ اُس کے لبوں کی نمی محسوس کرتے ہی میں خوف زدہ ہو گیا۔

”تم سو کون؟“

”جیسی۔“ اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، اندھیرے میں اُس کی آنکھیں بجھتی ہوئی دیا سلائی کی طرح نو دے رہی تھیں۔

”تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ یہ لڑکی کسی ذہنی مرض کا شکار ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے فوراً کہا حالانکہ میں یہی سوچ رہا تھا۔

”اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو کہ میں بہت ہی آسان اور برے اخلاق کی لڑکی ہوں۔“

”بالکل نہیں۔“ میں یہ بھی سوچ رہا تھا۔

”مجھ سے جھوٹ مت بولو، میں جانتی ہوں۔“ وہ پھر سے میرے پاؤں پر جھجکنے لگی۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو، لیکن اب تم میرے ہو۔“

میں نے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔

”اور تم مجھ سے ڈرتے بھی ہو۔“ سنوکل دوپہر جب تم کافی ہاؤس میں داخل ہوئے، میں نے تمہیں دیکھا اور اُس لمحے کے بعد میرے تمام اختیار زندگی اور بدن کے نام سے ہوتے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔... میری دادی نے بتایا تھا کہ جیسی اپنی

اور جھیل کی سطح تاریک تھی۔ اُس نے ہاتھ اپنے کونوں پر رکھے اور وہاں ہاتھ رکھنے کے لئے خاصی جگہ تھی اور تیزی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے آتش بازی ختم ہو چکی، اور واپس چلیں۔“ اس سے پیشتر کہ میں سانس درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ پھر تاریکی میں تاریک ہو رہی تھی... بٹھو کر میں کھاتے، گرتے پڑتے اور اپنی زندگی سے بیزار ہوتے ہوتے جب میں واپسی کی دوڑ میں تھا تو ایک خیال میرے ذہن میں تیرا کہ یہ لڑکی یا تو فائز العقل ہے اور یا کوئی بدروح ہے بلکہ بدروح ہی ہے جو اندھیرے میں بھی بخوبی دیکھ سکتی ہے۔

کیمپنگ کے قریب برف پوش یگ فرا کے سائے میں ایک سبزہ زار تھا وہاں ایک سفید پتھر کی نشست تھی، میں اُس پر ڈھیر ہو گیا۔ سبزہ زار کے درمیان دونوں جھیلوں کو ملانے والی نہر بہہ رہی تھی۔ اُس نے بڑے اطمینان سے نہر کے کنارے پر جا کر مٹہ ہاتھ دھویا اور برفیلے پانی میں پاؤں اتار کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد میں ایک اُبلتے ہوئے انتقامی جذبے کے تحت اُٹھا اور اُس کے قریب جا کر لیٹ گیا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔

وہ بہت صحت مند تھی۔

”گھاس بہت ٹھنڈی ہے۔“ بالآخر اُس نے سرگوشی کی۔

”ہوں۔“

درختوں کی تاریک اوٹ میں سے ایک روشن کشتی یوں چلی آئی جیسے گھاس پر رداں ہو کہ نہر کا پانی لیٹے ہوئے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کشتی میں سوار لوگوں نے تو ہمیں نہیں دیکھا ہو گا۔...“ وہ دہی ہوئی بولی۔

”نہیں۔“ اولین تجربوں کی حدت جسم کو چھوڑ رہی تھی۔ میں اُٹھا اور سفید نشست

کی جانب چلنے لگا۔ مزید تھکا دوٹوں سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ کیا یہ سب کچھ ایسا ہی ہوتا ہے اور بس اتنا کچھ ہی ہوتا ہے... ایک جگہ گھاس کے نیچے کچھ تھا، میں نے

زندگی میں صرف ایک شخص سے محبت کرتی ہے اور وہ جب بھی اس کے سامنے آجائے اُسے پہچان جاتی ہے۔

”تمہاری دادی کون تھی؟“

”جیسی۔“ اُس نے مختصراً کہا۔

”اور آج رات جھیل تھن پر کوئی آتشباری نہ تھی؟“

”اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو تم چلے جاتے۔“ وہ پہلی مرتبہ مسکراتی۔ ”اور میں تمہیں

جانے نہیں دوں گی۔“

”اور اگر میں اس کے باوجود چلا جاتا تو؟“

”تو میں تمہارا پیچھا کرتی، میں نے تمہارے پاسپورٹ اور کمپننگ کارڈ سے تمہارا

لندن کا پتہ نوٹ کر لیا تھا۔“

ڈورینگ فرا کے سفید دامن میں گلابی روشنی کا ایک بے آواز جھباہا ہوا اور چند

لمحوں میں تیز مرنائی ہوا چلنے لگی۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ”میرے دادا نے ہنگری

کی ایک جیسی سے شادی کر لی تو والدین نے خانہ بدوش خون کی مخالفت میں انہیں

گھر سے نکال دیا۔ وہ دونوں تنگدستی میں ہی مر گئے مگر ایک دوسرے کے ساتھ شدید

محبت کرتے ہوئے۔ میرا باپ بالکل سوس ہے، شہری بال اور مرنخ و سفید کالباری

چہرہ اور میرے دو بہن بھائی بھی۔ لیکن میں۔۔۔ جیسی ہوں اپنی دادی کی طرح اور

میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“

یہ صورت حال ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کے لئے جسے ہفتے میں ایک آدھ باہ

ہی شیوہ کرنے کی حاجت پیش آتی تھی، بے حد اچھی ہوتی تھی اور مجھے وہ فی الحال اتنی

اچھی بھی نہیں لگ رہی تھی۔

”میں تمہیں ابھی اچھی نہیں لگتی۔“ وہ جیسے میرے خیال کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

”لیکن تم دیکھو گے کہ میں لگوں گی۔“

وہ برن یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران کمپننگ کے کافی

ہاؤس میں کام کر رہی تھی۔

”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ میرے سینے پر پھیلتا سانس ایک بچے کا تھا جو

مذتوں کھلے آسمان تلے گھومتا رہا اور اب گھر کی چوکھٹ پر مٹنے رکھے پناہ میں تھا۔

میں سالانہ خیمے میں سویا رہتا اور شام ڈھلے تیار ہو کر سبزہ زار کے بیچ بہتی نہر کے کنارے

سفید نشست پر جا بیٹھتا جیسی ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی آجاتی۔ یہ عجیب بات تھی

کہ وہ دن میں ہمیشہ مجھے بھی اور ایک تیم بچے کی اداسی لئے ہوتی اور رات کی تاریکی میں

اُس کی آنکھیں نو دینے لگتیں۔ وہ واقعی مجھے اچھی لگنے لگی تھی لیکن میں انٹر لاکن میں

کتنے روز گزار رہتا۔ مجھے چھٹیوں کے خاتمے سے قبل جرمنی اور ہالینڈ کے راستے واپس

لندن پہنچنا تھا۔ پانچویں روز میں نے خیمہ سمیٹ لیا۔ کمپننگ کے دفتر میں جا کر کرایہ

اداکیا اور اپنا پاسپورٹ مانگا۔ منیجر نے فون اٹھا کر جرمن میں کچھ کہا اور پھر دراز میں

سے پاسپورٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

دفتر کے باہر جیسی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

”میں کافی ہاؤس کی طرف ہی جا رہا تھا تمہیں خدا حافظ کہنے۔۔۔“

وہ نیچلا ہونٹ دباتے ہوئے مسکرا دی جیسے میں نہیں جا رہا تھا حالانکہ میں جا رہا تھا۔

”جرمنی جانے کے لئے تمہیں برن جانا ہو گا اور برن میں میرا گھر ہے۔ میں اپنے

والدین سے مل لوں گی۔“

برن کے سٹیشن پر جیسی نے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ

پوچھتا وہ غائب ہو گئی۔ تین گھنٹوں کے بعد وہ واپس آئی تو میں اُسے پہچان نہ پایا۔

وہ ایک راج ہنس لگ رہی تھی۔ تازہ سیٹ کئے ہوئے باں، سبک کا سفید لباس

اور نمود کی شال، اُس کے ہاتھ میں اب ایک نیا سوٹ کیس تھا۔

”تم مجھے کسی کمپننگ میں چھوڑ کر اپنے والدین سے مل آؤ۔“

”میں انہیں مل کر آ رہی ہوں۔ آؤ میں تمہیں کیمپنگ میں چھوڑ آؤں۔“

برن کے مشہور گھڑیال کے پہلو میں ایک قدیم سڑک ہے جس پر ٹھکی عمارتیں اور برآمدے چودھویں صدی کے سٹوٹز ریلینڈ کی یادگار ہیں۔ ان کی ساخت میں رد و بدل کرنا خلاف قانون ہے۔ وہ فوارے بھی موجود ہیں جن کے تالاب میں جانور پائیں بچھاتے تھے۔ جیسی اس سڑک پر کھلتے ایک ہوٹل ”ایڈلر“ میں چلی گئی۔ کاؤنٹر پر اپنا نام پتہ لکھا اور دوسری منزل پر واقع کمرے کا دروازہ کھول کر بولی ”کیمپنگ۔“

ہم دن کے وقت بہت کم باہر نکلتے کیونکہ باہر برن تھا اور کسی بھی موڑ پر اس کا کوئی جاننے والا یا رشتہ دار مل سکتا تھا۔ رات کو ہم پتھریلی گلیوں میں ایک ہو کر چلتے یا بڑے پل کے عین نیچے لب دریا ایک رستوران میں جا بیٹھتے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا اس قسم کا تھا جیسے ہم ایک عرصے سے ساتھ رہ رہے ہوں بلکہ اولاد کو بیاہ کر اب ریتا تو زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وہ ایک نوکرانی کی طرح میری خدمت کرتی اور ایک حاکم کی طرح میرے بارے میں فیصلے کرتی۔ اس کے اندر صرف دو جذبے تھے، محبت اور حسد۔ وہ میری طرف ایک نظر دیکھنے پر راہ چلتی لڑکیوں کے گلے پر جاتی۔ میں جس شے کے بارے میں بھی پسندیدگی کے کلمات ادا کرتا وہ اس کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کر دیتی۔ ان دنوں میرے پاس ایک سیاہ جیکٹ تھی جو میں دن رات پہنے رہتا۔ ایک رات ہوٹل واپسی پر اس نے وہ جیکٹ حسب معمول میرے کندھوں سے اتاری اور کھڑکی سے باہر پھینک دی... وہ شیو کرتے ہوئے بھی مجھے دیکھتی رہتی۔

ایک رات ہم دریا کے پار ایک پہاڑی سیرگاہ میں گئے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے سٹوٹز ریلینڈ میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہاں سردی لگتی ہے اور میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔“

”تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی...“ اسے عمروں کے فرق کا شہ

احساس تھا حالانکہ مشکل سے اکیس برس کی تھی۔

”مجھے جانے دو، کرسمس کی چھٹیوں میں پھر آ جاؤں گا، ضرور!“

وہ اپنے اس پاس سے بے خبر ہو گئی۔ وہ ابھی سے کرسمس کے گیت اور سُر ملی گھنٹیاں سن رہی تھی۔ ”سنو۔“ وہ عقوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں نہیں... میں سلمانکا یونیورسٹی میں ہسپانوی سیکھنے کے لئے ایک مختصر کورس میں داخلہ لے رہی ہوں، تم سپین آ جانا... اور پھر میں تمہارے ساتھ ہی لنڈن واپس چلی جاؤں گی۔“

اگلے روز میں سامان پیک کر رہا تھا تو وہ چپکے سے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے سیاہ چمڑے کی ایک جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن بند نہیں ہو رہے تھے۔ ”یہ میری طرف سے۔“ اس نے جیکٹ اُتار کر مجھے پہنا دی۔

مجھے احساس ہوا کہ اب تک کسی بھی مقام پر اس نے مجھے ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہوٹل کا بل بھی اُسی نے ادا کیا، حاکمیت کے ساتھ۔

سٹیشن جاتے ہوئے میں ایک شوکیس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”اگر تمہیں یہ سویر پسند ہے تو میں خرید دیتا ہوں۔“

”یہ مجھے پورا نہیں آئے گا۔“

”اور سائز بھی تو ہوں گے۔“

”میرا سائز نہیں ہو گا، میں بہت بڑی ہوں، بالکل سوئس گائے، تم نہیں جانتے؟“

”بہر حال...“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ میں تمہیں کچھ دوں۔“

وہ رُک گئی۔ ”کیا تم مجھے اپنا بچہ دے سکتے ہو؟“

میں بھی رُک گیا... وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دُج ڈاکٹر جاوٹی پھونک مارنے سے پیشتر مریض کو دیکھتا ہے۔ سیاہ اور حکم دیتی ہوئی انگلیں۔ ”کیا تم میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“ میرے بازو میں گھبٹی انگلیاں مجھے اذیت دینے لگیں۔ ”میں اسے شہزادوں کی طرح پالوں گی۔“ وہ اس وقت ایک تہذیب یافتہ سوئس لڑکی نہیں لگ رہی تھی اور وہ تھی بھی نہیں، وہ جیسی تھی،



اپنے قدیم جذوبوں کی نگہبانی کر رہی تھی، کہیں وہ ان جدید بستیوں میں کھو نہ جاتیں... میں اُس کی ”بچکانہ“ خواہش پوری نہ کر سکا۔

سٹیشن پر الوداع کہتے ہوئے وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ایک کند ذہن طالب علم کی طرح کھڑی رہی۔

دلایت میں ہر صبح میری ناشتے کی میز پر اخبار کے علاوہ ایک سوٹزر لینڈ کے ٹکٹوں والا لفافہ ضرور موجود ہوتا۔

کرسمس کی چھٹیاں آگئیں اور پھر کرسمس بھی۔ شدید برفباری میں سب طالب علم پرنسپل کے گھر گئے جہاں دوست ٹرکی اور کرسمس پڈنگ کا روٹی ڈنر ہمارا منتظر تھا اور اُس کی بیٹیاں پیانو پر کرسمس کیرل گارہی تھیں... جیسی مسلمانکامیں تھی جو بہت دور تھا۔

ناشتے کی میز پر رکھے خطوط قدرے بے قاعدہ ہونے لگے۔ میں کبھی کبھار ہی جواب دیتا۔ اگلے برس جیسی کا ایک طویل خط آیا۔ میں فلاں تاریخ کو ایک اطالوی بزنس میں کے ساتھ شادی کر رہی ہوں، اگر تم اب بھی آجاؤ تو... میں نے اس خط کے جواب میں جیسی کو اُس کی آئندہ شادی شدہ زندگی کی مسترتوں کی خواہش کا ایک تار روانہ کر دیا... اب ناشتے کی میز پر صرف اخبار میرا منتظر ہوتا... اُس کے اگلے برس میں پاکستان لوٹ آیا۔

ایک کرسمس تھی، مسلمانکا کی کرسمس کے چھ برس بعد... میں نے مختلف یورپی دوستوں کے نام مبارکباد کے کارڈ روانہ کئے۔ ڈائری میں جیسی کا پتہ بھی موجود تھا۔ جنوری میں اُس کا خط آیا۔ میں فردری میں تمہیں ملنے کے لئے پاکستان آ رہی ہوں اور وہیں رہنے کے لئے۔

لاہور ایئر پورٹ پر جیسی اُتری تو اُس کی کلاتیوں میں ایک ایرانی وزیرِ اعظم کی پیش کردہ دہرِجن بھروسوں کی چوڑیاں تھیں اور انگلیوں میں مشرق وسطیٰ کے کسی

شہزادے کی دی ہوئی بیروں کی متعدد انگٹھیاں۔ وہ اب اپنے کردہ پتی باپ کے ساتھ بزنس پارٹنر تھی اور کاروبار کے سلسلے میں دنیا کے مختلف ممالک میں آتی جاتی رہتی تھی۔ اُس کی شبابہت اب بھی جیسیوں کی سی تھی مگر شست و برخواست کے انداز نیم شاہانہ تھے۔ میں تمہارے موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی۔ فردری کے مہینے میں زکام آسانی سے لگ جاتا ہے۔ تم اتنے بوسیدہ اور تنگ گھر میں کس طرح سانس لیتے ہو، اس ملک میں اتنی دھول ہے کہ میرے پیچھے متاثر ہو جاتیں گے۔ وہ ہمدقت گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اُس کی آنکھوں میں لگے ہوئے کانٹیکٹ لینز میں بھی شاید دقت بتانے کا کوئی آلہ نصب تھا... اُن دنوں میرا حالہ زاد بھائی ساجد نذر حسبِ عادت ایک کار کریش میں ٹانگ ٹرڈا کر بستر میں لیٹا اپنی ماں سے خدمتیں کروا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیسی کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”میلو“ اور پھر پستیر میں بندھی ٹانگ کی طرف اشارہ کر کے معذرت کی۔ جیسی اُس کے پاس بیٹھی رہی اور بے تحاشہ ہنستی رہی۔ اُس نے ساڑھی بھی پہنی اور پھر میری ہمنوں کے ہمراہ بالو بازار چاٹ کھانے بھی گئی۔

لاہور ایئر پورٹ پر اُس نے مجھ سے ایک زبردست مہینڈ شیک کیا۔ ”سوری میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم اگر سوٹزر لینڈ آجاؤ تو میں تمہیں اپنی آرگنائزیشن میں ایک باوقار نوکری دے سکتی ہوں۔ تم اس کا ڈفارسیکن ملک میں پتہ نہیں کیا کر رہے ہو۔“ ”اس ملک میں وہ گھر ہے جس کے فرش صاف کرنے اور برتن دھونے کی تمہیں آرزو تھی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بچپن میں انسان کیا کچھ نہیں کہتا“ وہ گھڑی پر سے نظریں ہٹا کر مقدمہ مار کر ہنس دی۔ ”لیکن میں یہاں آکر مایوس ہوئی ہوں۔ تم بھی ایک مختلف انسان نظر آتے ہو... سوری میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے...“ تاریکی میں دیکھنے والی لڑکی اب دن کی روشنی سے واقف ہو چکی تھی۔

چار برس بعد میرے پاؤں کا جنون پھیلنے لگا۔ سوسٹریلینڈ لے گیا۔ برن کے کوچہ بازار میں سے بھی گزر رہا۔ آخری روز میں نے یونیورسٹی کو فون کیا، وہ ناراض ہو گئی۔ ”تمہاری بچوں ایسی حرکتیں مجھے سخت ناپسند ہیں، تم نے برن پہنچتے ہی مجھے کیوں فون نہیں کیا... کیا اب ہم دوست بھی نہیں ہیں؟ تمہیں مزید ٹھہرنا ہوگا؟“ اس کی حاکمیت برقرار تھی۔ مجھے رکنا پڑا۔

## بچہ جیسی اور خاموشی

میں نے درہ سینٹ کو تھارڈ کی چوٹی پر واقع رستوران سے جیسی کو فون کیا۔ ”مادام سالانہ چھٹیاں گزارنے فرانسیسی روپے لگتی ہوئی ہیں۔“ دفتر کے کسی کارندے نے جواب دیا۔ البتہ برن پہنچنے پر آپ پاکستان سے آئی ہوئی اپنی ڈاک ضرور وصول کر لیجئے گا، شکریہ۔“

ڈنیل کار کے باہر ٹھہر رہا تھا۔ ”جلدی چلو، اس درے میں دوپہر کے بعد ہمیشہ تیز اور سرد ہوا میں چلنے لگتی ہیں۔“

درے کے دوسری جانب ڈنیل نے انجن بند کر دیا اور نکلی متی بستران ایک سنپولے کی طرح پہاڑ کے گرد گھومتی اترنے لگی۔

انڈر ماٹ کے آگے سڑک کے درمیان ایک بورڈ رکھا تھا۔ ”گرمرل پاس برف کی درجہ سے بند ہے۔“ ہمیں برن جانے کے لئے ایک طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ کبھی بارش شروع ہو جاتی، کبھی گیلے پہاڑ اور پہاڑی قصبوں کی چھتیں چمکنے لگتیں اور کبھی ہم دھند میں اترنے لگتے۔ دلیم ٹیل کے قصبے میں سے گزر کر ہم ایک آبشار کے قریب رُکے اور اپنی اپنی پوٹلیاں کھول کر دوپہر کا کھانا کھانے لگے۔ سامنے ندی پر ایک پل تھا اور اس پر دو مجسمے ایسا تھے۔

”کہتے ہیں کہ اس وادی کے باشندے جب بھی ندی پر پل بنانے کی کوشش کرتے وہ پانی میں گر جاتا۔ بالآخر شیطان نے پیشکش کی کہ میں ایک ایسا پل بنا دوں گا جو کبھی

... اور اب ... یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب تجربے خود کار مشینیں بن جاتے ہیں، بٹن دبانے پر حرکت میں آتے ہیں اور کبھی نہیں آتے۔ سرد اور با مقصد احساسات ہر منظر کو ہر بدن کو ایک نئی فلم کے بار بار چلنے کی آگاہی سے دیکھتے ہیں۔ اور یہی دن ہیں جب سرسبز درخت بھی اچھے نہیں لگتے کہ ان کے پتے گر کر لان کو گندہ کرتے ہیں اور راج ہنس ہوتے ہیں مگر ان پر نظر نہیں جاتی۔ نظر اس گھڑی پر ہوتی ہے جو آپ کو ایک باقاعدہ اور ترتیب شدہ زندگی میں سے گزرتی ہے... آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل حقن کے کنارے آتش بازی چھوڑی جائے گی، اسے دیکھیں بغیر تو آپ یہاں سے جا ہی نہیں سکتے... اس فقرے کی سولہویں سالگرہ ان دنوں میں تھی۔



نہیں گرے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ پل پر سے گزرنے والا پہلا شخص میرا ہوگا۔ پہاڑی لوگ بے حد کاٹیاں ہوتے ہیں، انہوں نے نو تعمیر پل پر سب سے پہلے ایک بکری کو گزار دیا۔ شیطان نے غصے میں آکر ایک بڑا پتھر پل کی جانب لٹھک دیا مگر وہ خدا کے حکم سے راستے میں ہی ٹھہر گیا... ادرا ب ہم اسی شیطانی پتھر پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔“ ڈینیل نے بتایا۔

آلٹ ڈراف سے جھیل ٹومرن شروع ہو گئی۔ ہم ٹومرن شہر کی اس کمپینگ کے قریب سے بھی گزرے جس کی زمین میرے خیمے سے آشنا ہو چکی تھی... پھر ایک وسیع میدان کا آغاز ہو گیا جس میں ستران نے ایک ایسے بچے کی طرح بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا جو پہاڑی دروں میں گھٹ گھٹ کر چلنے سے اکتا چکا تھا۔ جھیل تھن کے پانی نظر آئے تو شام ہو چکی تھی... آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل تھن کے کنارے... برنیز نام کا ایک قصبہ آیا۔ گڑیوں کے گھروں والے ایسے سُرخ چھتوں والے سو سو شیلے جھیل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے ایک کمپینگ سائٹ بھی گزرتے دیکھی۔ پھر آتیں گے کہ خدا لایا۔ پھر انٹر لاکن دکھائی دیا۔ نیگ فراتے برس گزرنے کے بعد بھی نوجوان دھن ہی تھی۔

آج ہم تقریباً نصف سوئٹزر لینڈ میں سے گزر رہے ہیں، رات تک ہم برن پہنچ جائیں گے۔“ ڈینیل تھکاوٹ سے بولا۔

برن سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ذولی کوفن کے قصبے میں ”ماروناٹ ٹپل“ کی عظیم الشان عمارت کھڑی تھی۔ معبد کے پہلو میں رکھوالے کا مختصر گھر تھا۔ ڈینیل کے ماں باپ نے مجھے زبردستی روک لیا۔ ”رات کے وقت برن جیسے شہر میں رہائش تلاش کرنا بے حد دشوار ہوگا، صبح چلے جانا۔“

دوسری صبح مقامی ٹرین ایک سگرٹ کے خاتمے تک مجھے برن لے گئی۔

.....

وہی قدیم سڑک تھی۔ خراب دار برآمدے کے اوپر ”ہوٹل ایڈلر“ کا بورڈ اب بھی موجود تھا، اُس کھڑکی کے آگے مستطیل گلیے میں سے سُرخ پھول لٹک رہے تھے... ”ہمپرز رہت“ سڑک کے پار دوسری جانب کے برآمدے میں تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ ”ٹورسٹ ہیورڈ والوں کا کہنا ہے کہ آپ کے ہوٹل میں کمپینگ کی نسبت بھی کم کرتے پر رہائش دستیاب ہے...“ میں نے کاؤنٹر پر ایک تباہ حال بوڑھے کو پایا جو مسلسل چھت کو گڑبڑا رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک فارم پُر کیا۔ ”اس پر دستخط کر دو اور دوسری منزل پر چلے جاؤ۔“

ایک وسیع ہال میں ڈارمیٹری طرز پر نیچے اوپر تیس چالیں بستر لگے تھے۔ بیشتر لوگ ابھی سو رہے تھے اور جھٹکے فرش کے باوجود فضا میں ایک نامعلوم بساؤ تھی۔ میں نے سڑک پر کھلتی ایک کھڑکی کے قریب بستر پر اپنا سامان رکھ دیا۔ سامنے ”ہوٹل ایڈلر“ کی کھڑکی اب میری سطح پر تھی۔ اس کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔

برن ہمیشہ کی طرح قدامت میں سویا ہوا ایک ایسا شہر تھا جو یورپ کی انڈاؤنڈ آبادیوں میں ”لوٹس ایٹرز“ کی طرح شانتی سے اُگھٹا رہتا ہے۔ درمیان میں بہنے والا دریا بھی اتنا نرم مزاج ہے کہ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے والے پل پر کھڑے ہو کر اگر کان لگا کر سُنا جائے تو بھی اُس کی آواز بمشکل سُنائی دیتی ہے۔ شہر کے تفریحی چوک بارن پلائن میں قہور خالوں کے باہر لگی کرسیوں پر سیاحوں کے جھگٹے تھے۔ ایک ہتی گٹار پر جرمین لوک گیت سُنا رہا تھا اور اُس کی دوست بیڑ کے لئے پیسے اکٹھے کر رہی تھی۔ ایک مخمور بوڑھا باقاعدہ جھک کر سب کو سلام کر رہا تھا اور پھر تالیوں کے جواب میں اُس نے چوک کے درمیان میں بیٹھکیں لگانی شروع کر دیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ پتلون کی گریز خراب نہ ہو... ایک طرف فرش پر شطرنج کے خانے پیٹ کئے گئے تھے جن پر قد آدم مہرے حرکت میں تھے۔ تماشائی

دو بوڑھے فوجیوں کے درمیان لگتی بازی کو دیکھ رہے تھے۔ چال چلنے والا کھلاڑی غور و خوض کے بعد اٹھ کر اپنے مہرے کو آغوش میں لیتا اور گھسیٹتا ہوا اگلے خانے میں رکھ دیتا... کیسینو پلاٹزم میں ایک خوبصورت خاتون اشارے کر رہی تھی اور لوگ رُک رہے تھے کیونکہ وہ وردی میں تھی اور ٹریفک کا نشیلم تھی۔

بوم پلاٹزم شہر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ایک چار منزلہ جدید عمارت کے ماتھے پر بڑے حروف میں جیسی کی کاروباری فرم کا نام دور سے نظر آگیا۔ اندھا لکڑی حاکت کا احساس ہوا۔ سفر میں دنوں کا حساب تو رہتا نہیں، میں اتوار کے روز آ گیا تھا اور چھٹی تھی۔ عمارت کا بوڑھا رکھوالا، اس کی بیوی اور ان کی پٹی ہوئی ٹرکی مجھے مشکوک جان کر میرے گرد بھر گئے۔ میں نے اشارے سے سمجھایا کہ میں ان کے مالکان کا جاننے والا ہوں اور صرف اپنی ذاتی ڈاک وصول کرنے آیا ہوں جو پاکستان سے اس پتے پر بھیجی گئی تھی۔ پٹی ہوئی ٹرکی نے فون پر ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے بولنے والے سے متوہب ہو کر بات کی اور چونکا مجھے تھما دیا۔

”ہیلو۔ دیکھتے میرا نام مستنصر ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں، جیسی کا دوست ہوں، آپ جیسی کو جانتے ہیں ناں...“

دوسری جانب سے ایک بے اختیار منہسی کے درمیان میں مجھے اپنا نام سنائی دیا۔ یہ تو جیسی خود تھی۔

”تم تو چھٹیاں منانے کے لئے فرانسیسی روٹیراجا چکی تھیں...“

”نہیں نہیں میں یہیں ہوں مستنصر“ وہ ہنسی جا رہی تھی۔ جیسی تو صرف تم مجھے کہتے ہو بیوقوف آدمی، میرا سٹاف تو مجھے میرے خاندانی نام سے ہی جانتا ہے! انہوں نے سمجھا کہ شاید تم میری چھوٹی بہن کے بارے میں دریافت کر رہے ہو... مجھے فکر تھی کہ کہیں تم میری غیر موجودگی کی بنا پر سینٹ کو تھارڈ سے ہی واپس نہ چلے جاؤ...“

”میں صرف تمہارے لئے تو سوشل لینڈ نہیں آیا...“ اُسے برن میں پا کر مجھے

بے حد مسرت ہو رہی تھی۔

”اگر تم سوشل لینڈ کی سرحد پار کرتے ہو تو میرے مہمان ہو...“ وہ اسی طرزِ ثاب ہنسی چلی جا رہی تھی۔ ”چاہے تم میرے لئے یہاں آئے ہو یا نہیں... کہاں ٹھہرے ہو؟ کیا میں تمہارے لئے رہائش کا بندوبست کر دوں؟“

میں نے اُسے ہوشل کا نام بتایا۔

”غیر معروف جگہ ہے... بہر حال تلاش کر لوں گی۔ اس وقت میں مصروف ہوں شام چھ بجے آؤں گی۔“

وہ ایک سوس گھڑی کی طرح پورے چھ بجے میرے ہوشل کے دروازے پر ٹک ٹک کر رہی تھی... پہلے سے قدرے ڈبلی اور سماٹ البتہ دانتوں اور بالوں میں ایک مانگی تھی جیسے ایک وحشی جانور ایک عرصے تک قید رہے تو اُس کی آنکھیں کھجی کھجی سی رہنے لگتی ہیں۔ جیسی بھی وحشی جذبول کو کاروباری قید میں کھو چکی تھی، ایک عرصے سے۔

”تم ٹھیک لگ رہے ہو...“ اُس نے پُر مسرت نظروں سے میرے چہرے کو جانچا۔

”اور تم کیسی ہو؟“

”پچھلے ہفتے میرے ڈاکٹر نے تفصیلی جسمانی معائنے کے بعد مجھے ایک گھوڑے کی طرح فٹ قرار دیا ہے...“ وہ حسبِ معمول تمقہ لگا کر بولی اور پھر فزوافردا میرے خاندان کے بارے میں پوچھنے لگی جنہیں وہ پاکستان میں مل چکی تھی۔ ”اور ہاں وہ ڈنٹنگ لڑکا کیسا ہے جس کی ٹانگ پستری میں بندھی ہوئی تھی... اب بھی ریش ڈرائیونگ کرتا ہے؟“

”وہ اب فلائنگ کرتا ہے مگر ریش نہیں بے حد محفوظ، فوج میں کپتان ہے...“

”میرا بہت جی چاہتا ہے کہ میں اُن سب سے دوبارہ ملوں...“ اُس نے گھڑی لگائی۔ ”اوہ مجھے ابھی تمہارے ڈنر کا انتظام کرنا ہے... آؤ۔“

کار میں بیٹھ کر میں نے ”ہوٹل ایڈلر“ کے بورڈ کی طرف دیکھا۔ ”وہ گھڑی ابھی تک ہے...“

”ہاں“ اُس نے اُدھر دیکھے بغیر چابی گھمائی۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں... میں بھولی نہیں۔“

ہر چند سوگز کے فاصلے پر وہ کار روک کر نزدیکی سٹور میں چلی جاتی اور اشیاء خوردنی کے کاغذی تھیلوں سے لدی پھندی باہر آجاتی۔ ”تمہارا ڈنر...“

دو کروں کا فلیٹ دھیمی امارت کی ممک لئے ہوتے تھا، پریڈ فریجر، بھاری پردے اور دبیز قالین، سنہری فرموں میں جڑے آئینے... ٹیلی ویژن پر ایک چھوٹا سامصری مجسمہ رکھا تھا۔

”تم تہہ خانے سے اپنی پسند کا مشروب لے آؤ، اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں“ اُس نے ایک بھاری چابی میرے حوالے کی اور کچن میں گھس گئی۔

میں تہہ خانے سے مشروبات اٹھا کر واپس آیا اور کچن میں چلا گیا۔ ”دیکھو“ وہ ہنستے ہوئے بولی ”کیا میرا کچن ونڈر فل نہیں ہے؟... مشینیں ہی مشینیں...“

وہ گیس ریج اور فرج کے درمیان ایک مشین کی طرح حرکت کرتی رہی اور میں مشروب پیتا رہا۔

میرے ڈنر میں زعفرانی چاول تھے، گوشت کے مصالحے دار قتلے، پیس میں فراٹی کی ہوتی مچھلیاں اور پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ ایک بلاکی طرح میرے سر پر سوار رہی اور مجھے اپنی پلیٹ کی تنگی سطح دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

کافی کے لئے ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ”تم بہت زبردست لگ رہی ہو۔“

”میں؟“ وہ تہقہ لگا کر بولی۔ ”یہ کھانا تو میری مشینوں نے پکا یا ہے... میری ونڈر فل مشینیں، خیر اب تم بتاؤ کہ تم سوئزر لینڈ میں کیا کر رہے ہو؟“

”جو پہلے کرتا تھا، آواہ کر دی۔ یہاں سے جرمنی اور سویڈن جاؤں گا۔“

”ہج ہانگنگ کر کے؟“ وہ ناک چڑھا کر پوچھنے لگی۔

”ہاں، میرے پاس حسب معمول پیسے بہت کم ہیں۔ ہو سکتا ہے جرمنی سے ہی واپس چلا جاؤں...“

”تم اطمینان سے پورا یورپ دیکھو۔ میں کل ہی اپنے ٹریول ایجنٹ سے تمہیں ریل ٹکٹ خرید دوں گی اور تمام ملکوں میں اپنے کاروباری رابطوں کو ٹیلیفون سے دہانے کی کہ مستنصر کا خیال رکھا جائے ورنہ کاروبار ختم...“

”نہیں... اس مرتبہ نہیں۔“

”تم انکار نہیں کر دو گے؟“ اُس کی حاکمیت ابھر آئی۔ ”تم مجھ کو سوئزر لینڈ میں داخل ہوتے ہو، میری ذمہ داری بن جاتے ہو۔ خیر کل صبح تم کیسینو پلاٹزم میں میرے ذاتی دفتر میں آ جانا، پھر طے کر لیں گے...“

تپائی پر ایک ڈھلتی عمر کے خراٹ چہرے کی تصویر تھی۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ جانی ہے... وہ پیار سے بولی۔“

”اچھا تو یہ جانی ہے... منگلتر، سابقہ خاوند، محبوب یا کیا؟“

”فی الحال ایک بزنس پارٹنر... یونانی ہے، مصر میں رہتا ہے اور یہودی ہے۔“

... مصری فلائین جب ہل چلاتے ہیں تو کبھی کبھی کوئی دفن شدہ مجسمہ یا برتن زمین پر آ جاتا ہے۔ وہ اسے حکومت سے چھپا کر گاؤں کے نمبردار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں نمبردار اُسے نزدیکی شہر کے کسی ڈیلر کو دے آتا ہے اور ڈیلر قاہرہ لے آتا ہے اور وہاں جانی موجود ہوتا ہے... وہ فوراً مجھے اطلاع کرتا ہے اور میں قاہرہ پہنچ کر اُسے بیگ میں ڈال کر واپس آجاتی ہوں...“

”جیسی سمگلر ہو گئی ہے؟“

”یہ تو کاروبار ہے۔“ وہ کندھے سے سیکر کر بولی اور ٹیلی ویژن پر رکھا بالشت بھر کا مجسمہ اٹھا کر مجھے ہٹا دیا۔ ”اسے محسوس کرو کتنا وزن ہے... سنگ سیاہ سے بنا ہوا ہے۔“

وہ شلیف میں سے مصری فرعونوں کی ایک انسائیکلو پیڈیا نکال لاتی اور چند صفحے اُٹھانے

کے بعد ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ دیکھو کیا یہ مجسمہ اور یہ تصویر ایک ہی فرعون کی نہیں ہیں؟... برسیں نمبر ۳۴۔  
دونوں میں گہری مماثلت تھی۔

”ایک مجسمہ نادر تب ہی مانا جاتا ہے اگر اُس کی تاریخ اور شکل کا ٹھوس ثبوت مل گیا جائے... ریسرچ میں کرتی ہوں اور پھر مصریات کے کسی ماہر سے اُس کے بارے میں سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتی ہوں... اور پھر جو میوزیم بھی زیادہ قیمت ادا کرے“  
”یہ والا کتنے کا ہوگا؟“

”اگر کل ٹکڑے اس پر متفیق ہو جائے کہ مجسمہ اُسی فرعون کا ہے جس کی تصویر میں نے تلاش کی ہے تو پھر ایک لاکھ ڈالر کا...“

”اور تم اسے یونمی ٹیلی وژن پر بیٹھا چھوڑ کر باہر چلی جاتی ہو۔“

”انسورنس مائی ڈیر...“ وہ انگلیاں نچا کر ہنسی۔

دوسری تپائی پر ایک سُنہری بالوں والے قدرے نسوانی نوجوان کی تصویر تھی۔

”اور یہ کونسا جانی ہے؟“

”ہاں، یہ میرا سابقہ خاندن ہے... اس نے صرف میری دولت کے لالچ میں شادی

کی تھی۔ مجھے افریقہ لے جا کر ایک سات اکیڑ کے گھر میں بند کر دیا جہاں درجن بھر جستی ہو کر نے کھدے میں سے دانت نکالتے رہتے اور میں انٹر کنڈیشنڈ گھر میں سارا دن پڑی رہتی... تمہیں پتہ ہے میں کام کئے بغیر نہیں رہ سکتی، بس علیحدگی ہو گئی...“  
اُس نے غیر جذباتی انداز میں بتایا اور پھر تہقکہ لگا کر کہنے لگی۔ ”اصل بات یہ ہے کہ وہ کچھ آنا مرد بھی نہ تھا، خاص طور پر تمہارے آغاز کے بعد...“

وہ جھوٹی نہیں تھی۔

”تم یوں تنہا رہتے ہوئے اُگتا نہیں جاتیں جیسی؟“

”عام طور پر پُر خسانہ میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ بیمار ہے غریب شے ہسپتال

میں داخل کروایا ہے، اُس کی دُم میں زخم آگیا تھا۔“  
”دُم میں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں سڑک پار کر رہی تھی تو کسی بد بخت ڈرائیور نے اُس کی دُم پر سے پیٹہ گزار دیا...“ وہ چچ چچ کرتی ہوئی کہنے لگی... ”اور کافی لوگ؟“ وہ انتظار کئے بغیر ایک اور پیالی بھر لائی۔ ”اسے پورا در چلے جاؤ، کل صبح کیسینو پلازا آ جانا، میں دفتر سے چھٹی کر لوں گی اور پھر پلنگ کے لئے کہیں چلیں گے۔“

ہوسٹل کے دروازے کے سامنے کار روک کر اُس نے پہلے ”ہوٹل ایڈلر“ کی کھڑکی کو دیکھا اور پھر میرے گال پر ہتھیلی رکھ کر کہنے لگی۔ ”میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ میں مستفصر کو اتنے عرصے سے جانتی ہوں کہ ہم ساتھ ساتھ جوان ہوتے اور اب... کیا یہ وڈنڈل نہیں کہ ہم اس قدر قریبی دوست ہیں؟“

”وڈنڈل“ میں نے مشینی انداز میں جواب دیا اور کار کا دروازہ کھول کر فٹ پاتھ پر آگیا۔ ہوسٹل کے اندر تمام روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔

میں اپنے ہال کمرے میں داخل ہوا تو دروازہ کھلنے کی آواز پر مختلف بستروں میں سے عجیب ناقابل فہم سی بڑبڑاہٹ سنائی دی جیسے غلیظ جوہر میں کوئی خالی ٹکڑا ڈوب رہا ہو، بوجھ تھی، غلیظ جوہر ایسی... میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اوپر کے بستر میں لیٹا مسافر کو دہیں بدل رہا تھا اور اُس کے آہنی سپرنگوں کی کسمپاش میرے دماغ میں کھب رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا مگر ایک عجیب حیوانی آواز کے ساتھ جیسے ٹوڑھا مینڈک ٹرانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ میں کمبل میں مٹنے لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ایک شدید متلی آواز بوجھیل رہی تھی اور پانی کے گرنے کی آواز جیسے کوئی ڈھیلانکا بہہ رہا ہو... میں نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تاریک ہال کے وسط میں کھڑا ایک لرزتا ہوا جسم، سر جھکائے کچھ

بے اختیار سا ہو کر اپنا شانہ خالی کر رہا تھا...

”ہے...“ میں چنیا۔ ”تم ٹائلٹ میں نہیں جاسکتے؟“

وہ اُسی طرح کھڑا رہتا رہا، اپنے آپ کو خالی کرتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ بقیہ بستروں میں حرکت ہوتی مگر وہاں سے صرف ہلکی ہلکی ڈکار نما آوازیں آئیں، کوئی کچھ نہ بولا... میں مُنہ میں رُومال مٹھولیں کر پھر لیٹ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو ایک چُست جسم کی اُدھیر عمر عورت ایک لمبے بُرش سے لکڑی کے فرش کا متاثر شدہ حصہ دھو رہی تھی، میں نے اُسے پچھلی شب کے بارے میں بتایا۔ ”یہ بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ بُرش کو فیनाئل کی بالٹی میں ڈبو کر تاسف سے کہنے لگی۔ ”مجبور ہیں۔“

ناشتے کے لئے ڈائننگ رُوم میں داخل ہونے والا میں پہلا شخص تھا۔ میں نے میز پر ہاتھ بھیرا، اُس پر میل کی تہہ جی ہوئی تھی۔ ہال کی صفائی کرنے والی عورت اندر آئی۔ ایرن بانڈھ کر کاؤنٹر کے پیچھے جھکی اور پھر میری میز پر آکر کافی کا ایک گگ اور جام کی ایک پلیٹ رکھ دی... کافی یخ ہو چکی تھی اور اُس میں بھی بُو تھی، اور جام کا مزا کچھ ایسا تھا... آہستہ آہستہ ڈائننگ رُوم بھرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ مخصوص بساند جو اس عمارت کے رگ و پے میں تھی، تیز ہوتی گئی... میزوں کے گرد بیٹھے مسافر مجھے دیکھ رہے تھے، آنکھیں پھولی ہوئی اور مُردہ چہرے بگڑے ہوئے جیسے ناقص آئینوں میں سے جھانک رہے ہوں یا بڑے مجسمے کو تندر میں ڈال کر فوراً نکال لیا جاتے... وہ سب اتنے بوڑھے تھے کہ ان میں بولنے کی سکت بھی نہ تھی۔ وہ متلی آور بساند ان کے گھلتے ہوئے بوسیدہ نیم مُردہ گوشت میں سے آرہی تھی... ایک بوڑھا پاؤں گھسیٹتا ہوا اور میرے سر پر کھڑے ہو کر کسی ذبح ہوتے ہوئے حیوان کی طرح غاں غاں کرنے لگا۔ میں شاید اُس کی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ بُو بہت تیز تھی، میں اُٹھا اور ادائیگی کر کے باہر آ گیا۔

کیسینو پلاٹز کے آس پاس ٹریفک کا شور تھا اور شیشے کی دیواروں میں بند دفتر میں جیسی دو ٹیلیفونوں پر بیک وقت گفتگو جھگڑا رہی تھی اور ساتھ ساتھ لوٹ بھی گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے دونوں چونکے مُنہ کے قریب لاکر کوئی شکر کہ معذرت کی اور فون بند کر دیئے۔

”جن جن شہروں میں تمہیں جانا ہے وہاں میں نے ٹیلیکس کر دیئے ہیں، رات ٹھیک سوئے؟“

میں نے پچھلی شب اور ڈائننگ رُوم کی کراہت آمیز تفصیل بتائی۔ ”ہمارے ہاں اولڈ پیبلز ہوٹم تو موجود ہیں مگر ان میں رہائش کے لئے بھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے چنانچہ عزیز اور بے آسرا بوڑھے اس قسم کے سستے اور خیرات سے چلنے والے ہوٹلوں میں پڑے رہتے ہیں...“ اُس نے ایک اخباری اور غیر متاثرانہ انداز میں بتایا۔

”لیکن وہ صرف بوڑھے نہیں تھے، اُن کے جسموں سے نوال کی بو اُٹھتی تھی، گوشت بوسیدہ ہو کر گرنے کو تھا۔“

”وہ مصنوعی جسم ہیں۔“ جیسی بولی۔ ”ڈاکٹر انہیں طرح طرح کے ٹیکوں اور دواؤں سے مصنوعی طور پر زندہ رکھتے ہیں... تمہیں معلوم ہے کہ سوئٹزرلینڈ ایک ویل فیئر سٹیٹ ہے اور ہم لوگوں کو آسانی سے مرنے نہیں دیتے... ویسے مجھے ایسی جگہوں کے بارے میں علم تو تھا لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ ان کے اندر بوڑھے لوگ اس قسم کی حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں۔“

میں نے اُسے اپنے ہاں کے عمر رسیدہ لوگوں کے بارے میں بتایا جن کے چہرے غربت کے باوجود روشن رہتے ہیں اور جن کی موجودگی میں ہمیشہ سادگی کی آرام دہ ملک ہوتی ہے۔

”اصل فرق تنہائی یا ہمسائی کا ہوتا ہے... یہ لوگ تنہا ہیں اور کوئی بھی ان کے

قریب نہیں جاتا۔ تمہارے ہاں کے بوڑھوں کو میں نے اکثر اپنی اولاد کے درمیان دیکھا ہے۔“

”تم بھی تو تنہا سوچیں۔“

”میں؟ وہ بے تحاشہ ہنس دی۔ اتنے فون، فائلیں، دفتر اور پھر رخصانہ۔“ فون کی گھنٹی بجی۔ ”اوہ... میں پندرہ منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی، تم اتنی دیر کے لئے اپنے آپ کو مصروف کر لو۔“ اور چونکا اٹھا کہ کسی کا دوبارہ گفتگو میں مگن ہو گئی۔

میں اخبار دیکھنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد اُس نے دفتر بند کیا اور ایک بھاری بیگ میرے حوالے کر دیا۔ ”اس میں تمہارا ڈرنر ہے۔“ اور ہم باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔

”سب سے پہلے رخصانہ کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔“

رخصانہ مرنے میں تھی۔ چھوٹا سا شفاف ڈربہ، خوراک کے لئے چمکتی پلیٹیں اور اور پیالے اور ایک نوجوان نرس جو ہر دوسرے لمحے آکر اُسے مائی ڈارلنگ بے بی کہتے ہوئے تھپکتی اور چلی جاتی۔ اُس کی دم پر ایک دوگرہ کی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میرے ہوسٹل کا کوئی بھی بوڑھا اس ڈربے میں رہنے کے لئے رخصانہ کے پاؤں چاٹتا... جیسی نے اُسے ڈامن کی چند گولیاں کھلائیں اور ہم جانوروں کے ہسپتال سے باہر آ گئے۔

”ذرا چھوٹی بہن سیمن کو مل آئیں، پچھلے تین ہفتوں سے میں اُدھر جا نہیں سکی۔“

سیمن نے بقول جیسی ایک لٹکنے ملاح کے ساتھ شادی کر کے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی اور اب ایک وسیع رہائش گاہ کے دروازے کے ساتھ ایسا دہ ایک بوسیدہ سے جھونپڑے میں ہنسی خوشی رہتی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو تین ریچھ نمائکتوں نے ہمیں باقاعدہ صوفوں پر گرالیا، وہ بے حد نرم تھے۔

سیمن نے انہیں جبر میں برا بھلا کہا اور وہ کونے میں جا کر ایک کٹے ہوئے خمر گوش کے لوٹھڑے چبانے لگے۔ دونوں بہنوں میں مختصر سی گفتگو ہوئی میرا تعارف ہوا جس پر سیمن ایک خاص انداز میں کھانسی کہ اسے تو میں جانتی ہوں اور کافی کے ایک ایک مگ کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔

”جھوٹ بولتی ہے کہ اس کا خاندان شپ پر گیا ہوا ہے، وہ لفنگا اسی شہر میں ایک عورت کے ساتھ رہ رہا ہے اور کبھی کبھار اسے ملنے آ جاتا ہے... بس اب ڈاکٹر ذمن کے پاس ہوا تیں پھر کلنک پر چلیں گے۔“

ڈاکٹر ذمن کی سٹڈی میں فرعونوں کے مقبروں ایسا ماحول تھا۔ مصری مجسمے، تابوت، تصاویر اور شیلفوں میں مصریات کی ہزاروں کتابیں۔ جیسی نے اُسے اپنا مجسمہ دکھایا اور اپنی تحقیق کے بارے میں آگاہ کیا۔ ڈاکٹر ذمن نے مجسمے کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھا۔ تیزاب کا ایک قطرہ ٹپکا کر پتھر کی بوسونگھی اور کہنے لگے۔ ”مادام آپ اگلے ہفتے رابطہ قائم کیجیے گا۔ اس خاندان کے فرعونوں کے مکمل کوائف صرف برلن کی لائبریری میں ہی دستیاب ہیں، میں دو تین روز تک وہاں چلا جاؤں گا۔“

”اور تمام اخراجات میرے ذمے...“ جیسی سٹڈی میں سے نکلتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمام کوائف اس کی اپنی لائبریری میں موجود ہیں... بہر حال اگر یہ سرٹیفکیٹ بنا دے تو مجسمہ ایک لاکھ کا وزن ایک ہزار کا بھی نہیں... اور اب ہم کلنک کے لئے شہر سے باہر ایک کالج میں چلیں گے جو میرے بھائی کا ہے مگر ان دنوں خالی پڑا ہے۔“

گمراہ اور راستے کے آخر میں لکڑی کا ایک بوسیدہ پھاٹک تھا جو درازا سا دھکیلنے پر کھل گیا۔ کالج کے آس پاس قد آدم گھاس سرسرا رہی تھی اور لکڑی کی دیواروں سے خود رو بلیں چمٹی ہوئی تھیں۔

”اُدھر دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔“ اُدھر ہماری آہٹ سے گھاس میں لرزش پیدا



نہر کے کنارے گھاس تھی، وہ ہمارے جسموں سے دہی تھی۔

کافی گرم تھی، میں نے گھونٹ بھرا اور ٹیلی ویژن پر رکھے فرعون کے سیاہ مجسمے کی طرف دیکھا۔ اُس کی تنہائی ہزاروں برس کی تھی... جیسی اپنے جوتے اتار کر صوف پر نیم دراز کافی کی پیالی پر جھکی تھی، اس کی تنہائی کا آغاز تھا۔

”تم مجھے کہیں سے ایک بچہ لا کر نہیں دے سکتے؟“ وہ سر اٹھا کر بولی۔

میں چونک گیا۔ ”تم یقیناً اپنی خواہش یاد رکھتی ہو۔“

”میں اُسے ایک شہزادے کی طرح پالوں گی۔“

”اور تمہیں اُس کے پالنے کی تفصیل بھی یاد ہے۔“

”نہیں مستنصر... مجھے ایک سگرٹ دو۔“ میں نے ایک سگرٹ سُلگا کر اُس کی

آنکھوں میں رکھ دیا۔ ”میں واقعی کسی بچے کو گود لینا چاہتی ہوں... میں نے پاکستان میں بے شمار لاوارث بچے دیکھے ہیں۔ کیا تم اُن میں سے کسی ایک کو سوئٹزرلینڈ بھجوانے کا انتظام نہیں کر سکتے؟“

”تم بہت مصروف ہو اور بہت ہی خود مختار... بچے کی پرورش کے لئے وقت اور غلامی چاہیئے۔“

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ”میں اتوار کو بالکل نارغ ہوتی ہوں اور اکثر شاموں کو بھی۔“

...تم نے دیکھا نہیں کہ میں رخصانہ کی کس طرح دیکھ بھال کر رہی ہوں...“

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ ”کچھ فرق ہوتا ہے ایک کُتیا میں اور ایک انسانی بچے میں۔“

”انسان بھی تو ایک طرح کا جانور ہی ہے ناں... میں اُسے بہترین خوراک اور لباس

دوں گی، دیکھ بھال کے لئے ایک نرس رکھ لوں گی، اُسے اور کیا چاہیئے...“

”دہی جو ہوسٹل میں گھسنے والے غاں غاں کرتے بوڑھے اپنی ادلا کو نہیں دے سکے۔“

”تم قنوطی ہو گئے ہو۔“

ہوتی اور ایک طویل قامت سُنہری بالوں والی بھری بھری خاتون کھڑی ہو گئی، پھر بیٹھ گئی۔ دوبارہ کھڑی ہوئی تو تویے میں لپٹی ہوئی تھی... جیسی نے ایک زہر آلود سکرپٹ اُس کی جانب پھینکی اور دو چار نفروں کے تبادلے کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی میرے بھائی کو جانے بڑا گوشت کیوں آنا پسند ہے... اُس کی داشتہ ہے، مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گوشت آج ہی دھوپ سینکنے یہاں آجائے گا۔“

کار میں دوبارہ بیٹھ کر وہ اُنکی سے ناک تھکنے لگی۔ ”اب کہاں جائیں؟“

”دوپہر ہو چکی ہے، کھانا ہی کھانا ہے، یہاں کار میں بیٹھ کر ہی کھا لیتے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔“ اُس کی حاکمیت جاگ اُٹھی۔ ”ہم کسی ونڈر فل مقام پر پکنک

منائیں گے مثلاً... مثلاً...“ اُس کا چہرہ کیدم کھل اُٹھا اور آنکھیں شرارت سے چمکنے

لگیں۔ ”مجھے بالکل معلوم ہے کہ ہمیں پکنک کے لئے کہاں جانا ہے۔“

اولین تجربوں کا میدان سرسبز تھا۔ شاید وہی سفید نشست اور یقیناً وہی

پُر سکون نہر جو جھیلوں کے درمیان بہتی تھی... نیک فرا کی چوٹی دوپہر کی دھوپ

میں آئینہ بنی کھڑی تھی۔ سبزے کی تازہ مہک اور پانی کی نم آلود قربت ہوا میں تھی...

جیسی نے سفید نشست کی سطح پر اُنکی پھیری، گرد تھی۔ وہ اس پر رُومال بچھا کر

قدرے بے آرامی سے بیٹھ گئی۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“

”میں اس منظر کو پہلی مرتبہ دن کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں...“ کہیں نے اپنے

پاؤں کی طرف دیکھا۔

”میں بھی اُس کے بعد پہلی مرتبہ بیان آئی ہوں...“ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی

میں سفید نشست کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا مگر بے دلی کے ساتھ۔ زمین دہی

تھی مگر اُس پر چند برس پیشتر بسنے والے خانہ بدوش کوچ کر چکے تھے... مجھے لگتا ہے

کہ میں واپس بوڑھوں کے ڈانٹنگ روم میں پہنچ گیا ہوں۔ ”یہاں بوسیدگی ہے۔“

”یہاں نہیں، ہم میں ہے...“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ چلیں۔“

”انگلینڈ... وہاں میرے چچا ہیں، چند روز پراٹھے اور پلاؤ کھا کر سیاحت کے لئے طاقت حاصل کروں گا اور پھر جرمنی اور ڈنمارک کی اُہلی ہوئی سبزلیں کی جانب لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے اگر تم نے ارادہ کر لیا ہے تو...“ اُس نے فون آگے کر دیا۔ ”انہیں اپنی آمد کی اطلاع کر دو۔“

”اپنے چچا ہیں جیسی انہیں اطلاع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“  
 ”نہیں مجھے فکر ہے کہ تمہیں کہاں چلے گئے ہو، فون کر لو۔“  
 میں نے آپریٹر کو برمنگھم انگلینڈ کا نمبر دیا اور اُس نے لائن ملا دی۔ اُن کی بیٹی نے فون اٹھایا۔

”مستعمر بول رہا ہوں، سوٹزر لینڈ سے۔“

”جی بھائی جان...“ اُس نے صرف اتنا کہا اور دھڑپیں مار کر رونے لگی۔

”خالہ، کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

”خیر نہیں ہے بھائی جان... ساجد بھائی جہاز کے حادثے میں شہید ہو گئے ہیں۔“  
 ”کب؟“

”آج اُن کا دسواں ہے...“

میں نے فون بند کر دیا۔

کوئٹہ کی وہ صبح بھی ایسی ہی ہوگی، قدرے ٹھنک اور چمکلی جب پٹن ساجد نے اپنے فوجی ہوائی جہاز کے پیلوں کو زمین کی گرفت سے آزاد کیا۔ چند سو گز اوپر جانے کے بعد زمین پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ جہاز واپس آ رہا ہے اور پھر اُس کا ڈھانچہ اُن کے سامنے جل رہا تھا۔ ساجد کو جلتے ہوئے جہاز کو توڑ کر باہر نکالا گیا تو وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے سٹر پیچر پر لیٹنے سے انکار کر دیا اور اپنے قدموں پر چلتا ہوا جیپ تک گیا۔ جیپ ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال پہنچا، طویل سیڑھیاں اُٹھ کر کمرے میں داخل ہوا۔

”میں تھک گیا ہوں...“

اُس رات مجھے اُس پاس کے بستروں میں کراہتے اور پھولتے ہوئے جسموں پر بے حد ترس آیا۔ بے چہرہ اور بے گھر بوڑھے جو کبھی اپنے بچوں کو بہترین لباس اور زینت مہیا کر کے کہتے تھے، انہیں اور کیا چاہیے؟

اگلی صبح میں نے کسی میز پر بیٹھنے کی بجائے کاؤنٹر پر ہی ناشتہ کر لیا... مجھے عجیب سا ہوا تھا کہ میری پشت پر تمام بوڑھوں کی نیم مردہ آنکھیں ہیں، یہ کہاں سے آگیا، کھڑا ہو سکتا ہے، چل بھی سکتا ہے اور اس کی زبان بھی کام کرتی ہے... راہداری میں سے گزرتے ہوئے میں ایک بڑھیا کو راستہ دینے کے لئے رُک گیا۔ سفید ہیٹ جس پر گلاب کا ایک پھول لگا ہوا تھا، شوخ لباس، ادبچی ایڑی کی جوتی اور جرابیں۔ وہ پھولدار چھتری کی نوک فرش پر جاتے ایک پاؤں گھسیٹ کر آگے کر رہی تھی۔

”کیا میں مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں چل سکتی ہوں۔“ اُس نے خفیف آواز میں کہا۔

میں کافی دیر کھڑا رہا مگر اس دوران اُس نے صرف دو تین قدم کا فاصلہ طے کیا۔ میں مجھک کر قریب سے گزرا گیا۔

باہر ایک نیم خنک دھوپ والی سوس صبح تھی۔

جیسی کے دفتر میں داخل ہوتے ہی کیسینر پلاٹر کی ٹریفک کا شور مدھم ہو گیا... وہ حسب معمول فون پر قبضے لگا رہی تھی۔ میں تازہ اخبار کے درق اُلٹنے لگا۔ میں نے تمہاری رہائش کے لئے ایک صاف ستھرا کمرہ تلاش کر لیا ہے۔ وہ فون رکھ کر سرکاری انداز میں بولی۔ ”فوراشفٹ کر جاؤ۔“

”میرا خیال ہے کہ میں مزید ایک شب اُن بوڑھوں کے ساتھ گزار لوں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں مزید ایک شب اُن بوڑھوں کے ساتھ گزار لوں گا۔“

”کہاں؟“

”تم نے فون پر کوئی بُری خبر سنی ہے۔“ اُس نے کارسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”اب مجھے بتاؤ۔“ وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بٹھاتی ہوئی بولی۔  
 ”ساجد... آئی ایم سوری، وہ کتنا خوبصورت نوجوان تھا۔“

میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ساجد کے نام کے ساتھ ”ہے“ کی بجائے ”تھا“ کا لفظ سنا اور مجھے جیسی بے حد بُری لگی۔ وہ میرے دکھ میں شریک ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ اُس مختصر ملاقات کا ایک ایک لمحہ بیان کرتی رہی جب اُسے دیکھ کر ساجد اپنا لمبا بازو ہلاتا ہوا بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ہیلو۔“ اور اُس کی شرارتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”میں ابھی وطن کوٹنا چاہتا ہوں، ابھی...“

”تم اس حالت میں پہنچ ہی نہیں سکتے... راستے میں رہ جاؤ گے... میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

میرا جسم فوج زدہ تھا جیسے پھول رہا ہو۔ جیسی سے کافی کا لگ لیتے ہوئے میں نے شکریہ کہا اور مسکرایا بھی۔

اگلے روز برن تارک تھا۔ بادل سردوں پر اُترے ہوئے تھے۔ بے پناہ بارش تھی۔ میں ٹھٹھرتا بھیگتا پاکستانی سفارت خانے میں گیا کہ شاید وہاں کسی اخبار میں حادثے کی تفصیل نظر آجائے، کچھ بھی نہ تھا۔ ”کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنے بھائی کا؟“ ایک نوجوان سفارت کار نے پوچھا میں نے بتایا۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ”میرا ایک دوست ہے اسی نام کا لیکن وہ میجر ہے... شکریہ ہے، میں سمجھا شاید...“ میں باہر نکل آیا۔

بارش کا پانی سیاہ تھا، کونوں میں گھلا ہوا۔

اگلے تین روز جیسی مجھے ایک بیمار بچے کی طرح بہلاتی رہی... اپنے تمام دوستوں کے پاس لے کر گئی۔ سٹوڈنٹ لینڈ کے طول و عرض میں گھماتی رہی مگر مجھے تمام

ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگا۔ ”ڈاکٹر میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں، مجھے کوئی انجکشن لگا دیں۔“ اُس کے چوڑے کندھوں پر سچی خاکی وردی سلگ رہی تھی، سیاہ ہو رہی تھی۔ جسم کا نوٹے فی صد حصہ جل چکا تھا۔ جلے ہوئے جسم کو سب سے بڑا خطرہ سپینک ہو جانے کا ہوتا ہے چنانچہ اُس کے بستر کے گرد پالی تھین کا ایک خیمہ نصب کر دیا گیا۔ اُس نے نرس سے کہا۔ ”میری ماں لاہور میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے، میں اگلے ہفتے چھٹی پر جا رہا تھا۔ میرا کوئی سگا بہن بھائی نہیں، ماں خالہ زاد ہیں... میرے ایک بھائی جان ہیں جنہیں سیاحت کا جنون ہے... وہ اس وقت یورپ میں ہوں گے کہیں...“ اور بالآخر لاپے قدر اور گھنگھریالے بالوں والا ساجد جس کی شرارتی آنکھیں اور ڈشنگ شخصیت دیکھ کر مجھے زارِ روس کی فوج کے بیباک گھڑسوار افسر یاد آجاتے تھے، موت کے زرد دوسپیکر کے آگے بازی ہار گیا۔  
 ... ساجد اپنا جہاز روک دو۔ آسمانی بلاؤں نے کہا اور اُس نے روک دیا۔

میری آنکھیں خشک تھیں اور بدن کا نپ رہا تھا۔

میں دفتر سے باہر آگیا... خاموشی تھی، جیسے تمام آوازیں بند ہو چکی ہوں... لوگوں کے منہ ہل رہے تھے مگر آوازیں نہیں تھیں... ٹریفک کا شور بھی نہیں تھا... چیزیں سیاہی مائل دکھائی دیتی تھیں... لوگ چل رہے تھے اور یہ لوگ کیوں زندہ ہیں... انہیں مرجانا چاہیے... میں ان کا گلا گھونٹ دوں گا، یہ سب ساجد سے عمر میں بڑے ہیں... میں دروازہ کھولوں گا تو خالہ کہیں گی۔ ”ساجد چلا گیا۔“ میری ننگی پیٹھ پر دھوپ کی شدت اُترتی، اُس پر بھائی کا سایہ نہ تھا... بڑے پُل کے پار دیاتے آر کے ساتھ جنگل نما ایک گھنا پارک تھا... میں نے ایک اُونچے درخت کے تنے کے گرد اپنے بازو پیٹے اور رونے لگا۔

میں اپنے بستر پر اوندھا لیٹا تھا، جیسی ہال میں داخل ہوئی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

پھاڑ اور پانی سیاہ دکھائی دیتے۔ میں راتوں کو چلتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بیٹھا رہتا۔  
 بُرن کے سٹیشن پر چبھی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ایک گندہن  
 طالب علم کی طرح کھڑی تھی۔ میں اور اینٹ ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔

## ہوا میں مرگ

استنبول تک دو دن کا سفر مجھے یاد نہیں۔ صرف وہ قبر نما طویل مُرنگس یاد ہیں  
 جن میں گاڑی ایک مُردہ جسم کی طرح داخل ہوتی تھی... میں سر جھکائے گم رہا... میں  
 اُس وقت کہاں تھا، وہ لمحہ کونسا تھا جب ساجد کا جہاز کریش ہوا... اُس کا بدن  
 جلا... کونسا... میں کہاں تھا...

آج اتوار تھا، صبح کے دس بجے تھے، ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔  
 دس بجے تھے مگر دھوپ میں ایک نامعلوم سی سیاہی گھٹی ہوئی تھی۔  
 ابدی شہر سے نکلنے والی سڑک کے دور درید سرو کے درخت پتھر کے بنے تھے کہ  
 بالکل ساکت کھڑے تھے جیسے روم سے بغاوت کے جرم میں مصلوب غلاموں کے لاشے  
 اکڑ رہے ہوں۔

ایک کھنڈر ہوتا ہوا اُدھی اکھاڑا نظر آیا۔ شکستہ اینٹوں میں گھاس اور سر کنڈے  
 اور درمیان میں ایک نوجوان جس کی نگاہیں اپنے گرد سمار ہوتی ہوئی عمارت میں کچھ تلاش  
 کر رہی تھیں... گلیڈی ایٹر میدان میں مقابلے کے لئے کھڑا تھا، مگر بغیر ہتھیار کے...  
 آج اتوار تھا، صبح کے دس بجے تھے، ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔

اور وہ سالن میں نے کہاں لئے جب اُس کے سالن ختم ہوئے... کوئی شہر  
 میں... کوئی جگہ تھی جہاں میں تھا اور اُس وقت ساجد نہیں تھا... کونسا لمحہ...  
 میں کہاں تھا؟

... دھوپ صرف چھتوں پر تھی اور ایک موزڈب خاموشی تھی جیسے گھر کے کونوں میں جھانکنے سے سنائی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہوگی... باہر کی دُنیا سے ایک کبوتر اُترا اور باغیچے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے پردوں کی پھڑپھڑاہٹ بھی مجھے ناگوار گزری۔ وہ کچھ دیر گردن پھللا پھللا کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر شاید لب خانے کے سناٹے سے تنگ آکر اڑا، پھڑپھڑاتا ہوا جیسے ابھی گر جائے گا... وہ گر گیا۔

استنبول آ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ پر بحیرہ مرمر، چھیروں کی کشتیاں، بائیں طرف خانہ بدوشوں کے خیمے، پھر چھیروں کے گاؤں، بلند پارٹنٹ، چٹانوں پر بنے لکڑی کے گھر۔ پھر شہر کی دیوار آئی، ستائیس سو برس سے زندہ شہر۔ سنہری دروازے پر پرکڑے شوکھ رہے تھے، نیلی مسجد اور ٹوپ کاپی دکھائی دیتے اور گاڑی شاخ دریں کا چکر کاٹ کر سرکسی شیشن پر کھڑی ہو گئی۔

سفر کے دوران اطالوی لڑکے فرانسکو اور رکارڈو اپنی ڈھیمی شرافت اور پرفارم کم گوئی کی بنا پر میرے دوست بنے، وہ افغانستان جا رہے تھے۔ زیر زمین آبِ محل کے قریب ہم نے ایک ہوٹل میں سامان رکھا اور ”سلم ٹورز“ کے دفتر سے ڈائرکٹ تہران جانے والی بس کے بارے میں معلومات حاصل کیں... پوسٹوں، شام، پانچ بجے... ہم تینوں نے ٹکٹ خرید لئے۔

دوسرے روز میں اُن کو شہزادوں کے جزیروں میں لے گیا۔ چوک میں رنگین جھانڈوں والی سیاہ گھسیاں کھڑی تھیں۔ ”اوپر چوٹی پر چیل اور سرو کا گھنا جنگل ہوگا۔ خود رو گھات میں جنگل بھول ہوں گے“ میں نے رکارڈ کو بتایا، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ رہائشی مکان اُس جگہ کو ڈھانپ چکے تھے۔ دوسری طرف اتر کر میں نے ڈھلوان پر جیکٹ بچا دی۔ ”یہاں سے بحیرہ مرمر اور اُس میں بکھرے خوبصورت جزیرے دکھائی دیتے تھے“ ”کیا تمہیں یقین ہے؟“ خوش شکل رکارڈو نے گھروں کی چار دیواریوں میں سے

کہیں کہیں جھانکتے بحیرہ مرمر پر نگاہ ڈالی۔

”ہاں، ایسا تھا اور نیلے سمندر میں جھولتی کشتیوں کے بادبانوں کے گلوں میں گھنٹیاں بانہ دینے کی خواہش سر اٹھاتی تھی۔“

”اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا“ فرانسکو جیسے میں دُنیا کا خوبصورت ترین جزیرہ دکھانے کا وعدہ کر کے یہاں لایا تھا، مایوسی سے بولا۔

”ہاں، کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔“

ہم نے اپنا پکنک بیچ ختم کیا اور اگلے سٹیمر سے استنبول واپس آ گئے۔

ہم اپنے سامان سمیت تین بجے ہی ”سلم ٹورز“ کے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے۔ بیشتر مسافر آچکے تھے اور بے حد باتونی ہو رہے تھے۔ ایک فلی مینیوٹر کا بار بار قہقہے لگا رہا تھا اور ہر مسافر سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ ایک امریکی سیاح میرے مین خالی کر رہا تھا اور گیارہ پر ایک کا ڈبوائے گیت ”قبرستان ادہ قبرستان“ بڑے اُداس انداز میں گارہا تھا۔ چار بجے کسی نے اندر آ کر نعرہ لگایا ”بس آرہی ہے“۔ سب مسافر سامان گھسیٹتے ہوئے باہر نکل آئے۔

بس کی پیشانی پر ”استنبول، تہران ڈائرکٹ“ کا بورڈ ہر کسی نے خصوصی توجہ سے پڑھا اور گہرے اطمینان کا اظہار کیا۔ شمسیت آرام دہ تھیں۔ روانگی سے بیشتر سلم ٹورز کے ترک منیجر نے مسافروں کی گنتی کی، سوچ میں پڑ گیا، رجسٹر پر اکتیس ٹکٹوں کا اندراج تھا اور مسافر تینتیس تھے۔ ٹکٹ دوبارہ چیک کئے گئے... سب کے پاس ٹکٹ تھے۔ اُس نے ٹکٹوں کی کاپی منگوائی، وہاں بھی اکتیس مسافروں کی ٹکنگ تھی۔ تیسری بار پھر مسافر گنے گئے اور ٹکٹ چیک ہوئے۔ بغیر ٹکٹ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بس کمپنی کے ٹکنگ کلرک کو بلا یا گیا۔ اُس نے مسافروں اور اُن کی ٹکٹوں کا بغور مطالعہ شروع کیا اور بالآخر دو انگریز ٹورسٹوں پر برس پڑا۔ ”تمہارے پاس پوسٹوں کی ٹکنگ ہے، تم آج روانہ

”نہیں۔“ فرانسکو چونکا۔ ہمارے والدین تو ہمیں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔  
 ”میں مذاق کر رہا تھا۔ میں کئی مرتبہ یہ سفر کر چکا ہوں، کبھی خراش تک نہیں آتی۔  
 ... بس استنبول سے باہر نکل لے تو میں واپس آ کر تمہارے ساتھ ایک سگرٹ پیوں گا۔  
 میں اپنی نشست پر آ گیا۔

ہم باسفورس پر تعمیر کردہ نئے پل کی جانب جا رہے تھے۔ سامنے وندسکرین  
 میں ایک مڑنگ نظر آئی۔ محسوس ہوا جیسے بس کی رفتار کچھ زیادہ ہے۔ مڑنگ میں ایک  
 دوکاروں کو بھی ادورٹیک کیا اور ہم دوسری طرف روشنی میں نکل آئے۔ شاہراہ کے  
 دونوں طرف فٹ پاتھ تھے اور ان کے ساتھ آہنی ریلنگ۔

”مجھے استنبول کی سکاٹی لائن بے حد پسند ہے۔“ میں نے ہم نشست فلی پیو سے کہا۔  
 ”آخری مرتبہ دیکھ لوں۔“ میں اپنی نشست سے اٹھا۔ سامنے ایک پل نظر آ رہا تھا اور  
 اُس کے نیچے باسفورس کا سیاہی مائل پانی۔ اسی لمحے میں نے وندسکرین میں دیکھا کہ  
 پل اور ہماری بس کے درمیان ایک سرخ دین نمودار ہو رہی ہے۔ وہ غلط ہاتھ پر مڑ رہی  
 تھی، تیز رفتار بس نے اُسے بچانے کی کوشش کی مگر پچھلے حصے میں جا کر اپنی ”خدا کا شکر  
 ہے ہم بچ گئے۔“ کسی نے کہا کیونکہ بس پھر چل رہی تھی، مگر اب قدرے بے قابو ہو کر۔

ایک شدید دھچکے سے فٹ پاتھ پر چڑھی، ریلنگ کو توڑا اور پھر فضا میں تیرنے لگی۔  
 استنبول کی سکاٹی لائن آخری مرتبہ... بدن میں ایک خلائی کیفیت... میں نے اگلی  
 نشست کو مضبوطی سے پکڑ لیا... نیچے سمندر تھا اور ہم جانے کتنی بلندی پر تھے...  
 نیچے سمندر۔ سمندر... ”میں مرنے لگا ہوں...“ لیکن خوف نہیں تھا، ایک رگ دپے  
 کے سن اور لا پرواہ ہونے کا گندا احساس... ایٹم کے یہ دترے جن سے میرے ہاتھ،  
 کان، آنکھیں لا پرواہی سے اکٹھے ہوئے تھے اُسی طرح اب کبھر جائیں گے۔ ”میں  
 مرنے لگا ہوں۔“ تمہاری ہڈیاں کبھر جائیں گی اور جب تک یہ اکٹھی ہیں ان کو ساتھ  
 لے کر چلو... ایک آوارہ کرد، ایک نافرمان اور مذہبچے کی زندگی زندگی کی لبرکرتا

ہونے والی بس میں کیوں سوار ہو گئے ہو؟ انہوں نے بہت سختی کی کہ ہمیں آج  
 ہی لے چلو، ہمیں ہر صورت پرسوں تک تہران پہنچنا ہے مگر انہیں زبردستی اتار دیا گیا۔  
 ... رکاردو اور فرانسکو فوراً پچھلی نشستوں سے اٹھے اور ان کی خالی کردہ نشستوں پر  
 براجمان ہو گئے، ڈرائیور کے عین پیچھے، وندسکرین کے پاس۔  
 ڈرائیور نے چابی کھائی تو رستم ٹورز کا میجر مسافروں سے مخاطب ہوا: ”کیا  
 آپ میں سے کوئی صاحب اس سے پہلے تہران جا چکے ہیں؟“  
 میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

”تو پھر براہ مہربانی اس بس کو امیر کبیر سٹریٹ تک پہنچا دیجئے گا، ڈرائیور  
 پہلی مرتبہ تہران جا رہا ہے۔“

مسافروں میں کھسکے ہوئے کہ ڈرائیور کہیں انارڈی نہ ہو۔ فلی پیو کہنے لگا۔  
 ”نہیں یونہی ترک جس مزاج کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔“

”تو خواتین و حضرات...“ میجر اترنے سے پیشتر ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔  
 ”آپ کو تہران تک کا خوشگوار اور محفوظ سفر مبارک ہو اور رستم ٹورز کو یاد رکھئے۔“ اور  
 بس سے نیچے اتر گیا۔

بس چلی تو وہ انگریز سیاح ہمیں اتنی بے چارگی سے دیکھ رہے تھے جیسے ہم  
 انہیں استنبول کے کسی چوک میں نہیں، موت کے منہ میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔  
 مسافر جیکٹیں اور سویٹر اتار کر آرام سے بیٹھنے لگے۔ بس استنبول کے پرجوش  
 بازاروں میں سے گزر رہی تھی۔ پھر ہم ایک شاہراہ پر مڑ گئے۔ میں اپنی نشست سے  
 اٹھ کر ڈرائیور کے عین پیچھے بیٹھے رکاردو اور فرانسکو کے پاس چلا گیا۔  
 ”بشرطی کی جانب یہ ہمارا پہلا سفر ہے... ہم اپنے جسموں میں سنسنی محسوس کر  
 رہے ہیں۔“

”اور یہ ایک نہایت ہی پراسرار سفر ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”پراسرار اور پرخطر۔“

ہے، کسی کا حکم نہیں مانتا، اُس کا واحد مالک رنگ بدلتا آسمان ہوتا ہے...  
 صرف آسمان دکھائی دے رہا تھا اور استنبول کی عمارتیں تیزی سے حرکت کر رہی  
 تھیں... اور آوارہ گرد اُس آدم کا بیٹا ہے جو ابھی ابھی زمین پر اترتا ہے اور  
 خدا سے دُھوپ، بارش، دُھند، برف، گرمی، سردی، بھوکا یا بھرا ہوا پیٹ لیتا  
 ہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ یہ سب وصول کرتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ مستقبل میں کیا  
 ہوگا... کیا ہوگا، نیچے سمندر ہے۔ سمندر۔ سمندر...

بس شاید ایک لمحے کے لئے ایک ہی جگہ معلق ہوئی، رُکی... کئی سو گز نیچے  
 سمندر... ایک آوارہ گرد بے شک تہذیب یافتہ ہو یا جنگلی، زندگی میں ناکام ہو  
 یا کامیاب، بہادر ہو یا بُزدل، وہ ایک بچہ ہے اور ڈرتا ہے اُس مرگ سے جو ہوا  
 میں ہے اور زندگی کی حرارت کو کھا جائے گی... مرگ جو ہوا میں ہے... بس شاید  
 ایک لمحے کے لئے ایک ہی جگہ معلق ہوئی، رُکی اور پھر ہوا میں گرنے لگی جیسے ایک  
 پر کٹے پرنڈے کو ہوا میں اُچھال دیا جائے تو وہ بالآخر نیچے گرنے لگتا ہے۔

